حیدر آباد ـــــــ جو کبھی تھا

سقوطِ حیدر آباد کی سبق آموز اور افسوس ناک کہانی
کے۔ ایم منشی اور وی۔ پی مینن کی خود نوشت داستان
منشی مینن کے افکار و خیالات پر سیر حاصل تبصرہ

رئیس احمد جعفری

کتاب منزل، لاہور

THE END OF AN ERA.

حیدر آباد — جو کبھی تھا؟

مملکت حیدر آباد کے سقوط کی کہانی

کے، ایم منشی ایجنٹ جنرل حکومتِ ہند متعینہ حیدر آباد

اور

وی پی مینن سکریٹری محکمۂ امورِ ریاست حکومتِ ہند

کی زبانی!

رئیس احمد جعفری

ناشرین

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۶۷

طبع اوّل ۱۹۶۰ء

مطبوعہ .. .. علمی پرنٹنگ پریس لاہور

پرنٹر و پبلشر .. شیخ نیاز احمد

سب سے پہلے

سارے ہندوستان میں رقبہ، آبادی، اور آمدنی کے لحاظ سے حیدرآباد کی ریاست
یگانہ اور ممتاز تھی، یہ یورپ کے کئی ملکوں سے بڑی تھی۔ اس کے مخصوص روایات تھے۔
ان روایات کے زیر سایہ ہندو مسلم معاشرت نے ایک نیا قالب اور سانچہ بنا لیا تھا
سارے ہندوستان میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی، لیکن حیدرآباد میں امن تھا،
سارا ملک ہندو مسلم تفرقہ کا شکار تھا، لیکن حیدرآباد میں اس طرح کا سوال ہی نہیں
تھا۔ ہندو اور مسلمان سب اپنے بادشاہ کے زیر سایہ آشتی اور امن سے رہ رہے
تھے۔ اس بادشاہ کی ایک آنکھ ہندو تھے اور ایک مسلمان اس بادشاہ نے قومیت
متحدہ کی صحیح معنوں میں داغ بیل ڈال دی تھی لیکن اس کا سب سے بڑا جرم یہ
تھا کہ اس کا نام عثمان علی خاں تھا پرتاپ سنگھ نہ تھا۔ از روئے آئین، از روئے
معاہدہ یہ آزاد تھا، اسے آزاد رہنے کا حق تھا، لیکن یہ حق زور اور قوت کے بل پر چھین
لیا گیا جسطرح برطانیہ نے یہ حق کبھی ہندوستان سے چھین لیا تھا، جسطرح روس نے فن لینڈ
سے یہ حق چھین لیا تھا، جس طرح جاپان نے کوریا اور منچوریا سے یہ حق چھین لیا تھا، جس طرح
جرمنی نے چیکوسلواکیہ سے یہ حق چھین لیا تھا، جس طرح فرانس اب تک الجزائر کا یہ حق دبائے

بیٹھا ہے، جس طرح برطانیہ نخلستان برومی کو یہ حق دینے پر تیار نہیں ——

اس بادشاہ نے اور اس کے آباؤ اجداد نے بڑے کٹھن اور نازک وقت پر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا، لیکن جب اس پر کٹھن اور نازک وقت آیا تو انگریزوں نے اسے تنہا چھوڑ دیا۔ انگریزوں کے سب سے بڑے نمایندے نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا، انگریزوں سے آزادی چھیننے والی کانگرس نے حیدرآباد کو آزادی دینے سے انکار کر دیا۔

یہ داستان گھر کے بھیدی منشی اور مینن نے صفائی اور بیباکی سے بیان کی ہے میں نے جوں کی توں پیش کر دی ہے، بعد میں ملاحظات و الضاحات کے ماتحت اہم حقائق برافگندہ نقاب کر دیئے ہیں۔ میری بعض کتابوں پر بعض بزرگ جن سے مہر و کرم کی توقع تھی خفا ہو گئے، بعض کرم فرما شورش پر آمادہ ہو گئے، دیکھا چاہئے اس مرتبہ مجھے ان سے کیا ملتا ہے، چلتے چلتے ایک شعر پڑھنے کو جی چاہ رہا ہے۔

جلوۂ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شور قیامت کس کے آب و گل میں ہے؟

رئیس احمد جعفری

انتساب

اپنے بزرگ دوست سید تقی الدین مرحوم
ہوم سکریٹری حکومت حیدرآباد
کے نام جنھوں نے آزادیٔ حیدرآباد
کے لئے تن، من، دھن، سب کچھ
قربان کر دیا۔

رئیس احمد جعفری

فہرست

حیدر آباد کو مملکتِ اسلامیہ بنانے کی کوشش صفحہ ۷۲

حیدر آباد کا آزاد رہنے پر اصرار صفحہ ۴۶

قاسم رضوی کا عروج صفحہ ۹۴

سردار کی بساط شطرنج صفحہ ۱۰۰

چھتاری ڈیلیگیشن صفحہ ۱۱۱

رضوی کی فتح مندیاں صفحہ ۱۱۷

لائق علی وزارت صفحہ ۱۲۹

آتشیں تقریر ــــــ

حالات:۔ جن سے میں دوچار ہوا، صفحہ ۱۳۷

دکن ہاؤس ــــ بدگوئی ــ حملے ــــ مسلمان مہاجر ــــ ریاستی ریلوے ــــ سردار سے ملاقات

گفت و شنید: پہلا مرحلہ صفحہ ۱۴۲

لائق علی سے ملاقات ــــ میری حیثیت ــــ میں کیا تھا؟ ــــ میرے مشاہدات ــــ معین نواز جنگ ــــ میرا دورہ ــــ بڑی مشکل ــــ کیا میں جھوٹا تھا؟

کیمونسٹ میدان میں آتے ہیں صفحہ ۱۵۰

کامریڈ ایسوسی ایشن ــــ کیمونسٹ تکنیک ــــ کیمونسٹوں کی تلون کیشی ــــ متشددانہ سرگرمیاں ــــ کانگرس سے اتحاد ــــ کیمونسٹوں کی چالاکی ــــ بعض کیمونسٹ لیڈروں سے میری ملاقات،

حلقہ ٹوٹتا ہے، صفحہ ۱۵۶

رضا کار میرا تعاقب کرتے تھے ــــ پرنس آف برار کی سعادت مندی ــــ یہ سالار جنگ تھے ــــ وہ ہندو جاگیردار ــــ جاسوس بے وقوف بناتے تھے ــــ جاسوسوں کے نرغہ میں ــــ دوگانہ فرض ــــ بیچارہ ڈاکٹر ــــ پنالال پٹائی ــــ شاستری کی کارگزاریاں ــــ میرا جاسوس ــــ خودکشی کا راستہ ــــ منظور یار جنگ کا ذکر خیر ــــ ہوش یار جنگ کی سرگرمیاں ــــ ہوش بڑے اچھے آدمی تھے ــ

نصف شب کے وقت ـــــ علی یاور جنگ کا تبصرہ ـــــ بیگم علی یاور جنگ ـ ـــــ مہدی یار جنگ بستر مرگ پر ـــــ میری نئی قیام گاہ ـــــ

گاندھی جی کا قتل صفحہ ۱۶۸

میرے اسٹاف کے ممبر ـــــ ایک خرابی افسر ـــــ مسٹر "ایکس" ـــــ عجیب حرکت ـــــ میرے خلاف میرے دفتر میں محاذ ـــــ سردار سے میری شکایت ـــــ میں نے سب کچھ بتا دیا ـــــ سردار سے طویل گفتگو ـــــ سردار کو خراج تحسین ـــــ سردار کے کارنامے ـــــ ـــــ گاندھی جی اور کانگرس ـــــ گاندھی جی اور سردار ـــــ گاندھی جی کا قتل ـــــ حملہ آور مغلوب ہوگیا ـــــ حسرت ناک منظر ـــــ "بس ختم" ـــــ قاتل ہندو تھا ـــــ گاندھی جی کی وصیت ـــــ گاندھی جی کی لاش ـــــ

یہ رضاکار! صفحہ ۱۷۶

ہم انتظار نہیں کریں گے ـــــ معین نواز جنگ کا بیان ـــــ گاندھی جی کی خاکستر ـــــ جوشی اور لائق علی ـــــ لائق علی عجیب شخص تھا ـــــ خاکستر کا جلوس ـــــ لائق علی کافی متاثر تھے ـــــ لائق علی سے میری گفتگو ـــــ مانکٹن سے میری ملاقات ـــــ رضوی پھر خفا ہوگئے ـــــ ممالک غیر سے رابطہ کی کوشش

بلارم ریزیڈنسی میں میرے شب و روز، صفحہ ۱۸۴

میری مصروفیتیں ـــــ میری بیوی ـــــ کار پر ہندوستانی پرچم ـــــ میری جان لینے کی تیاریاں ـــــ میرے بچے ـــــ فون پر گفتگو ـــــ

آخری دوستانہ گفتگو صفحہ ۱۹۰

کمیونسٹوں اور رضاکاروں کے بے پناہ مظالم صفحہ ۱۹۶

بحرِ عمیق صفحہ ۲۳۱

رضوی کی پُراسرار تقریر صفحہ ۲۰۵

لائق علی پھر بدلے ــــــ مجھے بے وقوف بنایا گیا ــــــ عجیب وغریب ماحول
ــــــ پنڈت جی لائق علی سے عاجز آ گئے ــــــ نظام نے پھر انکار کر دیا ــــــ
نظام کے شرائط صلح

لارڈ ماؤنٹ بیٹن رخصت ہوتے ہیں صـــ ۲۳۵

موقع ہاتھ سے نکل گیا ــــــ نہرو کی پریس کانفرنس ــــــ کیا مسٹر جناح ڈوری
ہلا رہے تھے؟ ــــــ ماؤنٹ بیٹن سے میری الوداعی ملاقات ــــــ
ماؤنٹ بیٹن کی نظام کو تنبیہہ ــــــ ظہیر احمد سکرٹری وزارت خارجہ
ــــــ سردار کا فرمائشی قہقہہ ــــــ ستون منہدم ہونے لگا ــــــ
جوشی کا استعفا ــــــ اٹلی سے نظام کی استدعا ــــــ جنگی تیاریاں
ــــــ بنا ہوائی اڈہ ــــــ امریکہ میں پروپیگنڈا ــــــ طاؤسی فضائی
فوج

بے حوصلگی! صـــ ۲۴۵

سردار کا فیصلہ کن اعلان ــــــ یہ تھے کمانڈر انچیف العیدروس ــــــ
میرا لڑکا رضاکاروں کے نرغہ میں ــــــ رضاکاروں سے عیدروس کی ان بن
ــــــ بادشن بجبر کرنل گراہم ــــــ رضوی اور عیدروس میں کھٹ پٹ
میرا ایک کارنامہ ــــــ پرنس آف برار اور عیدروس میں چل گئی ــــــ
نظام اور پرنس آف برار ــــــ نظام کا ایک اور فرزند سعادت مند ــــــ

کنگ کوٹھی میں طوفان صـــ ۲۵۲

ہوش اور نظام ــــــ سر مرزا اسماعیل پردہ کے پیچھے ــــــ علی یاور جنگ
کی سازباز ــــــ سر مرزا اسماعیل نظام کے ایلچی بن کر دہلی گئے ــــــ

پولیس ایکشن کا آغاز اور میری گرفتاری صفحہ ۲۷۸

میر اور حیدر آباد کا سقوط ساتھ ساتھ صفحہ ۲۸۷

پولیس ایکشن کے بعد صفحہ ۲۹۷

ایک مرحلہ کا اختتام صفحہ ۳۰۴

حکومت ہند کے ہاتھوں میری درگت صفحہ ۳۰۷

ایک دَور کا خاتمہ صفحہ ۳۱۲

نظام راج پر مکھ بن گئے ـــــ عثمانیہ یونیورسٹی کا انجام ـــــ
ریاست حیدرآباد ختم ـــــ ہندو مسلم اختلافات ـــــ ہندوؤں نے مسلمانوں
کو ترکی بترکی جواب دیا ـــــ تحریک آزادی ہند میں چند مسلمان بھی شریک
تھے ـــــ نظام کچھ نہیں رہ گیا ـــــ ایک دور ختم ہوگیا ـــــ

خالدہ ادیب خانم کا سفر حیدرآباد صفحہ ۳۱۷

مشاہدات و تاثرات
(میں نے حیدرآباد میں کیا کیا دیکھا)

ملاحظات و ایضاحات (۱) صفحہ ۳۳۵

کانگرس کی قوم پرستی کا امتحان ـــــ مسٹر منشی کا تعارف ـــــ
کانگرس سے مسٹر منشی کا قطع تعلق ـــــ منشی اور جواہر لال ـــــ
ـــــ مسٹر منشی حیدرآباد میں ـــــ مسٹر منشی کی خود گزشت
غیر معتبر حکایات ـــــ بیگمات کی توہین ـــــ جاسوس ساز ایجنٹ جنرل
ـــــ مسٹر منشی کا غصہ ـــــ سیکولر حکومت کا فرقہ پرست
ایجنٹ ـــــ حیدرآباد اور کشمیر کا فرق ـــــ مسٹر منشی کا تعصب
ـــــ "تاریخی" شاہکار ـــــ رضوی کی تقریروں پر احتجاج و اضطراب ـــــ
رضاکاروں کے خلاف احتجاج و اضطراب ـــــ شعیب اللہ کو رضاکاروں نے نہیں قتل کیا تھا ـــــ
خود ہندوؤں نے کیا کیا؟ ـــــ کیا حکومت حیدرآباد کے ہندو مظلوم تھے
ـــــ حیدرآباد کے امتیاز خاص سے انکار ـــــ حیدرآباد کو آزادی
پر اصرار کیوں تھا؟ ـــــ بی بی نگر ڈکیتی کیس ـــــ مسٹر منشی
کا اعتراف شکست ـــــ غداران مملکت آصفیہ ـــــ پرنس آف برار

—— معاہدہ قائمہ پر دستخط ہو گئے —— معاہدہ قائمہ کے دفعات
نظام کا خفیہ خط

حیدرآباد (۲)

معاہدہ قائمہ کی خلاف ورزیاں اور جارحانہ کارروائیاں صفحہ ۳۸۶

خود فریبی —— کے ایم منشی —— ایجنٹ جنرل بے حیثیت تھا ——
نظام کے دو آرڈی ننس —— پاکستان کو بیس کروڑ کا قرض ——
معین نواز جنگ کی طلاقت لسانی رضاکاروں کی خوفناک سرگرمیاں سردار کی معنی خیز تقریر
—— وزیر اعلیٰ مدراس کی فریاد —— پاکستان کو قرض کیوں
دیا گیا ؟ —— حیدرآباد میں نئے فضائی اڈے —— رضاکار
اور لائق علی —— تعاون کی فضا کیونکر پیدا ہو ؟ ——
حیدرآباد میں جمہوریت کا مطالبہ —— پھر وہی الحاق کا مسئلہ
—— سردار پٹیل ہی سب کچھ تھے —— گول میز کانفرنس کا اعلان
—— حکومت ہند کا الٹی میٹم —— لائق علی کا جوش جہاد ——
عید روس کی اپیل —— لائق علی کے جوابی الزامات —— ثالثی کا
مطالبہ ؛ نظام کا مکتوب —— قاسم رضوی کی شعلہ بار تقریر ——
نہرو سے مانکٹن کی ملاقات —— ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ
—— نظام کو رشوت کی پیش کش —— حکومت ہند حیدرآباد
پر حملہ نہیں کرے گی —— رضوی کی شعلہ بار تقریریں ——
نہرو کی یقین دہانی —— منشی کے خلاف لائق علی کی شکایت ——
—— حیدرآباد کے مسائل کا فیصلہ عوام ہی کر سکتے ہیں —— لائق علی
کی سردار سے ملاقات —— حیدرآباد کسی امتیاز کا سزاوار نہیں ——

حیدر آباد (۳۱)

پولیس ایکشن کی کہانی صفحہ ۴۱۳

—— نظام کا اقرارِ وفا —— جیل میں قاسم رضوی سے میری ملاقات
—— حیدر آباد کا نظم و انصرام —— حیدر آباد کے مسلمانوں میں ہم
نے اعتماد پیدا کر دیا —— جاگیرداری نظام کی تنسیخ ——
نظام کے صرف خاص پر قبضہ —— معاوضہ کی ادائی —— ریاستی
جاگیروں کی آمدنی —— ہندوستان کے خلاف نکتہ چینی ——
لائق علی کا طعنہ —— ایک انگریز ریزیڈنٹ کے پیمبرانہ الفاظ

تصویر کا دوسرا رُخ صفحہ ۴۲۷

•

"حیدر آباد کی خونیں داستان"

فوجی یلغار سے پہلے —— تخریبی سرگرمیاں —— چھیڑ چھاڑ کا
آغاز —— حیدر آباد کی فریاد —— جنگ بغیر اعلان جنگ کے
—— غلامی کی زندگی یا آزادی کی موت —— رضا کار فوج میں
شامل ہو گئے —— لیکن . . . . ——
فوج کو واپسی کا حکم —— سازش اور غداری کا جال ——
لیکن یہ سرفروش ——؟ —— آنے والی مصیبت کا انتظار
—— یہ پولیس ایکشن نہ تھا فوجی حملہ تھا —— پھر کیا ہوا-؟
—— تبدیلی مذہب کے واقعات —— یہ نہاجر . . . ——
پٹھان اور عرب —— مسلمان ملازمین سرکار ——
کشتگانِ ستم —— مسلمانوں کی جگہ ہندوؤں کا تقرر ——
- نظام کی آزادی —— اخبارات بند —— . . . . یہ بھی ہوا
—— اب یہ بھی جرم ہے —— وہ چھ پٹھان ——
—— صادق علی شہید —— مالا باری بہادر ——

ملاحظات و ایضاحات (۲) صفحہ ۴۵۷

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی —— لائق علی نے چھکے چھڑا دیے —— الحاق کیوں اور کس اصول سے ؟ —— حیدر آباد کی اقتصادی وصنعتی حیثیت —— حیدر آباد کی آزادی و خود مختاری —— بادشاہت سے انکار —— خود مختاری کا ایک اور ثبوت —— دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست —— نظام اور حکومت ہند کے مابین سفارتی تعلقات —— غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی فیاضانہ سلوک —— تخویف و تہدید گورنر جنرل وغیرہ کی طرف سے —— ایک پرانی یاد —— پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی مثالیں —— ثالثی سے چڑ —— پولیس ایکشن کے بعد —— ہمیشہ رہے گا نام اللہ کا،

نقش و نگار در و دیوار شکستہ صفحہ ۴۸۳

سر اکبر حیدری —— عثمانیہ اردو یونیورسٹی —— دار الترجمہ —— دائرۃ المعارف —— سردار پٹیل کے نام کے ایم منشی کا خط —— حیدر آباد کے اقتصادی حالات کی رپورٹ، سردار پٹیل کی خدمت میں۔

ایک دَورِ کا خاتمہ

•

کے، ایم منشی ایجنٹ جنرل حکومتِ ہند متعینہ حیدرآباد

•

اب بزم میں حاضر جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سوداؔ کو سنا بولتے یارو
اللہ رے اللہ رے کیا زورِ بیاں ہے

حرفِ محرمانہ!

غیر منقسم ہندوستان کی سیاسی تاریخ مرتب کرنے والوں کے لئے ہندو سیاستدانوں نے عام طور پر اپنی خود نوشت، ڈائری، یادداشت اور تاثرات لکھکر بہت بڑا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ بعض نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھی اس طرح کی کوشش کی ہے، اور وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہی ہے، بہر حال معلومات کا اچھا خاصا سرمایہ ان چیزوں کو سامنے رکھ کر حاصل ہو جاتا ہے

جیسے جیسے "جمہوریت" یعنی اکثریت کی حکومت کا تصور نمایاں ہوتا گیا، جیسے جیسے مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ وہ مستقل اقلیت ہیں، اور مغربی جمہوریت انھیں مستقل اکثریت کا مستقل غلام بنادے گی، ہندو اکثریت بھی یہ محسوس کرنے لگی کہ خدا نے اسے لازوال اور دائمی اکثریت کی دولت سے مالا مال کیا ہے، اسے حق ہے کہ سب کچھ خود لے لے، دوسروں کو کچھ نہ دے، خود تو اپنی تہذیب، اپنا کلچر، اپنی ثقافت، اپنے روایاتِ ملی و قومی، اپنے شعائر دینی و مذہبی، اپنی زبان اور اپنے رسم الخط کو فروغ دے، لیکن اقلیتوں کی ان تمام چیزوں کو پنپنے اور ابھرنے کا موقع نہ دے۔

یہیں سے ہند و مسلم کشمکش کا آغاز ہوا۔ ______________

___ اور جب تک اس کشمکش کا آغاز نہیں ہوا تھا مسلمانوں نے بغیر کسی شرط کے، بغیر کسی معاہدہ کے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے آزادیٔ ہند کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی، وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے استعمار فرنگ کا طلسم توڑ کر رکھ دیا، جو اقلیت میں تھے، نہتے تھے، سازو سامان اور وسائل و ذرائع سے محروم تھے، لیکن جب آزادیٔ ہند کے لئے سر بکف ہو کر میدان میں آئے تو قصرِ فرنگ سست بنیاد ثابت ہوا، اور ___ تزلزل در ایوان کسریٰ فتاد!"

اس حقیقت سے جواہر لال بھی انکار نہیں کر سکتے کہ کانگرس کی حیات نو اور اس کی قومی حیثیت مسلمانوں کی رہین منت تھی، اب تک کانگرس پہ ماڈریٹ اور لبرل قسم کے ہندو سیاستدانوں کا قبضہ تھا جو لیڈر یا رسمی کی چھٹیوں میں بیٹھ کر اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کے تناسب یا اسی طرح کی بے ضرر سی تجویزیں منظور کر لیا کرتے تھے لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد کانگرس کو نیا خون ملا، نئی قوت ملی، نیا زور ملا، نیا دبدبہ حاصل ہوا، اور بہت جلد وہ سارے ہندوستان کی سب سے زیادہ فعال اور کارگزار سیاسی جماعت بن گئی۔

کانگرس جب اپنا چولا بدل رہی تھی تو اس کا خزانہ خالی تھا، وہ مجلس خلافت تھی جس نے اسے بیش قرار مالی امداد دی، وہ محمد علی، شوکت علی تھے جنھوں نے اپنے ساتھ خلافت کے روپیہ سے ہندوستان کے طول و عرض میں گاندھی جی کو دورہ کرایا، وہ یہی دونوں کوہ پیکر اور کوہ وقار بھائی تھے جنھوں نے مرعوبیت کا طلسم توڑا اور ہندوستان کے باشندوں کو آزادیٔ ہند کے لئے مرنے اور مٹ جانے کے لئے آمادہ کر دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے موقع پر جب گاندھی جی انگریزوں کے لئے فوجی رضاکار بھرتی کر رہے تھے، موتی لال نہرو الہ آباد ہائی کورٹ میں پریکٹس کر رہے تھے، سی آر داس ایک بلند پایہ قانون دان کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہے تھے، مسز اینی بسنٹ وائسرائے کی مہمان بن رہی، اور وزرائے انگلستان سے نامہ و پیام کر رہی تھیں۔ سروجنی نائیڈو، نظام حیدر آباد کی شان میں مدحیہ قصیدے کہہ رہی تھیں، جواہر لال نہرو الہ آباد

میونسپلٹی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے تھے، سریندر ناتھ بنرجی "سر" کا خطاب حاصل کر رہے تھے۔ چندر پال گوشۂ عافیت میں معتکف ہو گئے تھے، لاجپت رائے ہر دیال اور ساورکر چھٹے ہوئے کارتوس بن چکے تھے، راج گوپال اچاریہ قانونی موشگافیاں کر رہے تھے، سردار ولبھ بھائی پٹیل احمد آباد میں ایک معمولی وکیل کی حیثیت سے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے، گوبند ولبھ پنت، سمپورنانند، منشی، کھیر، کیلکر، ریڈی، آئینگر، وغیرہ کسی شمار قطار میں نہ تھے، مسلمان انگریزوں سے کلہ بکلہ لڑ رہے تھے، مولانا عبدالباری فرنگی محلی بغاوت کی تیاریاں کر رہے تھے، محمد علی کا "کامریڈ" انگریزی خواں اور انگریزی داں طبقہ کو انقلاب کے لیے تیار کر رہا تھا، شوکت علی کی بے پناہ اور بے نظیر تنظیمی صلاحیتیں مسلمانوں کی آوارہ اور منتشر قوم میں ضبط و نظم پیدا کرنے کی موجب بن رہی تھیں۔ ابوالکلام آزاد کا "الہلال" مسلمانانِ ہند میں ایک نئی روح، ایک نیا ولولہ پیدا کر رہا تھا، ڈاکٹر انصاری دیار طبی وفد لے کر ترکیہ جا رہے تھے کہ ستم زدگان برطانیہ کی مرہم پٹی کریں، ان کے زخم جسم اور زخم دل پر پھاہا رکھیں اور کچھ من چلے اور سر پھرے ——— نوجوان بھی تھے جو اپنے مستقبل کی امنگوں کو خیرباد کہکر بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا کہتے بحر ناپید کنار کے سفر میں ساتھ تھے ——— خلیق الزماں، شعیب قریشی، عبدالرحمن صدیقی (سندھی) عبدالرحمن پشاوری، عبدالعزیز انصاری ——— اجمل خاں، لارڈ ہارڈنگ کی نیاز مندی نواب رام پور کی دوستی اور گوشۂ عافیت کی آسودگی ٹھکراتے ہوئے سجن و زندان اور دار و رسن کے لئے تیار ہو رہے تھے ——— آج یہ داستان کسے معلوم ہے؟ کل اس داستان پر کوئی یقین کرے گا؟

پھر جب مسلمانوں کے شہ دینے سے، مسلمانوں کی مالی اعانت سے بہرہ ور ہو کر، مسلمانوں کی تائید سے مسلح ہو کر، کانگرس کانگرس بنی، گاندھی جی نے مہاتمائیت کا لبادہ پہنا، سارے ہندوستان میں قومیت متحدہ کی داغ بیل پڑی، انگریز سامراج کے خلاف متحدہ محاذ بنا، اور جنگ آزادی شروع ہوئی تو اسی جنگ میں ہندوستان کی صرف دو قوموں ——— ہندو مسلم ——— نے حصہ لیا، دوسری اقلیتیں

بالکل خاموش اور الگ تھلگ رہیں، اور ان دو قوموں میں سب سے زیادہ جرأت، دلیری، ہمت، شجاعت، ایثار، قربانی اور مقصد سے وفاداری کا مظاہرہ، اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے کیا۔

جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو اپنے تناسب آبادی سے کہیں زیادہ تعداد میں وہ جیل گئے۔ جب انگریزی مال کے بائیکاٹ کا سوال درپیش ہوا تو بے زر اور تہی دست ہونے کے باوجود وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے بے دھڑک قیمتی بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی، اور ذرا نہ سوچا کہ کل کیا پہنیں گے، جب عدالتوں سے مقاطعہ کا سوال پیدا ہوا تو وہ مسلمان ہی تھے جن کے وکیلوں اور بیرسٹروں نے بہت بڑی تعداد میں اپنی کامیاب اور قابلِ رشک پریکٹس پہ لات ماروی، اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنے لگے، سی آر داس آخر وقت تک اپنی پریکٹس چھوڑنے میں متامل رہے، موتی لال کے پاس خدا کا دیا زر و جواہر "سب کچھ تھا لیکن بار بار پریکٹس چھوڑ کر شروع کر دیتے تھے، مگر مظہر الحق (پٹنہ ہائی کورٹ) نے جب پریکٹس چھوڑی تو ایوانِ شہی سے بوریۂ فقر پہ آکر بیٹھ گیا، اور وہاں سے مرکر اٹھا، اس کا قائم کیا ہوا "صداقت آشرم" (صوبہ بہار کانگرس کا دفتر) آج بھی موجود ہے۔ اور راجندر پرشاد اسی کے اور وہیں کے تربیت یافتہ ہیں، سیف الدین کچلو کی پریکٹس نصف النہار پر پہنچی ہوئی تھی، مگر اس مردِ غنی کو مال و زر کی کشش اپنی طرف ذرا بھی متوجہ نہ کر سکی۔ اسی طرح اور بہت سے مسلمانوں نے شاہی چھوڑ کر گدائی اختیار کر لی۔

پھر جب انگریزوں کے قائم کردہ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ترک موالات کا پروگرام بنا تو مسلمان اس مرحلہ میں بھی پیش پیش تھے، بنارس ہندو یونیورسٹی کے علاوہ ہندوستان کی ہر یونیورسٹی علاً ہندو یونیورسٹی ہی تھی، لیکن مسلمانوں کے پاس لے دے کے صرف ایک ہی جامعہ تھی ـــــ مسلم یونیورسٹی ـــــ لیکن مسلمانوں نے اس کے دروازوں پر تالا لگانے میں بھی کوئی تامل نہ کیا، اور پھر جب یہاں پورے طور پر کامیابی نہ ہوئی تو نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی طرح محمد علی نے

ڈال دی جسکے ایک گل سرسبد ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ہیں، جنھیں آج کون نہیں جانتا؟

پھر جب تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کا پہلا مقدمہ کراچی میں چلا تو ملزمین کی صف میں نہ گاندھی جی نظر آتے ہیں، نہ موتی لال، نہ سی آر داس، نہ جواہر لال، نہ راجندر پرشاد نہ گوبند ولبھ پنت، ملزمین میں اور پھر اس الزام کے ماتحت سزا یافتگان میں اگر نظر آئے ہیں تو محمد علی، شوکت علی، حسین احمد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، پیر غلام مجدد سرہندی' یہ جیالے ملزم عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر بے جھجک کہتے ہیں، ہاں! ہم نے بغاوت کی، اور کریں گے۔

اور عین اس وقت جب یہ جنگِ آزادی کامیابی کی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ گاندھی جی نے "افغانی ہوے" سے ڈر کر، اور بظاہر حادثہ چورا چوری کی آڑ لے کر جنگ بند کر دی، جس کے بعد کانگریس کی صف سے سوامی شردھانند نمودار ہوئے، جنھوں نے یک بیک "شدھی" اور "سنگھٹن" کی تحریک شروع کر کے مسلمانوں کو ہندو بنانا اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف منظم کرنا شروع کر دیا۔

کہتے ہیں کہ مسلمان جذباتی ہیں، وہ جذباتی ہوتے تو آزادیٔ ہند کے مساعی پر پانی پھیرنے والی یہ تحریکیں انھیں مشتعل کر دیتیں، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، انھوں نے سب سے پہلے اپنی مثال قائم کی خلافتی زعیم میر غلام بھیک نیرنگ (انبالہ) نے تبلیغ کا کام شروع کیا، مقدمۂ بغاوت کے ایک سابق اسیر سیف الدین کچلو نے "تنظیم" کی بنیاد ڈالی، مجلس خلافت نے ان دونوں سے قطع تعلق کر لیا ــــــ ان کی شخصیت ان کے خدمات' اور ان کے کارناموں کے باوجود ــــــ یہ اصولی اختلاف تھا اور اس پر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تھا، اس کے بعد محمد علی اور شوکت علی نے گاندھی جی سے استدعا کی کہ وہ مداخلت کریں، مگر انھوں نے کہا "میں تو ایک چھٹا ہوا کارتوس ہوں" موتی لال نہرو سے گزارش کی کہ ان حریت سوز تحریکوں کو بریک لگائیں، مگر انھیں نئے انتخابات میں مہاسبھا کی اخلاقی اعانت کے بغیر کامیابی کی توقع نہ تھی انھوں نے بھی معذرت کر دی، پھر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر کچلو کی تحریک کو کہیں پیچھے

چھوڑ کر خواجہ حسن نظامی مرحوم و مغفور میدان میں آئے، اور انھوں نے ترکی بترکی جواب شدھی اور سنگھٹن کا دینا شروع کر دیا۔ علی برادران اور خاص طور پر محمد علی کے بڑے گہرے ذاتی تعلقات خواجہ صاحب سے تھے، لیکن یہ ذاتی تعلقات اصولی اختلافات کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دونوں میں لڑائی ہو گئی، اسی زمانہ میں امرت سر کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے سوامی شردھانند کی مسلم آزار اور حریت سوز مساعی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھیں غدار وطن کہہ دیا، تو گاندھی جی ضبط نہ کر سکے، انھوں نے فوراً ظفر علی خاں کو ٹوکا، اور فرمایا۔

"مولانا صاحب آپ نے سوامی جی کے لئے یہ الفاظ کہکر میرے سینہ پر گھونسہ مارا ہے"

پھر مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے پر اور گائے کی قربانی کرنے پر ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہوا، محمد علی، شوکت علی اور زعماء خلافت نے اس موقع پر صبر و ضبط سے کام لیا، مسلمانوں کو امن و آشتی کی تبلیغ کرتے رہے، اور اتحاد و اتفاق کے لئے اپنی جان اور وقار کی بازی لگاتے رہے ——— آج کون ہے جو مسلمانوں کے ان کارناموں کا اعتراف کرے، اور کل کون ہو گا جو مسلمانوں کے ان کارناموں پر یقین کرے گا؟

شعیب قریشی غلام محمد کے عہد میں وزیر بنے تو میں نے ایک ملاقات کے موقع پر ان سے استدعا کی تھی کہ تاریخ تحریک خلافت جو درحقیقت مسلمانوں کے سیاسی بلوغ شعور کی تاریخ ہو گی، مرتب کرائیں، مقصد سے انھوں نے انتہائی دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ لیکن بڑی بے بسی کے ساتھ کہا "اس کام کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

بہرحال واقعات و حوادث کا چکر چلتا رہا

۱۹۲۸ء میں ہندوستان کو لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے چیلنج دیا کہ تم ایک متفقہ دستور بھی نہیں بنا سکتے، آزادی کیا لو گے؟

کانگرس نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔

پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک دستوری کمیٹی کی تشکیل ہوئی، کہ وہ ایک متفقہ دستور بنائے، چند ماہ بعد "نہرو رپورٹ" منظرِ عام پر آئی، اس رپورٹ میں مسلمانوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا، نہ سندھ کو ایک جداگانہ صوبہ بنانے کا مطالبہ قبول کیا گیا تھا، نہ سرحد کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کی صف میں لانا منظور کیا گیا تھا، نہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت قائم اور باقی رکھنے کی گارنٹی دی گئی تھی، اس گارنٹی کی ضرورت اس لئے پیش آئی تھی کہ ان دونوں صوبوں میں گو مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن یہ اکثریت عددی تھی، ذرا سے ہیر پھیر میں اسے اقلیت بنایا جا سکتا تھا، ——— چند مسلمانوں کو توڑ کر اسے غیر موثر کیا جا سکتا تھا، جیسا کہ ۱۹۴۶ء میں مولانا ابو الکلام آزاد نے بظاہر سر خضر حیات خاں کی اور درحقیقت ہندو کانگرس کی وزارت قائم کرا کے کیا تھا، مرکزی اسمبلی کے لئے بھی مسلمانوں کو مطلوبہ نشستیں دینے سے انکار کر دیا گیا تھا، غرض ان کا کوئی جائز مطالبہ قبول نہیں کیا گیا تھا۔

جب تک لڑائی صرف آزادی کے لئے ہو رہی تھی مسلمان دل و جان سے شریک تھے، بغیر کسی شرط اور مطالبہ کے شریک تھے لیکن جب دستوری مرحلہ آیا، اور ایک دستور مرتب کر لیا گیا، تو وہ کیونکر خاموش رہ سکتے تھے؟

چنانچہ مسلمانوں نے اپنے جائز مطالبات پیش کئے، اور ان کی منظوری پر اصرار کیا اس وقت اگر خاموش رہتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ انھوں نے اپنی حق تلفی منظور کر لی اور دستور نافذ ہونے کے بعد احتجاج کرنے اور شرائط پیش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ———

ہر کہ بعد از جنگ یاد آید بر کلۂ خود می باید زد!۔

محمد علی، شوکت علی اب تک کانگرس کے ساتھ تھے لیکن یہ دستور دیکھ کر پکار اٹھے۔

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہدے گا کہ منزل تو نہیں یہ!

اب انھیں کانگرس کے خلاف میدان میں آنا پڑا اور حقوق مسلمین کی حفاظت کے لئے اپنے پرانے ساتھیوں سے جنگ کرنی پڑی۔ جو لوگ حق و صداقت کے ساتھی ہوتے ہیں

ان کی دوستی اور دشمنی بھی حق و صداقت کی تابع ہوتی ہے۔ چنانچہ جس اخلاص سے انھوں نے کانگرس کا ساتھ دیا تھا، اسی اخلاص سے کانگرس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

لیکن اب کانگرس ایک بہت بڑی تنظیم بن چکی تھی محمد علی، شوکت علی کو کھو دینے کا اسے کچھ زیادہ رنج نہیں ہوا کیونکہ اسکے پاس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جو کہ لیتوں سے مسلمانوں میں کوئی اثر نہیں رکھتے تھے۔ لیکن کانگرس نے ہندو رہنماؤں پر اپنی دھاک بٹھائے ہوئے تھے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں، پھر سنہ ۱۹۳۲ء میں، پھر سنہ ۱۹۳۳ء میں گاندھی جی نے جنگ آزادی شروع کی۔ لیکن اب مسلمان ہوشیار ہو چکے تھے۔

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نشتر کھلا

انھوں نے سمجھ لیا تھا، یہ جنگ ہندو سامراج کو برسرِ اقتدار لانے کے لئے لڑی جا رہی ہے، اس جنگ کا مقصد یہ ہے کہ اقلیت ہمیشہ کے لئے ماتحت ہو جائے اور اکثریت ہمیشہ کے لئے تاجِ خسروی زیبِ سر کرے۔

عام مسلمانوں نے ان نام نہاد جنگوں میں حصہ نہیں لیا۔

مسلمانوں نے بار بار کانگرس سے ایک ہی مطالبہ کیا کہ مسٹر جناح کے چودہ نکات منظور کر لئے جائیں، جن پر مسلمانوں کے تمام سربرآوردہ زعما اور اہم سیاسی جماعتوں کا اتفاق ہے، پھر ہم جنگ آزادی کے لئے پہلے سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ میدان میں آنے کو تیار ہیں، پھر ہم اپنی جیب کی آخری پائی اور خون کا آخری قطرہ آزادیٔ ہند کے عظیم و جلیل مقصد کے لئے قربان کر دیں گے، لیکن اپنی غلامی اور ہندوؤں کی آزادی کیلئے جنگ کرنے پر ہم تیار نہیں ہو سکتے۔

ہندوؤں کے اس تغافل اور کانگرس کی اس بے نیازی نے مسلم لیگ کو ایک زندہ اور عملی جماعت بنا دیا۔ اس کی قیادت اب مسٹر جناح کے ہاتھ میں تھی جو بہت جلد قائداعظم بن گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو منظم کیا، ان میں اتحاد پیدا کیا، انھیں ایک مقصد پر متحد کیا، اور پاکستان کا مطالبہ پیش کر دیا۔

پاکستان کا مطالبہ بم کا گولہ تھا، جو ہندوستان کی سیاسی فضا پر گرا۔
لیکن یہ بم کا گولا ناقابلِ مدافعت تھا، اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔
ساری ہندو قوم دکھ مسلمانوں کو اپنا ہم نوا بنا کر، اس مطالبہ کے خلاف ڈٹ گئی
مگر کچھ نہ کر سکی ——— الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا۔

اس مطالبہ کی شدت اور تاثر کا یہ عالم تھا کہ جہاں مسلمانوں میں ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی جیسے مسلمان دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کو تقسیم نہیں ہونا چاہیئے، وہاں راجگوپال اچاری، اور پورن چند جوشی جیسے ہندو دیانت داری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ اب ہندو مسلم مسائل کا حل صرف تقسیم ہند ہے۔ مسلم لیگ نے ابوالکلام کو "شو بوائے" کہا۔ کانگریس نے راجہ جی کو نکال دیا۔

۱۹۴۲ء میں ایک مرتبہ گاندھی جی نے پھر "آزادی" کی جنگ شروع کی، خود ان کے بقول یہ آخری جنگ تھی "جس میں کانگرس تباہ ہو جائے گی، یا آزادی حاصل کرے گی"!

یہ جنگ مسلمانوں کا مطالبہ مانے بغیر شروع کی گئی تھی اور بڑے نفسیاتی موقع پر شروع کی گئی تھی۔ دوسری عالم گیر جنگ اپنے انتہائے شباب پر تھی، اتحادی ہار رہے تھے، محوری جیت رہے تھے، جرمن فوجیں فرانس پر قابض ہو چکی تھیں، افریقہ میں پہنچ چکی تھیں، یونان پر قبضہ کر چکی تھیں، جاپان نے برما پر قبضہ کر لیا تھا، سنگاپور چھین لیا تھا، ملایا کو غلام بنا چکا تھا اور ہندوستان کی طرف اقدام و ہجوم کی تیاریاں کر رہا تھا۔ گاندھی جی کو صاف نظر آ رہا تھا کہ اس جنگ میں اتحادیوں کو شکست ہوگی، اور محوری جیت جائیں گے۔
انھوں نے شرط عائد کر دی کہ اگر ہمارا تعاون چاہتے ہو تو ہندوستان کو آزاد کر دو، اور اقلیتوں کا سوال بیچ میں نہ لاؤ، وہ ہمارا داخلی مسئلہ ہے، ہم جانیں اور وہ، اور اگر ایسا نہیں کرتے تو ہم مساعی جنگ میں حصہ نہیں لیتے، نہ صرف یہ کہ حصہ نہیں لیتے بلکہ تخریب، انہدام، آتش زنی، توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کو اپنا شعار بنا لیں گے۔
ظاہر ہے یہ تحریک جو انگریزوں سے زیادہ مسلمانوں کے خلاف تھی قائدِ اعظم کی

زندگی اور موجودگی میں مسلمانوں کا تعاون تو نہیں حاصل کرسکتی تھی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، مسلمانوں نے اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا، وہ پاکستان کے موقف پر سختی سے قائم رہے اور انگریز بھی مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنانے کی جرأت نہ کرسکے۔
جنگ ختم ہونے کے بعد حالات ایسے پیش آئے کہ انگریزوں نے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ اپنے دوسرے مقبوضات کو بھی آزاد کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اس طرح چارو ناچار پاکستان عالم وجود میں آگیا۔
چارو ناچار کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ نہ ہندو پاکستان دینا چاہتے تھے نہ انگریز، ہندو اس لئے نہیں کہ ان کی جوع الارض کو صدمہ پہنچتا تھا، اور انگریز اس لئے نہیں کہ متحدہ ہندوستان سے جو مفاد حاصل کرسکتے تھے اس میں کمی ہو جاتی تھی
چنانچہ جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب انڈیا ونس فریڈم (India wins freedom) میں تحریر کیا ہے، ہندوؤں نے ذہنی تحفظ کے ساتھ پاکستان کو قبول کیا اور انگریزوں نے بے ایمانی کے ساتھ پاکستان بنایا جیسا کہ سابق چیف جسٹس آف پاکستان مسٹر محمد منیر نے اپنی ایک الوداعی تقریر میں کہا کہ گورداسپور وغیرہ کی تحصیلیں، سر ریڈکلف نے یہ کہنے کے باوجود کہ پاکستان کو ملیں گی ہندوستان کو دیدیں، اور اس طرح کشمیر میں ہندوستان کو قدم جمانے کا موقع دے دیا، نیز لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس جلن میں کہ وہ ہندوستان و پاکستان کے مشترکہ گورنر جنرل کیوں نہ بنائے گئے، ہندوستان کی طرف سے پاکستان کو برابر زچ کرتے رہے، حد یہ ہے کہ اس کا روپیہ اور سازو سامان تک جو از روئے معاہدۂ تقسیم اسے ملنا چاہئے تھا، روک لیا، اور انہی کی سربراہی میں حکومت ہند نے پاکستان کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ کانٹے بچھانے کی کوشش کی، لارڈ آکنلک Lord Auchinleck سابق کمانڈر انچیف کی سوانحعمری جو لندن سے شائع ہوئی ہے، اس طرح کے واقعات واشگاف الفاظ میں اس کے اندر ملتے ہیں
بہرحال ہندوستان آزاد ہوگیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کا جداگانہ وطن وجود میں آگیا۔

بعض ہندو لیڈروں کی خود نوشت سوانحمریاں، یادداشتیں، روزنامچے پہلے سے موجود تھے، مثلاً گاندھی جی کی "تلاش حق" جواہر لال کی "میری کہانی" مسز لکشمی پنڈت کی "حیاتِ زنداں"، بہت سی کتابیں آزادی کے بعد اس موضوع پر لکھی گئیں، سیاسی تجربات و تاثرات سے متعلق کتابیں لکھی جاتی ہیں، وہ تاریخ تو نہیں ہوتیں لیکن تاریخ بنتی انہی سے ہے، ہر لکھنے والا اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت لکھتا ہے، بعد میں مورخ کا کام ہوتا ہے کہ اس مواد کو سامنے رکھ کر، اور قدر مشترک نکال کر تاریخ مرتب کر ڈالے۔

کس قدر حسرت و افسوس کا مقام ہے کہ ہندوؤں اور نیشنلسٹوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرنے والی، اور ان کے تاثرات کو اجاگر کرنے والی کتابیں تو بکثرت ملتی ہیں لیکن ایسی کوئی کتاب نہیں جس میں مولانا عبدالباری نے بتایا ہو کہ وہ کون حالات تھے جب انھوں نے مسندِ علم چھوڑی اور میدان عمل میں قدم رکھا، محمد علی نے کامریڈ اور ہمدرد نکال کر ساری دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ لیکن اپنی خود نوشت لکھ کر یہ نہ بتا سکے کہ انھیں ہندوؤں سے، مسلمانوں سے، ساتھیوں سے، مخالفوں سے جو جنگیں لڑنی پڑیں، انگریزوں سے جو معرکہ آرائیاں ہوئیں ان کے اندرونی پہلو کیا تھے؟، شوکت علی نے علی گڑھ کی دنیا میں اور پھر ہندوستان کی دنیا میں جھنڈے گاڑ دیئے، لیکن راجکوٹ جیل میں ان پر کیا گزری، چھندواڑہ میں کس طرح نظر بند رہے، بیتول جیل میں کس طرح پہنچے؟، لارڈ اروِن اور لارڈ ولنگڈن سے مسلم معاملات و مسائل پر ان کی کیا گفتگو ہوئی، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں انھیں کن دشواریوں سے سابقہ پڑا؟، یہ داستان وہ قلم بند نہ کرسکے، قائدِ اعظم نے پاکستان کا نعرہ بلند کیا، اور پاکستان بنا بھی لیا، لیکن اس سلسلہ میں نیشنلسٹ مسلمانوں نے ان کے خلاف کس کس طرح مورچے قائم کئے؟ اور ان مورچوں کو کس کس طرح انھوں نے توڑا۔ کانگرسی ہندوؤں اور رہنماؤں نے ان کے خلاف کس کس طرح جوڑ توڑ کئے، انگریزوں نے ہندوؤں سے مل کر کس کس طرح

مسلمانوں کے مطالبات نظر انداز کرنے کی سعی کی، لارڈ لنتھگو نے، لارڈ ویول نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کس کس طرح مسلمانوں کے جائز مطالبات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی؟ وہ کیا چیز تھی جس نے انھیں کانگرسی سے مسلم لیگی بنادیا، وہ کیا چیز تھی جس نے "ہوم رول لیگ" کے کارفرما کو مسلم لیگ کا روحِ رواں بنا دیا؟، وہ کون سے موثرات دعوامل تھے، جنھوں نے اس شخص کو جو فرقہ پرستی کا بدترین دشمن تھا، قومیت متحدہ کا مخالف بنادیا؟ ان عنوانات پر اگر جناح صاحب لکھتے تو کیا کچھ نہ لکھتے؟ مگر انھوں نے کچھ نہیں لکھا، قائدِ اعظم کے ساتھیوں میں، لیاقت علی خاں، عبدالرب نشتر، چندریگر، خان عبدالقیوم خاں، راجہ غضنفر علی، چوہدری خلیق الزماں، اسمٰعیل خاں، ناظم الدین اور دوسرے لوگ تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے بہت سے عجیب و غریب واقعات پر افگندہ نقاب کرسکتے تھے، لیکن ایسا نہ ہوا، یہاں تک کہ لیاقت علی خاں شہید ہوگئے، عبدالرب نشتر بیماریٔ دل میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے، چندریگر نے اس کی ضرورت نہ سمجھی، خان عبدالقیوم نے اس طرف توجہ نہ کی، اسماعیل خاں نے ایسا سکوت اختیار کیا کہ وہ بالآخر سکوتِ مرگ بن گیا، غضنفر علی خاں کو بھی خاموشی میں جو لطف آتا ہے، وہ گفتگو میں نہیں ملتا۔ ناظم الدین سے ایک مرتبہ میں نے ملاقات کے دوران عرض کیا تھا کہ وہ قلم اٹھائیں، اور اپنے مشاہدات و تاثرات قلمبند کریں، لیکن انھوں نے کہا کہ وہ لکھنا نہیں جانتے، جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو بات خواجہ شہاب الدین پر ٹل گئی، جنھیں اپنے کارنامے بتانے کی اتنی فکر رہتی ہے کہ اپنے عظیم و جلیل بھائی کے کارناموں کو پردۂ خفا میں رکھنا ہی مناسب سمجھتے ہیں، خلیق الزماں البتہ کچھ لکھ رہے ہیں، لیکن نہ جانے ان کا لکھا ہوا کب تک منظرِ عام پر آتا ہے؟۔

ہندوؤں اور نیشنلسٹ لیڈروں کے فرمودات کے ساتھ اگر مسلمان زعیموں اور سرداروں کے تاثرات، و مشاہدات بھی منظر عام پر آگئے ہوتے تو ہندوستان کی تاریخ آج کتنی مختلف ہوتی؟ ——— کم از کم یک طرفہ نہ ہوتی،!

اب تو جو مورخ ہندوستان کی تاریخ لکھتا ہے وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھکر

لکھ دیتا ہے، اور فیصلہ صادر کر دیتا ہے کہ آزادیٔ ہندوستان نتیجہ ہے گاندھی جی اور جواہر لال کی قربانیوں اور ہندو عوام کی جاں نثاریوں کا، وہ فیصلہ کر دیتا ہے۔ کہ آزادیٔ ہند کی مساعی میں مسلمان قوم نے کوئی حصہ نہیں لیا، یا اگر لیا تو اتنا ناقابلِ لحاظ کہ تاریخ اس کے لئے اپنے صفحات میں جگہ نہیں نکال سکتی، لیکن اگر عبدالباری محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، قائدِ اعظم اور لیاقت علی خاں وغیرہ کے نقوش و مشاہدات اور تاثرات موجود ہوتے تو کیا کوئی بددیانت مورخ بھی یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ آزادیٔ ہند کی تاریخ میں مسلمانوں کا صفحہ سادہ ہے؟ لیکن اب اس کا نتیجہ یہی ہے، اور کوئی شبہ نہیں اس کی ذمہ داری کسی نہ کسی حد تک ہم پر بھی ہے۔

ہر معاملہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ فرق صاف اور واضح نظر آتا ہے، مثلاً حیدر آباد کا معاملہ لیجئے،

از روئے معاہدہ حیدر آباد کو آزاد رہنے کا حق تھا، اس نے یہ حق حاصل کرنا چاہا انڈین یونین نے پولیس ایکشن کر کے یہ حق ہمیشہ کے لئے چھین لیا، بات ختم ہو گئی۔

لیکن یہ بات نہ اتنی سادہ ہے نہ اتنی مختصر۔

حیدر آباد کو ہندوستانی ریاستوں میں کیا حیثیت حاصل تھی؟ برطانیہ سے اس کا کیا معاہدہ تھا؟، اس کے نظم مملکت کی برتری کا کیا حال تھا؟ اس کی معاشی ہمواری کی کیفیت کیا تھی؟، کیوں اسے اپنی آزادی پر اصرار تھا؟ کس طرح اس نے کچھ عرصہ تک اپنی آزادی قائم رکھی؟، یہ داستان بڑی دلچسپ، سبق آموز اور روح پرور ہو جاتی، اگر معین نواز جنگ قلم کو جنبش دیتے، اگر لائق علی خامہ فرسائی کرتے، اگر قاسم رضوی جنبشِ لب پر آمادہ ہوتے، اگر عبدالرحیم سکوت کو ترجیح نہ دیتے، لیکن یہ سب خاموش ہیں، اور ان سب کی خاموشی کے جواب میں ایک ناواقف کو قائل کر دینے والا کتنا بیش بہا سرمایہ موجود ہے، ایک نظر اس پر ڈال لیجئے۔

کے ایم منشی نے صرف نو مہینے کی مدت قیام کے تاثرات ایک نہایت ہی دلچسپ اور معرکۃ الآرا کتاب THE END OF AN ERA میں قلمبند کر دیئے، محکمہ امور ریاست

کے سیکرٹری وی پی مینن نے ایک نہایت اہم کتاب (Integration of the Indian States) لکھ ڈالی۔ سا جی نے پٹیل پر جو کتاب Life and Work of Sardar Vallabh Bhai Patel. لکھی ہے اس میں بڑا قیمتی مواد اس موضوع پر جمع کر دیا ہے۔ سر مرزا اسماعیل ہماری نظر میں کچھ ہوں، لیکن انھوں نے 'My Public Life' لکھکر جو بیش بہا معلومات فراہم کر دیے ہیں، انھیں ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، علی یاور جنگ نے جو کچھ اپنی کتاب Hyderabad in retrospect میں لکھا ہے، اسی طرح آج کیمپبل جانسن کی Mission with Mountbatten, معرکہ کی کتاب ہے۔ اس سے لاکھ اختلاف کیا جائے، لیکن قابل فکر و نظر چیزیں تو ملتی ہیں، غرض وہاں یہ سب کچھ ہے اور یہاں میدان صاف، پھر اگر حیدرآباد کو، اس کے مسائل کو، اس کی مظلومیت کو، اور حکومت ہند کی چیرہ دستیوں کو، جوع الارض کو، ہوس اقتدار کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں تو حیرت کیوں ؟ ، اور تعجب کس لئے ؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے، غالبًا یہ ۱۹۵۶ء کے اوائل کا واقعہ ہے کہ سید تقی الدین صاحب (آئی سی ایس، سابق ہوم سیکرٹری حکومت حیدرآباد لاہور تشریف لائے، اور نہ جانے کس طرح میرا پتہ لگا کر مجھ تک پہنچے، وہ میرے نہایت ہی مخصوص عنایت فرماؤں اور کرم گستروں میں تھے، ان کے کردار و سیرت اور شخصیت میں بلا کی دلکشی تھی۔ ان کی ادائیں بہت کچھ مولانا شوکت علی کی اداؤں سے ملتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ وہ مجھے عزیز رکھتے تھے اور میں ان کا احترام کرتا تھا، انھوں نے کہا میو گارڈن میں اپنے لڑکے کے ہاں (جو ریلوے میں ایک بلند منصب پر فائز تھے، ٹھہرا ہوں، وہاں آؤ تو مفصل باتیں ہوں گی۔

دوسرے روز میں وہاں پہنچا، مجھے دیکھتے ہی خوش ہو گئے، بکس کھولا اور ٹائپ کئے ہوئے بہت سے صفحے میرے سامنے ڈھیر کر دیئے، پھر پوچھا،

"یہ کیا ہے ؟"

میں نے عرض کیا،

وہ آپ ہی بتایئے!"

سید صاحب نے کہا یہ لائق علی کی کہانی ہے، جو انھوں نے مرتب کرلی ہے، میں چاہتا ہوں تم اس کا ترجمہ کر ڈالو، پہلے یہ امریکہ سے چھپنے والی تھی، مگر امریکی ناشر کچھ چیزیں حذف کرانا چاہتا ہے، جس کے لئے ہم تیار نہیں ہیں، اب یہ کتاب پاکستان ہی سے طبع ہوگی، بتاؤ کب شروع کرتے ہو ترجمہ؟ میں نے عرض کیا پہلے پڑھ تو لینے دیجئے، کہنے لگے، پڑھتے جاؤ ترجمہ کرتے جاؤ، میں نے کہا تعمیل ارشاد سے مجھے انکار نہیں لیکن لائق علی صاحب کی طرف سے اجازت بھی تو ملنی چاہیئے۔ ارشاد فرمایا، میں جو کہہ رہا ہوں، ویسے تم چاہو تو وہ بھی مل جائے گی، کراچی پہنچ لیتے دو مجھے، کتاب کے چند باب لے کر میں واپس آگیا، کوئی شبہ نہیں کتاب ہر اعتبار سے دلچسپ اور معلومات افزا تھی، میرے دل میں ترجمہ کرنے کا ولولہ پیدا ہوا، لیکن ارادہ یہ تھا کہ پہلے سے ہاتھ میں جو کام ہے اسے ختم کرلوں، پھر اسے شروع کردوں گا، ایک روز اطلاع ملی وہ فالج میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ بلڈ پریشر کے مریض پہلے سے تھے، عیادت کو گیا تو ایک ہاتھ پاؤں پر اثر تھا، لیکن بات چیت کرسکتے تھے، ڈاکٹر یوسف کا علاج تھا، اور انھوں نے اطمینان دلایا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں، انشاء اللہ جلد اچھے ہوجائینگے۔ پھر کئی مرتبہ حاضر خدمت ہوا، حالت ہر مرتبہ پہلے سے بہتر نظر آئی، آخری مرتبہ جب گیا تو برآمدے میں بستر پر لیٹے تھے، حسب معمول بہت تپاک اور گرم جوشی سے ملے، ۵۵۵ سگریٹ کا بہت شوق تھا، خود پیا، مجھے پلایا، بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور ترجمہ پر اکساتے رہے، میں نے اطمینان دلایا کہ جو کام ہاتھ میں ہے اسے ختم کرتے ہی شروع کردوں گا۔

چند روز بعد گرمی گزارنے میں مری چلا گیا، ہوٹل سنٹرل میں جہاں میرا قیام تھا ایک دوست بغرض ملاقات تشریف لائے اور انھوں نے یہ غم انگیز خبر سنائی کہ دفعتہً سید تقی الدین صاحب کا انتقال ہوگیا، یہ خبر سن کر دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہوگئی، سید صاحب کو قدرت نے صفات گوناگوں سے مالا مال کیا تھا، جوش ملی، اور جذبۂ قومی

نے انھیں سیماب بنا رکھا تھا کسی ایک پہلو قرار نہ تھا، وہ انڈین سول سروس (آئی سی ایس) کے ممبر تھے، لیکن نہ انگریزوں سے دہشت زدہ تھے، نہ ہندوؤں سے مرعوب، وہ بڑے بڑے مناصب پر فائز ہوئے، لیکن جہاں رہے اپنی انفرادیت پر قائم رہے، بے انتہا دبنگ صاف گو اور سراپا عمل انسان تھے، برطانوی ہند میں جب تک رہے امنگ اور حوصلے کے مطابق کام نہ کر سکے، پھر جب ریاست حیدرآباد نے ان کی خدمات مستعار لیں، تو وہاں خدمتِ ملی کا ایک وسیع میدان موجود ملا، اور وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگ گئے، وہاں وہ ہوم سیکرٹری کے منصب جلیلہ پر فائز تھے، اور منشی نے یہ غلط نہیں لکھا کہ مجلس اتحادالمسلمین اور مسلمانان حیدرآباد کی نشاۃ ثانیہ میں ان کا بہت بڑا اور غیر معمولی حصہ تھا، سر مرزا اسماعیل جب وزیر اعظم ہو کر حیدرآباد آئے تو سید صاحب کی سرگرمیاں برداشت نہ کر سکے، لیکن سید صاحب بھی دبنے والے نہ تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملازمت سے علیحدہ کر دیئے گئے، لیکن لائق علی کے دور میں پھر بحال ہوئے، مشرق وسطیٰ اور متعدد ممالک میں حیدرآبادی وفد کے سربراہ بن کر تشریف لے گئے، حیدرآباد کا کیس انھوں نے بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا، اور اس کے نتائج حسب دل خواہ برآمد ہوئے، سقوط حیدرآباد کے بعد پھر واپس نہ گئے، کراچی میں رہ پڑے، اس دور میں ان پر بڑے بڑے کٹھن وقت آئے، جو لکھ لٹ تھا وہ نانِ شبینہ تک کو محتاج ہو گیا، جو حیدرآباد میں ایک نہایت شاندار کوٹھی کا مکین اور مالک تھا، وہ کراچی میں مسان روڈ کی بہار کالونی کے ایک بہت معمولی سے مکان میں زندگی کے دن گزار رہا تھا، لیکن نہ جبیں کے تیور میں فرق آیا تھا، نہ قہقہوں میں، نہ نشاط فکر میں، جس خوشی سے اس نے عیش و تنعم کا زمانہ گزارا تھا، اسی خوشی سے ابتلا اور فلاکت کا دور گزار رہا تھا، یہ زندگی بھی عجیب زندگی تھی، کبھی بے کار، کبھی باکار، آج کسی انگریزی فرم میں دو ہزار ماہوار پر جگہ مل گئی، ساری پریشانیاں دور ہو گئیں، کل کوئی بات ناگوار گزری تو استعفا دے دیا، پھر پریشانیاں آموجود ہوئیں، کبھی اسٹیٹ آف پاکستان میں معقول مشاہرہ پر ملازم ہو گئے، کوئی بات گراں گزری فوراً الگ ہو گئے۔

کبھی اردو کالج کی تعمیر میں بابائے اردو کے دوش بدوش مصروف جد و عمل ہیں، کبھی انجمن ترقی اردو کے سکرٹری بن کر ساری جد وجہد کا مرکز اسے بنائے ہوئے ہیں۔ لائق علی اور معین نواز جنگ کی دوستی انھیں حیدرآباد ٹرسٹ میں لے گئی اور وہاں ہمہ تن عمل بنکر کام کرنے لگے، اور آخر اس جہان سے رخصت ہوگئے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

تقی الدین صاحب کے انتقال کے بعد بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ لائق علی صاحب سے مجھے شرف نیاز نہیں حاصل تھا، اور ان کی خود نوشت کا ترجمہ کرنے کے لئے شرفِ نیاز حاصل کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی۔

لائق علی نے اپنی کتاب منشی کی کتاب سے کہیں پہلے لکھی تھی، منشی اور مینن نے حیدرآباد اور خود لائق علی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا جواب باصواب اسی کتاب سے مل سکتا تھا، منشی اور مینن نے اگر تصویر کا ایک رخ دکھایا تھا، تو لائق علی بڑی صحت اور سچائی کے ساتھ دوسرا رُخ دکھا سکتے تھے، منشی کی کتاب چھپ گئی مینن کی کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہوگئی، اور لائق علی کی کتاب اب تک کولڈ اسٹوریج میں رکھی ہوئی ہے، لیکن دنیا تو کسی کا انتظار نہیں کرتی، لائق علی اور معین نواز جنگ وغیرہ اگر خاموش ہیں تو خاموش رہیں، دنیا منشی اور مینن کی کتاب دیکھے گی اور اپنا فیصلہ صادر کردیگی۔

میں نے منشی اور مینن کے افکار و خیالات اسی لئے اور زیادہ جوش کے ساتھ اردو میں منتقل کئے ہیں کہ شاید لائق علی چونکیں، معین نواز جنگ جنبشِ لب پر آمادہ ہوں ——
—— شاید کہ ہمیں بیضہ بر آرد پر و بال!

منشی اور مینن نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، میں نے آخر میں "ملاحظات و ایضاحات" کے عنوان سے اپنے علم و معلومات کے مطابق ایک باب لکھکر ان دونوں حضرات کی غلطیوں کی تصیح کردی ہے، لیکن اندرونِ پردہ انکشافات تو میرے بس کی چیز نہیں، یہ کام تو محرمانِ سراپردۂ خلوت ہی کر سکتے ہیں —— وہی لوگ جنھوں

نے آزادیٔ حیدرآباد کی تحریک کو چلایا، پروان چڑھایا، نظام سے مقابلے کئے، غداروں اور جاسوسوں کے وار سہے، انڈین یونین کے وزراء اور سربرآوردہ اصحاب سے مذاکرے کئے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن، سردار پٹیل، جواہر لال نہرو سے رودررو گفتگو کی، ان کا نقطۂ نظر سنا، اپنا نقطۂ نظر پیش کیا، حیدرآباد کا مسئلہ مجلس اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر اب تک موجود ہے، اگر تصویر کا یہ دوسرا رخ بھی سامنے آجائے تو بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو سکتی ہیں، اور یہ مسئلہ ایک نئی اور واضح صورت اختیار کر سکتا ہے۔

رئیس احمد جعفری
۸۹۔ ٹیگور پارک ۔ لاہور

میر اور و د حیدر آباد

۲۰ر دسمبر ۱۹۴۷ء

"مسٹر منشی کیا آپ حیدر آباد جانے کے لئے تیار ہیں ؟"

یہ الفاظ سردار ولبھ بھائی پٹیل نائب وزیر اعظم ہند اور وزیر امور ریاست کے تھے ہم لوگ چائے نوشی میں مصروف تھے، سردار کے یہ الفاظ سن کر میں متحیر بلکہ بھونچکا رہ گیا۔

"معاہدۂ قائمہ کے ماتحت ہمیں اپنا ایجنٹ جنرل، جلد از جلد حیدر آباد بھیجنا چاہیئے!"

سردار نے ایک مرتبہ پھر وہی موضوع چھیڑا۔

میں نے محسوس کیا۔ سردار کا انداز گفتگو کافی سنجیدہ ہے، اور کوئی شبہ نہیں معاملہ تھا بھی اہم، گزشتہ چند مہینے کافی ہنگامہ خیز گزرے تھے، ملک اب تک اس لرزہ خیز انقلاب کے اثرات سے بحال نہیں ہو پایا تھا، جو تقسیم ہند پر منتج ہوئے تھے۔ لاکھوں پناہ گزیں اب تک خانہ بدوشی کے عالم میں مارے مارے پھر رہے تھے، لاتعداد آشفتہ حال، اور برگشتہ بخت اب تک سرحد پار کر کرکے یہاں پہنچ رہے تھے، ہندوستانی ریاستوں کا الحاق اب تک مکمل نہیں ہوا

تھا، جوناگڈھ نے ملحق ہونے سے انکار کر دیا تھا، کشمیر نہ ختم ہونے والے اضطراب و کشمکش کا سبب بنا ہوا تھا، حیدرآباد، جیسا کہ سردار نے خود فرمایا تھا بھارت کے پیٹ میں سرطان کی طرح موجود تھا۔

معاہدۂ قائمہ

۲۰ رنومبر کو سخت اشتعال انگیز اور صبر آزما مذاکرات کے بعد بھارت اور حیدرآباد کے مابین معاہدۂ قائمہ پر دستخط ہوئے تھے۔ اس موقع پر مجلس دستور ساز میں بیان دیتے ہوئے سردار نے اس امید کا اظہار کیا تھا کہ اس عارضی معاہدہ کے دوران میں مستقل الحاق کا راستہ ہموار ہو جائے گا، گو اس اثنا میں نظام حیدرآباد اپنے نئے مشیروں کی حوصلہ افزائی سے یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ خود مختار ہے، کیونکہ اس کی اور اس کے مشیروں کی یہ رائے تھی کہ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو بھارت سے انگریز کے رخصت ہوتے ہی وہ خود مختار فرماں روا بن گیا۔

حیدرآباد سے ملحقہ صوبوں میں صدہا خوف زدہ اور سہمے ہوئے خاندانوں کا پناہ لینے کے لئے تانتا لگ گیا۔ جو مسلمانوں کی ایک فرقہ وارانہ تنظیم کے رضاکاروں سے دہشت کھا کر بھاگ آئے تھے۔ معاہدہ قائمہ پر دستخط ہونے سے ملک میں عام طور پر محسوس کیا جا رہا تھا کہ حکومتِ ہند کی گرفت سے معاملات دور نکل گئے۔

گاندھی جی ناخوش تھے

گاندھی جی ان واقعات سے اور جن لوگوں کے ہاتھوں میں عنان اقتدار تھی دونوں سے ناخوش تھے۔ نئی دہلی کانا پھوسی کا ایک بہت بڑا ہال بنا ہوا تھا، جہاں ہر طرح کی خوفناک افواہیں بغیر کسی تامل کے فوراً قبول کر لی جاتی تھیں۔

سردار سے میرے تعلقات کی تاریخ

۱۹۲۶ء کی بردولی ستیہ گرہ کے زمانہ سے میرے بہت قریبی تعلقات، کسی سے ہار نہ قبول کرنے والے سردار سے رہے ہیں، اگاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی کو ناقابل شکست مورچہ بنانے والا یہی شخص تھا، یہی تھا جس نے اس دبدبہ کی بنیاد ہلا دی تھی جو ایک سو سال کی مدت میں اس مرتبہ پر پہنچا تھا، بمبئی لیجسلیٹو اسمبلی کے ایک آزاد ممبر کی حیثیت

سے واقعات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے لئے میں بردولی پہنچا، وہاں پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ گاندھین تکنیک کی قیادت سردار کے ہاتھ میں ہے، وہاں میں نے سردار کی ان عظیم الشان صلاحیتوں کے عملی مظاہرے دیکھے، جو فطرت نے انھیں ودیعت کی تھیں۔ جنھوں نے ہندوستان کا احساس کی تاریخ کا رخ بدل دیا تھا، سردار نہ صرف پُرقوت اور باحوصلہ آدمی تھے بلکہ ان میں تنظیمی صلاحیتیں بھی غضب کی تھیں، اور اپنے تاثرات کا دوسروں کو تابع بنالینا بھی انھیں خوب آتا تھا، حقائق کی تہ تک پہنچ جانے کا فن بھی وہ خوب جانتے تھے اور اس معاملہ میں تو ان کا جواب ہی نہیں تھا کہ لوگوں کو جب چاہیں اپنے ڈھب پر چلانے لگیں۔

پٹیل: میری قوت کا سرچشمہ

اسی وقت سے ہم دونو ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لگے۔ ۱۹۳۷ء میں جب بمبئی کی ہوم منسٹری میرے ہاتھ میں تھی، میری قوت کا اصل سرچشمہ وہی تھے، ۴۱-۱۹۴۰ء کی ستیہ گرہ میں ہم دونو برودا جیل میں بھی ساتھ ساتھ تھے، اور جب میں وہاں سخت بیمار پڑا تو مادرانہ شفقت کے ساتھ وہ میری دیکھ بھال کرتے رہے، قدرتی طور پر ہم دونوں ایک دوسرے کے اداشناس ہو گئے۔

سردار کی ماتحتی میں کام کرنا میرے لئے ہمیشہ موجب صد نشاط وافتخار رہا، دیگر امور سے قطع نظر بہر حال وہ دانش مند اور فیاض سردار تھے، اپنے ساتھیوں کی تنگ نظری وہ مسکرا مسکرا کر برداشت کر لینے کے عادی تھے، لیکن مشکلات اور ناکامیوں کے دور میں ان کے ہمدردانہ مشورے غم خوار ثابت ہوتے تھے

سردار کا اٹل فیصلہ

بہر حال اس طرح ہم دونو میں کامل ہم آہنگی اور مطابقت پیدا ہو گئی، چنانچہ جب حیدرآباد کا ذکر انھوں نے چھیڑا، میں تے فوراً محسوس کر لیا، واقعی وہ مجھے وہاں بھیجنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، مجھے بھی رائے قائم کرنے میں دیر نہ لگی، کیونکہ مجوزہ منصب قبول کرنے پر میں آمادہ نہیں تھا، حیدرآباد جا کر مجلس دستور ساز سے یک بیک الگ ہو جانا، جس کے لئے اب تک شب و روز میں مصروفِ کار رہا تھا،

میرے لئے تکلیف دہ تھا، لیکن سردار فیصلہ کر چکے تھے اور فرض کی پکار یہ تھی کہ مجھے لبیک کہنا چاہیئے، میں نے کہا۔

"پہلے مجھے باپو (گاندھی جی) سے مشورہ کر لینے دیجئے، لیکن یہ سن لیجئے، اگر میں گیا تو مجلس دستور ساز کی ممبری ترک نہیں کر دوں گا، اس کے علاوہ میں کوئی تنخواہ بھی نہیں لوں گا۔"

"ٹھیک ہے باپو سے مشورہ کر لو" سردار نے کہا۔

باپو کی خدمت میں

اسی شب کو میں مہاتما گاندھی سے ملا، وہ میری کمزوریوں سے خوب واقف تھے، جن میں سے ایک یہ تھی کہ آنکھ بند کر کے کسی کی پیروی کرنا میرا شعار نہ تھا۔

"باپوجا" جب میں ان کے کسی مشورہ کو نہ ماننے پر تل جاتا تو کہتا تھا "آپ ستیہ گرہ (صداقت) کے حامل ہیں اور وہ یقیناً بہت عظیم ہے، لیکن میں بھی صداقت کی حقیر سی پونجی اپنے پاس رکھتا ہوں، کیا آپ مجھے اس کی پیروی کرنے کی اجازت نہ دیں گے؟"

اور گاندھی جی کی عظمت کا مجھے اعتراف کرنا چاہیئے کہ میری اس آزادروی پر وہ کبھی خفا نہیں ہوئے بلکہ یہ آزادی بے تامل مجھے مرحمت فرمائی۔

لیکن جب میں نے سردار کی تجویز ان کے سامنے رکھی تو گاندھی جی نے نہ صرف اس سے اتفاق کیا بلکہ اسے قبول کرنے سے انکار کرنے کا مجھے حق نہیں دیا، البتہ میرے تنخواہ نہ لینے کے فیصلہ کو انھوں نے منظور کر لیا۔

"یہ صرف ایک فریضہ کی بجاآوری نہیں ہے" انھوں نے کہا "بلکہ تمہارا مذہبی فریضہ ہے۔"

"لیکن!" میں نے احتجاج کرتے ہوئے "فریضہ ہے بہت کٹھن!"

"ہاں میں جانتا ہوں!" انھوں نے فرمایا "واقعی کام کٹھن ہے، لیکن تم کامیاب ہو گے، اگر تم جیسے لوگ بھی ایسے اہم امور کی انجام دہی میں این وآں کرنے لگیں تو ہم قدم آگے کیسے بڑھا سکیں گے؟"

باپو کا اعتماد ہمیشہ میرے اندر ایک نئی قوت پیدا کرنے کا موجب بنتا رہا، بہرحال

مسائل حیدر آباد کی پیچیدگی ہی وہ نا قابل مزاحمت چیز تھی جو مقناطیس کی طرح مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

باپو نے میری ذہنی کش مکش کا اندازہ کر لیا، انھوں نے فرمایا۔

"رضوی گروپ، مجھے تسلیم ہے، تمھیں سخت ناپسند کرتا ہے۔"

"جی ہاں! یہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟" انھوں نے فرمایا "تمھیں اپنے فیصلہ پر بہر حال عمل کرنا چاہیئے۔"

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک پُر اضطراب مستقبل دریائے موسیٰ کے ساحل پر میری راہ تک رہا ہے۔ جہاں نظام اپنا داؤں لگا رہا تھا، اور قسمت بھی اپنا کھیل کھیلے جا رہی تھی۔

سردار کا فون

دوسرے روز جب میں بمبئی روانہ ہوا تو دماغ اب تک کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

بمبئی پہنچنے کے دوسرے دن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دلّی سے سردار کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"حیدر آباد کب جا رہے ہو؟"

"کل ہی تو باپو کے پاس سے واپس آیا ہوں" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا "اور سچ پوچھیے تو اب تک کسی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔"

"لیکن بغیر کسی تاخیر کے تمھیں حیدر آباد روانہ ہونا چاہیئے" سردار نے کہا "اچھا یوں کرو کل صبح دلی آجاؤ، یہاں ساری باتیں طے کر لیں گے۔"

سردار کو بات کرنے کا ایسا ڈھب آتا تھا کہ آدمی کا تذبذب دھرا کا دھرا رہ جاتا، فون پر ان کی گفتگو بہت مختصر تھی، صرف چند خاص مسائل پر۔

میں دہلی پہنچ گیا

دوسرے دن میں دہلی پہنچ گیا، اور ہوائی اڈے سے سیدھا سردار کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"کیا آپ نے اٹل فیصلہ کر لیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کیا اب کوئی نیا فیصلہ کرنا ہے؟" سردار نے جواب میں کہا "جس قدر جلد ممکن ہو سکے تمہیں حیدرآباد جانا چاہیئے، مینن تم سے ملیں گے اور جلد ضروری مسائل طے کر لیں گے۔"

"کیا آپ کو یقین ہے نظام مجھے قبول کر لیں گے؟" میں نے سوال کیا، "یہ بڑی نازیبا بات ہوگی کہ آپ تو میرا تقرر کر دیں، پھر اسے منسوخ کرنے پر (نظام کی نامنظوری کے باعث) مجبور ہو جائیں۔"

میں جانتا تھا حیدرآباد میں انڈیا کے ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے میرا وجود تحسین اور مسرت کی نظر سے نہیں دیکھا جائے گا۔

دس برس پہلے جب میں بمبئی کا وزیر داخلہ تھا میں نے نظام کی یہ التجا ٹھکرا دی تھی کہ آریہ سماجی ستیہ گرہیوں کے خلاف کوئی اقدام کروں جو حیدرآباد جاتے ہوئے شولاپور میں پڑاؤ ڈالا کرتے تھے، مذہبی آزادی حاصل کرنے کے لئے حیدرآباد کے ہندو جو جدوجہد کر رہے تھے اور جو مصائب برداشت کر رہے تھے اس کے خلاف نظام کی تائید کرنا ظاہر ہے میرے لئے ناممکن تھا۔

پھر ۱۹۴۲ء میں جب اکھنڈ (متحدہ) ہندوستان کے لئے فضا ہموار کرنے اور جدوجہد کرنے کی غرض سے میں نے کانگرس سے ترک تعلق کیا، اور مسلم لیگ کی افتراق انگیز سرگرمیوں کے خلاف صف آرا ہوا تو میرے پرانے دوست مسٹر جناح بھی مجھ سے سخت برہم ہو گئے، یہ وہ حقائق تھے جنھیں نظام گورنمنٹ کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

نظام نے میرا تقرر پسند نہیں کیا

۲۵ ردسمبر کو جب میرے تقرر کا اعلان ہوا تو نظام نے اسے پسند نہیں کیا۔ اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ بھارتی ایجنٹ جنرل کو صرف وکیل تجارت کی حیثیت تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھنی چاہئیں، اور دوسرے امور میں نہیں الجھنا چاہیئے لیکن وزارت امور ریاست نے یہ پوزیشن نہیں تسلیم کی، اور معاہدہ قائمہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ مطالبہ ناواجب ہے، کیونکہ ایجنٹ جنرل کی منصبی ذمہ داریوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ معاملات خارجہ، دفاع اور مواصلات کے معاملات پر نگاہ رکھے، کیونکہ امور بالا کی از روئے معاہدہ حکومت ہند نگراں تھی۔

دوسرے روز ۲۔ ونڈسر پلیس میں، جہاں مجلس دستور ساز کے ممبر کی حیثیت سے میں مقیم تھا، سری وی پی مینن، سیکرٹری محکمہ امور ریاست جو دہلی میں عام طور پر "وی پی" کے نام سے معروف تھے، ایڈیشنل سیکرٹری، سری سی، سی ڈیسائی کے ساتھ تشریف لائے، اور میرے تقرر سے متعلق معاملات پر بحث و گفتگو کی مینن کا شمار ہندوستان کے قابل ترین آئی سی ایس افراد میں ہوتا تھا، اور بھارتی ریاستوں کے الحاق کے سلسلہ میں وہی تھے جو سردار کی پالیسی کو روبہ عمل لارہے تھے۔

وی پی مینن کا ذہن بھی صاف نہ تھا

لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا خود مسٹر مینن کے ذہن میں یہ بات صاف نہ تھی کہ حیدرآباد میں میرا قیام کہاں ہوگا؟ اور وہاں میرے فرائض کیا ہوں گے؟ میں نے دریافت کیا۔

"میں ٹھہروں گا کہاں؟"

مینن نے بتایا

"بولارم ریذیڈنسی کے سوا اور کہاں؟"

حیدرآباد میں دو ریذیڈنسیاں ہیں، ایک خاص حیدرآباد میں، دوسری وہاں سے دس گیارہ میل کے فاصلہ پر، مضافات سکندرآباد بولارم میں۔

"میرا اسٹاف؟"

"ہم تو آپ کو ایک افسر دیں گے، دوسرے آپ خود ہی صوبوں سے چن لیں۔"

"کچھ کاغذات اور دستاویزات؟"

"گزشتہ ریکارڈ ٹائپ کیا جارہا ہے اور چند روز کے اندر اندر آپ کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے گا۔"

ایک بات پر مینن بالکل اٹل تھے۔ یعنی ۵ جنوری ۱۹۴۸ء تک مجھے حیدرآباد پہنچ جانا چاہیئے۔"

ماؤنٹ بیٹن کی خدمت میں باریابی

دوسرے روز میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا۔ یہ شاندار اور باوقار مدبر، یکتا وضع اور

آداب کا حامل ہے، موصوف نے فرمایا کہ یہ منصب صفِ اول کے ایک سیاست داں ہی کے لئے موزوں تھا، اور آپ سے بڑھ کر اس تقرر کا اہل کون ہو سکتا تھا؟ ساتھ ہی ساتھ لاٹ صاحب نے گزشتہ مذاکرات کا ایک خاکہ بھی میرے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا۔

"میرا خیال ہے آپ کو حیدرآباد میں تین چار ماہ سے زیادہ قیام کی زحمت نہیں برداشت کرنا پڑے گی، اس اثنا میں نظام دستاویزِ الحاق پر دستخط کر دے گا"

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے انھوں نے کہا۔

ایک بات میں میری کچھ نہیں چل پاتی، قاسم رضوی مجلس اتحاد المسلمین کا صدر، اور طوفانی فوج کا سالار ہے۔ وہ تُلا ہوا ہے کہ دکن میں مسلم بالادستی قائم رکھے، اس شخص نے مجھے بہت زیادہ پریشان کر رکھا ہے، لیکن خیر کوئی بات نہیں، سر والٹر مانکٹن نظام کے مشیر دستوری کی حیثیت سے وہاں موجود ہیں"

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مزید کہا۔

"میں اور آپ اس خاص و اہم معاملہ میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ ایک مرتبہ اگر نظام حیدرآباد سے چل کر یہاں آگیا، تو کوئی شبہ نہیں وہ الحاق کی دستاویز پر دستخط کر کے واپس جائے گا۔ پھر ہم رضوی سے سمجھ لیں گے"

قبل اس کے کہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو الوداع کہوں، انھوں نے فرمایا۔

"سر والٹر مانکٹن میرے دوست ہیں! یہ دوستی اس وقت سے چلی آ رہی ہے جب وہ پرنس آف ویلز کے قانونی مشیر تھے، جو اب ڈیوک آف ونڈسر کہلاتے ہیں اور میں ڈیوک کا اے ڈی سی تھا"

سر والٹر سے میں ناواقف نہ تھا، اور ایک قانون داں کی حیثیت سے وہ غیر معمولی شہرت کے حامل رہے ہیں، بمبئی ہائی کورٹ کے سالیسٹروں کے ہاں ان کی بڑی مانگ رہتی تھی، کہ پریوی کونسل میں وہ اپیلیں پیش کر دیا کریں، بعض مقدمات جو میرے پاس تھے اور جنھیں میں چلا رہا تھا قابلِ تعریف اسلوب سے موصوف نے پریوی کونسل میں ان کی پیروی کی۔

جواہر لال کی خدمت میں یہاں سے فارغ ہو کر میں پنڈت جواہر لال کی خدمت میں حاضر ہوا جو وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے ریاستی کانگرس کی سرگرمیوں کی تفصیل اور روئداد میرے سامنے پیش کی، انھوں نے فرمایا۔

"بلاشبہ حیدرآباد کو ملحق ہونا ہے، وہ ہندوستان سے باہر نہیں رہ سکتا"

پنڈت جی کی یہ قنوطیت کچھ متعدی قسم کی تھی۔

میرا اذعان بھی یہی تھا کہ اپریل کے آخر تک میں اس حالت میں دہلی واپس آؤں گا کہ دستاویز الحاق میری جیب میں ہوگی۔

گاندھی جی نے مجھ سے عہد لیا بمبئی جانے سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"میں چاہتا ہوں تم وعدہ کرو کہ اپنی پوری صلاحیت بھارت اور حیدرآباد کے مابین معاملات طے کرنے میں صرف کر دو گے۔ گاندھی جی نے کہا میں نے یہ وعدہ کر لیا لیکن یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا

"مذاکرات کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ کیا غیر معین مدت تک جاری رہے گا؟"

گاندھی جی نے ایک قہقہہ لگایا، میری ذہنی کش مکش ان کے سامنے بے نقاب ہو چکی تھی۔

"بس تین چار ماہ!"

میں یہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"اور اگر یہ مذاکرات ناکام ہوئے تب؟"

"پھر؟ ——— پھر اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ جائے گا کہ معاملات کو بہر حال ختم کیا جائے!"

گاندھی جی کے جواب کا یہ خاص انداز تھا۔

پھر گاندھی جی نے مجھ سے فرمایا کہ سدھیر گھوش کو اپنے ساتھ لیتا جاؤں۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ گاندھی جی کے خاص چیلے ہیں، میں نے جواب دیا۔

"ضرور وہ میرے ساتھ شوق سے جا سکتے ہیں!"

ملک میں میرے تقرر کا خیر مقدم کیا گیا، دہلی کے ایک ممتاز اخبار نے لکھا۔

"یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وزارت امور ریاست حیدرآباد کے مسئلہ کی اہمیت کس درجہ محسوس کر رہی ہے؟ اور یہ کہ معاملات کو رو براہ کرنے کے لیے چوکس رہنے کی ضرورت ہے!"

"بیچارہ نظام گیا"

کسی خاص حلقہ میں شہرت اور عزت کا حامل ہونا کسی دوسرے حلقہ میں اسی اختصاص کے ساتھ داخلہ کا پاسپورٹ نہیں بن جاتا، مثلاً ڈاکٹر آر سی مجمدار نے کلکتہ میں اپنے ایک دوست کو جب میرے تقرر کی اطلاع دی تو اس نے کہا،

"بیچارہ نظام گیا!"

"یہ کیوں؟" ڈاکٹر مجمدار نے پوچھا۔

"بس اب نظام ختم ہے!" اس نے جواب دیا

میرے تقرر سے خود حیدرآباد میں بھی کم ہل چل نہ تھی۔

"آخر یہ شیطان یہاں کیوں آرہا ہے؟" ——— ایک وزیر نے اپنے ایک ساتھی وزیر سے پوچھا۔

مجلس اتحاد المسلمین کے صدر محترم، سید قاسم رضوی الگ دفور اضطراب سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرے بمبئی کے دوست اس انتخاب سے بہت خوش تھے۔ میری خدمت میں تبریک و تحسین کا تحفہ پیش کرنے کے لیے انھوں نے کئی پارٹیاں دیں۔ ان میں سے بعض پورے طور پر محسوس کر رہے تھے کہ میرے دوشِ ناتواں پر کتنا بڑا بوجھ آپڑا ہے، بالڈون (Baldwin.) کے الفاظ مستعار لیتے ہوئے میں نے اپنی جوابی تقریر میں اپنے بہی خواہ دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"براہ کرم مجھے مبارک باد نہ دیجئے۔ مجھے آپ کی دعا کی ضرورت ہے۔"

میرے اسٹاف کا مسئلہ

میرے لئے اپنے اسٹاف کا انتخاب کسی مرغ گریزپا کو اسیر دام کرنے کے مترادف تھا، آخر کار مدراس کے چیف منسٹر اوپی رام سوامی ریڈیار نے ایم ٹی راجو آئی سی ایس کو جو ڈاٹرکٹر انڈسٹریز کے عہدہ پر فائز تھے

اور اب اندھرا کے ہوم سیکرٹری ہیں، میرے حوالہ کیا۔ اڑبہ نے راگھوپتی کو جو ہندوستان کی ایڈمنسٹریٹو سروس میں نئے نئے بھرتی ہوئے تھے میرے جھولے میں ڈال، یہ صاحب فوج میں بمقام سکندرآباد رہ چکے تھے، اور انھیں میں اچھی طرح جانتا تھا۔

مجھے بے شمار لوگوں سے ملنا پڑا، بمبئی میں سوامی رامانند تیرتھ اور ملکوٹ سے جو حیدرآباد کی کانگرسی تنظیم کے رہنما تھے مجھے گفتگو کا موقع ملا، ونکٹ راما ریڈی نظام گورنمنٹ کے نائب وزیر اعظم میرے پرانے رفیق کار بھی تھے، جبکہ میں بمبئی لائف انشورنس کمپنی کا چیرمین تھا، یہ بھی کئی باتیں میرے علم میں لائے۔ مدراس میں حیدرآباد کے فنانس سیکرٹری ایل این گپتا سے بھی میں ملا، جو وہاں کی صورت حالات سے اچھی طرح واقف تھے، بہت جلد میں نے ایسے اطلاعات فراہم کرلئے جنھوں نے میرا یہ یقین مستحکم کردیا کہ مجھے ایک طوفانی دور سے گزرنا ہے۔

نظام گورنمنٹ کا رویہ

۱۹۴۸ء کے آغاز ہی میں سدھیر گھوش اور وزارت امور ریاست کا ایک افسر حیدرآباد پہنچ چکے تھے۔ نظام گورنمنٹ قیام کے لئے کوئی جگہ ہمیں دینے کے لئے تیار نہ تھی، سدھیر فوراً حیدرآباد ریذیڈنسی میں منتقل ہوگئے، یہیں سے طوفان اُٹھ کھڑا ہوا، میر لائق علی وزیر اعظم حیدرآباد جو کبھی میرے موکل رہ چکے تھے سردار سے مطالبہ کیا کہ سدھیر کو ریذیڈنسی فوراً خالی کردینی چاہیئے۔

نظام اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے درمیان بھی تار کھڑکنے لگے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مجھے بلارم ریذیڈیسی میں ٹھہرنے دینا چاہیئے ——— یہی جگہ اب راشٹرپتی نیلایم[1] کہلاتی ہے ——— کم از کم پندرہ جنوری تک، پھر میں دکن ہاؤس میں جو گورنمنٹ آف انڈیا کی عمارت ہے منتقل ہوجاؤں گا، کیونکہ مذکورہ تاریخ تک سکندرآباد میں متعین ہندوستانی فوج کا جنرل آفیسر کمانڈنگ اس عمارت کو خالی کردے گا، لیکن نظام نے چند روز کے لئے بھی حیدرآباد یا بلارم ریذیڈنسی میں میرا قیام گوارا نہ کیا یہ طرز عمل معاہدہ کے خلاف تھا، اور غیر دستوری بھی، ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کا مرتبہ وہی تھا جو انگریز ریزیڈنٹ کا ہوا کرتا تھا۔ نظام نے تجویز پیش کی کہ دس گیارہ روز تک میں لائق علی کے مہمان

---

[1] ہندوستان کے صدر مملکت کی جنوبی ہند میں قیام گاہ۔

کی حیثیت سے رہ سکتا ہوں، ورنہ:

"ہمارے جدید اور خوشگوار تعلقات جن کا آغاز ابھی ابھی ہوا ہے کشیدہ ہوجائیں گے"

دہلی، بمبئی اور حیدرآباد کے مابین نہ ختم ہونے والے پیامات کا تبادلہ شروع ہوگیا۔

حیدرآباد میں تو کافی ہلچل نظر آرہی تھی، لوگوں کی زبان پر چرچا یہ تھا:

میرا ریذیڈنسی میں قیام منظور نہ کیا گیا

"ہندوستان کا ایجنٹ جنرل ریذیڈنسی میں کس طرح قیام کرسکتا ہے؟"

مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا! مملکت حیدرآباد کی طرف میں ہندوستان کی ہواؤں کا جھونکا تک نہ آنے دوں گا" ——— قاسم رضوی نے گرج کر ایک جلسۂ عام میں کہا "اگر منشی نے ریذیڈنسی پر قبضہ کرلیا تو نہ صرف اس اقدام کی مزاحمت کی جائے گی بلکہ ریذیڈنسی کی اینٹیں اکھیڑ اکھیڑ کر دریائے موسیٰ میں پھینک دی جائیں گی"

یہ جلسۂ عام آزاد حیدرآباد، زندہ باد کے نعروں پر ختم ہوا۔

مجلس اتحاد المسلمین کی نظر میں حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل ایک بدیسی تھا۔

جس منصب پر میں فائز تھا، اس کے وقار میں ان مباحث کے باعث مشکل ہی سے کوئی اضافہ ہوسکتا تھا، دہلی سے اجازت لے کر میں نے اپنے آفیسرز کو ہدایت کی کہ وہ ممتاز شہریوں کو میری طرف سے ایک ایٹ ہوم پر پانچ جنوری کو حیدرآباد ریذیڈنسی میں مدعو کریں، نیز میر لائق علی اور ان کے رفقا کو اسی رات ایک ڈنر پارٹی میں شرکت کی دعوت دیں۔

لائق علی سخت ضغطہ میں پڑ گئے، انھوں نے فون پر مجھ سے درخواست کی کہ میں ان کا مہمان بن کر تمام ناخوشگواریوں کا خاتمہ کردوں، لیکن میں نے انکار کردیا۔

"یہ کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے" میں نے کہا

نظام مان گئے

آخر کار نظام نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ذاتی روابط کا احترام کرتے ہوئے ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کو گیارہ روز کے لئے بلارم ریذیڈنسی میں قیام کی اجازت دے دی، یعنی پانچ جنوری سے پندرہ جنوری تک، اس سے زیادہ ایک دن بھی نہیں۔

جب یہ معاملہ طے پاگیا تو لائق علی نے مجھ پر زور دیا کہ ایٹ ہوم اور ڈنر پارٹی دونو

منسوخ کر دی جائیں، میں نے جواب دیا، دعوت نامے جاری ہو چکے ہیں۔ اب تنسیخ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، آخر کار ہم میں ایک دوستانہ مفاہمت ہو گئی، ایٹ ہوم اور ڈنر پارٹی کی جگہ حیدرآباد ریذیڈنسی کی بجائے بلارم ریذیڈنسی طے پا گئی، جہاں مجھے قیام کرنا تھا، لیکن ڈنر جو نظام کے وزراء کو میری طرف سے دیا جا رہا تھا، وہ لائق علی کی طرف سے مجھے دیا جانا طے پا گیا۔

اے ڈی سی کی نظر میں میری وقعت

راگھو پتی تین جنوری کو میرے پاس آیا۔ چار جنوری کو ایک کشیدہ قامت اور بانکا فوجی نوجوان افسر میرے پاس پہنچا اور اس نے کہا، مجھے حکم ملا ہے کہ میں آپ کے اے ڈی سی کی حیثیت سے رہوں، میں نے محسوس کیا کہ ایک دھوتی بند ایجنٹ جنرل کا اے ڈی سی ہونا اسے شاق گزر رہا ہے، دوران گفتگو میں اس نے کہا، کہ اگر میں اسے اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دوں تو بڑا اچھا ہو، کیونکہ اس صورت میں بڑی آسانی سے وہ گورنر بمبئی کا ایڈی کانگ بن جائے گا۔

یہ گفتگو رات کے ساڑھے دس بجے ہوئی، جبکہ میں کل کی تقریبات کے سلسلہ میں بدحواس ہو رہا تھا، اس نوجوان کے اس طرز عمل پر میں خاموش نہ رہ سکا، میں نے کہا۔ میں حیدرآباد جا رہا ہوں، تم دہلی سے حکم پا کر بھیجے گئے، ہم دونو اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہیں، جو تمہارا جی چاہے، کرو" میری آواز کافی اونچی ہو گئی تھی۔

دوسرے روز وہ نوجوان ہوائی اڈے پر میرے ساتھ مل گیا، دو دن کے بعد وہ رخصت ہو گیا، خوش قسمتی سے راگھو پتی وفادار اور بہادر آدمی ثابت ہوا جس پر میں اعتماد کر سکتا تھا۔ لیکن اس موقع پر وہ ایک جذباتی بحران سے دوچار تھا جس سے بہر حال اسے عہدہ برآ ہونا تھا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسے اہم اور ذمہ دار منصب کا چارج لیتے وقت کیسے بے ہنگم آدمیوں سے مجھے سابقہ پڑ رہا تھا! ۵ جنوری کو یک چارٹرڈ طیارے پر ہم نے حیدرآباد کی طرف پرواز کی، اس طیارے پر قومی جھنڈا لہرا رہا تھا، حکیم پیٹھ کے ہوائی اڈے پر ایک عظیم الشان مجمع تھا جو زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھا گرم جوشی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم کیا اور "گاندھی جی کی جے" کے پُر جوش نعرے لگائے،

حیدر آباد کے لوگ مکمل طور پر مجلس اتحادالمسلمین سے دہشت زدہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ معاہدہ قائمہ نے انھیں بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا ہے۔ بھارتی ایجنٹ جنرل کا تقرر بہر حال کسی نہ کسی حد تک ان کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے تقرر کا اعلان ہوتے ہی ہندوؤں کی بڑی تعداد جو فرار ہونے پر مجبور ہو گئی تھی سکندر آباد واپس آگئی۔

ہوائی اڈے پر ہندوستانی فوج کا دستہ موجود تھا، اس موقعہ پر پہلی مرتبہ مجھے سلامی لینے کا تجربہ حاصل ہوا، مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ رسم کس طرح انجام دی، ممکن ہے کچھ چوک بھی ہو گئی ہو، حکام فوج کی درخواست پر میں نے چند الفاظ کہے، اور ان سپاہیوں کو خراج تحسین پیش کیا جو کشمیر میں مصروف پیکار تھے، میری اس تقریر نے حیدر آباد کی حکمران ٹولی اور مجلس اتحاد کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔

میری پہلی پریس کانفرنس

بلارم ریذیڈنسی میں میں نے بھارت کا قومی جھنڈا آصف جاہی پرچم کے پہلو بہ پہلو لہرایا، پھر ایٹ ہوم میں آئے ہوئے مہمانوں سے ملاقات کی، نظام گورنمنٹ کے عہدہ دار اور حامیان مجلس اتحاد بہر حال غیر حاضر تھے۔

فوراً ہی پریس کانفرنس شروع ہو گئی، اتحاد پریس کے نمایندے برابر نیش زنی کئے جا رہے تھے، وہ بھی نہایت خیرہ چشمی کے ساتھ، نہایت جارحانہ انداز میں مجھ سے سوال کیا گیا۔

"کیا آپ اعلیٰ حضرت کو یور مجسٹی کہہ کر مخاطب کریں گے؟"

مجلس اتحاد کا دعویٰ تھا کہ چونکہ نظام اب آزاد ہیں لہٰذا انھیں ہز مجسٹی کہنا چاہیئے۔

میں نے جواب دیا۔

"جس لقب سے میری گورنمنٹ انھیں مخاطب کرتی ہے، اسی طرح میں بھی انھیں مخاطب کروں گا۔"

ڈنر پارٹی میں لائق علی کو دے رہا تھا، لیکن اب لائق علی کی طرف سے مجھے ڈنر دیا جا رہا تھا، بہر حال ڈنر کا موقع خوش گوار طور پر گزر گیا، لائق علی نے ایک اچھی خیر مقدمی تقریر کی، میں نے جوابی تقریر میں کہا، کہ اس مجمع میں میں، اپنے آپ کو موجود پا کر بہت خوش ہوں۔ پھر میں نے اپنے ایک زیر تحریر تاریخی ناول کا حوالہ دیتے ہوئے کہا، کہ اس کا

تعلق حیدرآباد سے قریب ایک بہت پرانے شہر سے ہے، میرا یہ حوالہ تمام تر معصومانہ تھا، لیکن اسے مخالفانہ سمجھ لیا گیا کہ میں نے ایک قدیم ہندو مملکت کا ذکر کیا۔

نظام، ان کی مجلس وزراء اور مجلس اتحاد نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کی آمد کو نظر انداز کرتے ہوئے حیدرآباد کو وہ ایک آزاد اور خود مختار مملکت تصور کرتے رہیں گے۔[1]

---

[1] مسٹر منشی نے اس باب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ماننا چاہیئے، بہت محتاط انداز اور رچے تلے الفاظ میں، لیکن اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ وہ اس ذہنیت کو نہ چھپا سکے جو حیدرآباد کے سلسلہ میں ان کی، سردار پٹیل کی، جواہر لال کی، اور گاندھی جی تک کی تھی۔

(رئیس احمد جعفری)

ہز اگزالٹڈ ہائی نس

ہندوستان کے ایجنٹ جنرل متعینۂ حیدرآباد کی حیثیت سے میرا ایک سرکاری فرض یہ تھا کہ نظام سابع ہز اگزالٹڈ ہائی نس میر عثمان علی خاں کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کروں جو آصف جاہی خاندان کے ساتویں فرماں روا تھے۔

۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو میر لائق علی وزیر اعظم حیدرآباد کی معیت میں کنگ کوٹھی کی طرف روانہ ہوا یہ کوٹھی متعدد و بدنما مکانات کا مجموعہ ہے جو نظام کے تصرف میں ہیں نظام کی وسیع حرم کو اس کے عرب محافظ اور ایک بلند و بالا فصیل نے گھیر رکھا ہے۔

نظام ——— دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند، اور نہایت غیر معمولی آدمی سے روبرو ملاقات کے تصور نے ایک جھرجھری کی میرے اندر پیدا کر دی۔

یہ تھے اعلیٰ حضرت

ہم جیسے ہی کار سے اترے، میری نظر ایک دبلے پتلے، بوڑھے اور خمیدہ قامت انسان پر پڑی جو برآمدہ میں کھڑا تھا جس کے سر پر ایک کہنہ ترکی ٹوپی، گلے میں ایک میلا سا مفلر، بدن پر ایک پرانی شیروانی اور ویسا ہی پائجامہ، استری شاید اسی دن ہوئی تھی جب یہ دونو چیزیں درزی کے ہاں سے سل کر آئی تھیں۔

میر عثمان علی خاں نظام دکن

جو کبھی سکندر صولت - فریدون حشمت، کیوان رفعت، اور ہز اگزالٹڈ ہائی نس تھے
سلطنت برطانیہ کے یار وفادار تھے، اب صرف ایک شہری -
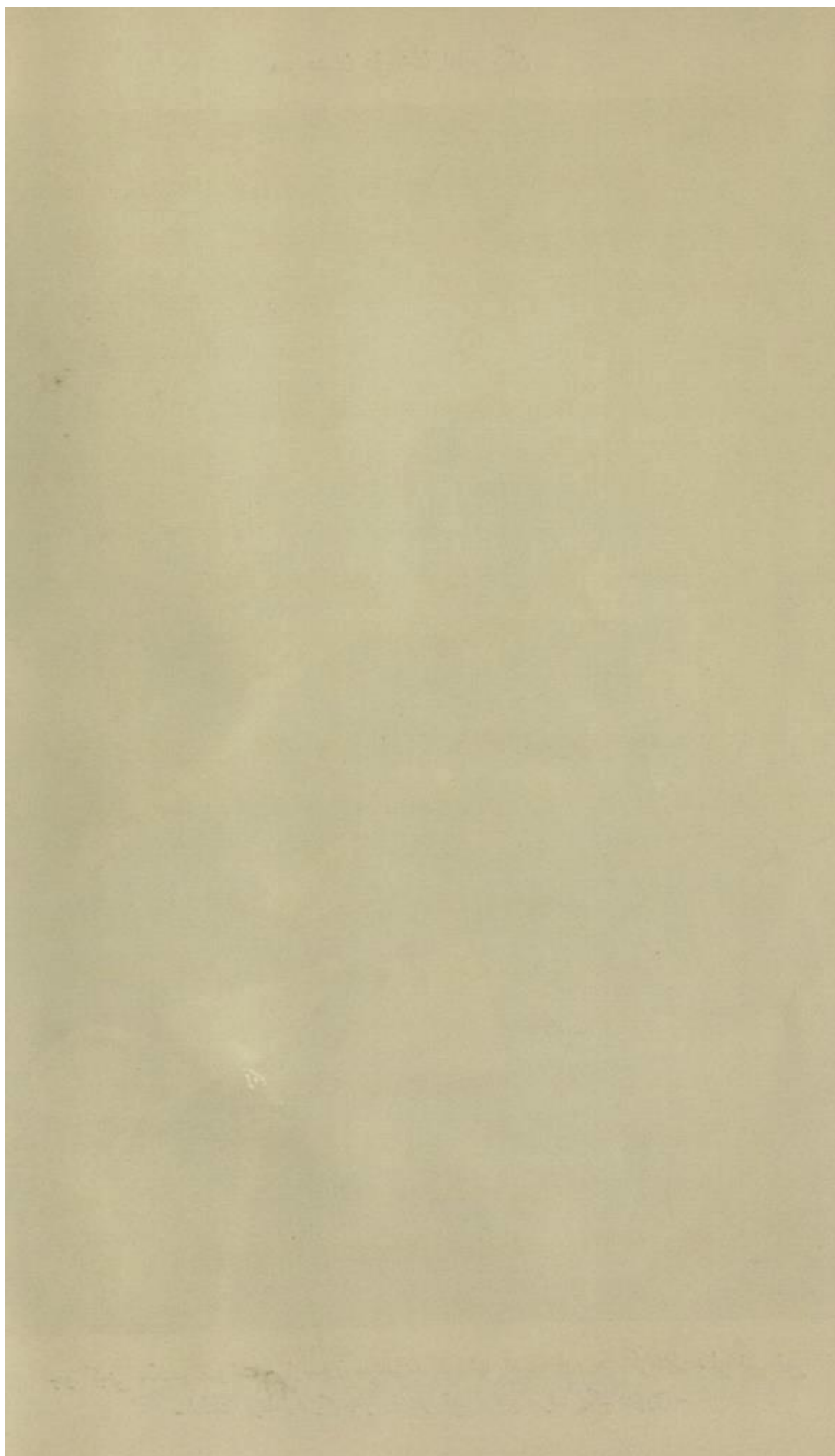
فاتح اور مفتوح

انقلابات ہیں زمانہ کے
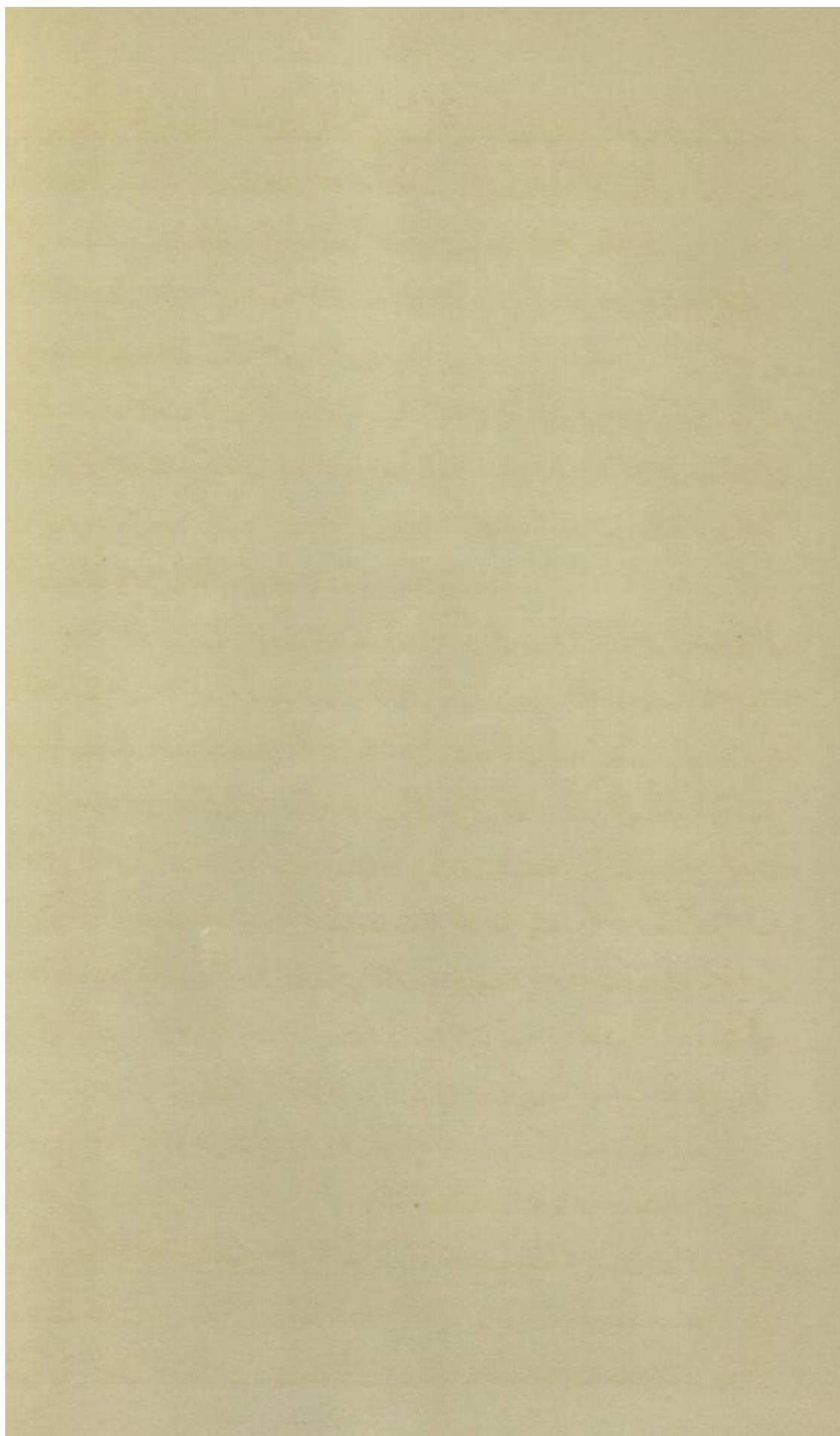
میرے لئے بڑا مشکل تھا کہ میں اس شخص کو کیا سمجھوں، لیکن لائق علی کو سرنگوں اور خالص جیدرآباد انداز میں ادب و احترام سے جھکا ہوا دیکھ کر شک و شبہ کی کوئی گنجائش بھی باقی نہیں رہ گئی ——— میں ہز اگزالٹڈ ہائی نس حضور نظام کے سامنے کھڑا تھا۔

نظام نے روایتی، لیکن افسردہ تبسم سے مجھے خوش آمدید کہا اور میرا ہاتھ ہلایا، پھر ہم ایک فرسودہ اور بے ڈھنگے سے کمرہ میں داخل ہوئے جس میں گرد و غبار سے اٹی ہوئی تصویریں اور ظروف آرائشی اس طرح بکھرے ہوئے تھے، جیسے کسی نیلام گھر کی بے ترتیب چیزیں۔ جس فضا میں ہم بیٹھے تھے، یہ دو گزرے ہوئے زمانوں یعنی ٹوپے دلزلی اور چند ولال کے زمانہ کی عکاسی کر رہی تھی۔ آثار کہن کی ایسی دنیا، جہاں بنیادی حقوق، جمہوریت اور معاشرتی انصاف کا گزر نہ تھا، اور میں تھا کہ اس جذبہ سے سرشار تھا۔

ہم نے گفتگو شروع کی، یوں ہی رسمی سی، مختلف متعلق اور غیر متعلق باتیں آصف جاہی خاندان کے بانی کا تذکرہ میرے ناولوں کا ذکر جن کے بارے میں نظام نے یقیناً کچھ معلومات فراہم کرلئے تھے، ہندوستان میں انکم ٹیکس کا ناقابل برداشت بوجھ، جس کے بارے میں نظام کو اندیشہ تھا کہ کہیں وہ اس کے دوش ناتواں پر بھی نہ آپڑے، یہ سوال بھی ہوا کہ میں کتنا انکم ٹیکس ادا کرتا ہوں، اس ساری گفتگو کے دوران میں ہمارے دماغ کے اندر جو چیز گردش کر رہی تھی وہ بھارت اور حیدرآباد کے تعلقات کا مسئلہ تھا، جسے زیر گفتگو لانے سے کامل اعراض کیا جا رہا تھا۔ اپنے مخصوص انداز میں نظام نے میرے اوپر سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ ایک سوال کا دوسرے سوال سے کوئی ربط نہیں تھا، اور لطف یہ کہ سوالات کی یہ بوچھاڑ اس شدت سے تھی کہ مجھے جواب دینے کی مہلت بھی نہ ملتی۔ اکثر اوقات اپنی رانوں پر ہاتھ مار کر وہ اس طرح خوش ہوتے گویا بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں!

نظام کی دولت اور اس کے ذرائع

نظام ——— دنیا کا سب سے متمول آدمی، جسے ہندوستان میں اور دنیا کے دوسرے مقامات میں عام طور پر ایک افسانوی شخص سمجھا جاتا تھا، جس کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں، اس کے مخصوص انداز و اطوار، روپے سے اس کی بے پناہ

محبت، اس کے جاگیردارانہ عادات، جہاں بھی جایئے، دنیا کے جس گوشے میں بھی: یہی چرچا تھا۔ خود حیدرآباد میں بھی ان کہانیوں اور افسانوں کا کوئی قحط نہ تھا۔ لوگ نہ جانے کیا کیا بیان کرتے رہتے تھے۔ لیکن مجھے اپنے موضوع سے نہ ہٹنا چاہیئے۔

نظام کے بارے میں جو خبریں مشہور تھیں وہ یہ کہ انھیں دو چیزوں سے عشق ہے، دولت سے، اور اپنی ذات سے، اور ان دو میں بھی سب سے زیادہ دولت سے۔ ولیعہدی ہی کے زمانہ سے دولت جمع کرنے کی دھن سوار تھی۔ اسی چیز نے شروع ہی سے حد درجہ کفایت شعار اور جزرس بنا دیا تھا، بے انتہا دولت حاصل کر چکنے کے بعد بھی اور غیر معمولی آمدنی کے باوصف دولت کی قدر و قیمت نظام نے کبھی فراموش نہیں کی۔ نظام کو پچاس لاکھ روپے سالانہ شاہی خزانہ سے ملتے تھے۔ ریاست سے متعدد متفرق الاؤنس الگ۔ اس کے علاوہ صرف خاص کی جاگیر سے ڈھائی کروڑ سالانہ کی آمدنی جدا۔

ان مدات کے علاوہ جو نذریں گزرانی جاتی تھیں، ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کے انگریز ریذیڈنٹ نے سارا ریکارڈ جلا کر خاکستر کر دیا، لیکن کچھ بچے کھچے کاغذات میرے ہاتھ آ گئے۔ اس میں ایک فہرست ان نذروں کی بھی تھی جو ہر سال گرہ کے موقع پر نظام کو پیش کی جاتی تھیں۔ ہر نمایاں اور ممتاز شخص جو نظام کی خدمت میں باریاب ہوتا تھا، خواہ وہ بلایا گیا ہو یا خود آیا ہو پابند تھا کہ ایک اشرفی دیا اس کی قیمت ایک سو چوبیس روپے، کی نذر شرف باریابی حاصل کرنے کی خوشی میں پیش کرے سال گرہ کے موقع پر ہر شخص سے نذر لی جاتی تھی۔ خواہ وہ کوئی بہت بڑا جاگیردار ہو یا ایک معمولی سرکاری ملازم۔

ہر وہ چیز جو جلب زر کا ذریعہ ہو نظام کو نہایت مرغوب تھی، ہر وہ چیز جو صرف زر کا سبب ہو نظام کے لئے ہولناک حد تک تکلیف دہ تھی شاذ و نادر ہی ان کی قامت پر نیا لباس دیکھا گیا ہوگا، ۱۹۱۸ء کے ماڈل کی ایک پرانی کار پر جس کی کھڑکھڑاہٹ کا شور کان کے پردے پھاڑتا تھا، وہ نکلا کرتے تھے کسی ملاقاتی کی ضیافت ایک ایسا امر محال تھا جس کی ان سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

مشہور تھا کہ زر نقد، کرنسی نوٹ، سونا، چاندی اور جواہرات جن کی قیمت کا تخمینہ افسانوی انداز میں کیا جاتا تھا نذر باغ میں محفوظ تھے، جو کنگ کوٹھی کا ایک حصہ تھا، یہ سب چیزیں یہاں تہ خانوں میں، سیف میں، میز پر، زمین کے فرش پر بکھری ہوئی تھیں، نذر باغ کے فرش پہ کوئی ملازم اس وقت تک جھاڑو نہیں دے سکتا تھا جب تک نگرانی کے لئے اعلاحضرت خود دروازہ پر نہ کھڑے ہوں، قیمتی چیزیں جو زمین پر پڑی تھیں، ان پر سفید چادریں ڈھکی ہوئی تھیں، اور ان چادروں پر فاختاؤں اور دوسری چڑیوں کی بیٹ کی مسلسل بارش ہوتی رہتی تھی، مجھے بتایا گیا کہ چوہے یہاں کے ماحول کو بہت پسند کرتے تھے، نظام جب یہاں بیٹھ کر کافی سے شغل کرتے ہوئے اس خزانہ عامرہ پر نظر ڈالتے تو خزانہ کے یہ پرندے کافی کی طشتری میں سے اپنا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لے مرتے، یہ کہانی ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے لیکن دلچسپ اتنی ہے کہ اس کا ذکر کئے بغیر چارہ بھی نہ تھا۔

ایک کہانی میں نے یہ بھی سنی کہ چند سال پہلے نظام نے اپنا خزانہ چھکڑوں پر رکھوا کر اپنی نشست گاہ کی سامنے والی کھڑکی کے مقابل رکھوا لیا، اس طرح اپنے محبوب خزانہ کو محبت بھری آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ہر وقت مل جاتا تھا۔

نظام کی حرم سرا

نظام ایک وسیع حرم سرا رکھتے تھے۔ یہ بیان کرنا شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ سنہ ۱۹۴۳ء کے بعد نظام نے جو خاندانی وقف قائم کیا، اس میں ان کی محبوب بیوی لیلیٰ بیگم کے پانچ چھوٹے بچے بھی شامل تھے، نیز دو کم سن لڑکیاں۔

آٹھ لڑکے جو دوسری ماؤں کے بطن سے تھے۔

سینتیس پوتے۔

دوسری بیویوں کے بطن سے پندرہ لڑکیاں۔

ولی عہد بہادر اور ان کی والدہ محترمہ۔

ولی بہادر کی خواہر عزیزہ۔

حضور نظام کی بیوی، جو امام جنگ کی صاحبزادی ہیں۔

تین ذی مرتبہ خواتین جنہیں نظام کی رفیقہ صحبت ہونے کا شرف حاصل تھا۔

پینتالیس باندیاں باخواصیں۔

نظام کے قائم کئے ہوئے وقف سے ان سب کے گزارہ اور معاش ونفقہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

حرم سرا میں سب سے بڑا مرتبہ خاندانی بیگم کا تھا۔ جو شہزادوں اور شہزادیوں کی والدہ تھیں۔ یہ نظام کی بڑی سختی سے نگرانی کیا کرتی تھیں۔ بڑے طنطنہ کی بیگم تھیں۔ اور اپنی دنیا میں مگن تھیں۔

ایک ہندو خاتون بھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا، اس حرم سرا کی مکین تھی، لیکن ایک الگ اور جداگانہ مکان میں۔

علاوہ ازیں اور بھی بے شمار عورتیں تھیں جو اپنے کا بک کے سے گھروں میں الگ الگ رہتی تھیں۔ عورتوں کی اس "جنت" کے بارے میں بڑی دلچسپ کہانیاں زبان زد خاص و عام تھیں لیکن میری اس خود گزشت سے چونکہ وہ متعلق نہیں لہٰذا ان کا ذکر چھوڑتا ہوں۔

کنجوس باپ کے شاہ خرچ بیٹے

کنگ کوٹھی میں نظام کے ساتھ ان کے اور بھی بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں کا قیام تھا۔ لیکن نظام کو سب سے زیادہ دولت کی فکر تھی۔ اور اس سلسلہ میں وہ ہمیشہ ہوشیار اور چوکنے رہتے تھے۔ کنگ کوٹھی کے مکینوں میں کسی کی ہمت نہ تھی کہ درد سر کی شکایت بھی کر سکتا۔ کیونکہ ایسی شکایت اگر نظام کے کانوں تک پہنچ جاتی تو فوراً اس کا راشن کم کر دیا جاتا کہ کم کھانے کے باعث جلد تندرست ہو جائے۔ بعض دشمنوں کا تو یہ کہنا بھی ہے کہ تندرست ہونے کے بعد بھی کم کیا ہوا راشن بڑی مشکل سے بحال کیا جاتا تھا۔

پرنس آف برار اور شہزادہ معظم جاہ ایک عرصہ تک اپنے والد کے ساتھ کنگ کوٹھی میں رہتے رہے لیکن زیادہ مدت تک نباہ نہ سکے۔ جلد ہی ان کی سرکشی نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ آخر لارڈ ولنگڈن نے جو گورنر جنرل تھے مداخلت کر کے

اس قضیۂ نامرضیہ کو کسی طرح ختم کرا دیا۔ اس کے بعد شہزادگان والاشان کی اقامت گاہ بدل گئی اور وہ الگ الگ رہنے لگے۔ ان گراں بار رقومات کے علاوہ جو سرکاری خزانہ سے انھیں ملتی تھیں یہ مہاجنوں سے بے دھڑک بڑی بڑی رقمیں قرض لینے لگے اور مہاجن اس امید میں بڑی سے بڑی رقم دید یتے کہ آخر ایک روز عنانِ حکومت انہی کے ہاتھ میں آئے گی۔ پھر پو بارہ ہیں۔ ایک کے دس وصول کرلیں گے۔ ستارہ کبھی تو عروج پر آئے گا۔

۱۹۱۱ء میں جب نظام کو اختیارات حکومت تفویض ہوئے، اسی وقت یہ بات نمایاں ہو گئی تھی کہ اس شخص کو اقتدار کی کتنی ہوس ہے۔ جب ریذیڈنسی بک کی یہ رپورٹ زیر بحث آئی کہ ریذیڈنٹ نے اعلاحضرت کو عنانِ حکومت سونپی ہے تو نظام نے یہ بات نہیں مانی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس مسند پر از روئے استحقاق متمکن ہوئے ہیں لیکن ظاہر ہے یہ بات مانی نہ گئی۔

ریذیڈنسی سے کش مکش جب ریذیڈنٹ نے سر سالار جنگ کو ریاست کا پہلا وزیر اعظم نامزد کیا۔ تو نظام کی سرگرمیاں فوراً رو بہ عمل آنا شروع ہو گئیں ــــــ اور سازشیں اس امر کی شروع ہوئیں کہ نظام گورنمنٹ کے معاملات میں ریذیڈنٹ کا اثر ختم کر دیا جائے۔

شخصی اقتدار کے حصول کا کوئی موقعہ نظام نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور جب کبھی بھی ممکن ہوا انھوں نے ریذیڈنٹ کے مشورہ کو نظر انداز کرتے میں تامل نہیں کیا۔ وائسرائے کی منظوری حاصل کئے بغیر اکثر انھوں نے اپنے وزراء کا تقرر کر لیا اور ہمیشہ اس کی سعی کی کہ معمولی سے معمولی انتظامی معاملہ بھی ان کی ہدایت اور فرمان کے بغیر طے نہ پائے۔

۱۹۲۶ء میں نظام نے دعویٰ کیا کہ انھیں داخلی خود مختاری حاصل ہے۔ اس دعویٰ نے لارڈ ریڈنگ کو مشتعل کر دیا جو اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ ۲۷ؔ مارچ کو انھوں نے وہ مشہور مکتوب نظام کے نام لکھا جس میں صاف اور غیر مشتبہ طور

پھر اس بات کا اعلان تھا کہ "بالادست قوت (برطانیہ) ہر معاملہ میں بالادست ہے! یہ بالادستی ازروئے معاہدات حاصل نہیں۔ بلکہ ازروئے فرمان روائی حاصل ہے، یہ اس کا حق ہے اور فرض ہے کہ سارے ہندوستان میں نظم و امن برقرار رکھے۔ اور یہ کہ نظام کو "یارِ وفادار" (Faithful Ally) کا جو خطاب حاصل ہے، وہ انھیں دوسرے والیانِ ریاست کے زمرہ سے الگ کر کے کوئی جداگانہ امتیاز نہیں عطا کرتا!"[ط]

اپوزیشن لیڈر خود نظام

ریاستی معاملات میں نظام کی تکنیک بلاشبہ نہایت مہارت اور چابک دستی کی حامل تھی، انھوں نے نہایت استقامت کے ساتھ اپنی حکومت کو ایک "اپوزیشن پارٹی" سے دوچار رکھا، جو خود انہی کی بنائی ہوئی تھی، انہی کی مالی امداد پر زندہ تھی اور انہی کی ہدایات پر عمل پیرا رہتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وزراء کے مشورہ کو نظر انداز کر کے ہمیشہ من مانے فیصلے وہ کر گزرتے۔ جب یہ وزراء نظام کو یاد دلاتے کہ اصولاً ہر فیصلے سے پہلے انکا مشورہ حاصل کرنا ضروری ہے تو نظام انپر برس پڑتے" بادشاہ تو میں ہوں۔

اگر یہ وزراء نظام کے کسی فیصلے سے اختلاف کرتے تو وہ انھیں برخاست کر دیتے۔

وزراء اس حقیقت کے رمز شناس تھے کہ نظام وہی کریں گے جو ان کے منہ سے نکل جائے گا، چنانچہ نہایت سعادت مندی کے ساتھ ہر معاملہ میں وہ سرِ تسلیم خم کر دیتے۔

سازشوں کی سرزمین

سر ویلیم بارٹن جو حیدرآباد کے سب سے زیادہ قوی ریذیڈنٹ گزرے ہیں اپنے ایک میمورنڈم میں ۱۴ر فروری ۱۹۲۶ء کو اس طرح کی باتیں لکھی ہیں۔

سازشوں کی اس سرزمین میں نظام کی فنکاری لاجواب تھی۔

نظام میں حُبِ جاہ و اقتدار بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ حیدرآباد کو ایک اسلامی مملکت میں تبدیل کر دیں، قبل اس کے کہ مسٹر جناح اپنے تصور پاکستان کو فروغ دیں۔ نظام کی یہ ہوس کامیابی کی منزل سے قریب تر ہو چکی تھی۔ کیونکہ

ط White Paper on Hyderabad, p. 19

انھوں نے اپنے ملک کی ۹۰ فیصدی ہندو آبادی کو بے طرح دہشت زدہ کر کے یکسر بے کس اور نکما بنا دیا تھا۔

اس زمانہ میں نظام نے ایک اور خواب دیکھا، یعنی اب وہ سارے عالم اسلام کا پیشوا بننے کا خواب دیکھنے لگے۔ برطانیہ کی عالمی پالیسی سے نظام کا یہ خواب ہم آہنگ تھا، یار وفادار کی حیثیت سے نظام کا ایسا وجود برطانیہ کے مسلم نواز ہونے کا بہترین پروپگنڈا بن سکتا تھا۔

جب دولت عثمانیہ ختم ہوئی تو نظام کو شہنشاہی کے باقیات الصالحات کی حیثیت سے سابق سلطان ٹرکی کے خاندان کی شہزادیوں سے اپنے شہزادوں کی شادی کرنے پر آمادہ کر لیا گیا۔ اس خاندانی اتحاد کا مقصد یہ تھا کہ دو گزری ہوئی مملکتوں کے انبار خاکستر سے اقتدار کا ایک نیا وجود پیدا کیا جائے۔

نظام کی اس تخیل پرستی کی برطانوی حکومت نے اپنے مقاصد و مصالح کے ماتحت حوصلہ افزائی شروع کر دی۔

حیدرآباد: عہد قدیم کا نشان

حقیقت یہ ہے کہ نظام، حیدرآباد کے عہدِ قدیم کا نشان بنا ہوا تھا، جسے دولتِ فراواں، جو ہر طرح کے ٹیکس سے آزاد تھی، حاصل تھی۔ نظام حد درجہ اور طبقہ کے درباری اور تملق پرست لوگوں میں گھرا ہوا تھا، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے خلاف سازش میں مصروف تھا۔ اس کے پاس بہت بڑا ذاتی عملہ بھی تھا، پھر جاسوسوں کی ایک پوری کھیپ مستزاد، جو زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل تھے۔ مسلم حکام اپنی ترقی اور عروج کے لئے اس کی نگاہِ لطف کے متمنی رہتے تھے۔ یا تو یہ بے پناہ وفاداری کے جذبہ سے سرشار تھے، یا پھر غلامانہ طور پر اس کی خوشامد کو حاصلِ حیات سمجھتے تھے۔ ہندو حکام اگرچہ بہت تھوڑے تھے، لیکن دکھ بھری زندگی بسر کر رہے تھے، کیونکہ ان کا وجود خواہ مخواہ کا دردِ سر سمجھا جاتا تھا، چونکہ دشمن سمجھے جاتے تھے، لہٰذا ان کی جاسوسی بھی ہوتی رہتی تھی۔ حکومت برطانیہ کے نامزد کئے ہوئے وزراء یا حکام کی نقل و حرکت کی بھی

پوری نگرانی کی جاتی تھی، انھیں بھی جھانسے میں رکھا جاتا تھا اور آزادانہ طور پر کام کرنے کی اجازت نہ تھی، ان میں سے اگر کوئی ریذیڈنٹ کی تائید یا سرپرستی سے محروم ہوجاتا تو فوراً چلتا کردیا جاتا۔

ہر شخص نظام کے ساتھ کام کرتے ہوئے دشواری محسوس کرتا تھا، کیا وہ سر تھیوڈارٹاسکر ریونیو منسٹر حکومت نظام ہی نہیں تھے جنھوں نے ایک مرتبہ کہا تھا:

"نظام کی ایگزیکیٹو کونسل کی حیثیت ایک نرس کی ہے جس کا کام ایک بیمار بچہ کی دیکھ بھال ہے جو خودکشی کے نمایاں رجحانات رکھتا ہے!"

سر مہدی یار جنگ نے جو حیدرآباد کے ذی رتبہ بزرگ اور قدیم تہذیب کا نمونہ تھے جن سے ان کی آخری علالت کے زمانہ میں کئی بار مجھے ملنے کا شرف حاصل ہوا، ایک مرتبہ کہا:

"انگلینڈ میں حکمراں سربراہ مملکت ہوتا ہے، اور امور مملکت اکثریت والی پارٹی انجام دیتی ہے، لیکن حیدرآباد میں حکمران وقت کی حیثیت ایگزیکیٹو کونسل کے لئے اپوزیشن لیڈر کی ہے۔"

ریاست کے معاملات میں تن تنہا ہر اختیار کا سرچشمہ ہونے کا دعویٰ نظام کی تنگ طبع اور روایات سے قطع نظر متعدد عوامل کا حامل ہے۔

لوٹ کھسوٹ کا ملک

ریاست حیدرآباد کا کل رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل ہے اس میں سے ۸۱۰۹ مربع میل کا علاقہ صرف خاص یعنی نظام کی ذاتی جاگیر ہے، جس کی سالانہ آمدنی ......۲۵ ہے۔

اس کے علاوہ جاگیر کا رقبہ ۲۵۶۲۹ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، ان زمینوں کے مالک مرائے پائے گاہ، جاگیردار اور سمستھان ان جاگیروں پر مالکانہ اور خودمختارانہ اختیارات رکھتے تھے۔ شرط صرف یہ تھی کہ نظام کو خوش رکھیں کیونکہ نظام کو غیر مسئول طور پر یہ اختیارات حاصل تھے کہ وہ جسے چاہیں کسی جاگیردار کا جانشین تسلیم کریں یا نہ کریں، اور جاگیرداروں سے نذر کی صورت میں جو محصول چاہیں

وصول کریں، یا کوئی حاکم جاگیر کی دیکھ بھال کے لئے اپنی طرف سے مقرر کر دیں۔
پرانا جاگیردارانہ دستور، بے محابا لوٹ کھسوٹ، کاشتکاروں کی غلامانہ زندگی، بیگار اور دوسری بے شمار انسانیت کش حرکتوں پر عمل درآمد جاری تھا، اور ان چیزوں نے اس ریاست کے وسیع رقبہ کو اقتصادی اعتبار سے تباہ کر دیا تھا۔

امرائے پائے گاہ کی مثال بجا طور پر عہدِ وسطیٰ کے یورپین نوابوں کی سی تھی، اپنے علاقوں پر انھیں مالکانہ تصرف حاصل تھا، اور ۱۹۲۹ء تک یہ اس حق کو بے غل و غش استعمال کرتے رہے۔ انھیں اپنی پولیس رکھنے کا اختیار بھی تھا، جو ضبط و نظم سے محروم تھی، لیکن غیر مسلح دیہاتیوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھی۔

ریاست کے باشندے تاریکی میں زندگی بسر کر رہے تھے، ہر طرح کی روشنی سے محروم، خواندگی کا تناسب صفر کے برابر تھا، بڑی سے بڑی درس گاہ مڈل سکول تک محدود تھی، اسکول ماسٹروں کو عام طور پر صرف تین روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

پائے گاہوں کا انتظامی سربراہ ریوینیو کلکٹر یا حیدرآباد کی اصطلاح میں تعلقدار ہوتا تھا، یہ مال گزاری وصول کرتا تھا، یہی مجسٹریٹ کی حیثیت سے مقدمے سنتا اور ان کے فیصلے کرتا تھا، دیوانی کے سارے مقدمات اسی کے سامنے پیش ہوتے تھے، تعلیم، رفاہ عامہ، مقامی درو بست اور آبپاشی کا یہی انچارج تھا، اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ روپیہ جمع کرے۔ برطانوی ہند کے پرانے جاگیرداروں کی طرح یہ نت نئے ٹیکس بھی عائد کرتا رہتا تھا، حتیٰ کہ عام طور پر ببول کے درختوں پر بھی ٹیکس لگا دیتا اگرچہ وہ کسی دوسرے کی زمین پر کیوں نہ ہوں، خرید و فروخت کی عام چیزوں پر حتیٰ کہ گھاس اور ایندھن تک پر یہ محصول عائد کر دیتا تھا۔

نظام کا ناقابلِ شکست سہارا

نظام کے اقتدار کا ایک ناقابلِ شکست سہارا، مسلمانانِ ہند کا رہنما ہونا تھا، اور یہ بھی کہ مناصب اعزاز اور جاہ و رتبہ کی تقسیم اسی کے ہاتھ میں تھی، دولت مند اور ذی رتبہ مسلمانوں کی زندگی اسی کے سہارے قائم تھی۔ اسی کی نگاہِ لطف اِن کا مرتبہ قائم رکھ سکتی تھی، حکام کی

مہربانیاں عطا کرسکتی تھی اور ان کے بیٹوں کا مستقبل بنا سکتی تھی۔ ریاست کے حکام میں ۷۵ فیصد عہدے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے۔ یہ لوگ روایتی طور پر آلودہ دامان تھے، ریاست کے باشندوں سے انھیں کوئی ہمدردی نہ تھی، اور انتہائی طور پر جارحانہ اور ناقابل برداشت فرقہ پرستی میں مبتلا تھے۔ پولیس اور فوج میں ۹۰ فیصد مسلمان تھے صنعت و حرفت چند لوگوں کے ہاتھ میں تھی اور یہ برابر حکام پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ مزدوروں کو مجبور کرکے کام کرتے رہنے پر آمادہ کریں۔

مسلمان عام طور پر شہروں میں بود و باش رکھتے تھے کیونکہ یہیں ملازمت کی سہولتیں اور رعایتیں حاصل تھیں، چونکہ یہ حکمران کے ہم مذہب تھے لہٰذا انھیں ہر طرح کی سرکاری مراعات حاصل تھیں، جہاں تک پبلک لائف کا تعلق تھا ہر سرگرمی میں یہ آزاد تھے، جو چاہیں کریں بشرطیکہ حکمران کی بالادستی اور مطلق العنانی کو کسی طرح کا گزند پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو۔

حیدرآباد کے بدقسمت ہندو دیہاتی رقبہ ۹۵ فیصد آبادی پر مشتمل تھا اور یہ تقریباً سب کے سب ہندو تھے، دو صدیوں کی مسلسل غلامی نے ہندو رعایا میں سگانہ ذہنیت پیدا کر دی تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو بھی اسی ذہنیت کا حامل تھا۔ کسی ہندو میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ نظام کی طرف انگلی بھی اٹھا سکے، یہ لوگ سرکار کی عنایت حاصل کرنے کے لئے گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہتے تھے، یہ نہایت ڈھٹائی سے کہا کرتے تھے کہ اعلیٰحضرت بڑے دانشمند آقا ہیں، ہندو اور مسلمان ان کی دو آنکھیں ہیں، جن سے بالکل مساویانہ سلوک روا رکھتے ہیں، لیکن پرائیویٹ جلسوں میں ان کی تلخ گفتاری، اعلیٰحضرت کی شان میں سننے کے قابل ہوتی تھی۔

سروجنی نائیڈو کا قصیدہ مدحیہ اسی صدی کے آغاز میں شریمتی سروجنی نائیڈو نے جو حیدرآباد کی مسلم تہذیب سے بے انتہا متاثر تھیں، نظام کی شان میں ایک قصیدہ کہا تھا۔

● جس کے زیر سایہ ہم آہنگی کے ساتھ سب رہتے ہیں۔

- وہ تمام لوگ جنھیں تیرے قانون نے اپنے دامن میں جگہ دی۔
- رنگا رنگ کی قومیں اور نسلیں۔
- گوناگوں ذاتیں اور مذہب تیرے زیر سایہ ہم آہنگی سے بسر کر رہے ہیں

●●

- تیرا عہد اتنا تاباں اور درخشاں ہے۔
- جو فردوسی کے نغموں سے آب و تاب میں کہیں بڑھ گیا ہے۔
- تیرا نام قوم اپنی دعاؤں میں لیتی ہے۔
- تیرا ترانہ قوم کی زبان پر ہے۔

کبھی میں نے کوئی مداحانہ نغمہ شاید ہی اتنا پرجوش سنا یا پڑھا ہو، لیکن اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ نام نہاد فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا جو حلقہ نظام نے اپنے گرد بنا لیا تھا وہ اتنا جاذب نظر بن گیا تھا کہ ایک نوخیز شاعر کے دل پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکا۔

یہ تھے وہ اعلاحضرت جن کی دولت سرا میں ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے قسمت مجھے کھینچ لائی تھی۔

حیدر آباد کو مملکتِ اسلامیہ بنانے کی کوشش

حیدر آباد میں میرا سب سے پہلا فریضہ یہ تھا کہ اصل حقائق کا مطالعہ کروں۔

ہماری کشمکش اقتدار کا میدان جنگ حیدر آباد ہی تو تھا۔ یہاں کئی برسرِ قوت اور با اقتدار وجود جوش اور سرگرمی کے ساتھ مصروفِ کار تھے، ہز اگزالٹڈ ہائی نس نظام مجلس اتحاد المسلمین اسٹیٹ کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا۔

مجلس اتحاد المسلمین کی داغ بیل

۱۹۱۹ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے مطابق برطانوی ہند میں صوبائی حکومتوں کے کئی محکمے کسی حد تک منتخب مجالس قانون ساز کی طرف منتقل ہو گئے تھے، یہی موقع تھا جب ریاستی باشندوں میں —— جن میں حیدر آباد کی ریاست بھی شامل تھی —— سیاسی حقوق کے حصول کے لئے بیداری اور سرگرمی کی لہر پیدا ہو گئی۔

نئی صورتِ حال سے عہدہ برا ہونے کے لئے سر علی امام نے جو حیدر آباد کے روشن دماغ وزیر اعظم تھے، نظام کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ اپنی مطلق العنانی میں کچھ کمی کر دیں اور ایک ایگزیکیٹو کونسل قائم کر دیں، لیکن کونسل قائم ہوتے ہی نظام نے اپنی بے بسی محسوس

کرلی، اور ۱۹۲۰ء میں ریاست کے اندر جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی اسے کچل کر رکھ دیا۔

چھ سال پہلے محمود نواز خاں، ایک پنشن یافتہ افسر نے مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد ڈالی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو متحد کیا جائے، نظام کی حمایت کی جائے اور ہندوؤں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو مشرف بہ اسلام کر کے ہندو اکثریت کو اقلیت بنا دیا جائے۔ نظام ان سرگرمیوں کے سرپرست تھے۔

اس اثنا میں ایک محفل میلاد کے موقع پر نظام کو، بہادر خاں کی صورت میں ایک کارآمد آدمی نظر آیا، یہ ایک قابل شخص تھا، نظام نے اسے بہادر خاں سے بہادر یار جنگ بنا دیا اور مجلس اتحاد المسلمین کی سربراہی اسے سونپ دی۔

۱۹۲۶ء میں جب لارڈ ریڈنگ نے نظام کو ڈانٹ بتائی تو برطانوی تاج حیدرآباد کی بدانتظامیوں کی اصلاح کے لئے آگے بڑھا، چار انگریز اہم عہدوں پر برطانوی حکومت کی طرف سے نامزد کئے گئے۔ اس طرح مالیات، پولیس اور صنعت کے محکمے انگریزوں کی تحویل میں آ گئے، ان میں سے ایک انگریز ایگزیکٹو کونسل کا ممبر نامزد کر دیا گیا، نظام کو ہدایت کی گئی کہ کونسل کے متفقہ فیصلوں پر مہر تصدیق ثبت کر دیا کریں۔

ملکی اور غیر ملکی

حیدرآباد کے مسلمان جاگیردار اور مفاد پرست لوگ اس بات پر چیخ اٹھے یہیں سے حیدرآباد میں "ملکی تحریک" شروع ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام غیر حیدرآبادی لوگوں سے کلیدی مناصب اور اقتدار و اختیار کی باگ چھین لی جائے، اس تحریک کا نعرہ تھا۔

"نظام زندہ باد!"

اب نظام کا نام اس طرح لیا جانے لگا اور یہ دعویٰ کیا جانے لگا کہ وہ دکن کی گزری ہوئی شہنشاہیت کا نمائندہ اور علمبردار ہے۔

حیدرآباد میں جو غیر ملکی برسر اقتدار تھے، وہ زیادہ تر مسلمان تھے، اور شمالی ہند کے رہنے والے تھے، وہ چاہتے تھے جوش و خروش کا یہ رخ بدل دیا جائے جو اس تحریک نے

پیدا کر دیا تھا، لہذا انھوں نے ایک اور نعرہ ایجاد کیا، یہ کہ حیدرآباد ایک خودمختار اسلامی مملکت ہے۔ یہ تحریک جتنی "بر د مسلم" تھی اتنی ہی "اینٹی ہندو" اور "اینٹی برٹش"۔ بہادر یار جنگ اس نئی تحریک کے روح رواں تھے، اور مختصر سی مدت میں مسلمانوں کے مسلّم زعیم بن گئے۔

اس نعرہ کے پہلو بہ پہلو کہ نظام دکنی شہنشاہیت کا مظہر ہیں، یہ دوسرا نعرہ کہ وہ مسلم خودمختاری کا شاہی نشان ہیں، بہت راس آیا، اور نظام نے دونوں نعروں کی سرپرستی قبول کر لی، کیونکہ ان کا دونوں میں بھلا تھا۔

بہادر یار جنگ

بہادر یار جنگ کی قیادت میں مجلس اتحاد المسلمین نے ایک نہایت طاقتور تنظیم کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا مقصد وحید یہ تھا کہ ہندوؤں اور ترقی پسند مسلمانوں کے سیاسی جذبہ کو دبایا جائے، ملکی احساس کی شدت کو جو عوام میں پیدا ہو گیا تھا۔ اینٹی ہندو فرقہ پرستی میں تبدیل کر دیا گیا، چنانچہ بہادر یار جنگ نے حیدرآباد کے اضلاع میں ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کرنے کی جد و جہد کا آغاز تیزی سے کر دیا۔ ظاہر ہے اس سے ہندو مشتعل ہوئے، اور ثابت قدمی کے ساتھ مخالفت پر اتر آئے، لیکن اس تحریک کا بانی عامۂ مسلمین کی نظر میں مجاہد اعظم بن گیا۔

پارلیمانی جمہوریت کا فروغ ہندوستان میں بڑھتا جا رہا تھا، اور ریاست کے سیاسی اور عوامی رجحانات کو زیادہ دیر تک پامال کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا، ۱۹۲۲ء میں ایک نیا حکم یہ نافذ ہوا کہ عام اجتماعات پر پابندی لگا دی گئی۔ یہ پابندی عملاً صرف ہندوؤں پر تھی مجلس اتحاد کی حیثیت "کنگ پارٹی" یعنی شاہی جماعت کی تھی، وہ ہر طرح کی سرگرمیوں میں پورے طور پر آزاد تھی۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی بحران کا دور تھا۔ گاندھی جی کی تحریک ستیہ گرہ نے سارے ملک میں ہلچل ڈال دی تھی، اسی زمانہ میں "راؤنڈ ٹیبل کانفرنس" لندن میں معاملات ہند سلجھانے کے لئے منعقد ہوئی، اور برٹش پارلیمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور کر لیا۔

انجمن رعایائے نظام

حیدرآباد میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے لئے چند سربرآوردہ

غیر فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والے لوگوں نے "انجمن رعایائے نظام" قائم کی۔ نظام کی حکومت فوراً میدان میں اتر آئی۔ ریاست میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف اعلاحضرت کا حق ہے کہ وہ اپنی رعایا پر جس طرح چاہیں حکومت کریں، نتیجہ یہ ہوا کہ انجمن بے موت مر گئی۔

حیدرآباد لسانی اعتبار سے تین ٹکڑوں میں منقسم ہے۔ ایک وہ علاقہ جو تلنگو بولنے والے اضلاع پر مشتمل ہے، دوسرا وہ علاقہ جس میں مرہٹی بولنے والے اضلاع شامل ہیں، اور تیسرا وہ علاقہ جہاں کے اضلاع میں کنری زبان بولی جاتی ہے۔ ان میں سے ہر علاقہ کے ورکر ہندو مہاسبھا کے ساتھ شامل تھے۔

مجلسِ اصلاحاتِ سیاسی

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رُو سے جب برطانوی ہند کے صوبوں کو داخلی آزادی ملی تو یہی مطالبہ ریاست کے باشندوں نے بھی شروع کر دیا۔ ۱۹۳۷ء میں نظام نے ایک "مجلس اصلاحات سیاسی (Reform Committee) قائم کر دی، تاکہ" ریاست کے مختلف طبقوں میں زیادہ تعاون کے ساتھ حکومت کی تائید کا جذبہ پیدا ہو۔ ترقی پسند ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس سلسلہ میں ایک کنونشن طلب کی، لیکن فوراً ہی بلی تھیلے سے باہر آگئی۔ سوال یہ پیدا کیا گیا کہ کیا ہندو پچاس فیصد نشستیں تیرہ فیصد مسلم اقلیت کو دینے پر تیار ہیں؟ چونکہ اس سوال کا جواب اثبات میں ممکن نہ تھا، لہٰذا مسلم ممبر کنونشن سے الگ ہو گئے۔ یہ نصفا نصف تناسب کا فارمولا جب تک نظام کی حکومت ختم نہیں ہو گئی۔ حیدرآباد کے مجوزہ دستور کا بنیادی مسئلہ بنا رہا۔

۱۹۳۷ء میں سر اکبر حیدری اگزیکٹو کونسل کے صدر بنا دیئے گئے، جنھیں خوش فہمی کی بنا پر "وزیر اعظم" بھی کہا جاتا تھا۔

سر اکبر نے اپنے آپ کو عجیب پوزیشن میں گھرا ہوا پایا۔ مقامی مسلمان ان سے یوں بدظن تھے کہ وہ حیدرآباد کے آل انڈیا فیڈریشن میں شامل ہونے کے حق میں تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی رو سے قائم ہونے والی تھی اور برطانوی حکومت ان سے

یوں نالاں تھی کہ وہ فیڈریشن کو ناکارہ بنانے کے لئے ریاست کے مخصوص حقوق پر زور دے رہے تھے۔

جارحانہ مسلم جذبات کو قابو میں لانے کے لئے سر اکبر حیدری نے خواجہ معین الدین انصاری کو ـــــ جو بعد میں نواب معین نواز جنگ کے نام سے مشہور ہوئے ـــــ یعنی ایگزیکیوٹو کونسل کا سکریٹری بنالیا۔ معین نواز جنگ مجلس اتحاد کے سربراہوں کی ناک کے بال تھے مجلس کا ترجمان "رہبر دکن" بھی انہی کے کنٹرول میں تھا، بہت جلد معین نواز جنگ مجلس کا دماغ بن گئے۔

حیدرآباد میں کانگریس کا قیام

۱۹۳۸ء میں دو کانگریسی لیڈروں سری راما چار اور سری بی رام کرشنا راؤ ـــــ موجودہ گورنر کیرالا ـــــ نے ریاستی کانگریس کا آغاز کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ نظام کی بالادستی میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔

نظام کا ردعمل حسب معمول تھا!

۸ ستمبر کو ڈیفنس آف حیدرآباد کا ضابطہ منظور ہوا، چار دن کے بعد اسٹیٹ کانگریس غیر قانونی جماعت قرار دے دی گئی، اس بنیاد پر کہ یہ ایک "فرقہ وارانہ" جماعت ہے، لیکن ہندو مہا سبھا اور مجلس اتحاد المسلمین جو علانیہ فرقہ وارانہ جماعتیں تھیں، ہر پابندی سے آزاد تھیں، انھیں اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت تھی۔

کوئی شبہ نہیں کہ سر اکبر حیدری ظرائف کا اچھا ذوق رکھتے تھے، ٹھیک اس وقت جب حیدرآباد گزٹ ـــــ جس میں کانگریس کے غیر قانونی جماعت ہونے کا اعلان تھا ـــــ چھپ رہا تھا، انھوں نے چند قومی کارکنوں کو طلب کیا اور ان سے کہا۔

"کوئی ایسی ترکیب بتایئے کہ حیدرآباد میں نیشنلزم کے جذبات پھیلائے جاسکیں"۔

حکام نے نجی طور پر بھی لوگوں کو ڈرانا اور دھمکانا شروع کردیا، ہندوؤں کو اس کی اجازت نہ تھی کہ مسلم علاقہ میں کوئی مندر بنا سکیں یا اس کی مرمت کر سکیں۔ مندروں کی اکثر بے حرمتی کی جاتی لیکن مجرموں کا سراغ کون لگاتا؟ شاید ہی کبھی کوئی

مجرم دستیاب ہوا ہو۔ اور اگر ہوا بھی تو اسے کوئی سزا نہیں ملی، ہندوؤں کے مذہبی نیتاؤں کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن مسلم علماء مجلس اتحاد کے ممبر، دیندار پارٹی کے لوگ کھلے بندوں ہندوؤں میں تبلیغ اسلام کرتے پھر رہے تھے۔

ہندوؤں کی گورنر جنرل سے فریاد ہندوؤں نے مذہبی آزادی کے حصول کے لئے گورنر جنرل کو ایک درخواست بھی گزرانی جس پر ایم ایس اینے، سر پی سی رائے، سر چنتا منی اور پی ایس آئر کے دستخط تھے۔[1]

اسی اثنا میں آریہ سماج نے جو ہندوستان میں ہندوؤں کی واحد مذہبی جماعت تھی، حیدرآباد میں مذہبی آزادی کے حصول کے لئے ستیہ گرہ کا آغاز کیا، اس تحریک میں "ہندو سول لبرٹیز یونین" بھی شریک ہوگئی۔

یہ وہ پہلا موقعہ تھا کہ جب بمبئی کی پہلی کانگرس وزارت میں وزیر داخلہ کی حیثیت سے پہلے پہل میں نے حیدرآباد کے معاملات پر غور کیا۔

اس زمانہ میں ہندوستان کے ہر گوشہ سے آریہ سماجیوں کے ستیہ گرہی جتھے حیدرآباد کا رخ کر رہے تھے، حیدرآباد جاتے ہوئے یہ لوگ بمبئی سے گزرتے اور ایک آدھ دن شولاپور میں قیام کرکے اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ جب سر اکبر حیدری نے محسوس کیا کہ اس تحریک پر قابو پانا آسان نہیں ہے تو انھوں نے مجھ سے چاہا کہ میں ان جتھوں کو صوبہ بمبئی سے گزرنے کی اجازت نہ دوں۔ سر اکبر کی یہ سادگی و پرکاری (Blandishments) بڑی جاں ستاں تھی۔

"مجھے کیا حق ہے کہ پابندِ قانون لوگوں کو اپنے صوبے سے گزرنے سے روکوں" میں نے سوال کیا" ان لوگوں نے میرے صوبہ میں نہ کبھی قانون شکنی کی، نہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور اگر انھوں نے کبھی میرے صوبہ میں کوئی قانون توڑا تو بیشک میں اقدام کرنے میں تامل نہیں کروں گا۔ ورنہ نہیں۔

---

[1] یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس درخواست پر کسی حیدرآبادی کے دستخط نہ تھے۔ یہ سب دستخط کنندگان برطانوی ہند کے مہاسبھائی لیڈر تھے۔ (رئیس احمد جعفری)

سر اکبر حیدری سے میری گفتگو

سر اکبر حیدری نے حق ہمسائگی کا واسطہ دیا۔ میں نے سوال کیا "وہ بتائیے کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ حیدرآباد میں ہندو ہر مذہبی حق سے محروم ہیں، اور مسلمان مذہبی معاملات میں جارحانہ اقدامات کرنے میں بھی آزاد ہیں؟" سر اکبر نے جواب دیا "حیدرآباد کے خلاف جو الزامات عائد کئے جارہے ہیں وہ صرف مخالفانہ پروپگنڈا ہے، ورنہ حقیقت بالکل برعکس ہے"۔ میں نے پوچھا "کیا آپ میرے چند قانون دان دوستوں کو حیدرآباد آنے کی اجازت دیں گے کہ وہ بچشم خود حالات دیکھ کر رائے قائم کرسکیں اور موقع واردات پر حقیقت کو تلاش کرسکیں؟" اس کا جواب سر اکبر نے یہ دیا کہ پھر مجھ سے ملنے نہیں آئے۔

سر اکبر حیدری کی اس یقین دہانی پر کہ ہندوؤں کے مذہبی حقوق میں کوئی مزاحمت نہیں کی جائے گی، آریہ سماج نے ستیہ گرہ کی تحریک واپس لے لی، جس میں آٹھ ہزار ہندو جیل جانے پر مجبور ہوئے تھے ——— لیکن اس وعدہ پر عمل نہیں کیا گیا۔

اپنی وزارت مالیات کے طویل عہد میں سر اکبر حیدری نے ہندوؤں کو چھانٹ چھانٹ کر محکمہ رفاہ عامہ اور اکاونٹ ڈیپارٹمنٹ سے نکالا، جہاں کافی تعداد میں ہندو ملازم تھے۔ علاوہ ازیں دوسری کلیدی آسامیوں سے بھی ہندوؤں کو الگ کیا۔ برطانوی حکام پر سر اکبر حیدری کو جو غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل تھا اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے نظام کو بین الاقوامی وقار کا حامل بنا دیا، گویا ایک طرح کا نیا خلیفۃ المسلمین!

سر اکبر حیدری نے صنعتوں کو قومیانے کا پروگرام بنالیا اور اس طرح اکیاون (۵۱) فی صد نفع مختلف صنعتی کارخانوں کا محصول کی صورت میں لے لیا۔ یہ سارے کارخانے ہندوؤں کے تھے۔ بہ حیثیت ایک وکیل میں نام نہاد ثالثی کے اس قضیہ سے واقف ہوں جس میں ایک ہندو کا بہت بڑا کاروبار حکومت نے سنبھال لیا۔

لائق علی اُبھرتے ہیں

میر لائق علی جو اسسٹنٹ انجینیر تھے کسی طرح سر اکبر حیدری کی نظر پر چڑھ گئے، اس وقت کے وزیر مالیات مسٹر غلام محمد

______ جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے ______ نے بھی لائق علی کو بہت پسند کیا،
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میر لائق علی نے "حیدرآباد کنسٹرکشن کمپنی" کے نام سے ایک کمپنی قائم کی،
اور خود اس کے چیرمین بن گئے حکومت کے اکثر تعمیراتی کام اسی کمپنی سے لئے جاتے تھے،
پھر مزید یہ کہ جن متعدد صنعتی کارگاہوں کی مینجنگ ایجنسی حکومت کے پاس تھی وہ بھی لائق علی
کی کمپنی کو دے دی گئی۔ یہ کمپنی مجلس اتحاد المسلمین کی مالی مدد بھی خوب جی کھول کر کرتی تھی۔

گو سر اکبر حیدری نے پبلک طور پر عہد کیا تھا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں رہیں گے
لیکن جس حکومت کے وہ صدر رہے، اس نے مجلس اتحاد کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنایا،
اسٹیٹ کانگرس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا، اور ہندوستان کے مذہبی معاملات میں
اتنی مسلسل مداخلت ہوئی جس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو تھی، ریاست کے چھیاسی فیصد باشندوں میں
چند ہی اردو جانتے تھے۔ ان کی مادری زبان مرہٹی، تلنگی یا کنری تھی، دیہاتی علاقوں
کے مسلمان بس یوں ہی ٹوٹی پھوٹی اردو بول لیتے تھے، کیونکہ گھر میں وہ مذکورہ تینوں بانوں
میں سے کوئی زبان بولا کرتے تھے۔

اردو کا رواج و نفاذ! نظام کے مسند نشین ہوتے ہی تعلیمی پالیسی یہ قرار پائی کہ مقامی
زبان کے بجائے اردو کو رائج کیا جائے، حکومت سے
امداد پانے والے تعلیمی ادارے صرف انگریزی یا اردو کو ذریعہ تعلیم بنا سکتے تھے ۱۹۱۵ء
میں انگریزی بھی رخصت کر دی گئی جسے اب تک اختیاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔
اور تمام سرکاری اسکولوں میں اردو رائج کر دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست
میں فی ہزار بہتر آدمیوں سے زیادہ خواندہ نہ ہو سکے، حالانکہ پڑوسی صوبے مدراس
میں ایک سو تین کا اوسط تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں مدارس ابتدائی کے ہندو مسلم طلبہ کا تناسب
۲-۱ تھا، حالانکہ از روئے آبادی ۸-۱ ہونا چاہیئے تھا۔

ان تمام حرکتوں پر مستزاد یہ کہ سر اکبر حیدری نے حاتمانہ سخاوت کے ساتھ عثمانیہ
یونیورسٹی پر روپیہ صرف کیا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مذہبی جنون رکھنے والے

مسلم فضلا کو مسحور کر کے بلا یا جائے اور مسلم نوجوانوں کی ایک ایسی نسل پیدا کی جائے جو مسلمانوں کی تاریخی سر بلندی سے مخمور ہو، چنانچہ اُردو زبان کو زیادہ گراں مایہ بنانے کیلئے بے دریغ روپیہ صرف کر کے دوسری زبانوں کی کتابیں ترجمہ کرائی گئیں۔

بہت سے ہندو طلبہ مجبور ہو کر ان کالجوں میں داخلہ لینے لگے جو مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھے، کیونکہ اگر کوئی ہندو طالب علم عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہو کر کامیابی حاصل کرے تو بھی ریاستی ملازمت میں اسے حصہ ملنا مشکل تھا۔[1]

دسمبر ۱۹۲۹ء میں وائسرائے ہند لارڈ ارون نے حکومت حیدرآباد کو متنبہ کیا کہ تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی پالیسی اس طرح مرتب کرے، کہ ہندو رعایا کے طلبہ بھی اس میں وہی کشش محسوس کرنے لگیں جو محمڈن رعایا کے طلبہ محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ اپیل اور وارننگ بھی رائیگاں گئی۔

یونیورسٹی میں دھوتی اور کرتہ پر پابندی

۱۹۳۹ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے عثمانیہ یونیورسٹی کے مقصد کو بالکل ہی واضح کر دیا، ہندو طلبہ کو ممانعت کر دی گئی کہ وہ کلاس میں دھوتی اور کرتہ پہن کر نہ آیا کریں، وہی لباس پہنیں جو مسلمان طلبہ پہنتے ہیں۔ ایک مرتبہ جنم اشٹمی کے موقعہ پر جو ہندوؤں کا بڑا مقدس تہوار ہے چند ہندو طلبہ نے "بندے ماترم" کا ترانہ گایا جو گزشتہ تیس سال کی طویل مدت سے مادر وطن کا قومی ترانہ[2] چلا آرہا تھا، تو جو بال ہندو طلبہ کی عبادت کے لئے

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے سیکولر ہندوستان نے ہندی کو رائج کرنے کے سلسلہ میں فرقہ پرست حیدرآباد سے سبق سیکھا اور اسی کی تکنیک استعمال کی ہے۔ [2] یہی ترانہ تھا جو کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مابہ النزاع تھا کیونکہ یہ بت پرستانہ خیالات کا حامل تھا اور اس وقت پہلے پہل استعمال کیا گیا تھا جب بنگال سے مسلمانوں کی حکومت ختم کرنے کے لئے زمین دوز تحریک ہندوؤں نے قائم کی تھی اس کے برعکس

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

اقبال کا لکھا ہوا ترانہ عام فہم معنی خیز اور سحر طراز ہونے کے باوجود کانگرس نہ قبول کر سکی (رئیس احمد جعفری)

مخصوص تھا اسے مقفل کر دیا گیا[۱]۔ اور ہندو طلبہ سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی گئی کہ آیندہ سے یونیورسٹی کے رقبہ میں یہ ترانہ کبھی نہ گائیں جن طلبہ نے یہ ترانہ گایا تھا ان سے کہا گیا یا تو معافی مانگیں ورنہ ممنوع الادخال کر دیئے جائیں گے۔ محکمہ تعلیمات نے ایک کمیونکے میں اعلان کیا کہ سرکاری مدارس میں کہیں بھی یہ ترانہ نہیں گایا جا سکتا، نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ سو کے قریب ہندو طلبہ کالجوں اور سکولوں سے نکال دیئے گئے[۲]۔

سنہ ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ مجلس اتحاد المسلمین کا دستور از سر نو مرتب کیا گیا، بنیادی تبدیلی یہ ہوئی کہ اب حیدر آباد کی آزادی و خود مختاری کا نشان نظام یا ان کا خاندان نہ تھا بلکہ مسلمانان حیدر آباد تھے۔

اب مجلس اتحاد کنگس پارٹی نہیں رہی۔ حیدر آباد کی آزادی اور خود مختاری کا نشان وہ خود بن گئی۔

"ہم دکن کی خود مختار بادشاہت ہیں" ——— بہادر یار جنگ نے اعلان کیا۔

گو مجلس اصلاحات (Reform Committee) کے سفارشات کسی درجہ میں بھی ہندوؤں کے لئے پسندیدہ نہ تھے، لیکن نظام گورنمنٹ نے انہیں اور زیادہ ناپسندیدہ بنا دیا یعنی منتخب ممبروں کا پچاس فیصد ہندوؤں کے لئے اور پچاس فیصد مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیا، عیسائیوں اور پارسیوں کے لئے بھی ایک ایک نشست رکھی گئی تا کہ توازن ان کے ہاتھ میں رہے۔

لیکن مجلس اتحاد کے لئے یہ تبدیلیاں بھی ناقابل برداشت تھیں۔ بہادر یار جنگ کا اصرار تھا کہ حیدر آباد کو ایک مسلم مملکت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے، اور اس کا اعلان کر دیا جائے۔

مسٹر جناح میدان میں

اب مسٹر جناح بھی میدان میں آئے، جو مسلم لیگ کے قائد تھے، جن کا مطالبہ برطانوی ہند کے لئے یہ تھا کہ یا تو مسلمانوں کو ہندوستان کے مساوی حصہ دیا جائے، ورنہ پاکستان تسلیم کر لیا جائے مسٹر جناح نے

---

[۱] عبادت گاہوں کو سیاسی مرکز بنا لینا کیا جائز تھا؟

[۲] یہ داستان طلسم ہوشربا کا حصہ ہے جسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ (رئیس احمد جعفری)

بھی ایک الٹی میٹم دے دیا کہ حیدر آباد کی تناسی فیصد ہندو آبادی قانونی طور پر اقلیت میں ہو جانا منظور کرے۔

نظام نے اس موقع پر ایک اور گل کھلایا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ

(۱) حیدر آباد کی مجلس آئین ساز میں، علاقۂ صرف خاص کی نمایندگی کے لئے وہ صرف مسلمانوں کو نامزد کریں گے۔

(۲) منتخب ممبران مجلس آئین ساز میں مسلمانوں کا تناسب پچاس فیصد سے کم نہ ہوگا۔

(۳) ایک پارسی اور عیسائی نمایندہ ہندوؤں کی پچاس نشستوں میں سے منتخب ہوگا

قدرتی بات ہے جب ہندوؤں نے یہ دیکھا کہ وہ آئینی طور پر ایک اقلیت بنے جاتے ہیں، تو برہم ہوئے اور ان نئی تبدیلیوں کو انھوں نے سخت ناپسند کیا، اس فضا میں کوئی نیشنلسٹ مسلمان بھی کونسل میں منتخب ہو کر نہیں آسکتا تھا، کیونکہ فرقہ پرست مسلمان اسے کس طرح رائے دے سکتے تھے؟

ایک عظیم اکثریت کو سیاسی غلامی کے بندھن میں جکڑنے کی اس سے بڑھ کر شرمناک حرکت اور کیا ہو سکتی تھی[۱]۔ بقول نواب علی یاور جنگ کے یہ بدترین اعتماد شکنی تھی جسے بہ پردۂ راز میں رکھا جا رہا تھا[۲]۔

دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی حیدر آباد میں نظم و آئین مجروح ہو کر رہ گیا۔ ہٹلر نے جیسے ہی روس پر حملہ کیا، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا حکومت ہند کے ساتھ جنگ کی رفیق و شریک بن کر نمودار ہوئی۔ نتیجۃً برطانوی ہند اور حیدر آباد میں اس جماعت پر جو پابندیاں تھیں وہ بھی اٹھ گئیں۔ فوراً ہی کمیونسٹوں نے اپنے غیر قانونی تشدد دانہ حربوں سے کام لے کر تلنگونڈا ضلع پر گویا قبضہ کر لیا۔

مسلمانوں کی قانون شکنیاں

کمیونسٹوں کے علاوہ مسلمانوں نے بھی قانون اپنے ہاتھ میں لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۰ء میں عثمانیہ

[۱] اور کشمیر میں کیا ہو رہا ہے؟

[۲] Ali Yawar Jung, Hyderabad in retrospect

یونیورسٹی کے کچھ طلبہ نے بے ٹکٹ سفر کیا، ریلوے اسٹاف کو مارا، ایک چھوٹے اسٹیشن کو تباہ کر دیا) سر اکبر حیدری کے گھر کا محاصرہ کر لیا، ڈائرکٹر جنرل پولیس کا سر پھوڑ دیا) اور کئی سپاہیوں کو زد و کوب کیا، گو تحقیقات کی گئی، لیکن کسی مجرم کو سزا نہ ملی[۵]۔

۱۹۴۴ء میں جب بہادر یار جنگ کا انتقال ہوا تو آنسو بہانے والوں اور خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں نظام بھی تھے۔

بہادر یار جنگ کی جانشینی کا قضیہ نظام نے ابو الحسن سید علی کی تائید کر کے ختم کر دیا، "تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے مقاصد کی طرف بغیر کسی اختلال کے قدم بڑھایا جائے، انہی لائنوں پر جو بہادر یار جنگ نے قائم کی تھیں" ـــــ نظام نے اعلان کیا۔

بیچارے ابو الحسن

اس اثنا میں کانگرس برابر غیر قانونی جماعت رہی، پہلے تو نظام گورنمنٹ نے یہ مطالبہ کیا کہ یہ تنظیم اپنے نام کے ساتھ "کانگرس" کا لفظ نہ استعمال کرے، چنانچہ آخر اس کا نام "نیشنل کانفرنس" رکھ دیا گیا، پھر مطالبہ ہوا کہ لفظ "نیشنل" بھی اس وقت تک نہیں استعمال کیا جا سکتا جب تک ہندو مسلمانوں سے کوئی مفاہمت نہ کر لیں۔

آخری اعتراض اور زیادہ بنیادی تھا اس ادارہ (کانگرس) کا مقصد ذمہ دار حکومت کا قیام تھا یعنی ایک ایسی حکومت جو اکثریت نے قائم کی ہو، ایسی حکومت ان غیر منقسم ذمہ داریوں میں رکاوٹ بن جائے گی، جو تن تنہا فرماں روا پر عائد ہوتی ہیں اور جنہیں اپنی رعایا کے سود و بہبود کے لئے اپنی صواب دید بروئے عمل لاتا ہے۔

اس کے معنی یہ تھے کہ ہندو سیاسی حقوق اسی صورت میں حاصل کر سکتے تھے کہ اپنا سیاسی وجود ختم کر لیں۔ سری راما چار اور سری نرسنگھ راؤ، مقامی کانگرسی سمجھوتہ کے لئے حیدرآباد مجلس اتحاد کی خدمت میں حاضر ہوئے، ابو الحسن چونکہ روشن دماغ آدمی تھے

---

[۵] وہ تو جنگ کا زمانہ تھا، اب زمانہ امن میں "الہ آباد اور لکھنؤ یونیورسٹی ـــــ جس کے کئی سال تک مسٹر منشی چانسلر رہ چکے ہیں ـــــ کے طلبہ کیا عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ سے زیادہ متشددانہ بالکل ویسی ہی حرکتیں نہیں کر رہے؟

وہ مفاہمت کر بیٹھے، بس پھر کیا تھا، غدار قرار دیئے گئے، اور صدارت سے سبکدوش کر دیئے گئے۔

قاسم رضوی آتے ہیں

آخر بہادر یار جنگ کی قائم مقامی قاسم رضوی کے حصہ میں آئی، ۱۹۴۶ء میں وہ مجلس کے صدر منتخب ہو گئے۔

حیدر آباد کے ایک چھوٹے سے ضلع لاتور میں رضوی، جو علی گڑھ کے گریجویٹ تھے ایک وکیل کی حیثیت سے پریکٹس کرتے تھے، مقامی مجلس اتحاد کے وہ روح رواں تھے، ایک خطرناک مجرم کی سربراہی میں غنڈوں کا جو گروہ قائم تھا، اس کے وہ قانونی مشیر بھی تھے۔

ایک مرتبہ غنڈوں کے اس گروہ نے اناج سے بھری ہوئی ایک لاری لوٹ لی، چند آدمی گرفتار ہوئے، فوراً ہی ایک مجمع اکٹھا ہو گیا، اور اس نے گرفتار شدگان کو پولیس کی حراست سے چھڑانے کی کوشش کی، پولیس نے فائرنگ کر دی، غنڈوں کا سردار ہلاک ہو گیا۔

پولیس فائرنگ کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن کا تقرر ہوا۔

اس چیز نے رضوی کو وہ موقع فراہم کر دیا جس کی وہ تاک میں تھا۔ پولیس کی کارروائی کی تحقیقاتی کمیٹی کے ایک ہندو اور ایک مسلمان ممبر نے، پولیس کی اس کارروائی کو جائز اور درست قرار دیا، ایک دوسرے مسلمان ممبر نے جو ہائی کورٹ کا ایک جج تھا ناجائز قرار دیا، بعد میں جب رضوی کے ہاتھ میں عنان اقتدار آئی تو یہ جج وزیر بنا دیا گیا۔ عدالت اور پولیس کے محکمے اسے تفویض کئے گئے۔

رضوی ایک ان تھک کارکن ہے، نہایت زیرک اور ہوشیار بھی، وہ تملق کرنا بھی جانتا ہے اور دھونس دینا بھی، اگر ضرورت ہو تو وہ مسکرا بھی سکتا ہے۔

سید تقی الدین آئی سی ایس اس کے مشیر خاص تھے۔

مجلس اتحاد المسلمین کے صدر کی حیثیت سے رضوی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حریفوں اور نکتہ چینوں کو چلتا کیا مجلس اتحاد سے بھی اور حکومت کے ایوان سے بھی

اور اپنے نیاز مندوں کو بڑے بڑے منصب بخش دیے ———
جن میں ایک مسٹر عبدالرحیم بھی تھے، [1]

---

[1] عبدالرحیم، اور تقی الدین کے سلسلہ میں اتنا عرض کر دینا شاید مناسب ہو کہ، تقی الدین انڈین سول سروس کے ایک ممتاز رکن تھے انھوں نے اُس زمانہ میں جب مسلمان، دھکّے دے کر پیچھے ہٹا دیے جاتے تھے، اپنی جگہ آپ بنائی، جس زمین پہ رہے آسمان بن کر رہے، اس کا سبب صرف یہ تھا کہ بے انتہا قابل اور بے انتہا مخلص تھے اگر وہ ضمیر فروشی پر آمادہ ہو جاتے تو ان میں کسی صوبہ کا گورنر بننے کی بھی صلاحیت تھی، اور مسٹر منشی کے ذریعہ سردار پٹیل کی ناک کا بال بھی بن سکتے تھے، لیکن ان کی راہ، علی یاور جنگ، منظور جنگ اور ہوشیار جنگ سے بالکل الگ رہی۔

آنکہ فخر تست آں ننگ من است

حیدرآباد کا آزاد رہنے پر اصرار

۳؍جولائی ۱۹۴۶ء کو کابینہ وفد ہندوستان میں وارد ہوا، اس تاریخ کو نواب چھتاری وزیراعظم حیدرآباد نے وہ پابندی اٹھالی جس کی رو سے اسٹیٹ کانگرس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا تھا، اگست ۱۹۴۶ء میں نظام نے نواب چھتاری کی جگہ سرمرزا اسماعیل کو وزیراعظم بنایا۔

سرمرزا اسماعیل کے نام گاندھی جی کا خط

سرمرزا اسماعیل ایک آزمودہ کار سیاستدان اور روشن دماغ مدبر تھے، غیر معمولی انتظامی صلاحیتیں ان کے خصوصیات میں داخل تھیں، میسور اور جے پور میں انھوں نے جدید بنیادوں پر انتظامیہ کا ڈھانچہ بڑی خوبی سے استوار کیا تھا، اپنے تجربات اور انتھک جدوجہد سے کام لے کر انھوں نے حیدرآباد کی تنظیم جدید کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

جیسے ہی سرمرزا کا تقرر وزیراعظم کی حیثیت سے ہوا، گاندھی جی نے انھیں فوراً ہی ایک مکتوب تحریر کیا؛

"میں نے حیدر آباد کے مجوزہ اصلاحات کا اس حد تک جو پریس میں آئے ہیں مطالعہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے یہ اصلاحات صرف نام نہاد ہیں میرا جہاں تک تعلق ہے میری رائے تو یہ ہے کہ اس طرح کوئی قدم آگے نہیں بڑھایا گیا ہے، ہاں ایک قدم پیچھے ضرور ہٹایا گیا ہے مجھے نہیں معلوم ان اصلاحات میں ردو بدل کے لئے آپ نے کیا سوچا ہے؟ مجھے تو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ آپ انھیں ردی کاغذ کا ٹکڑا کیوں نہیں قرار دیتے؟ کوئی ریاست جو معمولی سے معمولی قدم بھی اس سلسلہ میں اٹھا سکتی ہے، وہ کم از کم یہ تو ہونا چاہیئے، کہ "اسٹیٹس پیپل کانفرنس" کے مرتبہ اور رسوخ کو تسلیم کرے، جس کے جواہر لال نہرو صدر ہیں، اور کوئی قدم اٹھانے سے اس کانفرنس کی رضامندی ضرور حاصل کرلے۔" [۱۵]

سر مرزا کا جواب

سر مرزا کو یقین کامل تھا کہ وہ اپنے دَور وزارتِ عظمیٰ میں ناممکن کو ممکن کر دکھائیں گے، چنانچہ انھوں نے گاندھی جی کو جواب دیا:

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مجوزہ اصلاحات متعدد اعتبارات سے غیر تسلی بخش ہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ان کے نقائص کو دُور کرنا ممکن ہے کم از کم انھیں میسور بڑودا اور جے پور وغیرہ کی سطح پر تو لایا جا سکتا ہے، حیدرآباد کے چند مخصوص مسائل ہیں اور انھیں مخصوص طور پر ہی طے کیا جا سکتا ہے، ایک چیز جس نے مجھے دوسری تمام چیزوں کے مقابلہ میں مسرور و مطمئن کر رکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ہزاگزالٹڈ ہائی نس دستوری تعزیرات و اصلاحات کے سلسلہ میں نہایت معتدل رویہ رکھتے ہیں۔" [۱۶، ۱۷]

---

[۱۵] Sir Mirza Ismail, 'My Public Life', p. 101

[۱۶] کاش گاندھی جی نے اس طرح کا کوئی خط کبھی کشمیر کے کسی ہندو وزیر اعظم کو لکھا ہوتا اور اس نے بھی ایسا ہی شستہ جواب دیا ہوتا۔ (رئیس احمد جعفری)

[۱۷] Sir Mirza Ismail, 'My Public Life'

لیکن بیچارے سر مرزا اپنے آقا کے عرفان سے محروم تھے، جن اصلاحات کو وہ روبہ کار لانا چاہتے تھے، وہ حیدرآباد کے امتیازی خصوصیات میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک ایسی مجلس وضع قوانین جو ایک سو بائیس ممبروں پر مشتمل ہو گی، جس میں سے چھہتر (اڑتیس [۳۸] ہندو اور اڑتیس [۳۸] مسلمان) ممبر منتخب ہوں گے، باقی نامزد۔

چنانچہ لیجسلیٹو کونسل کا انتخاب ہندو مسلمانوں کی مساوی تعداد کے تناسب سے ہوا، جس میں ایک شرط یہ تھی کہ ہر منتخب ممبر کے لئے لازمی ہے کہ کم از کم اکیاون [۵۱] فیصد ووٹ اپنی قوم کے ضرور حاصل کرے، نتیجہ یہ ہوا کہ جو مسلمان ممبر منتخب ہوئے وہ تقریباً سب کے سب مجلس اتحاد المسلمین سے وابستہ تھے۔

ان حالات میں اسٹیٹ کانگرس نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا، بلکہ آزاد ٹکٹ پر جو ہندو امیدوار منتخب ہوئے تھے، ان میں سے بھی تیرہ [۱۳] سربرآوردہ ممبروں نے استعفا دے دیا، کیونکہ انھوں نے فوراً محسوس کر لیا تھا کہ وہ صرف مسلم مفاد کی خاطر آلۂ کار کے طور پر منتخب ہوئے ہیں۔

سر مرزا اور مجلس اتحاد المسلمین

سر مرزا کی پوزیشن خاص طور پر دلچسپ تھی مجلس اتحاد المسلمین کے ایک ترجمان نے ان کے بارے میں تحریر کیا:

"اس اثنا میں کہ مسلمان ہندوستان کی نام نہاد دستور ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کر رہے ہیں، اور جس نے ایک دستور ساز ادارہ کی خصوصیت سے محروم ہو کر، وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹیوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے، سر مرزا اسماعیل وزیر اعظم جو خود بھی مسلمان ہیں اور ایک مسلم مملکت کے سربراہ ہیں، تقریباً ہر روز کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کی لابی میں کانگرسی ہندوؤں سے مصروف راز و نیاز رہتے ہیں، ایک ہندو کی طرح ہاتھ جوڑ کر نمستے یا نمسکار کہتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے دوستوں کو یقین دلا رکھا ہے کہ چونکہ ہندو حیدرآباد میں غیر معمولی اکثریت رکھتے ہیں لہٰذا ہر طرح کی دشواریوں کے باوجود آخر کار وہی حکومت کریں گے۔"[۱]

---

[۱] سر سلطان احمد نے جو نظام کے مشیر تھے (Indian Nation) میں ایک مقالہ لکھا تھا جس سے حالات بالا پر مزید روشنی پڑتی ہے، (بقیہ حاشیہ ص۹۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

اب تقسیم ہند کے امکانات واضح تر صورت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ نظام نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر فوراً حیدرآباد کے آزاد مملکت ہونے کا اعلان کر دیا اور اب انہیں اپنے موجودہ وزیر اعظم کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

سر مرزا کا استعفا

سر مرزا نے ۱۵ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنے منصب سے استعفا دے دیا۔ "یہ میری بدقسمتی تھی کہ ہر مرحلہ پر مقامی مسلمانوں کی ایک جماعت کی طرف سے مسلسل موانعات کا مجھے سامنا کرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ ریاست کو خودکشی کے راستہ پر لئے جا رہے ہیں۔"

خود رضوی نے بھی اپنے قول سے اس بیان کی توثیق کر دی:

"ہم نے اپنا نعرہ بلند کر دیا" ایک تقریر کے دوران میں رضوی نے کہا "پہلی مرتبہ تو یہ بے اثر رہا لیکن چونکہ یہ ہماری روح کی گہرائی سے نکلا تھا لہذا آخر کار مرزا کو حیدرآباد سے بھاگنا پڑا ـــــــ"

نواب چھتاری وزیر اعظم کی حیثیت سے

سر مرزا کے مستعفی ہونے کے بعد نیک سرشت نواب چھتاری نے پوری غیر دانشمندی کے ساتھ دوبارہ حیدرآباد کا وزیر اعظم بننا منظور کر لیا، بہت جلد وہ بھی مجلس اتحاد کے ستم زدگان میں شامل ہو گئے۔ معین نواز جنگ وزیر منصوبہ بندی مقرر ہوئے، پریس اور پروپگنڈا کا شعبہ بھی انہی کے حصہ میں آیا، تقی الدین پھر بحال کر دیئے گئے، نواب علی یاور جنگ جو بحیثیت ڈپٹی پیپلز سے کے ناقابل اطمینان سمجھے جاتے تھے، معاملات دستوری کے وزیر بنا دیئے گئے،

(صفحہ ۸۸ کا باقی حاشیہ) "بدقسمتی سے مسلمانوں کی انتہا پسندانہ مخالفت کا اظہار مجلس اتحاد کی طرف سے برابر ہوتا رہا، اس مخالفت میں قائدانہ حصہ لینے والے معین نواز جنگ اور سید تقی الدین بہاری سکرٹری گورنمنٹ حیدرآباد تھے، جنہیں سر مرزا نے برطرف کر دیا تھا۔ عام طور پر یہ بات باور کی جاتی ہے کہ اپوزیشن کی مالی امداد میر لائق علی کرتے تھے، جو معین نواز جنگ کے بہنوئی ہیں۔"

Sir Mirza Ismail, 'My Public Life', p. 107

اور محکمہ پولیس بھی نواب معین نواز جنگ کے ہاتھ میں آ گیا۔[1]

اب صورت احوال یہ تھی کہ نواب چھتاری کی شرافت کی آڑ میں مجلس اتحاد حیدرآباد کے معاملات میں پورے طور پر دخیل ہوتی جا رہی تھی۔ نظام نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا کہ مجلس اتحاد کی اینٹی انڈین روش جو حیدرآباد کی آزادی کی ضامن ہے، بہتر ہے کہ ان کی حکومت میں شریک اور دخیل رہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب حیدرآباد اور انڈیا کے مابین الحاق کی گفتگو شروع ہوئی تو نظام ایک مطلق العنان فرماں روائے ممالکت اسلامیہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا جس کا دروبست مجلس اتحاد کے ہاتھ میں تھا، اور مجلس اتحاد کی قیادت رضوی کے ہاتھ میں اور رضوی کی رہنمائی معین نواز جنگ کے دست قدرت میں۔

سنہ ۱۹۴۶ء کے آغاز میں نظام نے ایک پراسرار قانون دان کی رائے حاصل کی جو میدان سیاست کا شہسوار بھی تھا۔

نظام نے اس قانون دان کی صلاح کے مطابق حیدرآباد کو مستحکم بنانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ ایک طرف یہ تیاریاں جاری رہیں دوسری طرف گوا کا بندرگاہ حاصل کرنے کی جد و جہد، یا کسی اور مقام کا بندرگاہ جو بھی حاصل ہو سکے مثلاً مشرقی ساحل کا بندرگاہ اور اگر پاکستان عالم وجود میں آ گیا تو پھر ہندوستان میں کئی یونین بن سکیں گی، اس صورت میں حیدرآباد اپنے رقبہ، آبادی، وسائل اور ذرائع کی بدولت ایسی پوزیشن اختیار کر چکا ہو گا کہ پھر اس کا آزاد وجود تسلیم کرنا ہی پڑے گا، اور دوسری طرف اگر ہندوستان میں ایک ہی یونین قائم ہوئی تو حیدرآباد کا مفاد یہ ہو گا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کمزور ہو۔[2]

نواب چھتاری نے اس "قانونی مشورہ" کو کابینہ وفد کے سامنے دہرایا۔ جبکہ وہ اور سر والٹر مانکٹن نظام کے افکار پیش کرنے وفد کے سامنے حاضر ہوئے تھے، بعد میں نظام نے جو روش

---

[1] Ali Yawar Jung, Hyderabad in retrospect

[2] Menon, Integration of the Indian States, p. 63

اختیار کی وہ تمام تر اسی مشورہ کے تابع تھی۔

نظام خود بھی بڑے حضرت تھے

اس تمام مدت میں نظام کنگ کوٹھی کے اندر بیٹھے سازشوں کا جال بنتے جارہے تھے۔ انھیں کسی شخص پر بھی اعتماد نہیں تھا، سازش کا سارا تانا بانا انہی کے ہاتھ میں رہتا تھا، اور کوئی دوسرا شخص ہرگز یہ نہیں جان سکتا تھا کہ وہ کس کے لئے کیا سوچ رہے ہیں، اور کیا کرنے والے ہیں؟ انھوں نے نواب چھتاری اور سر والٹر کی وساطت سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے گفت وشنید کی، اور آخرالذکر کی وساطت سے بارہا انھوں نے انگلستان کی قدامت پرست پارٹی کے زعماء کو ہم آہنگ کرنے کی سعی بھی کی، ایک طرف وہ قاسم رضوی کو مٹھی میں لئے ہوئے تھے کہ جب چاہیں اس کے ذریعہ ایک طوفان کھڑا کردیں۔ ساتھ ہی ساتھ لائق علی اور معین نواز جنگ کے مشورے بھی حاصل کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے ہوشیار جنگ کی حوصلہ افزائی کی کہ دین یار جنگ کے چرکے لگائے جاسکیں، اور انہی کے ذریعہ سر مرزا سے رابطہ قائم رکھا، کبھی کبھی وہ راجہ بہادر آرامودا آیننگر سے بھی مشورہ حاصل کرتے، جو ایک عمر رسیدہ اور قابلِ احترام قانون دان اور سابق وزیر تھے اسکے علاوہ بالواسطہ یا بلا واسطہ مسٹر جناح سے بھی رابطہ قائم رکھنے کا سلسلہ انھوں نے کبھی منقطع نہیں ہونے دیا۔

لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا!

نظام نے حیدرآباد آرمی کے کمانڈر انچیف العیدروس کو اس کام پر مامور کیا کہ چیکوسلواکیہ سے اسلحہ خریدنے کی کوشش کریں، ساتھ ہی ساتھ ایک انگریز نائٹ کو اس امر پر متعین کیا گیا کہ پرتگال کو خریدنے کی نظام کی طرف سے بات چیت کرے۔

نظام مسٹر جناح کے اشارہ پر چلتے تھے

۳ رجون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنے پلان کا اعلان کردیا، جس کی رو سے منقسم ہندوستان کے اختیارات حکومت دو آزاد مملکتوں پاکستان اور بھارت کو منتقل کئے جانا تھے۔ ۱۱ رجون ۱۹۴۷ء کو جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے مسٹر جناح کے اشارہ پر نظام نے اعلان کیا کہ ۱۵ راگست کو وہ اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار تصور کریں گے، اور یہ کہ ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں وہ

اپنے نمائندے بھی نہیں بھیجیں گے۔ ۱۹ جولائی کو برطانوی پارلیمنٹ میں آزادیٔ ہند کا بل پیش ہوا
نظام اس بات سے حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے ایک احتجاجی مراسلہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بھیجا جس میں
اس نے لکھا کہ انگریزوں نے اپنے یار وفادار کا ساتھ چھوڑ دیا، اس کے مشورہ کے بغیر حیدرآباد کو
ان دونوں حکومتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور کر دیا، یہ عہد شکنی ہے، نظام
نے اس بات پر زور دیا کہ حیدرآباد کو ایک تیسری مملکت ہونا چاہیئے۔ سر آرتھر لوتھین برطانوی
ریذیڈنٹ متعینہ حیدرآباد جو ۲۶ نومبر ۱۹۴۶ء کو اپنے منصب سے سبکدوش ہو چکے تھے، دوسرے
برطانوی حکام کی طرح نظام کے مانند برطانوی حکومت کے اس فیصلہ سے بہت چراغ پا ہوئے۔

موصوف نے اپنی کتاب (Kingdom of Yesterday) میں اس بات پر بہت
افسوس کا اظہار کیا ہے کہ اگر ان کے مشوروں کو مان لیا جاتا تو ہندوستان میں ایک نیا اور شاندار
دور شروع ہوتا۔ موصوف نے اپنی اس تصنیف میں بیان کیا کہ وہ ہندوستان سے محبت کرتے ہیں۔ انھوں
نے حیدرآباد کو تیسری مملکت بنانے کے سلسلہ میں پروپگنڈے کی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں
بہت ممکن ہے کہ خود مختاری کا تصور سب سے پہلے انہی نے نظام کے سامنے پیش کیا ہو،
لیکن اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ سر کنراڈ کارفیلڈ جو نمائندہ تاج کے مشیر تھے اس تصور کے
سرگرم حامی تھے۔

اگر ہندوستان کو تقسیم ہونا ہے جو اب روز بروز یقینی ہوتا جا رہا تھا تو برطانوی پولیٹیکل
افسران کے نکتہ نظر سے ضروری تھا کہ اسے دوسرا بلقان بنا دیا جائے، اس طرح ہندوستان متعدد
آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو جائے گا، جو ایک کمزور سے کنفیڈریشن کے ماتحت ہو جائے گا، ہر واحدہ
پورے طور پر برطانیہ سے وابستہ رہے گا، یہی چیز تھی جس نے نظام کو آزاد بننے کا خواب دیکھنے
پر آمادہ کر دیا تھا۔

سر والٹر مانکٹن کی صورت میں نظام کو ایک بہت اچھا آلہ کار ہاتھ آ گیا تھا، وہ بیک
وقت تین حیثیتوں سے اپنے فرائض نہایت خوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے، وہ نظام
کے دستوری مشیر تھے، اور اس کے گشتی سفیر بھی، اس حیثیت سے برطانیہ قدامت پسند پارٹی کے
لیڈروں سے وہ برابر ساز باز میں مصروف رہتے تھے، ساتھ ہی ساتھ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے

نہایت مخلص اور بہت گہرے دوست بھی تھے۔

۱۹۴۵ء کے اختتام پر جب آنے والے واقعات ہندوستان کی سیاست پر اپنا سایہ ڈال رہے تھے، سر والٹر مانکٹن نہایت سرگرمی سے لندن اور نئی دہلی میں نظام کی پوزیشن مضبوط کرنے کی جد وجہد کر رہے تھے۔

یہ قدرتی بات تھی کہ سر والٹر سب سے پہلے اپنے موکل یعنی نظام کا مفاد محفوظ رکھتے تھے، جو یہ تھا کہ انڈین یونین سے حیدرآباد کا تعلق کمزور ترین بنیاد پر قائم ہو، اور اندرونی طور پر وہ بالکل آزاد ہو، ان کا خیال تھا کہ اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر نہایت مناسب شرائط اپنے موکل کے لئے ہندوستان کے مزاحمت پسند، لیکن خستہ ودرماندہ لیڈروں سے حاصل کر سکیں گے۔ ۱۹۴۶ء کے وسط تک جبکہ سر والٹر نے مایوسی کے عالم میں نظام کے مقدمہ سے ہاتھ اٹھالیا تھا وہ نظام اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے معتمد بنے رہے۔ بالکل الگ الگ وجوہ کی بنا پر، نظام کو امید تھی کہ چونکہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور برطانیہ کی قدامت پرست پارٹی کے لیڈروں پر سر والٹر گہرا اثر رکھتے ہیں لہذا کم از کم حیدرآباد کے لئے مکمل آزادی حاصل کرانے میں وہ ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن دوسری طرف یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ صرف سر والٹر ہی ہیں جو حیدرآباد کو ہندوستان سے ملحق کرانے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں۔

قاسم رضوی کا عروج

بلند آہنگ خطیب

یہ وہ زمانہ تھا جب قاسم رضوی عہد وسطیٰ کے ایک تخیلی ہیرو کی طرح نمودار ہوئے۔ مجنونانہ جوش کے ساتھ شرربار آنکھیں رکھنے والا یہ پُرجوش اور بلند آہنگ خطیب اپنے بارے میں یہ اعتقاد رکھتا تھا کہ اسے خدا نے اس کام پر مامور کیا ہے کہ دکن کے مسلمانوں کو انڈین یونین سے محفوظ رکھے، لیکن یہ صرف پہلا قدم تھا دوسرا قدم یہ تھا کہ مدراس کی شمالی سرکار کا علاقہ جو پہلے کبھی حیدرآباد کا تھا پھر حیدرآباد میں شامل ہو جائے، پھر اپنے مسلم مجاہدوں کو ساتھ لے کر وہ دہلی کی طرف کوچ کرے تاکہ لال قلعہ پر آصفیہ پرچم لہرا سکے اور اس وقت تک وہ آرام نہیں لے سکتا جب تک خلیج بنگال کی لہریں اس کی آزاد مملکت کو نہ چھو لیں گی۔

وہ مسلمانوں کا یہ حق منوانے پر مصر تھا کہ وہ ہندوؤں کو غلام بنا سکتے ہیں کیونکہ وہ کافر ہیں، پتھر اور بندر کو پوجتے ہیں، گائے کا پیشاب پیتے اور اس کا گوبر مذہب کے نام پر کھاتے ہیں، دوسری طرف ایک مسلمان ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حق کے لئے ساری دنیا کا مقابلہ کر سکتا اور دشمنی مول لے سکتا ہے۔

قاسم رضوی
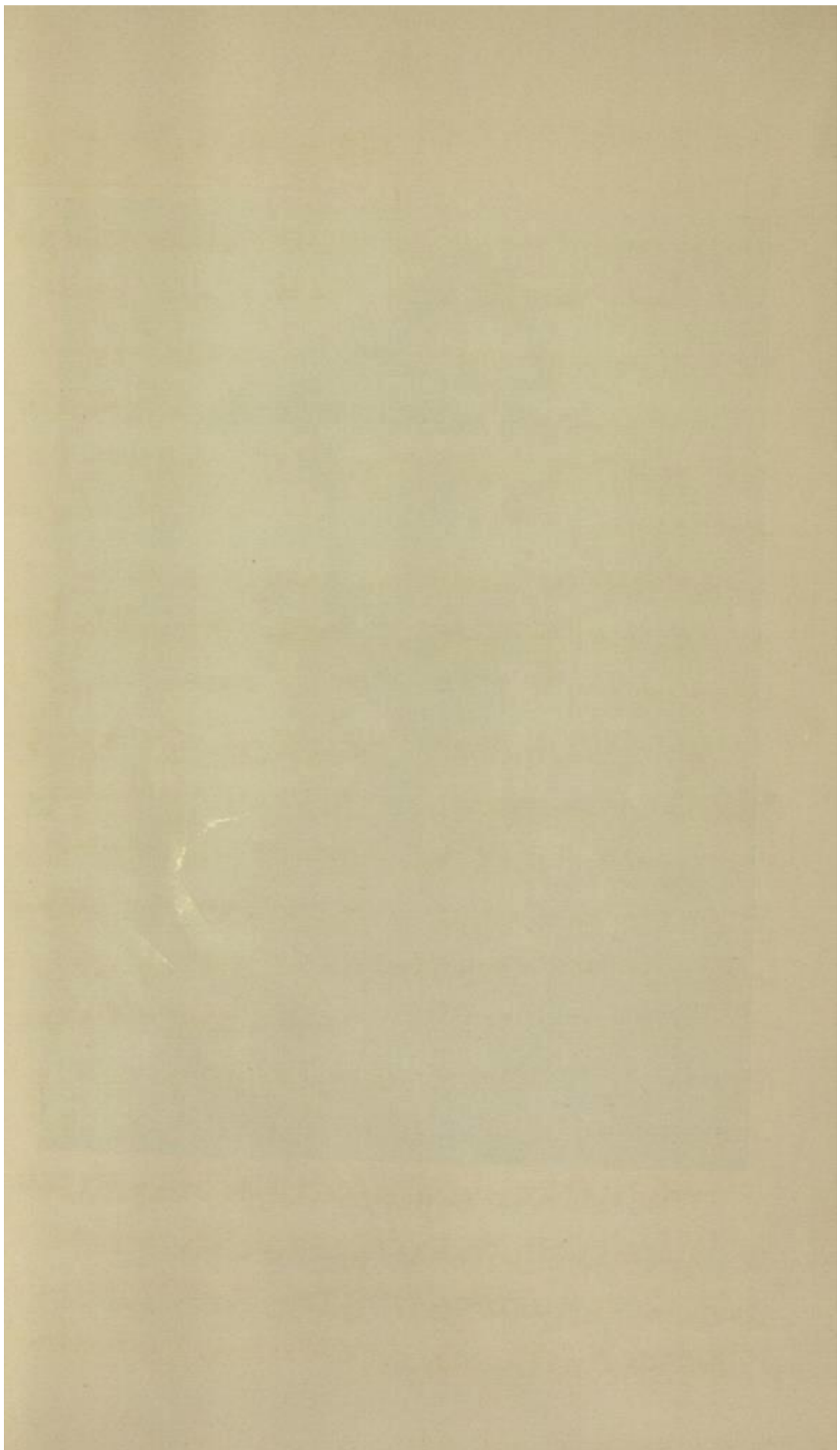
حیدرآباد کی ناقابل مزاحمت طاقت

ایک سال سے کم مدت میں رضوی حیدرآباد کی ناقابل مزاحمت طاقت بن گیا۔ اس نے نظام کو بھی باور کرا دیا کہ ان کا مقصد بہت جلد حاصل ہو جائے گا، اس نے حیدرآباد کے دہشت زدہ ہندوؤں پر مسلسل حملے کئے، اس نے سینکڑوں مسلح اور بے ضرر دیہاتیوں کو آگ میں جلوا دیا اور نشانہ شمشیر بنایا، اور آخر کار گورنمنٹ آف انڈیا کو مجبور کر دیا کہ ان دہشت انگیز سرگرمیوں کا پولیس ایکشن کے ذریعہ خاتمہ کر دے۔

جو لوگ دور سے بیٹھے اس سفاکانہ تحریک کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے ان کے سامنے متعدد مصالح تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک مرتبہ اگر دکن کی اس اسلامی مملکت کا معیار بلند ہو گیا تو شمالی ہندوستان کے مسلمان یہاں مرتکز ہو جائیں گے، ریاست کے ہندوؤں کو اگر پورے طور پر سراسیمہ اور دہشت زدہ کر دیا جائے تو ریاست سے باہر ہندوستان میں اپنے ہم مذہبوں کی طرف امید کی نظر نہیں دوڑائیں گے بلکہ یہ سمجھنے پر مجبور رہوں گے کہ ہندوؤں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور پھر بےبسی میں نصفا نصفی فارمولا مان کر سیاسی غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈال لیں گے اور نظام کو اپنا آقا اور مالک تسلیم کر لیں گے۔

ان لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ جو چاہیں کریں۔ حکومت ہند اتنی کمزور اور ہندوستانی فوج اتنی غیر منظم ہے کہ حیدرآباد کے خلاف کوئی سخت اقدام ممکن نہیں، لیکن اگر حکومت ہند نے ایسا کیا تو مسلمانان ہند متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور حکومت کا تختہ الٹ دیں گے، کسی موقع پر اگر ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی تو حیدرآباد کے ہندوؤں کو یرغمال تصور کیا جائے گا۔ "اگر انڈین یونین نے حیدرآباد پر حملہ کیا" رضوی نے دھمکی دیتے ہوئے کہا "تو حملہ آوروں کو قدم قدم پر ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ آدمیوں کی جھلسی ہوئی لاشیں ملیں گی۔ ہم مسلمان دوسروں کو بھی جیتا نہ چھوڑیں گے، اگر زندہ رہنے کا حق ہم سے چھین لیا جائے گا۔" نو مہینے کے دوران قیام حیدرآباد میں مجھے رضوی اور اس کی سرگرمیوں سے متعارف ہونے کا کافی موقع ملا جس راستہ پر وہ چل رہا تھا اس سے ڈگمگاتے ہوئے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، جو گزند حیدرآباد پر تباہیاں لایا کٹھن موقعہ پر اس کا تنہا فرد رضوی تھا جس نے اپنی حفاظت

کے لیے پاکستان کی طرف پرواز کرنے سے گریز کیا، اور شاید اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے وہ ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔

حیدرآباد کے مقدس مجاہد

رضوی کی ماتحتی میں رضاکاروں نے مقدس مجاہدوں کا لبادہ پہن لیا۔ جب کوئی شخص اس جماعت میں شامل ہوتا تو اسے حلف اٹھانا پڑتا کہ وہ اپنی جان مجلس اتحاد المسلمین اور حیدرآباد کے لئے قربان کرنے پر اپنے لیڈر کے فرمان کے مطابق ہمیشہ تیار رہے گا، حلف نامے کے الفاظ میں یہ بھی شامل تھا کہ میں اللہ کے نام پر یہ عہد کرتا ہوں کہ اپنے آخری قطرۂ خون تک دکن میں مسلمانوں کی آزادی اور بالادستی کے لئے جدوجہد کرتا رہوں گا۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں جب میں حیدرآباد گیا تو تیس ہزار سے زیادہ رضاکار ——— مرد، خواتین، اطفال ——— اس فہرست میں شامل تھے، اگست ۱۹۴۸ء میں ان کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہو گئی۔

رضاکاروں کی سرگرمیاں متنوع قسم کی تھیں، یہ حیدرآباد اور دوسرے شہروں میں مظاہرے کر کے ان لوگوں کا جینا دوبھر کر دیتے جو ان کے مخالف تھے۔ جو لوگ ہندوستان سے الحاق یا ذمہ دار حکومت کے قیام کے حامی تھے انھیں ہر طرح سے دہشت زدہ کیا جاتا) فوجی مظاہرے کر کے عوام کو بھی یہ لوگ ہراساں کر دیتے، نظام پولیس کا تعاون خواہ حاصل ہو یا نہ ہو رضاکار تعزیری اقدام بھی بعض دیہاتوں کے خلاف کر گزرتے، جو دیہات ہندوستان کی سرحد پر واقع تھے نظام پولیس کی مدد سے یہ انھیں گھیر لیتے اور وہاں کے باشندوں کو کسی ملزم کی تلاش کے بہانے یا کسی نامعلوم شخص کی حرکات کا انتقام لینے کے لئے تنگ کرتے۔

جاسوسی کی درس گاہ

رضاکاروں نے جاسوسی اور پروپگنڈے کی تعلیم دینے کے لئے ایک درسگاہ بھی قائم کر رکھی تھی، یہاں کے تربیت یافتہ لوگ ایک برہمن کا روپ بھر کر کسی گاؤں کے ہندوؤں کو آمادہ کرتے کہ وہ مسجد کو نقصان پہنچائیں، اس سے مقامی مسلمان مشتعل ہو جاتے، پھر فوراً رضاکار پہنچتے اور گاؤں کے سربرآوردہ ہندوؤں کو قتل یا مجروح کر دیتے اور ان کے گھروں کو آگ لگا دیتے۔ یہ لوگ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں پہنچکر مسلمانوں

کو انڈین یونین سے بدظن کرتے اور انھیں حیدرآباد آجانے پر آمادہ کرتے تاکہ اس طرح ریاست میں ہندوؤں کا تناسب آبادی کم ہوجائے۔

رضاکاروں کے ذرائع اور وسائل لامحدود تھے۔ کوئی شبہ نہیں حکومت نظام ان کی پشت پناہ تھی، ان کے پاس درجنوں لاریاں، جیپ اور ٹرک تھے، اگو پیٹرول کی کمی تھی، مگر سرکاری ڈپو سے انھیں حسب ضرورت پٹرول ملتا رہتا۔

نظام گورنمنٹ دیہاتوں کو غیر مسلح کرتی جارہی تھی، اس طرح جو اسلحہ اور ہتھیار فراہم ہوتے وہ رضاکاروں کے تصرف میں آتے نئے ہتھیار بھی جو سڈنی کاٹن نے اسمگل کیے تھے، یہ بے دھڑک استعمال کرتے۔

ہندوستان کے خلاف مجلس اتحاد کی اعصابی جنگ

ہندوستان کے خلاف اعصابی اور نفسیاتی جنگ میں مجلس اتحاد بڑی خوبی سے پروپگنڈا مشین استعمال کرتی ۱۹۴۸ء میں اس نے سات روزنامے اور چھ ہفتہ وار اخبار جاری کیے، جو اردو میں شائع ہوتے تھے، نظام ریڈیو بھی بے محابہ پروپیگنڈے کے اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا تھا، ہر روز انڈین یونین، پنڈت جی، سردار اور دیگر رہبروں کے خلاف آتش فشاں تقریریں نشر ہوتی رہتیں، اور بیان شائع ہوتے رہتے۔ تشہیری محاذ میں قاسم رضوی کی پُرجوش تقریریں بڑا کام دیتیں،

رضاکاروں کا صدر مقام، دارالسلام تھا، رضوی کا یہیں قیام تھا، اور یہی جگہ اس کی سرگرمیوں کا مرکز تھی، یہاں سے باون تشہیری مراکز کا انتظام باقاعدگی کے ساتھ ہوتا رہتا، ہر مرکز ایک کمانڈر کے ہاتھ میں تھا۔

نواب دین یار جنگ، پولیس کمشنر نظام کے معتمد خصوصی تھے، ان کی شہرت اس بات میں تھی کہ یہ رضوی کے حامی ہیں، اور رضوی پر غیر معمولی اثر رکھتے ہیں مجلس اتحاد کے دماغ معین نواز جنگ اور تقی الدین تھے، میر لائق علی اس جماعت کے فنانسر تھے۔ یہ لوگ سرمرزا کے خون کے پیاسے تھے، اور دین یار جنگ کے ذریعہ نظام کو سرمرزا سے برگشتہ کرنے کی سعی میں لگے ہوئے تھے۔

یہ لوگ جو مجلس کے دماغ بنے ہوئے تھے، رضوی کو اپنا آدمی سمجھتے تھے، لیکن رضوی انھیں اپنا آلۂ کار سمجھتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں مجلس نے تبلیغی سرگرمیاں بند کر دیں، لیکن نظام گورنمنٹ کی طرف سے مساجد کو بڑی بڑی رقومات ملتی رہیں، جو کسی نہ کسی صورت میں ہندوؤں کو حلقۂ اسلام میں داخل کرنے پر صرف ہوتی رہیں۔

اسلام قبول کرنے والے ہریجن بیچارے ہریجن (اچھوت) ترغیب یا ترہیب کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے، میرے علم میں ان کے قبول اسلام کی کئی انوکھی مثالیں آئیں، کوئی فاقہ زدہ ہریجن خاندان، اپنے کسی رکن کو مسلمان بننے کی اجازت دیدیتا تھا تاکہ وہ مالی امداد حاصل کر سکے، خاندان کے باقی لوگ اس نومسلم کی بیوی سمیت ہندو رہتے۔

ایسے خاندانوں کی حالت بعض وقت بڑا تفنن پیدا کرنے کا موجب ہوتی، نومسلم ہریجن ترکی ٹوپی پہن کر اور داڑھی رکھ کر کھانا کھانے، باقی ممبران خاندان سے الگ بیٹھتا بیوی دور سے اس کے سامنے کھانا رکھ دیتی، یہ نومسلم اس کے بچوں کا باپ رہتے ہوئے بھی یہ برداشت کرتا، کیونکہ بیوی ہندو تھی اور وہ ضرورت سے مجبور ہو کر مسلمان بنا تھا۔

پھر جب تشدد اور دباؤ کا زور ختم ہوا تو یہ نومسلم ہندو عام طور پر اپنے آبائی مذہب پر پھر واپس آ گئے۔

دیندار جماعت بہرحال سرگرم طور پر تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھے رہی۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں اس جماعت کا اثر کم ہو گیا۔

صدیق دیندار اس جماعت کا پیشوا ایک شخص حضرت مولانا صدیق دیندار چانابشیشور قبلہ تھا، اس کا دعویٰ تھا کہ یہ چانابشیشور کا اوتار ہے، جو ہندوؤں کے لنگایت فرقہ کا بانی تھا، اس کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ جو خدائی نشانات چانابشیشور کے بدن پر تھے اس کے بدن پر بھی ہیں۔

صدیق کا مرکز حیدرآباد میں تھا، اس کے متبعین میں پانچسو ایسے جانباز شامل تھے، جن کا بظاہر کوئی ذریعہ معاش نہ تھا، یہ لوگ مسلمان علماء کی طرح سر پر عمامہ پہنتے، ہندو سادھوؤں

کی طرح زرد چادر اوڑھتے، سکھوں کی مانند داڑھی رکھتے، جب کسی گاؤں کی صورت حال نازک ہو جاتی تو یہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکساتے، جب یہ ہندوؤں کا مال، و دولت لوٹنے آتے تو رضاکاروں کا لباس پہن لیتے۔

صدیق چونکہ اپنے بارے میں یہ دعویٰ کرتا تھا کہ ایک ہندو سنت کا اس نے جنم لیا ہے اس لئے رضوی اسے سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا تھا، اور شاید اپنا حریف بھی خیال کرتا تھا، اور گورضاکار اور اس کے قائدان کو حقیر نظروں سے دیکھتے تھے لیکن انھیں گوارا کرنے پر بھی مجبور تھے، کیونکہ ہندوؤں کو دہشت زدہ کرنے میں ان سے خاص مدد ملتی تھی، جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سردار کی بساطِ شطرنج

۱۹۴۶-۴۷ء میں ہندوستان کے سیاسی اسٹیج پر جو ڈرامہ کھیلا جا رہا تھا، اس کے سب سے ممتاز اداکار سردار ولبھ بھائی پٹیل تھے جو کسی کے سامنے دبنا اور جھکنا نہ جانتے تھے اور جو ہندوستان کے نائب وزیر اعظم اور وزیر اطلاعات و نشریات اور محکمہ امور ریاست تھے،

منقسم خاندان

اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوستان میں جو حکومت قائم تھی وہ کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں پر مشتمل تھی، یہ ایک منقسم خاندان تھا، لہذا سردار کی لامتناہی جنگی تیاریاں اور صلاحیتیں اس امر پر مرکوز ہو رہی تھیں کہ کانگرس کسی مرحلہ پر ہدف فریب نہ بن سکے ۱۵ اگست کے بعد، حکومت کا سارا ڈھانچہ از سر نو تعمیر ہونا تھا، مرکز میں بھی، اور صوبوں میں بھی۔ یہ ایسا مرحلہ تھا، جو در حقیقت سردار کے تدبر، حکمت عملی، اور موقعہ شناسی کا امتحان تھا۔

تقسیم کے روبہ عمل آتے ہی فرقہ وارانہ کشمکش اور تصادم نے شمالی ہند کے متعدد علاقوں میں نظم و امن کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا، اسے ہر قیمت پر بحال کرنا تھا۔ پاکستان سے پناہ گزینوں کے قافلے پر قافلے چلے آ رہے تھے، ان کی آمد کے ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا تھا کہ یہ کہاں ٹھہرائے جائیں؟ انہیں سر چھپانے کو جگہ کہاں دی جائے اور نظم و امن میں مزید ابتری بھی نہ پیدا ہونے دی جائے۔ ان تمام مسائل کو، بڑی دانشمندی، حکمت عملی، اور عزم و اثبات کے ساتھ حل

کرنا تھا۔ وہ سردار ہی تھے، جنھوں نے یہ بارگراں بے تامل اپنے دوش ناتواں پر اٹھا لیا،

صورت حالات کی پیچیدگی اس لیے اور زیادہ بڑھ گئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت نے پاکستان کی تائید وحمایت میں پرجوش اور بیش قرار حصّہ لیا تھا۔ سردار کے نقطۂ نظر سے، یہ بہت بڑی غداری تھی، انھوں نے اپنی اس رائے کو کبھی نہیں چھپایا کہ جو مسلمان ہندوستان کے وفادار نہیں ہیں ان کی یہاں کوئی جگہ نہیں ہے، انھوں نے متعدد مواقع پر، علی الاعلان کہا کہ ان مسلمانوں کو اسی ملک میں چلا جانا چاہیے، جس کے یہ وفادار ہیں، اپنی ایک تقریر میں انھوں نے کہا، :

سردار کی معرکہ آرا تقریر

"ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان آباد ہیں، ان کی بڑی تعداد نے تخلیق پاکستان میں مدد کی، ہے کون اس امر پہ یقین کر سکتا ہے کہ راتوں رات ان کی ذہنیت بدل گئی؟ مسلمانوں کا دعوٰے ہے کہ وہ وفادار شہری ہیں، اور کسی کو کیا حق ہے کہ ان کے اس دعوے کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھے؟ میں ان سے کہتا ہوں تم ہم سے یہ سوال کیوں کرتے ہو؟ خود اپنے دل کو کیوں نہیں ٹٹولتے؟ خود اپنا جائزہ کیوں نہیں لیتے؟"[۱]

ایک دوسرے موقع پر سردار نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا، :

"ہندوستانی مسلمانوں سے میں صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں، حال میں جو مسلم کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی اس میں تم نے کشمیر کے معاملہ پر لب کشائی کیوں نہیں کی؟ تم نے کیوں پاکستان کو اس کی روش پر ملامت نہیں کی؟

یہی چیزیں ہیں جو تمھاری وفاداری کے بارے میں لوگوں کے دلوں کو شک وشبہ میں مبتلا کر دیتی ہیں، اب میں مسلمانوں کے دوست کی حیثیت سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور دوست کا یہ فرض ہے کہ وہ کوئی بات ہر صفائی سے کہدے یہ تمھارا فرض ہے کہ اب ایک ہی کشتی پر بیٹھے رہو، خواہ وہ ڈوبے یا تیرے، میں نہایت وضاحت کے ساتھ

---

[۱] P. D. Saggi. Life and Work of Sardar Vallabh Bhai Patel p. 54

کہہ دینا چاہتا ہوں کہ تم بیک وقت دو کشتیوں پر پاؤں نہیں رکھ سکتے، تم کسی ایک گھوڑے کو سواری کے لیے منتخب کر لو، —— جسے بھی تم پسند کرو، جو بھی تمھیں بہتر نظر آئے،

مجلس دستور ساز میں لکھنؤ کے ایک مسلم لیگی نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب اور محفوظ نشستیں منظور کی جائیں، مجھے مجبوراً لب کشائی کرنا پڑی اور کہنا پڑا کہ دونوں طرف سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں، اب وہ صاحب پاکستان میں ہیں، جو لوگ پاکستان جانا چاہتے ہیں وہ شوق سے جا سکتے ہیں بلکہ انہیں چلا جانا چاہیے، وہ وہاں امن اور چین سے رہیں، ہمیں یہاں چین اور امن سے رہنے دیں،" [۱]

ٹیل اور گاندھی جی کا اختلاف

تقسیم ہند کے بعد فوراً، انڈیا اور پاکستان کے تعلقات بگڑنے گئے، سردار کا خیال تھا، پاکستان عملی طور پر ہندوستان سے برسر جنگ ہے، لہٰذا انھوں نے کوشش کی کہ پاکستان کے حصہ کا سامان جنگ روک لیا جائے، اور اسے نہ دیا جائے، پاکستان کو اپنے حصہ کا جو ۵۵ کروڑ روپیہ ملنا تھا وہ بھی سردار کے حسب ہدایت روک لیا گیا،

لیکن گاندھی جی نے تقسیم ہند کے انتظامات کے سلسلہ میں پاکستان کے حصہ کا روپیہ روک لینا پسند نہ کیا، اور اس بات پر برت رکھ لیا، آخر حکومت ہند کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا،

اب پنڈت جی اور سردار میں اختلاف فکر و نظر نمایاں ہونے لگا، اسی طرح گاندھی جی اور سردار کا اختلاف بھی چھپائے نہ چھپ سکا، لیکن اس وقت جب ساحل مراد قریب آ گیا تھا کشتی کے ملاح آپس میں برسر آویزش ہو گئے، قریب تھا کہ کسی چٹان سے ٹکرا کر وہ پاش پاش ہو جائے،

۱۹۴۶ء کے وسط میں، جب انتقال اختیارات کی پالیسی مرتب ہو رہی تھی سر کنراڈ کارن فیلڈ Sir Conrad Cornfield جناب تاج کے سیاسی مشیر تھے، مسٹر جناح کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے، صورت احوال کانگرس کے لیے مستقل درد سر بن گئی تھی، سر موصوف اس کوشش میں تھے کہ ہندوستانی والیان ریاست کو ایک تیسری طاقت بنا دیں جو اجتماعی حیثیت سے مملکت ہند سے معاملات طے

---

[۱] P. D. Saggi, Life and Work of Sardar Vallabh Bhai Patel, p. 62

کرے،

نواب بھوپال کی دراندازیاں

نواب بھوپال جیسا زیرک شخص سر موصوف کا رفیق طریق تھا نواب بھوپال نے والیان ریاست کی اجتماعی خود مختاری کا ایک نیا فلسفہ پیش کیا، یعنی کوئی والی ریاست ہندوستان سے اس وقت تک الحاق نہیں کر سکتا جب تک وہ ایوان والیان ریاست کے چانسلر کی منظوری نہ حاصل کرے، دوسرے الفاظ میں نواب بھوپال کی منظوری کے بغیر کوئی والی ریاست بھارت سے ملحق نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ وہی ایوان والیان ریاست کے چانسلر تھے، اور ان کی تمام ہمدردیاں کانگریس کے مخالفوں کے لیے وقف تھیں،

نواب بھوپال کے بعد، دوسرا شخص جو والیان ریاست پر کچھ اثر رکھتا تھا وہ جام صاحب نوانگر تھے، بدقسمتی سے جام صاحب سردار کے سخت مخالف اور ان کی پالیسی کے سخت نکتہ چیں تھے، ۳۹-۱۹۳۸ء میں راجکوٹ کا جو حادثہ پیش آیا تھا، یہ تلخی اسی وقت سے چلی آ رہی تھی، جام صاحب اپنی ساری سرگرمیاں اس امر پر مرکوز رکھے ہوئے تھے کہ کاٹھیاواڑ کے دوسرے والیان ریاست کو ملا کر، حکومت برطانیہ یا سردار سے مضبوط پوزیشن میں معاملات طے کریں،

یہ تمام باتیں ان برسر اقتدار حکام کیلئے حد درجہ خوش آئند تھیں جو برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ کے منصوبے دوبارہ آزادی ہند کو ناکام بنانے پر تلے ہوئے تھے، اگر ہندوستان کو آزاد ہی ہونا ہے تو کم از کم اس کے ایک حصہ کو اتنا کمزور ہونا چاہیے کہ وہ برطانوی اقتدار کو ناگزیر بنا دے،

اس اثنا میں کہ سردار اپنا جال پھیلا نے جا رہے تھے، دستور یہ ہند کی مجلس گفت و شنید (Negotiation Committee) ایوان والیان ریاست کی مجلس گفت و شنید سے مفاہمت کرنے میں کامیاب ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجگان، بڑودا، بیکانیر، کوچین، جے پور، جودھ پور، پٹیالہ اور ریوا، اپریل ۱۹۴۷ء میں اپنے نمائندے دستوریہ ہند میں بھیجنے پر آمادہ ہو گئے

سردار کا فیصلہ

سردار نے فیصلہ کیا کہ دوسرے والیان ریاست سے الگ الگ معاملہ طے کریں،

سردار کے رسوخ۔ اور ان کی قائدانہ صلاحیت کا اس ساری مدت میں ہر طرف جلوہ بکھرا ہوا نظر آتا ہے، جس کا آخری نتیجہ الحاق حیدرآباد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ میں نہیں کہہ سکتا سردار بھی اپنے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے جو بسمارک کی اپنے بارے میں تھی:

"ایک مدبر خود سے کسی چیز کی تخلیق نہیں کرتا وہ انتظار کرتا رہتا، اور اس وقت تک گوش بہ آواز رہتا ہے کہ وقائع اور حوادث میں خدا کی کارفرمائی نظر آنے لگے پھر وہ یک جست میدان میں اتر آتا ہے۔!"

یہ واقعہ ہے کہ سردار اس تمام مدت میں انتظار کرتے اور اگر خدا کی نہیں تو وقائع و حوادث کی آواز پا کو کان لگائے سنتے رہے۔

سردار نے جب نئے قائم شدہ محکمۂ امور ریاست کا چارج لیا تو حالت یہ تھی کہ بہت سے والیان ریاست ملک کے اتحاد اور سالمیت کے خلاف صف آرا تھے، سردار نے یہ ذمہ داری سنبھا ہی تھی کہ مستقبل میں بھارت یونین اور ریاستوں کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ برطانوی کابینہ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اس سلسلہ میں غیر معمولی طور پر معین و مددگار ثابت ہوئے۔ سردار عزت کے ساتھ اور ناقابل مزاحمت طور پہ قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ وی پی مینن بھی ایک گرگ باراں دیدہ۔ اور والیان ریاست یوسف بےکارواں، نہ رعایا ان کے ساتھ تھی، نہ وہ طاقت جو ہمیشہ ان کی پشتیبان ثابت ہوا کرتی تھی، ایسے مواقع بھی آئے جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ اتحاد ہند کا تصور ہرگز عملی صورت نہیں اختیار کر سکے گا، لیکن سردار ہاتھ میں ہاتھ ڈالکر، یا دھکیلتے ہوئے ہر والی ریاست کو انڈین یونین سے الحاق کے راستے پر لے ہی آئے،

ہمیں کسی دلال کی ضرورت نہیں

سر بی ایل مترا ان روشن دماغ مدبروں میں تھے جو والیان ریاست سے قریبی تعلق رکھتے تھے، گائیکوار بڑودا کے وہ وزیر اعظم تھے، اور سردار کا شرف تقرب بھی انھیں حاصل تھا۔ سب سے پہلے ایک دلیرانہ قدم انہی نے اٹھایا، سر کانرڈ کارن فیلڈ سے جو والیان ریاست کی طرف سے کانگرس کے "وہانت دار دلال" کی حیثیت سے گفت و شنید پر تلے ہوئے تھے، سر بی ایل مترا نے کہا،

"ہمیں کسی دلال کی ضرورت نہیں ہے، نہ دیانت دار کی، نہ بے ایمان کی۔!"

سروی کی کرشنا ماچاری، وزیر اعظم جے پور کا شمار ریاستوں کے صاحب بصیرت وزرائے اعظم میں ہوتا تھا، انھوں نے نہایت قابلیت کے ساتھ ریاستوں کے الحاق کے معاملہ میں وی پی مینن کا ساتھ دیا،

میرے ناچیز خدمات

متعدد والیان ریاست سے میرے دوستانہ یا پیشہ وارانہ تعلقات تھے، اور اس ساری مدت میں ان سے میرا رابطہ قائم رہا، مہاراجہ بیکانیر نے اپنی ریاست میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے بارے میں مجھ سے صلاح لی، اپنے وزیر اعظم سردار کے ایم پانیکر کی پشت پناہی سے متاثر ہو کر وہ ان والیان ریاست میں سے ایک تھے جو فوراً الحاق پر تیار ہو گئے، ایک مرتبہ انھوں نے مجھے بتایا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپنے مقدور بھر اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنے کا وعدہ کر چکے ہیں لیکن بعد میں جب بیکانیر راجستان کے ساتھ ملحق کر دیا گیا، تو اس سے انھیں سخت صدمہ پہونچا،

۱۹۴۶ء میں میرے مشورہ کے مطابق ریاست ہائے دکن کے فرماں رواؤں نے اپنی ایک یونین قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اگر میں غلطی نہیں کرتا تو وراج پر مکھ کا سکہ میرا چلایا ہوا ہے،

۱۹۴۴ء میں، مہارانا بہادر آف اودے پور، اور مہاراجہ پنا سے میرے گہرے روابط چتوڑ میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے سلسلہ میں رہے، دستوری معاملات میں بھی مہارانا مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے، اور ۱۹۴۷ء کے آغاز میں تو میں انکا آئینی، دستوری مشیر بن گیا۔ میں نے اودے پور کا دستور بھی وضع کیا، جس میں بنیادی حقوق، حق رائے دہی بالغاں، اور آزاد پارلیمانی جمہوریت کے اصول قانونی طور پر پہلی مرتبہ کسی ہندوستانی ریاست میں تسلیم کیے گئے تھے۔

غدار ہند و والیان ریاست

اس وقت جب سردار کو نہایت سبک دستی کے ساتھ ایک غدارانہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا مہاراجہ کمار آف جیسلمیر، یونین آف راجستان کے قیام کے داعی بنے ہوئے تھے، مہاراجکمار کو اندیشہ تھا کہ اگر پاکستان بیچ میں کود پڑا تو وہ اپنی ریاست کا دفاع نہیں کر سکیں گے، جب انھیں گاندھی جی اور سردار کے پاس لے کر گیا، دونوں نے انھیں ہر طرح کی ضمانت دے دی،

مہاراجکمار جیسلمیر کو، مہاراجہ جودھپور نے ورغلا کر مسٹر جناح سے ملنے پر آمادہ کر لیا تھا، پاکستان کا معمار اس فکر میں تھا کہ ایک چھوٹا سا پاکستان، ہندوستان کے مغرب میں بھی پیدا کر دے،

چنانچہ انھوں نے مہاراجہ جودھپور کو ایسے شرائط پیش کیے جو دل کو لبھا لینے والے تھے،

نواب بھوپال ان فرماں روایان ریاست میں سے ایک تھے جو ہندوستان کے دائرہ الحاق سے باہر رہنا چاہتے تھے۔ نواب صاحب کا کہنا تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت کسی کے ساتھ ملحق نہیں ہوں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ان کی ساری ہمدردیاں پاکستان کے ساتھ تھیں، مہاراجہ جودھپور بری طرح نواب بھوپال سے متاثر تھے، اپنے وزیر اعظم سی ایس ڈنکا ٹچار آئی سی ایس کے مشورہ کے برخلاف وہ مہاراجگان بڑودا اور اودے پور کے پاس بھی یہ التجا لے کر پہنچے کہ وہ پاکستان سے ملحق ہو جائیں تاکہ یہ علاقہ جودھپور، اودے پور، اندور، بھوپال اور بڑودا تک وسیع ہو جائے۔ ادھر سے ادھر تیز رو قاصدوں کا تانتا لگا ہوا تھا، جلدی جلدی مشورے ہو رہے تھے، وی پی مینن نے مہاراجہ جودھپور سے اپنے ایک انٹرویو کا حال بیان کیا ہے، جب کہ موصوف نے پستول نکال لیا تھا اور قتل کرنے کی دھمکی دی تھی، بہر حال پاکستان کی یہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی، [1]

مہاراجہ اودے پور کا جواب

جب مہاراجہ اودے پور کو اس نئے انتظام میں شرکت کا دعوت نامہ ہز ہائی نس مہاراجہ جودھپور اور بعض دوسرے والیان ریاست کی طرف سے ملا، تو رانا پرتاب سنگھ کی اس یادگار نے جواب دیا،

"میرا انتخاب، میرے اجداد پہلے ہی سے طے کر چکے ہیں، اگر ان کے پائے ثبات میں ذرا بھی جنبش آگئی ہوتی تو وہ ہمارے لیے حیدر آباد سے بڑی ریاست چھوڑ جاتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، اور میں بھی ہرگز ایسا نہیں کروں گا، میں ہندوستان کے ساتھ ہوں"!

دوسرے روز مہارانا اودے پور کے ایجنٹ نے مجھے دہلی میں فون کیا، اور دریافت کیا، کیا میں مہارانا کے جواب کو پسند کرتا ہوں؟

میں نے جواب دیا، نہ صرف اس جواب کو بے حد پسند کرتا ہوں بلکہ اس کی تعریف و تحسین کے لیے مجھے الفاظ نہیں ملتے، رانا پرتاپ کی اس ذریت صالحہ کا جواب اس سے زیادہ معقول اور کیا ہو سکتا تھا؟ اور وہ بھی ٹھیک اس وقت جب اس خاندان کی ۱۵ سو برس کی عظمت رفتہ کو خاک میں ملانے کی سازش

---

[1] Menon, Integration of the Indian States

ہو رہی تھی،

جام صاحب نوانگر نے مسٹر جیکر کے مشورہ کے مطابق ایک یونین بعض والیان ریاست کے ساتھ مل کر قائم کرنا چاہی، مہاراجہ بیانا اور بعض دوسرے والیان ریاست، بمبئی میں میرے مکان پر صلاح و مشورہ کرنے جمع ہوئے، ہم نے فیصلہ کیا کہ راجستان کی ایک یونین قائم کی جائے، جس کے راج پرمکھ مہارانا اودے پور ہوں،

مہاراجہ کشمیر کی فکرمندیاں

شروع شروع میں مہاراجہ کشمیر کا بھی یہ حال تھا کہ گو وہ ہندوستان کی طرف راغب تھے، لیکن پاکستان اور انڈیا میں سے کسے اپنائیں، یہ فیصلہ کرنے میں انھیں دشواری پیش آ رہی تھی، اس کا عارضی حل مہاراجہ نے یہ سوچا کہ سردست انڈیا اور پاکستان سے معاہدۂ قائمہ کر لیں، یہ فیصلہ انھوں نے ریاست کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر کیا تھا کیونکہ بھارت اور پاکستان دونوں سے جغرافیائی طور پر کشمیر ملا ہوا تھا،

پاکستان نے آمادگی کے ساتھ مہاراجہ کی تجویز منظور کر لی، اور معاہدہ قائمہ پر دستخط کر دیے، لیکن انڈیا اس چیز کو پسند نہیں کرتا تھا کشمیر ہندوستان سے بہت دور پڑتا تھا، کیونکہ مواصلات کا سلسلہ تقریباً کوئی نہیں تھا، لہٰذا معاہدۂ قائمہ صرف زیب قرطاس رہتا، اس کے برعکس اس معاہدہ سے پاکستان کو سرزمین کشمیر میں پاؤں جمانے کا موقعہ مل جاتا، جس میں بعد ازاں توسیع ہو سکتی تھی، یا کسی مناسب موقع پر فوجی قبضہ بھی کیا جا سکتا تھا،

۲۲- اکتوبر ۱۹۴۷ء تک یہ صورت قائم رہی، پھر پاکستان کی شہ پر، یا اس کے حسب ہدایت قبائلی حملے کا سلسلہ کشمیر پر شروع ہو گیا، اب مہاراجہ مجبور ہو گئے کہ ہندوستان سے مدد چاہیں،

انڈیا الحاق کے بغیر مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا- آخر مہاراجہ نے دستاویز الحاق پر دستخط کر دیے ہندوستان کشمیر کو بچانے پہنچ گیا، پاکستان کے جارحانہ اقدامات روک دیے گئے۔

اور جوناگڑھ

دوسری طرف نواب جوناگڑھ ان تمام حقائق سے انکار کر رہے تھے، جو جغرافیائی، ثقافتی، اور سیاسی طور پر ریاست کو بھارت سے وابستہ کیے ہوئے تھیں، انھوں نے اس وعدے کے برعکس جو کاٹھیاواڑ کے والیان ریاست سے کیا تھا، اور اپنی

رعایا کے اقتصادی مفاد کو یکسر نظر انداز کر کے پاکستان سے الحاق کر لیا،

اکتوبر میں باشندگان جونا گڑھ نواب کے خلاف بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، نواب پاکستان بھاگ گیا اور اپنے ساتھ ریاست کا سارا خزانہ، تمسکات، بیگم، بچوں اور کتوں کو بھی لے گیا۔ جونا گڑھ کے بعض لیڈروں نے ایک عارضی حکومت قائم کر لی، جس کے اصول و ضوابط میں نے مرتب کیے تھے، ۹ نومبر کو دیوان ریاست سر شاہنواز بھٹو، جن کے لیے اب عارضی حکومت کا مقابلہ کرنا اور کاروبار حکومت چلانا، دشوار ہو رہا تھا، مجبور ہو گئے کہ حکومت ہند کو ریاست سونپ دیں،

ٹراونکور کا آزادی پر اصرار

سر سی پی راماسوامی آئر کی بے لچک شخصیت ٹراونکور کی مسند وزارت عظمیٰ پر فائز تھی۔ ۱۱ جون کو انھوں نے اعلان کیا کہ انتقال اختیارات کی تجویز جس روز بروئے کار آئے گی اسی دن سے ٹراونکور ایک آزاد اور خود مختار حکومت ہوگی، یہ اعلان ہندوستان کی سب سے پرانی ریاست کی طرف ایک ممتاز اور منجھے ہوئے سیاست داں نے کیا تھا، جس کے مہاراجگان ریاست پر خدائی نصرت کے بل پر حکومت کرنے کے مدعی بنے چلے آرہے تھے، اسی اثنا میں سر سی پی ماہ بھی ملک میں ایک بم گولے کی طرح نمودار ہوئے، ان کا یہ اعلان کہ وہ پاکستان میں اپنا ٹریڈ ایجنٹ مقرر کر رہے ہیں سارے ملک کے لیے بے حد تلخ ثابت ہوا، جس سے عام برہمی اور ناراضی سارے ملک میں پھیل گئی،

میں سر سی پی راماسوامی آئر سے ۱۹۱۵ء سے واقف ہوں، جب ہم دونوں شانہ بشانہ ہوم رول لیگ میں کام کرتے تھے۔ وہ نہ صرف ایک محب وطن تھے، بلکہ نہایت دور اندیش ہندو سیاست داں بھی تھے۔ ان کا یہ رویہ میرے لیے حد درجہ تکلیف دہ ثابت ہوا، شاید ایک دن ایسا آئے جو یہ راز منکشف ہو سکے کہ، ایسا نو ٹنک اعلان کرنے پر کس چیز نے انھیں آمادہ کیا تھا؟

سر سی پی کے اس اعلان نے ان والیان ریاست میں نئی امنگ اور نیا حوصلہ پیدا کر دیا، جو ریاستوں کو ایک تیسری طاقت بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ علی یاور جنگ کے الفاظ ہیں،

"یہ والیان ریاست ٹراونکور کے جادوگر کی طرف اس نگاہ سے دیکھ رہے تھے، جو بہرحال ایک ساحل تو رکھتا تھا جہاں سے اپنا ناریل اور یورینیم دوسرے ملکوں

میں بہ آمد کر سکتا تھا۔" (۱)

سردار خفا ہو گئے

میں اس موقع پر موجود تھا، جب برلا ہاؤس دہلی میں سردار نے لنچ کے بعد، سر سی پی سے طویل گفتگو کی، جو جھنجھل میں ختم ہوئی۔ سردار بہت زیادہ برہم تھے اور یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ اگر ضروری ہوا تو وہ ٹراونکور کو سبق دے کر رہیں گے لیکن وائسرائے سے ملاقات کے وقت سر سی پی کا رویہ زیادہ سخت نہ تھا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مزید ملاقات کے بعد وہ یہ مان گئے کہ ٹراونکور کا انڈیا سے الحاق لازمی ہے۔

اس کے بعد حالات نے ڈرامائی طور پر پلٹا کھایا۔ سر سی پی ٹراونکور واپس گئے، مہاراجہ نے فوراً دستاویز الحاق اور معاہدۂ قائمہ پر دستخط کر دیے۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر سر سی پی پر اس کارروائی کے سبب چاقو سے حملہ کیا گیا، جس سے وہ زخمی ہوئے، اور مستعفی ہو گئے۔

اس ڈرامہ کا ضمیمہ بھی بڑا دلچسپ ثابت ہوا، ٹراونکور چھوڑنے کے کچھ روز بعد سر سی پی دہلی آئے، سردار نے انھیں لنچ پر مدعو کیا اور لکھا:

"میری کچھ سرشت ایسی ہے کہ جو دوستوں سے محروم ہو میں اس کا دوست بن جایا کرتا ہوں۔"!

لیکن سر سی پی کی حاضر جوابی، سردار پر سبقت لے گئی، انھوں نے جواب میں لکھا:

"وہ جو دوستوں سے محروم ہے، آج ایک دوست کے ہاں لنچ پر پہلے سے مدعو ہے!"

سر سی پی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لنچ کی دعوت دی تھی"!

آخر میں سر سی پی نے لکھا

"پھر کبھی! شاید اس سے بہتر حالات میں ملاقات ہو سکے"!

والیان ریاست کا اضطراب خیال

بہت سے والیان ریاست اب تک جس کشمکش میں پڑے تھے وہ الحاق سے خائف تھے، اور الحاق سے زیادہ اپنی رعایا سے دہشت زدہ تھے، وہ انڈین یونین کی سرپرستی اسی طرح چاہتے تھے جس طرح برٹش گورنمنٹ اب تک کرتی آئی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ یہ آس بھی لگی ہوئی تھی کہ اب انگریزوں کے عہد سے زیادہ مکمل آزادی

---

(۱) Ali Yawar Jung. Hyderabad in retrospect. p. 18

ے وہ بہرہ ور ہو سکیں گے،

محکمۂ امور ریاست کی طرف سے جب والیان ریاست کی ایک میٹنگ دہلی میں طلب کی گئی، سردار نے اپنے مخصوص انداز میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے استدعا کی کہ وہ حکومت کے ترجمان کی حیثیت سے اظہار خیال کریں۔ سردار کو معلوم تھا کہ یہ والیان ریاست تاج برطانیہ کے وفاداری کے جذبہ سے سرشار ہیں، یہ ہر حالت میں نمائندۂ تاج کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دینے پر مجبور ہیں، حقیقت یہ ہے کہ سردار اپنے مقصد میں اتنی سرعت سے اور اتنے پر امن طور پر ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے تھے، اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا سرگرم تعاون نہ حاصل ہوتا، ان کے طرز عمل سے والیان ریاست کو مایوس کر دیا، اور انھوں نے یقین کر لیا کہ برطانوی حکومت سے انھیں کسی طرح کی مدد نہیں مل سکتی۔

۲۵- جولائی کانفرنس کی تاریخ تھی اس سے پہلے، سردار نے بذات خود با وی پی مینن کے ذریعہ بہت سے ممتاز والیان ریاست سے الحاق کا وعدہ لے لیا تھا، پھر جب ایک بے تکلفانہ گفتگو کے موقع پر جو ایک پرائیویٹ لنچ میں ہو رہی تھی، جام صاحب اور مہاراجہ توانگر نے سردار کی پالیسی سے اظہار اتفاق کر کے بقیہ والیان ریاست کی کمر توڑ دی، ٭

چھتاری ڈیلی گیشن

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سردار، دونوں زبردست شخصیتوں کے مالک تھے، اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہر دو حضرات اس کوشش میں تھے کہ جس قدر جلد ممکن ہو حیدرآباد کا معاملہ نپٹا دیں۔ دونوں اس امر پر متفق تھے کہ حیدرآباد کو بھارت سے ملحق ہونا چاہیے، اور اس سلسلہ میں حتی الامکان کسی تصادم کی نوبت نہ آنی چاہیے، بشرطیکہ وہ ناگزیر نہ ہو جائے۔

حیدرآباد کی کشمکش

شروع ہی سردار اس حقیقت کے رمز آشنا تھے کہ نظام الحاق کے دائرہ سے الگ رہنا چاہتے ہیں، اور اس سلسلہ میں شاید مظاہرہ قوت کی بھی ضرورت پیش آئے گی، اگرچہ انھیں یقین کامل تھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اسے روکنے کی پوری کوشش کریں گے، اب گفت و شنید کا معاملہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر چھوڑ دیا گیا تھا، کیونکہ سردار انکے اخلاص پر کلی اعتماد رکھتے تھے۔ سردار لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ممنون بھی تھے کہ انھوں نے ملک کی بھلائی کے لیے وہ سب کیا تھا جو ان کے امکان میں تھا، لیکن حیدرآباد کا معاملہ دوسری ریاستوں سے قدرے مختلف تھا، اس لیے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا اس کا رد عمل بین الاقوامی طور پر، اور فرقہ وارانہ طور پر لازمی تھا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا اس معاملہ کو طے کرنا، باہر کی دنیا کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھا، کہ جو کچھ حکومت ہند کی طرف سے کیا جا رہا ہے، اس کی بنیاد فرقہ وارانہ نہیں ہے، بلکہ قومی مفاد کو پیش نظر رکھ کر ایک گھریلو مسئلہ کی طرح اسے سلجھایا جا رہا ہے۔

سردار خاص طور پر جبر اور دباؤ کو بروئے کار لاتے ہوئے اس لیے ہچکچاتے تھے کہ نظام

جیسے ممتاز مسلمان والی ریاست کے خلاف کسی تلخ اقدام پر وہ متہم نہ کیے جائیں، ان کا یہ خیال بھی تھا کہ سر والٹر مانکٹن سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے خاص تعلقات اس مرحلۂ صعب کو آسان بنا دیں گے،

سردار پٹیل سخت پریشان تھے

اس زمانہ میں دوسرے بھی بہت سے نازک اور پیچیدہ مسئلے تھے جنھیں سردار کو حل کرنا تھا، لہذا، اگر نظام سے معاملات کے طے ہونے میں کچھ دیر بھی لگ جائے تو سردار کو زیادہ فکر نہ تھی۔ وہ نہایت صبر اور استادانہ مہارت کے ساتھ شطرنج کی بساط پر اپنی چالیں چلتے رہے،

میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں ملک کی صورت حال کو پیش نظر رکھ کر سردار اس بات پر آمادہ تھے کہ نظام کو نرم سے نرم شرائط پر آمادۂ الحاق کر لیا جائے، تو بھی سر دست کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ اس کے بعد وہاں کی رعایا خود ہی اپنی بیداری کا ثبوت دے سکے گی۔ ایک مرتبہ اگر حیدرآباد، آزاد ہندوستان کے مدار میں داخل ہو گیا تو انھیں یقین تھا کہ حیدرآباد کے عوام پر بجا طور سے اس باب میں اعتماد کیا جا سکتا تھا کہ وہ خود آگے بڑھ سکیں گے۔ عوامی حکومت خواہ کتنی ہی محدود بنیاد پر کیوں نہ قائم ہو خود ہی اپنا راستہ ہموار کر لیتی ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مساعی کا خیر مقدم کر رہے تھے، اور اپنے بعض بنیادی اصولوں تک کو، صرف اس مسئلہ کی حد تک مفاہمت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے کو تیار تھے،

اس تمام مدت میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار کی منظوری لیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا، لیکن یہ ضرور ہوا، اور کئی دفعہ ہوا کہ نظام کو جو رعایتیں دی جا رہی تھیں انھیں کراہت کے ساتھ سردار نے منظور کیا، یا اس امید پر کہ یہ رعایتیں بھی بہر طور نظام کو منظور نہ ہوں گی، پھر وہ کیوں انھیں مسترد کر دیں۔

اگرچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نظام کو دائرہ الحاق میں لے آنے کی اپنے مقدور بھر پوری سعی کر ڈالی، نظام اور ان کے مشیر یہ باور کیے بیٹھے رہے کہ سر والٹر کی استادی، اور رسوخ کا بالآخر یہ نتیجہ نکلے گا کہ حیدرآباد، اگر آزادی نہیں تو آزادی کا جوہر ضرور حاصل کر لے گا۔

سر والٹر مانکٹن

سر والٹر مانکٹن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس بات پر آمادہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کہ اس سلسلہ میں نظام پر کوئی جبر نہ ہونا چاہیے۔ نظام اور ان کے مشیر اس بات کا یقین رکھتے تھے ——— اور بیرے

خیال میں یہ یقین غلط نہ تھا ______ کہ حکومت ہند کے حملہ سے بچانے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بڑھ کر ان کا محافظ کوئی نہ تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سر والٹر مانکٹن دونوں اس حقیقت سے یکسر نا آشنا تھے کہ حیدر آباد کو آزاد رہنے دینا اور ہندوستان کو برباد کر دینا ایک ہی چیز کے دو نام تھے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے الفاظ میں صرف جغرافیہ ہی کا دباؤ نہیں تھا، بلکہ تاریخ، زبان ثقافت تہذیب، معاشرت اور سیاست سب کا تقاضا یہ تھا کہ حیدر آباد، ہندوستان کا جزو لاینفک رہے،

کیمپبل جانسن نے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے، ا

"میرے اور اسمے کے دوران قیام لندن میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن ایک ایسے فارمولے کی جستجو میں رہے، جو الحاق (Accession) اور اشتراک (Association) کی معنوی بلاغت کا حامل ہو، سردار کے نزدیک وہ الحاق ہو، اور ہز اگزالٹڈ ہائی نس کی نظر میں اشتراک"۔ا

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی بیقراری

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس بات کے لیے بیقرار تھے کہ ہندوستان چھوڑنے سے پہلے جس طرح بھی ہو حیدر آباد سے کوئی مفاہمت کر لیں، میر لائق علی اور معین نواز جنگ ان کی اس خواہش سے باخبر تھے اور اس لیے یقین رکھتے تھے کہ گفتگوئے مفاہمت ختم کرنے کے مقابلہ میں وہ ہر دوسری تجویز منظور کر لیں گے۔

نظام نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستان سے گفت و شنید آزادی کی بنیاد پر نہ کہ الحاق کی بنیاد پر جاری رکھنے کو تیار ہیں۔ جولائی کے آغاز میں انھوں نے ایک وفد بھیجا، جو نواب چھتاری، وزیر اعظم حیدر آباد، سر والٹر مانکٹن، اور نواب علی یاور جنگ پر مشتمل تھا، قاسم رضوی بھی اس وفد کے ساتھ ساتھ تشریف لائے تھے۔

دہلی میں یہ لوگ مسٹر جناح سے مشورہ حاصل کرنے گئے، میں بڑی آسانی سے اس انٹرویو کا اندازہ کر سکتا ہوں، مسٹر جناح میرے پرانے دوست اور مسلم لیگ کے زمانہ کے لیڈر تھے، وہ نہایت ٹھاٹھ اور شان سے، پیکر وقار بنے بیٹھے، اور اپنے مانوکل (Monocol) سے کھیل

MISSION WITH MOUNTBATTEN P 251

دبے ہوں گے، حاضرین ادب و عقیدت سے سر جھکائے بیٹھے ہوں گے، پھر حسب عادت فوراً ہی مسٹر جناح نے اپنے جھنجھوڑ دینے والے انداز میں آقایانہ طور پر وعظ و پند شروع کر دیا ہوگا کہ ہر شخص کو اب کیا کرنا چاہیے؟

معمار پاکستان اور حیدر آباد

معلوم ہوا ہے کہ اس موقع پر معمار پاکستان نے اس امید کا اظہار کیا کہ اگر حیدر آباد کی طرف حکومت ہند کا تیغ استبداد استبداد بڑھا، تو شہید اعظم امام حسین کی طرح آزادی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو قربان کر دینا ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا،

مسٹر جناح نے یہ بھی کہا کہ ذمہ دار حکومت، ہندوستانی ریاستوں میں دفعتہً اور فوراً نہیں قائم کی جا سکتی، اس کے لیے سیاسی تجربہ اور تربیت ضروری ہے، جس سے ریاستی باشندے یکسر محروم ہیں بے شبہ وہ وقت آئے گا، جب ریاستوں میں بھی ذمہ دار حکومت متعارف ہوگی، لیکن اس کے لیے کچھ وقت چاہیے، تاہم اس کا آغاز کر دینا چاہیے، لوگوں کو اعتماد میں لینے کی سعی کرنی چاہیے، لیکن وقت آگیا ہے کہ ذمہ دار حکومت کی طرف سرعت رفتاری کے ساتھ اقدام شروع کر دیا جائے۔

چھتاری کا جناح سے سوال

اس موقع پر نواب چھتاری نے مسٹر جناح سے ایک سوال کر کے انھیں بھڑکا دیا، انھوں نے پوچھا،

"اگر ہندوستان نے جنگ کا الٹی میٹم دے دیا تو کیا پاکستان مدد کو آئے گا؟"

"ہرگز نہیں!!" مسٹر جناح نے حسب معمول بلند آہنگ انداز میں کہا، "پاکستان ہرگز حیدر آباد کی مادی مدد نہیں کر سکتا۔!" (۱)

۲۵۔ جولائی کو، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایوان والیان ریاست کو خطاب کیا، اور والیان ریاست کو انڈین یونین میں شریک ہونے کی ترغیب دی۔ اس موقع پر چند ممتاز والیان ریاست مہاراجگان نوانگر، بڑودہ، میسور، بیکانیر، گوالیار، اور پٹیالہ کی سرکردگی میں اس بنیاد پر کہ صرف معاملات خارجہ، دفاع اور مواصلات ہندوستان کی طرف منتقل ہو جائیں گے، الحاق پر رضامندی کا اظہار کر دیا،

---

(۱) ALIYAWAR JUNG HIDERABAD IN RETROSPECT P.12

دستاویز الحاق پر دستخط کی آخری تاریخ ۱۵- اگست تھی اس موقعہ پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک مجلس گفت و شنید دوسرے مراحل کی تکمیل کے لیے قائم کی، لیکن نواب چھتاری نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا، اس طرح حیدرآباد کا معاملہ پھر التوا میں پڑ گیا۔

رضوی پر جناح کی سرد مہری کا اثر

رضوی نے سوچا مسٹر جناح کی سرد مہری کا حیدرآباد کے عوام اور نظام پر نہایت خراب اثر پڑے گا اس نے حیدرآباد جاتے ہی چھتاری ڈیلیگیشن کے ممبروں کو غدار کا خطاب دے دیا، نواب چھتاری اس لیے غدار تھے کہ وہ یوپی میں ایک بڑی زمینداری کے مالک تھے، علی یاور اس لیے غدار تھے کہ وہ پٹیل اور نہرو کے آلۂ کار تھے، سر والٹر مانکٹن اس لیے کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دوست تھے، صرف پنگل وینکٹ راما ریڈی اور مسٹر رحیم وفادار اور صادق ثابت ہوئے، جنھوں نے اس مکتوب پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا، جو ماؤنٹ بیٹن کو لکھا گیا تھا اور جس کی رو سے دفاع اور معاملات خارجہ، حیدرآباد کے قبضہ سے نکل کر بھارت کے پاس چلے جاتے،

یاد رکھنا چاہیے یہ مکتوب نظام کی منظوری سے لکھا گیا تھا، وفد پر الزام یہ لگایا گیا کہ نظام نے جس خط کی منظوری دی تھی یہ اس سے مختلف تھا،

۲۵- اگست کو چھتاری وفد حیدرآباد واپس آیا تھا کہ نظام کے عتاب کا شکار ہو، اور مسلم لیگ سے غداری کا لقب حاصل کرے،

اب نظام نے فیصلہ کیا کہ بھارت یا پاکستان کے بجائے وہ براہ راست برطانوی حکومت سے الحاق پسند کرے گا،

نواب چھتاری نے نرم طریقہ پر اتحادی لیڈر علی کو جب وہ جنگ کا نعرہ لگا رہے تھے حقیقت احوال سے روشناس کرنے کی کوشش کی۔ وہ پھر مسٹر جناح کے پاس پہنچے کہ آیا پاکستان اسلحہ بھی دے سکے گا؟ ---------- "ہرگز نہیں، ایک گن بھی نہیں —— !" قائد اعظم نے صاف جواب دے دیا۔ جنگ بغیر اسلحہ کے نہیں لڑی جا سکتی تھی، اتحادی لیڈروں نے نواب چھتاری پر زور ڈالا کہ وہ جنرل العیدروس کمانڈر انچیف کو سامان جنگ خریدنے یورپ بھیجیں،

علی یاور جنگ کے لیے طے ہوا کہ وہ لائق علی کے ساتھ انگلستان اور امریکہ جائیں، تاکہ ایک دفاعی سمجھوتہ ان ممالک سے کر لیا جائے، لیکن وہ مرد زیرک مستعفی ہو کر اپنا دامن بچا لے گیا۔

نظام کی امیدیں انگریزوں سے

۱۴۔ اگست کی شب کو نظام نے آخری برطانوی ریزیڈنٹ کو الوداعی ڈنر دیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"میری اور باشندگان حیدرآباد کی یہ آرزو ہے کہ ہم برطانوی دولت مشترکہ کے خاندان کے رکن بن جائیں، دوستی کی اس طویل مدت پر ایک نظر ڈالنے کے بعد میں یقین کرتا ہوں کہ برطانیہ عظمی تعلقات کے اس رشتہ کو ٹوٹنے نہیں دے گی۔"

مسٹر ہربرٹ ریزیڈنٹ کی رخصتی تقریر، پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی ذہنیت کی ترجمان تھی:

"مجھے ہز اگزالٹڈ ہائی نس کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ برطانیہ اور حیدرآباد کے درمیان نئے تعلقات مضبوط بنیادوں پر جلد قائم ہو جائیں گے۔"

رضوی کی فتحمندیاں

نظام کا فرمان ۱۱۔جون سنہ ۱۹۴۷ء کو نظام نے ایک فرمان صادر کیا کہ ۱۵۔اگست کو آزادی ہند و انتقال اختیارات کے وقت وہ اپنے آپکو خودمختار اور آزاد فرمانروا قرار دینگے اس فرمان کے جواب میں ریاستی کانگرس نے الحاق کے نام پر سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔کانگرس کا مطالبہ یہ تھا کہ ریاست میں ایک ذمہ دار حکومت قائم کی جائے جو انڈین یونین سے ملحق ہو جائے۔

چیلنج ۱۵۔جون کو رضوی نے کانگرس کو چیلنج دیتے ہوئے وہ اعلان کیا جو پہلے ہی سے ایک ثابت شدہ حقیقت بنا ہوا تھا، یہ کہ رضا کار ایک مسلح جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ کہ ۱۵۔اگست کو حیدرآباد آزاد ہو جائے گا، رضوی نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو ترغیب دی کہ حریت و استقلال کے حصول کے لیے وہ ہر قربانی پر آمادہ رہیں،

تقریر ۱۹۔جون کو قاسم رضوی نے ایک پبلک تقریر میں بانگ دہل کہا،

" اعلیٰ حضرت کے فرمان شاہی کی مخالفت کرنا وفاداری کے خلاف ہے، ہر شخص کو اس فرمان کی اہمیت محسوس کرنی چاہیے، حیدرآباد کا یہ فطری حق ہے کہ وہ آزادی کا اعلان کرے، یہاں کی سطوت شاہی کے محافظ مسلمان ہیں، "

یہ بات بالکل قدرتی تھی کہ چیلنج اور جوابی چیلنج کے جواب میں مسلح رضاکاروں اور غیر مسلح کانگرسی کارکنوں میں تصادم ہو، نظام گورنمنٹ خاموشی کے ساتھ لیکن تحسین کی نظروں سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھی؛

یوم آزادی ۲۰۔جون کو مجلس اتحاد نے یوم آزادی، شہر حیدرآباد میں دھوم دھام سے منایا، ۷۔اگست کو ریاستی

کانگرس کی زیر قیادت، ۴۵۴ مراکز نے "انڈین یونین میں شامل ہو جاؤ" کا دن جوش و خروش سے منایا، ان تقریبوں کے موقع پر ۱۰۸۰ آدمی گرفتار ہوئے متعدد مقامات پر، عام مجمعوں پر لاٹھی چارج بھی کیا گیا، سوامی رامانند تیرتھ بھی جو ریاستی کانگرس کے صدر تھے گرفتار کر لیے گئے،

قومی جھنڈا

کانگرس چیلنج کو قبول کر چکی تھی۔ اس نے باشندگان حیدرآباد سے اپیل کی کہ تمام عمارتوں پر ۱۵۔ اگست کو قومی جھنڈا لہرایا جائے۔

۱۴۔ اگست کو نصف شب کے بعد، جب گلبرٹی مدراس ایکسپرس حیدرآباد سے گزری تو حیدرآباد اسٹیشن کی پولیس ٹرین میں داخل ہوئی، اور اس نے قومی جھنڈے ساری ٹرین، حتیٰ کہ وہ جوں کے اندر سے نکال دیے،

لاٹھی چارج

یوم آزادی کے موقع پر جلوس نکلے اور مظاہرے ہوئے، مظاہرین اور سرمائے جلوس قومی جھنڈا لہرا رہے تھے، پولیس نے لاٹھی چارج کیا، کہیں کہیں گولی چلنے کی نوبت بھی آئی، بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں ہوئیں، مسلح رضاکاروں نے پولیس کی امداد و تعاون سے جہاں کہیں بھی قومی جھنڈا دیکھا نوچ ڈالا، اور ہر طرح اس کی ذلت کی، حد یہ ہے کہ حکومت ہند کی عمارتوں پر جو جھنڈے لہرا رہے تھے غیظ و غضب کا نشانہ بننے سے وہ بھی نہ بچ سکے،

۲۹۔ اگست کو، جب پنڈت جی نے دستوریہ ہند میں ان شورشوں کے خلاف اظہار خیال کیا تو حیدرآباد گورمنٹ نے نہایت صاف اور واضح الفاظ میں انکار کر دیا کہ کہیں بھی قومی جھنڈے کی توہین نہیں ہوئی۔

ستیہ گرہ

ریاستی کانگرس کی تحریک ستیہ گرہ جنگل کی آگ کی طرح بڑھنے اور پھیلنے لگی، تقریباً ۹ ہزار آدمیوں نے گرفتاری کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا، جن کے ہاتھ میں قومی پرچم تھے، اناج پر جو محصول عائد کیا گیا تھا، اسے ادا کرنے سے بھی بہت سے لوگوں نے انکار کر دیا، دیہاتوں میں تاڑی کے ہزاروں درخت کاٹ دیے گئے، سیکڑوں حکام دیہات نے استعفا دے دیا، کانگرس، کمیونسٹ، اور دیہاتیوں نے متحد ہو سرحدی علاقوں کی کسٹم چوکیاں برباد کر دیں، اسکولوں اور کالجوں کے ہزاروں طلبہ نے قانون شکنی کی،

راست اقدام

رضوی بھی اپنے مشن پر نہایت سختی سے عمل کرتا رہا۔ اس نے اعلان کیا، حیدرآباد آزاد اور خود مختار ہو چکا ہے اور نظام گورنمنٹ کو صاف الفاظ میں راست اقدام کی دھمکی دی اگر انڈین

یونین سے الحاق کا ارادہ بھی کیا۔ جن دیہاتوں نے کانگرس کی تحریک ستیہ گرہ میں حصہ لیا تھا، انھیں بہت تعزیر بنا لیا گیا، اور وہاں دہشت پیدا کر دی گئی، سکندر آباد کے بہت سے ہندو، انڈین یونین کے ملحقہ اضلاع میں پناہ لینے کے لیے پہنچ گئے۔

۱۵- اگست، الحاق کی آخری تاریخ آئی، اور گذر گئی"!

نظام نے الحاق کی دستاویز پر دستخط نہیں کیے،

سر والٹر مانکٹن کو اب تک امید تھی کہ اگر مزید مہلت ملے تو گفت و شنید کامیاب ہو سکتی ہے اگرچہ سردار رضامند نہ تھے لیکن حکومت ہند نے لارڈ ماؤنٹ کو مزید دو مہینہ دے دیے کہ اس عرصہ میں وہ اپنی گفت و شنید اگر بار آور کر سکتے ہیں تو کر لیں۔ اس اثنا میں اتحادی لیڈروں نے کوشش کی کہ خارجی طور پر حیدر آباد کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنایا جائے، اور اس کی صورت یہ سوچی گئی کہ برطانیہ اور امریکہ سے تجارتی معاہدے کر لیے جائیں،

۱۷- اگست کو نظام نے ایک فرمان صادر کیا، کہ ۱۵- اگست کو وہ آزاد اور خود مختار فرماں روا کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں، فوراً ہی اتحادی لیڈروں نے زور شور سے یہ تحریک شروع کر دی کہ اب انھیں ہز میجسٹی کہا جایا کرے،

سر والٹر مانکٹن سر والٹر مانکٹن کی یہ رائے تھی کہ نظام کو انڈین یونین سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے، اس مشورہ نے بیچارے کو مطعون کر دیا، اور اتحادی حلقہ میں وہ معتوب و مردود قرار پائے۔ رضوی نے پبلک جلسوں میں ان کی خبر لینا شروع کر دی آخر انھوں نے نظام کی خدمت میں استعفا پیش کر دیا، نواب چھتاری اور نواب علی یاور جنگ نے بھی اپنے اپنے استعفے پیش کر دیے، سر والٹر کے استعفے کی خبر سنکر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہہ اٹھے،

"ہم ڈوب گئے"!!

واقعہ یہ ہے کہ سر والٹر، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے لیے ترپ کا پتہ تھے!

خود نظام بھی کم پریشان اور حواس باختہ نہ تھے، یہ محسوس کر کے کہ ان کا داؤں نہیں چلا، وہ ایک اور داؤں چلنے پر تیار ہو گئے، ۱۷- اگست کو نواب چھتاری نے نظام کے حسب ایما سردار کو ایک خط لکھا کہ ہم گفت و شنید ایک ہفتہ کے بعد شروع کریں گے، سردار نے فوراً اس پر آمادگی ظاہر

کر دی،

۲۴- اگست کو نظام نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ وہ سر والٹر کو حیدرآباد کے مشیر دستوری کی حیثیت سے کام جاری رکھنے پر آمادہ کریں، یہ درخواست قبول ہوئی، لیکن سر والٹر نے یہ شرط عائد کی کہ رضوی نے جو الزامات ان پر عائد کیے تھے، بلک طور پر وہ واپس لیے جائیں، فوراً ہی نظام نے ایک فرمان صادر کیا، جس میں چھتاری ڈیلی گیشن پر حملہ کرنے والوں کی مذمت کی گئی تھی، اس طرح انھوں نے اپنے دستوری مشیر کو جو روٹھ گیا تھا راضی کر لیا،

اب حیدرآباد اور انڈین یونین کے تعلقات کا انحصار سر والٹر پر تھا، !

جب حیدرآباد ڈیلی گیشن نے جو نواب چھتاری، نواب علی یاور جنگ، سر والٹر مانکٹن، اور سر سلطان احمد پر مشتمل تھا، نئی دہلی کا رخت سفر باندھ رہا تھا، سردار حد درجہ ملول و غمگین تھے،

ریفرنڈم

۲۴- اگست کو انھوں نے گورنر جنرل (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) کو لکھا کہ وہ دستاویز الحاق میں کسی طرح کی تبدیلی کرنے کو تیار نہیں ہیں، جس دستاویز پر دوسرے والیان ریاست نے دستخط کیے ہیں اس پر نظام کو بھی کرنا ہوں گے، اور اگر نظام گورنمنٹ انڈین یونین سے الحاق نہیں کرنا چاہتی تو پھر حیدرآباد میں ریفرنڈم ہونا چاہیے -

سردار کے حسب ہدایت جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نظام پر زور دیا کہ وہ دستاویز الحاق پر دستخط کر دیں، تو اسی شدت سے نظام نے انکار کر دیا، نظام نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۸- ستمبر میں لکھا کہ الحاق کا کوئی سوال نہیں ہے یہ تو دو آزاد اور خود مختار حکومتوں میں مساویانہ بنیاد پر معاہدے کی بات چیت ہے، نظام کے مکتوب سے یہ بات بھی عیاں تھی کہ انڈین یونین سے باقاعدہ الحاق یا انڈین یونین کے دائرہ قانون کو حیدرآباد تک وسعت دینا خارج از بحث بات ہے، نظام نے ریفرنڈم کی تجویز بھی مسترد کر دی تھی۔

نظام نے جو مسودہ تجویز کیا تھا، اس کی رو سے حیدرآباد ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے دومینین آف انڈیا سے، بعض خاص معاملات میں اشتراک پر تیار تھا، لیکن غیر ممالک سے سیاسی تعلقات کے قیام میں حیدرآباد آزاد ہوگا، انڈین یونین کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا، حیدرآباد کی فوج کی بھرتی، اس فوج کے ساز و سامان جنگ کی فراہمی، اور اس فوج کا نظم و ضبط، تمام تر

حیدرآباد کا تابع ہوگا، اس کے حکام اور سالار بھی نظام گورنمنٹ مقرر کرے گی، بیرونی حملے اور جنگ کی صورت میں حیدرآبادی فوج کا ایک حصہ، امداد و اعانت کے لیے حکومت ہند کو تفویض کر دیا جائے گا، لیکن اگر جنگ پاکستان سے ہوئی تو حیدرآبادی فوج حکومت ہند سے تعاون و اشتراک نہیں کرے گی۔ حیدرآباد کے مواصلات اور ذرائع نقل و حمل بھی، انڈین یونین کی بالادستی سے آزاد ہوں گے، لیکن آل انڈیا معیار بحال رکھنے کے لیے اس سلسلہ میں معاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

نظام نے یہ بات بھی صاف کر دی تھی کہ برطانوی حکومت وعدہ کر چکی ہے کہ وہ ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالے گی،

نظام کی دھمکی

مکتوب کے خاتمہ پر نظام نے دھمکی دینے سے بھی گریز نہیں کیا، :

"اگر انڈین یونین مجھ سے الحاق کے مطالبہ پر بضد رہی، تو آئندہ اس سلسلہ میں کسی طرح کی گفت و شنید نہیں کی جائے گی، اگر یہ گفتگوئے مصالحت ناکام ہوئی تو میں اپنی اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ساری خط و کتابت شائع کر دوں گا، !"

سر والٹر مانکٹن نے نظام پر زور دیا کہ وہ حکومت ہند سے ایک معاہدہ کر لیں، جو کسی حد تک الحاق کا ہم رتبہ ہوگا، لیکن آئین اور قانونی طور پر حیدرآباد آزاد رہے گا۔

سر والٹر نے نظام کو یہ مشورہ بھی دیا کہ جب حالات بدل جائیں یعنی جب پاکستان اور حیدرآباد قوت حاصل کر لیں تو یہ معاہدہ کالعدم کر کے نیا معاہدہ زیادہ بہتر شرائط پر دونوں حکومتوں سے کیا جا سکتا ہے اس دوران میں پاکستان سے روابط زیادہ سے زیادہ مستحکم کیے جائیں، اور حکومت ہند سے اسی تناسب سے کمزور، اس دوران میں زیادہ سے زیادہ دیر تک گفت و شنید کو طول دیا جائے، اور مناسب موقع پر تصادم کے لیے تیار رہا جائے۔

۲۲ ستمبر کو، حیدرآباد ڈیلی گیشن لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا، اس میں نواب چھتاری، علی یاور جنگ سر والٹر مانکٹن، اور سر سلطان احمد شامل تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انڈیا اور پاکستان میں ہر وقت جنگ چھڑ جانے کا خطرہ تھا، حیدرآباد ڈیلی گیشن نے اس موقع پر کانگرسی لیڈروں کو مرعوب کرنے کی پوری کوشش کی۔ اگر نظام کو الحاق پر مجبور کیا گیا تو حیدرآباد میں خون کی ندیاں بہ جائیں گی، مسلمان ہندوؤں کو ذبح کر دیں گے، اور سارے ملک میں ہندو مسلم فساد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

اس موقع پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا،

" اگر حیدرآباد میں خون کی ندیاں بہیں اور ہندوؤں کا قتل عام ہوا تو کیا حکومت ہند چپ چاپ بیٹھی تماشہ دیکھتی رہے گی؟ "

اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا!

متفقہ عنوانات

بہر حال کافی بحث و مباحثہ کے بعد سر والٹر مانکٹن نے معاہدہ کے چند متفقہ عنوانات قائم کرلئے، ڈیلی گیشن حیدرآباد واپس چلا گیا، لیکن نظام چٹان کی طرح اپنی جگہ قائم تھے۔ اس اثنا میں کوئی تمام خاص اندر ہی اندر وقوع پذیر ہو چکی تھی، شاید پاکستان کی طرف سے کوئی ہدایت نامہ موصول ہو گیا تھا، اپنے مکتوب مورخہ ۲۰ ستمبر میں نظام نے اپنی خود مختاری پر پھر اصرار کیا تھا، اور سارے جنوبی ہند میں خون ریزی کی پیش گوئی بھی کردی تھی، اگر حیدرآباد کو الحاق پر مجبور کیا گیا،

سر والٹر مانکٹن نے مایوس ہو کر انگلستان جانے کا فیصلہ کرلیا، انگلستان روانہ ہونے سے پہلے انھوں نے نظام کی طرف سے، بادشاہ برطانیہ، مسٹر اٹیلی، اور برطانیہ کی قدامت پرست پارٹی کے لیڈروں کے نام متعدد خطوط کا مسودہ تیار کیا، سر والٹر کو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ تھا، انھوں نے رخصت ہوتے وقت کہا۔

" میں جاتا ہوں، لیکن بہت جلد پھر واپس آؤں گا "!

لیکن سر والٹر کے جانے کا نظام کو قلق بھی تھا، وہ اس بات سے خائف تھے کہ اگر سر والٹر چلے گئے تو سردار، گفت و شنید کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں گے، اور یہ بات نظام کو کسی صورت میں بھی منظور نہ تھی۔

یہ ماننا پڑے گا کہ سر والٹر مانکٹن کا زرخیز دماغ نئی نئی تجویزیں خوب سوچتا تھا، اب انھوں نے ایک نیا شگوفہ کھلا دیا، ان کی رائے تھی کہ چھ ماہ کے لیے ایک معاہدہ کرلیا جائے، ان کا خیال تھا اس طرح جو مہلت ملے گی، اس میں فضا ہموار ہو جائے گی۔

اس اثنا میں نظام، اور سر والٹر مانکٹن کی طرف سے برابر لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر زور دیا جاتا رہا کہ بلارم، ریذیڈنسی اور چھاؤنی کا علاقہ حیدرآباد کو واپس دے دیا جائے اور سکندر آباد سے

ہندوستانی فوج واپس بلالی جائے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اگلے مہینہ میں ہندوستانی فوج واپس بلا لینے کا وعدہ کر لیا، لیکن سردار اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔

اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے، وی پی مینن سے کہا کہ وہ حیدر آباد جائیں، اور اپنی مسلمہ سحر طرازی سے کام لیں۔ عین اس وقت جب مینن رخت سفر باندھ رہے تھے نواب چھتاری نے استدعا کی کہ وہ سفر کا ارادہ ترک کر دیں کیونکہ حیدر آباد میں اس وقت قانون اور امن کا جو حال ہے اس کا تقاضہ یہی ہے، رضا کار کسی قیمت پر بھی دہلی کے کسی نمائندے کا وجود حیدر آباد میں نہیں گوارا کریں گے، ——— مینن جو ریاستی بندے کے لیے ایک وحشتناک وجود تھا، یہ سنکر اپنا بندھا ہوا سامان کھولنے پر مجبور ہو گیا،

سر والٹر نے اس طمانچہ کی چوٹ ہلکی کرنے کی کوشش کی، انھوں نے یقین دلایا کہ مینن کو حیدر آباد آنے کی اجازت نہ دینے سے حکومت ہند کی توہین ہرگز مقصود نہیں ہے، بہر حال یہ یقین دہانی تسلیم کی گئی، اور یہ توہین چپ چاپ سہ لی گئی،

دلائل بازی

۲۰ اکتوبر کو حیدر آباد ڈیلی گیشن پھر دہلی آیا، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا، دونوں طرف سے دلائل پیش ہوئے، ہر تجویز کے بارے میں وفد کا جواب ایک ہی ہوتا تھا، کہ یہ بات اعلیٰ حضرت کے گوش گزار کر دی جائے گی، پھر جو وہ فیصلہ کریں، سر والٹر نے نظام کی اس پالیسی کا اعادہ کیا کہ ان کی نگاہ میں ہندو مسلمان برابر ہیں اور وہ اپنی ہندو مسلم رعایا سے مساوی سلوک کرتے ہیں اور کریں گے،

لیکن سر والٹر نے اس عمل کے بارے میں کچھ نہیں کہا، جو اس اعلان مساوات کے برعکس ہندو رعایا کے ساتھ روبہ کار لایا جا رہا تھا،

یہ مطالبہ کہ دفاع اور امور خارجہ سے متعلق خاص اختیارات نظام ہی کے تصرف میں رہیں گے، سردار نے نامنظور کر دیا، اور اس سے بہتر یہ ہے کہ سلسلۂ گفت و شنید منقطع کر دیا جائے : سردار نے کہا، بہ نسبت اس کے کہ یہ مطالبات مان لیے جائیں،، سردار کے اس رویہ نے نظام میں کسی حد تک تبدیلی پیدا کی۔ چنانچہ ڈیلی گیشن پھر نئی دہلی آیا، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا،

کافی بحث و گفتگو کے بعد ایک سال کے لیے معاہدۂ قائمہ کا مسودہ تیار کیا گیا، جس میں تین عنوانات یعنی۔ دفاع، امور خارجہ، اور مواصلات مرکز کو تفویض کیے گیے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے

اس مسودہ میں نظام کو کافی اور مخصوص رعایتیں دی تھیں۔ یہ مسودہ وی پی مینن نے سر والٹر مانکٹن کے مشورہ سے تیار کیا تھا، اور اسے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جی اور سردار نے منظور کر لیا تھا،

ڈیلی گیشن کے تمام ممبروں کی رائے تھی کہ نظام اس مسودہ کو منظور کر لیں گے، ہر شخص مطمئن اور مسرور تھا کہ آخر کار جنوبی ہند میں امن قائم رہے گا، کم از کم ایک سال تک تو بہر حال، اور اس کے بعد شاندار صبح سعادت طلوع ہوگی، ــــــــــ لیکن اس صبح سعادت کے متعلق متعلقہ جماعتوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

۲۲ کی سہ پہر کو ڈیلی گیشن حیدر آباد واپس پہنچا اور سیدھا کنگ کوٹھی چلا گیا، وہاں اس نے نظام کو مجوزہ معاہدۂ قائمہ کا مسودہ پیش کیا، پہلے تو نظام کچھ متامل نظر آئے، پھر یہ مسودہ اگزیکٹو کونسل کے پاس بغرض مشورہ بھیج دیا،

کامل تین روز تک ــــــــ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵ ــــــــ اس مسودہ پر اگزیکٹو کونسل نے غور کیا، اور بال کی کھال نکالی،

ایک موقعہ پر اگزیکٹو کونسل کا جلسہ خاص کنگ کوٹھی میں منعقد ہوا جس کی صدارت بہ نفس نفیس نظام نے کی۔ اس موقع پر عید روس کمانڈر انچیف افواج نظام بھی موجود تھے، اور خاص دعوت پر راجہ بہادر آراموددا منگر بھی تشریف فرما تھے،

انفرادی مشورہ

نظام نے حاضرین میں سے ہر ایک کی الگ الگ انفرادی رائے طلب کی پنگل وینکٹ راما ریڈی نے خالص درباروانہ انداز میں کہا،

"میری وہی رائے ہے جو اعلیٰ حضرت کی"

اعلیٰ حضرت بھڑک اٹھے،

"میں نے تمہیں یہاں اس لیے بلایا ہے کہ ہر ایک کی انفرادی رائے معلوم کروں، نہ کہ اپنی آواز بازگشت سنتا رہوں"

راجہ بہادر نے میٹنگ سے چند سوالات کرنے کی اجازت چاہی، نظام نے اجازت دے دی۔ ریڈی نے پوچھا،

"کیا ہم کبھی بھی انگلینڈ، فرانس، یا جرمنی کی طرح آزاد تھے؟"

متفقہ جواب تھا "نہیں"

"فرض کیجئے انڈین یونین اور حیدر آباد میں تصادم ہوتا ہے، ہم کب تک میدان میں ٹھہر سکتے ہیں؟"

——— راجہ بہادر نے سوال کیا،

العیدروس سپہ سالار افواج نظام نے جواب دیا،

"زیادہ سے زیادہ چار روز!"

نظام نے مداخلت کرتے ہوئے کہا،

"نہیں، زیادہ سے زیادہ دو دن!"

"پھر دور اندیشی کا تقاضہ یہ ہے کہ معاہدہ قائمہ پر دستخط کر دیے جائیں!"

راجہ بہادر نے کہا، "دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں ہم نے کہیں بہتر شرائط حاصل کر لیے ہیں"

نواب مہدی یار جنگ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ مخالفت میں صرف معین نواز جنگ کی اور ایک دوسرے حضرت کی آواز بلند ہوئی۔

"مجھے نیکل کی رائے سے اتفاق ہے" نظام نے کہا۔

ہر شخص مطمئن ہو کر اس تاثر کے ساتھ اپنے گھر چلا گیا کہ نظام معاہدہ پر دستخط کر دیں گے اور دوسرے روز ڈیلی گیشن روانہ ہو جائے گا،

ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں میں سے چھ نے معاہدہ کے مسودہ سے اتفاق کا اظہار کیا، معین نواز جنگ عبدالرحیم اور ایک تیسرے وزیر نے اختلاف کا اظہار کیا؛

پچیس تاریخ کو نظام نے ایگزیکٹو کونسل کا فیصلہ منظور کر لیا اور وعدہ کیا کہ چند معمولی ترمیموں کے ساتھ معاہدہ قائمہ کی دستاویز پر دستخط کر دیں گے۔

دو نکتوں پر زور

دوسرے روز نظام نے ان خطوں کا مسودہ بھی منظور کر لیا جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام بھیجے جانے والے تھے، ایک مسودہ میں نظام نے دو نکتوں پر خاص طور سے زور دیا، ایک تو یہ کہ اگر انڈیا بھی برطانوی خاندان مشترکہ سے الگ ہوا تو وہ اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کریں گے، دوسرے یہ کہ اگر انڈیا اور پاکستان میں جنگ ہوئی تو وہ غیر جانبدار رہیں گے، نئی دہلی نے پہلے ہی سے ان دونوں نکتوں

کو منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، دوسرا مسودہ اس رازدارانہ خط کا وہ تھا جس میں نظام کو یہ وعدہ کرنا تھا کہ وہ پاکستان سے الحاق نہیں کریں گے،

ڈیلی گیشن ۲۷ تاریخ کو ساڑھے آٹھ بجے صبح دہلی روانہ ہونے والا تھا۔ ۲۶ تاریخ کی شام کو ممبران وفد نظام کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس امید کے ساتھ کہ ان کی موجودگی میں معاہدہ کے مسودہ پر دستخط کر دیے جائیں گے،

رکاوٹ ایک مرتبہ پھر معاہدہ کے الفاظ سنائے گئے، ہر چیز ٹھیک تھی ایکایک نظام نے اعلان کیا کہ آج اور اس وقت وہ دستخط نہیں کر سکتے، کل صبح وفد کے دہلی روانہ ہونے سے پہلے وہ دستخط کر دیں گے، ۲۷ تاریخ کو صبح تین بجے رضاکاروں نے سڑکوں پر گشت شروع کر دیا، تقریباً پچیس ہزار آدمیوں نے سر والٹر مانکٹن کی قیام گاہ لیک ویو کو، نیز نواب چھتاری اور سر سلطان احمد کے مکانوں کو گھیر لیا، یہ لوگ ٹرکس اور پرائیویٹ کاروں پر آئے تھے، نیزوں اور تلواروں سے مسلح تھے، اور لاوڈ اسپیکر پر چیخ چیخ کر اعلان کر رہے تھے کہ وفد کو دہلی جانے سے زبردستی روکنا چاہیے،

پانچ بجے صبح ممبران وفد نے فوج کے صدر دفتر کو فون کے ذریعہ صورت حال سے مطلع کیا اور استدعا کی کہ ان کی حفاظت کا انتظام کیا جائے، حیدرآباد آرمی کا ایک بریگیڈیر ایک ٹرک میں بٹھا کر ان لوگوں کو حفاظت کی جگہ لے آیا،

آٹھ بجے صبح نظام نے ڈیلی گیشن کو پیام بھیجا کہ دہلی جانے کا ارادہ ملتوی کر دے، انھوں نے لارڈ ماونٹ بیٹن کو ایک تار بھیجا، جس میں بیان کیا کہ بعض غیر متوقع حالات کے باعث آج وفد روانہ نہیں ہو سکا، لیکن تین چار روز کے بعد روانہ ہو جائے گا، سر والٹر مانکٹن نے بھی تار کے ذریعہ اطلاع دی کہ دو تین روز کی تاخیر سے ہم لوگ پہنچ رہے ہیں،

سہ پہر کے وقت نظام نے ڈیلی گیشن کو صورت حال پر غور کرنے کے لیے بلایا، انہوں نے نہایت سخت اور درشت الفاظ میں مجلس اتحاد کے اقدام کو قابل نفریں قرار دیا، رضوی کو برا بھلا کہا، اور کہا کہ مجوزہ معاہدۂ قائمہ بہترین چیز ہے، اسے ضرور قبول کر لینا چاہیے، "میں نے فیصلہ کر لیا ہے قاسم رضوی کو اسے قبول کرنے پر آمادہ کروں گا،

اٹھائیس تاریخ کو صبح کے وقت نظام نے وفد کو ایک مرتبہ پھر طلب فرمایا، انھوں نے کہا

"میں اپنے فیصلہ پر قائم ہوں" پھر وہ اپنے چیف سیکرٹری سے مخاطب ہوئے اور اس سے کہا۔
"رضوی کو فوراً حاضر کرو"

چند منٹ کے اندر رضوی آموجود ہوا، نظام اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا،
"اس معاہدہ پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

رضوی اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا،

"اگر اعلیٰ حضرت نے معاہدہ قائمہ پر دستخط کر دیے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حیدر آباد ختم ہو گیا"
رضوی نے کہا "یہ وفد کمزور ہے، اگر اس نے سابقہ معاہدہ کے مسودہ پر زور دیا ہوتا تو حکومت
ہند ہمارے مطالبات تسلیم کر لیتی، مجھے یقین ہے حکومت ہند کو ہمارے سامنے جھکنا پڑتا"

"یہ وفد قابل اعتبار نہیں ہے" رضوی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں اعلیٰ حضرت
سے التماس کرتا ہوں کہ اس معاہدہ پر وہ دستخط نہ کریں، مجھے ایک نیا وفد مرتب کرنے کا
موقع دیجئے، مجھے یقین ہے کہ وہ کامیاب ہوگا جبکہ یہ وفد بالکل ناکام ہو چکا ہے"

سر سلطان احمد | سر سلطان احمد رضوی سے مخاطب ہوئے۔

"جس وفد میں سر والٹر مانکٹن جیسا شخص شریک تھا اور پھر بھی ناکام رہا، آپ کے نزدیک وہ
کون سے وجوہ ہیں کہ نیا وفد کامیاب ہو جائے گا؟"

"میں اپنے دلائل رکھتا ہوں" رضوی نے جواب دیا،

"وہ دلائل کیا ہیں؟" سر سلطان نے پوچھا،

"ازراہ کرم مجھ سے اس طرح کے مہمل سوالات نہ کیجئے" ان الفاظ کے ساتھ رضوی نظام سے
مخاطب ہوا اور کہا،

"مجھے قطعاً یقین ہے کہ ہم کامیاب ہوں گے"

"کم از کم کوئی ایک ہی دلیل بتا دیجئے" سر سلطان نے اصرار کیا،

"انڈین یونین شمالی ہند میں جو تباہی مچی ہوئی ہے پورے طور پر اس میں الجھ کر رہ گئی ہے"
رضوی نے جواب دیتے ہوئے کہا "اگر ہم اڑ جائیں تو حکومت ہند نہ ہمارے مطالبات مسترد کر
سکتی ہے، نہ ہمارے خلاف کوئی اقدام کر سکتی ہے"

پھر رضوی نظام کی طرف مڑا اور گویا ہوا "حکومت ہند سے گفت و شنید کا کم از کم ایک موقع مجھے ضرور دیجئے۔"

مانکٹن کو اپنے موقف پر یقین تھا، یہی خیال ڈیلی گیشن کے دوسرے ممبروں کا تھا، "کوئی دوسرا وفد حکومت ہند سے معاہدہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا جو اعلیٰ حضرت نے تجویز کیا ہے۔ سردار پٹیل اس معاملہ میں بہت سخت ہیں، کوئی ایک نکتہ بھی جس پر اصرار کیا جا سکتا تھا، ہم نے نہیں چھوڑا" سلطان نے کہا،

رضوی اب تک اپنے رویہ پر قائم تھا، اس نے نظام سے اصرار کیا کہ معین نواز جنگ اور عبدالرحیم پر یہ نیا وفد مشتمل ہو،

ششش و پنج

نظام ششش و پنج میں پڑ گئے، وفد کے بقیہ چار ممبروں نے فوراً استعفا دے دیا، تاہم رضوی نظام سے اجازت لے کر چلے گئے۔

"یقیناً اس شخص کا دماغ چل گیا ہے ـــــــــ پاجی، لچا، رضوی کے جانے کے بعد نظام نے کہا،

سر سلطان طیش میں آ گئے "اس موقع پر اس شخص کو بلا کر ہم سب کی توہین کی گئی ہے، کل ہم نے صاف عرض کر دیا تھا کہ اگر یہ شخص موجود ہوا تو ہم حاضر خدمت نہ ہو سکیں گے"

ڈیلی گیشن کے ممبر اس گفتگو کے بعد رخصت ہو گئے،

نظام نے ممبران وفد کا استعفا منظور کر لیا،

رضوی کا رویہ اس استدلال پر مبنی تھا، اور اسے اس بات کا کامل یقین تھا کہ گورنمنٹ انڈیا بیرونی مسائل اور اندرونی اختلافات میں گھری ہوئی ہے، اس کا وجود خطرہ میں ہے، اتحادی لیڈروں کو یقین تھا کہ گورنمنٹ انڈیا میں بہت جلد تبدیلیاں ہوں گی، اس موقع پر اگر گفت و شنید ناکام ہوئی تو حیدرآباد کے خلاف کمزور ہندوستان کوئی اقدام نہیں کرے گا، اور اسی اثناء میں حیدرآباد اپنی پوزیشن زیادہ سے زیادہ مستحکم کرے گا، دوسری طرف اگر مسئلہ الحاق معاہدہ قائمہ پر دستخط کرنے سے ایک سال تک ٹل بھی جائے تو نقصان یہ ہوگا کہ ہندوستان کے مصائب ختم ہو چکے ہوں گے اور وہ اتنا مضبوط ہو چکا ہوگا کہ پھر اس کی مزاحمت ناممکن ہوگی۔

میر لائق علی - حیدر آباد کے آخری وزیراعظم
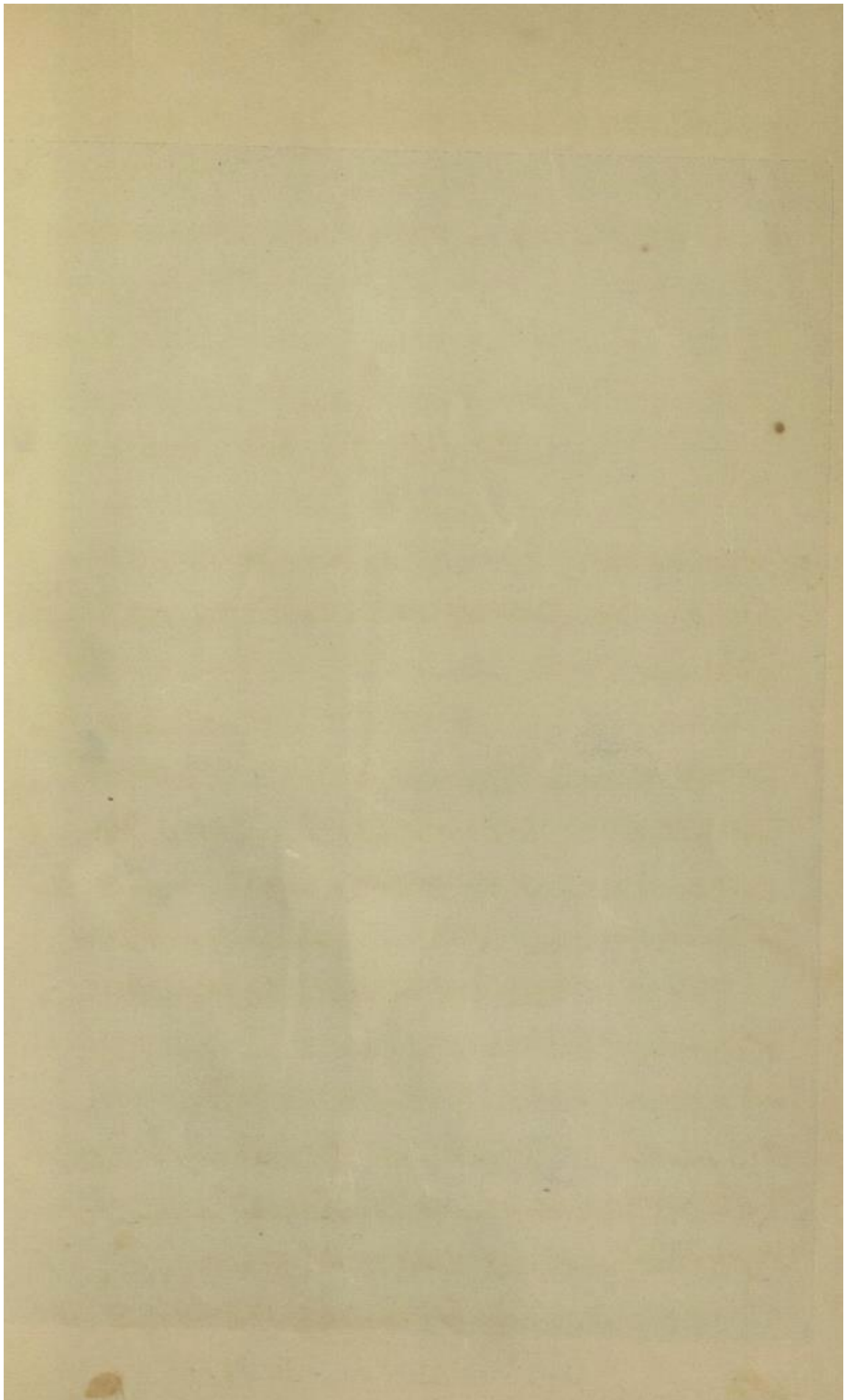
لائق علی وزارت

نیا وفد اب مجلس اتحاد المسلمین پورے طور پر چھا چکی تھی، نظام نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۱ - اکتوبر میں دھمکی دی تھی کہ اگر حکومت ہند نے گفت وشنید کا سلسلہ ملتوی کیا تو وہ پاکستان سے الحاق کر لیں گے، اب رضوی کا انتخاب کردہ ایک نیا وفد نظام نے مرتب کیا، جو معین نواز جنگ، عبدالرحیم اور پنگل وینکٹ راما ریڈی پر مشتمل تھا،

پنگل وینکٹ راما ریڈی حیدر آباد کے ہندو جاگیرداروں میں سے تھے، ہوشیار لیکن سلیم الطبع کاروباری آدمی، انھیں منصب یا سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن مسٹر عبدالرحیم کے وہ معتمد دوست تھے، اور جو پوزیشن اتحادی حلقہ میں انھیں حاصل ہو چکی تھی وفد میں شرکت سے انکار کے اس اعزاز سے محروم ہونا وہ پسند نہیں کرتے تھے، پھر بھی انہوں نے نظام کو ایک خط لکھ کر یہ بتا دیا تھا کہ نیا وفد مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا،

پنگل ریڈی سے میرے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، ۱۹۳۷ء سے پہلے جب میں بمبئی لائف انشورنس کمپنی کا چیئرمین تھا، ریڈی اس کے ڈائرکٹر تھے، لیکن حیدر آباد میں چونکہ اتحاد منسٹری میں شرکت کی برکت انھیں حاصل تھی، لہٰذا مجھ سے وہ بالکل اجنبی بنے رہے، نئی دہلی اور بمبئی میں جب ان سے ملاقات ہوتی تو حیدر آباد کی بے رخی دوستانہ بے تکلفی میں بدل جاتی اور اپنے حیدر آبادی دوستوں کے بارے میں سب باتیں وہ مجھے بتا دیتے، شروع ہی سے انھوں نے مجھے بتا دیا تھا، بلکہ یقین دلا دیا تھا کہ یہ لوگ تباہ ہو کر رہیں گے،

۲-نومبر کو حیدر آباد کا نیا وفد لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا، لیکن معین نواز جنگ کی طلاقت لسانی کام نہ آئی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی جگہ اڑے ہوئے تھے، بلکہ ایک حد تک رو کھے، انھوں نے گفت و شنید میں مزید پشت پناہی کرنے سے انکار کر دیا، ان کا کہنا تھا کہ معاہدہ قائمہ کا مسودہ اور متعلقہ خطوط کا مسودہ فریقین نے منظور کر لیا تھا، اب دستخط ہو جانے چاہئیں، اگر نظام نے دستخط نہ کیے تو انھیں ناقابل تلافی صدمہ پہنچے گا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ممبران وفد سے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کی طاقت کے بارے میں انھیں جو غلط فہمی ہے وہ جس قدر جلد رفع ہو جائے بہتر ہے، ہندوستان ایک بہت بڑی طاقت ہے، اور دنیا کی عظیم فوج کا مالک ہے،

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آخر میں ریڈی سے تخاطب کیا اور پوچھا "کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

ریڈی نے بعد میں مجھے بتایا کہ انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میری وہی رائے ہے جو میرے بادشاہ کی ہے"

ڈیلی گیشن جب حیدر آباد واپس پہنچا تو نظام کسی حد تک پریشان ہوئے، انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے جو انگلستان جا رہے تھے استدعا کی کہ اپنی واپسی تک گفت و شنید کا سلسلہ ملتوی رکھیں، حسب دلخواہ جواب پانے کے بعد نظام نے سر والٹر مانکٹن سے پھر رابطہ پیدا کیا، جو یہ دلی ہو کر لندن واپس جا رہے تھے، دونوں میں خطوں کا اور تاروں کا تبادلہ ہوا،

نظام نے اپنے مشیر دستوری سے سفر انگلستان ملتوی کرنے کی درخواست کی اور انکی یہ بھی کہ کراچی میں مسٹر جناح سے ملتے ہوئے آئیں، سر والٹر اس پر بضد تھے کہ وہ ایسا کرنا نہیں چاہتے، کیونکہ ان کا مشورہ مسترد کر دیا گیا ہے، اور جس ڈیلی گیشن کے وہ ممبر تھے برخاست کر دیا گیا ہے، ان حالات میں پاکستان کے گورنر جنرل سے ملنا کوئی خوشگوار چیز نہ ہوگی،

سر والٹر مانکٹن اصرار کر رہے تھے کہ نظام معاہدہ قائمہ پر دستخط کر دے تاکہ اس اثنا میں انھیں اندازہ ہو جائے کہ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں کس رخ پر جا رہی ہیں، ساتھ ہی ساتھ حیدر آباد اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش بھی جاری رکھے،

نومبر کے وسط میں سر والٹر مانکٹن مسٹر جناح سے ملے جو علیل تھے اور زیادہ وقت نہیں دے

سکتے تھے، دونوں کی گفتگو کا کچھ حاصل نہ نکلا، نظام کی ہدایت پر لندن میں سر والٹر لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے بھی ملے، انھوں نے جواب دیا میرے وزرا اپنے رویہ کا فیصلہ کر چکے ہیں، اور اب مزید گفت و شنید کا کوئی امکان نہیں "

اس اثنا میں رضوی اور ان کے ممتاز لفٹیننٹ سردار کو اور گورنمنٹ آف انڈیا کو پبلک تقریروں میں برابر گالیاں دیتے رہے، "عوام نظام کے اکثر وزراء پر اعتماد نہیں کرتے ہیں" رضوی نے اعلان کیا، اس نے مسلمانان دکن سے اور قائد اعظم سے اور مسلمانان پاکستان سے اپیل کی کہ حیدرآباد کو ہندوستان سے بچاؤ،

۲۴- نومبر کو معین نواز جنگ کی قیادت میں ڈیلیگیشن پھر دہلی روانہ ہوا، دوسرے روز لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے وفد کی ملاقات ہوئی، جنھوں نے صاف کہہ دیا کہ مجوزہ معاہدہ میں کسی تبدیلی پر غور نہیں کیا جا سکتا- ۲۹- نومبر کو ڈیلیگیشن حیدرآباد واپس آیا اور آخر کار نظام نے چند معمولی تبدیلیوں کے ساتھ اس پر اور متعلقہ خطوط پر دستخط کر دیے،

اسی روز سردار نے ہندوستان کی مجلس دستور ساز میں اعلان کیا کہ حیدرآباد نے معاہدۂ قائمہ پر دستخط کر دیے ہیں، اس اعلان کا خوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا، لیکن ہماری طرف کے لوگ عام طور پر اس معاہدہ سے مطمئن نہ تھے، عوام کی رائے یہ تھی کہ نظام نے فتح حاصل کر لی اور الحاق سے بچ گیا،

نظام نے فوراً ہی سر والٹر مانکٹن کے ذریعہ انگلستان کے ممتاز سیاست دانوں کو اس پر راغب کرنے کی کوشش کی دربار نظام میں برطانوی سفیر مقرر ہو جائے اور برطانیہ سے حیدرآباد کا معاہدہ دوستی ہو جائے،

رضوی نے تجویز پیش کی کہ سر مہدی یار جنگ کی جگہ جو نواب چھتاری کے بجائے وزیر اعظم تھے، میر لائق علی کو یہ منصب سونپا جائے، لیکن نظام نے یہ تجویز پسند نہیں کی، انھوں نے والٹر مانکٹن سے کہا میر لائق علی رضوی کے آدمی ہیں اور رضوی بجائے خود ناپسندیدہ شخص ہے-

جناح سے مشورہ

نظام نے مسٹر جناح سے رائے لی کہ آیا لائق علی کو حیدرآباد کا وزیر اعظم بنا دیا جائے؟ کیونکہ میر لائق علی کے خدمات بعض تعمیراتی کاموں کیلئے حاصل کئے جانے والے تھے، مسٹر جناح نے

لائق علی کو وزیر اعظم بنانے سے اختلاف کیا، کیونکہ اس طرح ہندوستان اور حیدر آباد کے تعلقات میں مزید خرابی کا اندیشہ تھا،

نظام اس مشورہ سے بہت خوش ہوئے، کیونکہ وہ کسی اتحادی شخص کو وزارت عظمی کا منصب نہیں سونپنا چاہتے تھے، ان کا خیال تھا کہ پنگل ونکٹ راما ریڈی اس منصب کے لیے موزوں ترین شخص ہیں، مسٹر عبدالرحیم نے بھی انہی کا نام پیش کیا تھا، لیکن نظام پر برابر دباؤ پڑتا رہا، آخر ۲۴- نومبر ۴۷ء کو اس بارے میں انھوں نے پھر مسٹر جناح سے مشورہ کیا،

نظام محسوس کر رہے تھے کہ ان کے ایک طرف کھائی ہے دوسری طرف خندق، ایک طرف رضوی ہے، دوسری طرف انڈین یونین، میر لائق علی کو مسٹر جناح نے پاکستان میں خدمت کرنے کے وعدہ سے آزاد کر دیا تھا اور وہ وزیر اعظم بنا دیے گئے، اس فتح مندی نے رضوی کو حیدر آباد کا مجاہد اعظم بنا دیا، ایک جلسۂ عام میں اسے قرآن اور تلوار کا ہدیہ پیش کیا گیا، میدان جہاد سے سالار کی حیثیت سے ساری ریاست میں اس نے ایریا کمانڈر مقرر کر دیے اور عوام سے اپیل کی کہ دفاع حیدر آباد کے لیے جوق در جوق رضاکار بھرتی ہوں،

بے بس نظام

نظام نے مجلس اتحاد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، لائق علی کا بینہ کا ہر وزیر رضوی کی رائے سے منتخب کیا گیا۔

پنگل ونکٹ راما ریڈی، عبدالرحیم کے معتمد دوست نائب وزیر اعظم بنا دیے گئے، ہندو وزراء میں دو آدمی رضوی گروپ میں شامل نہ تھے،

ونکٹ راؤ اچھوتوں کی طرف سے وزیر بنائے گئے، وہ اچھوتوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے لیڈر تھے اور رضاکاروں کی سرگرمیوں میں شریک، ان کا دعوی تھا کہ اچھوت ایک جداگانہ قوم ہیں اور وہ ان کے بہادر یار جنگ ہیں، لیکن جب اچھوت دھڑا دھڑ مسلمان بنائے جانے لگے تو انھوں نے فوراً اعلان کیا کہ ہریجن سب سے پہلے ہندو ہیں پھر کچھ اور، بعد میں وہ اپنے سابق نظریہ پر پھر آ گئے، یعنی یہ کہ ہریجن ہندو نہیں ہیں، وہ قاسم رضوی کے محبوب بن گئے، اور وزارت میں لے لیے گئے،

ایک اور ہندو وزیر مسٹر جوشی تھے، یہ گجرات کے رہنے والے اور کاروباری آدمی تھے، جا نا

میں ایک انجینرنگ فرم کے مالک بھی تھے، ایک ریسپشن کے موقع پر وہ مجھ سے ملے، میری اور میری بیوی کی خیریت بڑے دوستانہ انداز میں دریافت کی،

تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد میں میزبان سے مخاطب ہوا اور جوشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے ان سے کہا،

"آپ کی تعریف؟"

میرے اس سوال پر ایک قہقہہ پڑا، بیچارے جوشی کی حالت دیدنی تھی،

"آپ شاید مجھے بھول گئے؟" اس نے کہا "میں جوشی ہوں"

"یہ ہمارے نئے وزیر ہیں" میزبان نے تعارف کراتے ہوئے کہا،

دوسرے روز جوشی اپنی بیوی سمیت ہم سے ملنے آئے،

"مشی آپ نے مجھے برباد کر دیا!" اس نے کہا،

"وہ کس طرح؟" میں نے دریافت کیا،

"میں نے ہر شخص سے کہہ رکھا تھا کہ میری تعلیم و تربیت آپ کی زیر نگرانی ہوئی ہے" جوشی نے کہا،

"لیکن مجھے کس طرح معلوم ہو سکتا تھا کہ مجھے آپ کی تعلیمی سرپرستی کا شرف حاصل رہا ہے"

جوشی نے اپنے آپ کو بری طرح رضوی کے پنجہ میں پھنسا لیا تھا، نومبر میں اس نے رضوی کو یقین دلایا تھا کہ وہ میرے اوپر غیر معمولی اثر رکھتا ہے علاوہ ازیں اس نے رضوی کو یہ یقین بھی دلا رکھا تھا کہ اس کے سردار سے ذاتی تعلقات ہیں اور وہ براہ راست ایک باعزت سمجھوتہ کرا دے گا،

رضوی اور سردار

گجراتی ہونے کی حیثیت سے جوشی نے سردار کو ایک خط لکھ کر ملاقات کی استدعا کی اور یہ بھی لکھ دیا کہ درحقیقت یہ درخواست رضوی کی طرف سے ہے ۔ سردار نے جواب دیا کہ رضوی سے ملنے میں انھیں کوئی تامل نہیں ہے، جوشی نے رضوی پر یہ اثر ڈالا کہ سردار اس سے ملنے کے لیے بیتاب ہو رہے ہیں، رضوی جوشی کو لے کر دہلی روانہ ہو گیا،

میری جو گفتگو اس سلسلہ میں سردار اور ان کے سکریٹری مسٹر شنکر اور جوشی سے ہوئی، اس

سے میں نے باآسانی اندازہ لگا لیا کہ یہ ملاقات کس طرح انجام پائی،
رضوی اور جوشی کو شنکر نے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ سامنے ایک مجسمہ کی طرح سردار بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرہ سے سختی اور درشتی کے آثار ہویدا تھے،
جوشی نے نہایت فروتنی کے ساتھ نمسکار کیا، رضوی نے سلام کیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا
ڈرائینگ روم پر سناٹا چھایا ہوا تھا،
"جی!" سردار نے پوچھا "آپ کیا کہنا چاہتے ہیں"
رضوی نے برہم نظروں سے دیکھا، اس کا چہرہ ایک لمحہ کے لیے تمتما اٹھا، جوشی گھبرا گیا، لیکن سردار کا سکون قائم تھا،
رضوی نے طلسم سکوت توڑا، اس نے کہا "میں چاہتا ہوں آپ کا دل بدل جائے"
رضوی کی اس بات پر سردار کے لیے زیادہ دیر تک خاموش رہنا ناممکن ہو گیا، آخر کار انھوں نے کہا،
"دل کی تبدیلی اسی وقت ضروری ہوتی ہے جب وہ مسموم ہو"
"آپ حیدرآباد کو آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے؟" رضوی نے سوال کیا،
"امکانی حدوں سے اس سلسلہ میں بہت زیادہ دور تک میں جا چکا ہوں، میں نے حیدرآباد کے لیے وہ شرائط منظور کیے ہیں جو کسی دوسری ریاست کے لیے نہیں کیے" سردار نے جواب دیا،
"لیکن میں چاہتا ہوں کہ جن مشکلات سے حیدرآباد دوچار ہے، آپ انھیں سمجھیں" رضوی نے سردار کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا،
"مجھے تو کوئی دشواری نظر نہیں آتی، بشرطیکہ پاکستان سے آپ کوئی معاہدہ نہ کر چکے ہوں" سردار نے جواب دیا،
"اگر آپ ہمارے مشکلات محسوس نہیں کرتے تو ہم بھی سر نہیں جھکائیں گے" رضوی نے برہمی کے ساتھ نہایت مشتعل لب و لہجہ میں چیخ کر کہا "ہم اس وقت تک لڑتے رہیں گے اور مرتے رہیں گے جب تک حیدرآباد کا ایک آدمی بھی باقی ہے"

"لیکن اگر آپ فیصلہ ہی کر چکے ہیں تو خودکشی کرنے سے میں کس طرح آپ کو باز رکھ سکتا ہوں"
سردار نے نرم لہجہ میں جواب دیا۔

"آپ مسلمانان حیدرآباد کو نہیں جانتے۔ رضوی نے بلند آہنگی کے ساتھ کہا۔ آزادی کے لیے ہم ہر چیز قربان کر دیں گے"

"اگر قربانی کا سوال سامنے آتا ہے تو ہندوستان دنیا کو دکھا چکا ہے کہ قربانی کس طرح کی جاتی ہے، لیکن حیدرآباد کو ابھی ثابت کرنا ہے کہ وہ کتنی اور کہاں تک قربانی کر سکتا ہے" سردار نے نہایت ٹھنڈے لہجہ میں جواب دیا۔

رضوی نے اس طرح جیسے ہسٹریا کا دورہ پڑ گیا ہو ایک خطبہ دینا شروع کر دیا کہ مسلمان دین اور ملت پر کس طرح اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں۔

سردار نہایت خاموشی اور متانت کے ساتھ رضوی کی لاف زنی سنتے رہے۔ سانس لینے کے لیے جب رضوی ذرا رکا تو سردار نے کہا۔

"میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ چمکتے ہوئے سورج کو دیکھنے سے انکار نہ کیجیے، ایسا نہ ہو کہ وقت پھر ہاتھ سے جاتا رہے۔ روشنی کی موجودگی میں تاریکی کے اندر غوطے لگانے کی کوشش نہ کیجیے"

آخرکار یہ ملاقات رضوی کی فارسی آمیز اردو اور رواں دواں انگریزی اور سردار کی ہندی ملی ہوئی گجراتی اور سادہ انگریزی کے مظاہرہ پر ختم ہو گئی۔

رضوی اور جوشی رخصت ہو گئے۔

آتشیں تقریر حیدرآباد پہنچنے کے بعد ۲۵۔ نومبر کو رضوی نے ایک بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے سردار سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا اور خطیبانہ بلند آہنگی کے ساتھ اس بے پناہ مجمع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سردار پٹیل کی دعوت پر میں دہلی گیا۔ اس سفر سے میرا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے سامنے حیدرآباد اور مسلمانوں کے حالات رکھ دوں۔ مجھے سردار پٹیل نے خود بلایا تھا اگر یہ دعوت میں قبول نہ کرتا تو ہمارے خلاف پروپیگنڈا کیا جاتا اور ہمیں متہم

کیا جاتا کہ ہم میں معقولیت نہیں ہے، حالات خواہ کتنے ہی نازک کیوں نہ ہوں اخطرات امنڈ امنڈ کر کیوں نہ آ رہے ہوں ایک مسلمان سچائی کے لیے مرد میدان بننے سے نہیں جھجک سکتا کوئی خطرہ اسے مرعوب اور دہشت زدہ نہیں کر سکتا، میں سردار پٹیل سے ملا، اگر میں یہ کہوں کہ میں کانگرس سے ملا تو غلط نہ ہوگا، کیونکہ پٹیل کانگرس ہے اور کانگرس پٹیل،

خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک اپنے قومی نمائندوں کے ذریعہ فریق مخالف سے بات چیت کر رہا ہے، یہ حقیقت اب اچھی طرح منکشف ہو چکی ہے کہ سابقہ ڈیلیگیشن سردار پٹیل کے دروازہ پر خیرات مانگنے گیا تھا، اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے سامنے پیشانی ٹیکی تھی، ان نیاز مندیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سردار پٹیل نخوت و تکبر کی انتہائی اونچائی تک پہنچ گیا، اور یہ ڈیلیگیشن جو غیر قومی نمائندوں پر مشتمل تھا اصل سبب تھا سردار کی اس دعوت کا ''۔

حالات جن سے میں دوچار ہوا

دکن ہاؤس

۱۵ جنوری کو بلارم ریذیڈنسی سے گورنمنٹ آف انڈیا کی ایک عمارت دکن ہاؤس میں جو قریب ہی واقع تھی، ہم منتقل ہو گئے،

میں نے دکن ہاؤس کو دلکشا سدن کے نام سے موسوم کر دیا، اس معمولی بات نے نظام اور رضوی کے حلقوں میں سنسنی پیدا کر دی، اس شخص کو یعنی مجھے نام تبدیل کرنے کا کیا حق تھا جبکہ دکن ہاؤس سکندر آباد چھاؤنی کے ساتھ بہت جلد نظام گورنمنٹ کی تحویل میں آنے والا تھا، میرے اس تبدیلی نام کے واقعہ نے حیدرآبادی حلقوں کو اچھا موضوع سخن فراہم کر دیا، اس سلسلہ میں جو اطلاعات مجھے ملیں وہ خاصی دلچسپ تھیں،

اس موقع پر میں اس افسوسناک حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ پولیس ایکشن کے بعد ہمارے فوجی حکام نے دلکشا سدن کو پھر دکن ہاؤس بنا دیا، حالانکہ یہ نام ۱۹۴۸ء کے تاریخی دور کی بہت سی یادگاروں کا حامل تھا،

حیدرآباد میں انڈیا کے ایجنٹ جنرل کی موجودگی وہاں کے عوام کی حوصلہ افزائی کا سبب ثابت ہوئی، کسی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ برطانوی عہد میں ریذیڈنٹ کو جو اقتدار اور وقار حاصل تھا میں بھی اس کا حامل ہوں، حالانکہ اس اقتدار کا عشر عشیر بھی مجھے حاصل نہ تھا، حیدرآباد میں میری موجودگی اس بات کی بھی علامت تھی

گئی کہ آخر سردار نے جنبش شروع کی،

میری موجودگی سے کم حوصلہ لوگوں میں پھر حوصلہ پیدا ہو گیا، سیکڑوں پناہ گزین اپنے اپنے گھروں میں پھر سکندر آباد آ گئے، اور لوگ جوق در جوق اپنی دردناک کہانیاں بیان کرنے میرے پاس آنے لگے،

بدگوئی دوسری طرف اتحادی پریس نے میرے خلاف بدگوئی اور تہمت تراشی کا ایک مورچہ قائم کر لیا،

کوئی بات جو میں نے کہی ہو یا کی ہو، اسے یہ ایک سنگین جرم کا لباس پہنا دیتے اور اپنی بدگوئی اور زشت کلامی کا پہاڑ اس کی آڑ میں کھڑا کر دیتے، اتحادی اخبارات کے الفاظ میں ایک بات بالکل واضح تھی، یہ کہ میری حیثیت صرف ٹریڈ ایجنٹ (وکیل تجارت) کی ہے، جسے اپنے حدود سے تجاوز نہ کرنا چاہیے، مجھے کار میں بیٹھ کر قومی جھنڈا لہراتے ہوئے ادھر ادھر نہ جانا چاہیے، مجھے نہ لوگوں کو اپنے پاس بلانا چاہیے نہ اپنے دیے ہوئے ریسپشن میں دوسروں کو مدعو کرنا چاہیے،

حیدر آباد پہنچنے کے بعد اپنے پہلے اخباری بیان میں میں نے کہا، میرے آنے کا مقصد یہ ہے کہ انڈین یونین اور حیدر آباد گورنمنٹ کے درمیان دوستی اور یگانگت کا رشتہ استوار کر دوں میں نظام کا دل جیت لینے کے ارادہ سے، بشرطیکہ وہ مجھے اجازت دیں، یہاں آیا ہوں، میرے یہ بے ضرر الفاظ بھی قابل اعتراض بن گئے، مجھے کیا حق تھا کہ نظام کا دل جیت لینے کی جراءت کروں؟

جس روز میں حیدر آباد پہنچا اس روز سے مجلس اتحاد کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں کی طرف سے مجھے مرعوب کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ یا تو میں اپنا منصب چھوڑ کر چلا جاؤں یا خاموش تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھتا رہوں اور کچھ نہ بولوں،

میں نے فیصلہ کر لیا کہ نہ استعفا دوں گا نہ خاموش بیٹھوں گا،

متعدد تقریبیں ہوئیں، بعض میں لائق علی، معین نواز جنگ، راما چار اور جوشی بھی شریک ہوئے، ایک میزبان رضوی کی ناراضی سے بچنے کے لیے خود اس کے پاس گیا اور اسے اپنے دیے ہوئے ریسپشن میں دعوت دی،

"منشی کو جو ریسپشن دیا جا رہا ہے، اس میں میں شریک ہوں؟ حالانکہ وہ اب تک مجھ سے ملاقات کرنے بھی نہیں آیا؟" فیوہرر نے جواب دیا،

میرے حیدرآباد پہنچنے کے چند روز بعد باشندگان سکندرآباد نے میرے اعزاز میں ایک پبلک ریسپشن کا انتظام کیا، ریسپشن کے انعقاد سے ایک دن پہلے رضاکاروں نے متعلقہ علاقے میں گشت شروع کر دیا اور دھمکی دی کہ جو لوگ اس میں شریک ہوں گے ان کی خیر نہیں، اس کے باوجود تقریباً پچیس ہزار آدمی ریس کورس میں جمع ہوئے، اور راما نند تیرتھ نے کرسئ صدارت سنبھالی، پہلی مرتبہ یہاں کے لوگوں نے نعرہ لگایا،

"مہاتما گاندھی کی جے"

"جواہر لال نہرو کی جے"

میں نے اپنی تقریر میں نظام کو ہندو مسلم اتحاد کی اس عظیم روایت کا علمبردار قرار دیا جس کی بنیاد اکبر نے ڈالی تھی، یہ ایسا خراج تحسین تھا جس پر حکمران کو اور اس کے ہر مداح کو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان بجا طور پر فخر کرنا چاہیے تھا، میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ الحاق کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا اور اپنے آپ کو ایک ایسی داعی قرار دیا جس کی مساعی سے حیدرآباد اور انڈیا کے درمیان مستقل اور قریبی اشتراک کی تولید ہو سکے گی،

حملے

دوسرے روز اتحادی پریس نے مجھ پر حملے شروع کر دیے، مجھ پر الزام لگایا گیا کہ میں نے معاہدہ قائمہ کو بے کار کر دیا ہے، مجھے کسی ایسے ریسپشن میں شریک نہیں ہونا چاہیے تھا جو میرے اعزاز میں دیا گیا ہو، اور تقریر تو ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھی، وکیل تجارت کی حیثیت سے مجھے جو حقوق حاصل ہیں ان سے تجاوز کر رہا ہوں، مجھے فوراً خارج البلد کر دینا چاہیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہز مجسٹی نظام کا اکبر سے تقابل کر کے میں نے ان کی توہین کی، اکبر ایک سچا مسلمان نہیں تھا، اس کے برعکس نظام ایک مملکت اسلامیہ کے سربراہ ہیں، قریبی اور مستقل اشتراک کا حوالہ دے کر میں نے حیدرآباد کی بالادستی اور خود مختاری پر حملہ کیا،

میں نے فوراً ہی صورت حالات کی نزاکت محسوس کر لی،

رضاکار ایک بہت بڑا خطرہ بن چکے تھے، مجھے مکمل معلومات حاصل ہو چکے تھے کہ یہ لوگ ریاست کے دیہاتوں پر اور ریاستی سرحد سے ملے ہوئے بھارتی دیہاتوں پر سفاکانہ حملے کرتے ہیں، ان حملوں میں یہ لوگ قتل و غارت، لوٹ مار کسی چیز سے بھی گریز نہیں کرتے، جن دیہات پر

یہ شبہ ہو جاتا کہ کانگرس یا کمیونسٹ پارٹی سے ہمدردی رکھتا ہے اس کی شامت آجاتی، لرزہ خیز مظالم کا اسے نشانہ بننا پڑتا، کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے رضاکار دستوں کو سرحد کی طرف اپنے تباہ کن مقصد کے لیے ٹرکوں پر جاتے ہوئے دیکھا، یہ لوگ نعرے لگاتے ہوتے تھے، اور چمکتے ہوئے ہتھیار ان کے ہاتھوں میں ہوتے تھے،

مسلمان مہاجر

شہر حیدرآباد میں ایک کیمپ قائم کیا گیا تھا جس میں ضرورت مند مسلمان جمع کرلئے گئے تھے، یہ ہندوستان کے ہر مقام سے، اور پاکستان تک سے، بلکہ عرب تک سے اکٹھا کئے گئے تھے، تاکہ رضاکاروں کے مسلح دستوں میں انھیں شریک کرلیا جائے۔

ریاست اسلحہ اور بارود اور سامان جنگ تیار کرنے کے انتظامات تیزی کے ساتھ کررہی تھی، گو اخریدنے کی بات چیت ایک انگریز کے ذریعہ سے ہو رہی تھی، افواج حیدرآباد کا سپہ سالار عیدروس یورپ روانہ ہوگیا تھا، تاکہ چیکوسلواکیہ اور فرانس سے ہتھیار خرید سکے،

مجھے ایک نہایت معتبر اور اونچے ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ (طاؤس) (Peacock) ہوائی ڈویژن جو پچاس بمباروں پر مشتمل ہے، حیدرآباد کی طرف سے پاکستان یا عراق میں موجود ہے، اگر انڈین یونین نے حیدرآباد پر فوجی حملہ کیا تو حیدرآباد کی یہ فضائی فوج احمدآباد اور بمبئی پر اندھا دھند بمباری شروع کردے گی،

غلام محمد جو بعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے، اس زمانہ میں پاکستان کے وزیر مالیات تھے جس زمانہ وہ حیدرآباد کے وزیر مالیات تھے تو ان سے بڑھ کر لائق علی کا دوست اور مربی کوئی اور نہ تھا، میرے حیدرآباد آنے سے چند ہفتے پہلے وہ حیدرآباد آئے تھے اور انھوں نے نظام گورنمنٹ کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ بیس کروڑ روپے کے سرکاری تمسکات بطور قرض پاکستان کو دے دیئے جائیں،

ریاستی ریلوے

ریاستی ریلوے کا کنٹرول نظام کے ہاتھ میں آچکا تھا، ریاستی ملوکہ دکن ایرویز کے اسٹاف میں تمام اتحادی لوگ تھے۔

معاہدۂ قائمہ کے ماتحت پوسٹ، ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے محکمے حکومت ہند سے منتقل ہوکر نظام گورنمنٹ کی تحویل میں دے دیئے گئے، اور اس طرح ایک بہت بڑا خطرہ جنوبی ہند کے لیے پیدا ہوگیا، کیونکہ اب اس کا تعلق شمالی ہند سے صرف مجلس اتحاد کے رحم وکرم پر رہ گیا تھا،

نظام گورنمنٹ شدت کے ساتھ سکندر آباد سے ہندوستانی افواج کے انخلا پر اصرار کر رہی تھی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اس تجویز کو منظور کر چکے تھے، ان فوجوں کے انخلا کا مقصد یہ تھا کہ جو تھوڑا بہت ڈر اتحادیوں پر ان کی وجہ سے تھا وہ بھی گیا،

سردار سے ملاقات

۱۰ جنوری کو میں سردار سے بمبئی میں ملا، اس گفتگو کے نتیجہ کے طور پر سردار نے صوبائی حکومتوں کو ہدایات جاری کیں کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت میں وہ زیادہ چوکس ہو جائیں، انھوں نے یہ ہدایت بھی کی کہ سکندر آباد کی فوجی بارکیں اور مواصلات کے محکمے حیدر آباد کو اس وقت تک نہ دیے جائیں جب تک حالات رو براہ نہ ہو جائیں،

حیدر آباد کے ممتاز شہریوں میں سب سے پہلے جس شخص نے مجھے اپنے اعتماد میں لیا وہ لائق علی وزارت میں کانگریسی وزیر راما چار تھے، ان سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ جیسے ہی وہ شریک وزارت ہوئے حکومت کو عوامی بنیاد پر از سر نو مرتب کرنے کی تدابیر عمل میں لائی جائیں گی، جب بھی وہ یہ سوال اٹھاتے، لائق علی اپنی میٹھی باتوں سے انھیں تھپکیاں دے کر خاموش کر دیتے،

راما چار اس بات سے نہایت پریشان تھے کہ دیہاتوں میں رضا کاروں کی سرگرمیاں خطرناک تر ہوتی جا رہی تھیں، پہلے جو کچھ وہ سنتے آئے تھے اب وزیر کی حیثیت سے بچشم خود دیکھ رہے تھے۔

آخر ۲۴ جنوری کو انھوں نے استعفا دے دیا،

راما چار نے اپنے استعفا میں بی بی نگر اور نظام آباد میں رضا کاروں کی خوں آشامیوں کا تذکرہ کیا، انھوں نے نظام کو بھی ایک خط لکھا کہ پولیس اور فوج پر اتحادیوں کا قبضہ ہے اور یہ کہ موجودہ حکومت سے کوئی خوش نہیں ہے، ؁

گفت وشنید:۔ پہلا مرحلہ

لائق علی سے ملاقات

غالباً ۱۰۔جنوری کو میں لائق علی سے دو امور کی وضاحت طلب کرنے کے لئے ملا، یہ کہ آیا معاہدہ قائمہ میں کچھ پیچیدگیاں ہیں؟ اور اگر ہیں تو وہ کس طرح رفع ہو سکتی ہیں؟

۵۔جنوری کو میں حیدرآباد پہنچا، ۱۳۔ستمبر کو پولیس ایکشن ہوا، اس مدت میں حیدرآباد اور انڈیا کے مابین خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی چار مرتبہ کوششیں کی گئیں، اور وہ سب ناکام ہوئیں،

پہلی کوشش ۱۰۔جنوری سے ۲۱۔جنوری تک جاری رہی، میری کوشش یہ تھی کہ لائق علی کو معاہدہ قائمہ پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دوں، یہ کوشش ناکام ہوئی۔

دوسری مرتبہ پہلی فروری سے ۲۹۔مارچ تک میں نے لائق علی کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ حیدرآباد اور ہندوستان کے مابین مستقل اور مستحکم تعلقات کے لیے کوئی متفقہ بنیاد ہم تلاش کر سکیں، پھر بھی میں ناکام ہوا،

تیسری مرتبہ پہلی اپریل سے ۲۹جون تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سر والٹر مانکٹن کی مدد سے معاہدہ کی پیشکش مخصوص اور دور رس رعایتوں کے ساتھ کی، یہ کوشش بھی ناکام رہی۔

چوتھی مرتبہ نظام نے مجلس اتحاد کی گرفت سے نکلنے کی سعی کرتے ہوئے ایک سمجھوتہ منظور کر لیا، لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے۔

ان تمام مرحلوں پر مجلس اتحاد ہی آڑے آئی،

حیدر آباد میں ذمہ داری کا جو بوجھ مجھ پر ڈالا گیا تھا وہ پیچیدہ بھی تھا اور بھاری بھی۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ معاہدہ قائمہ کو متعلقہ فریقوں میں سے ہر ایک اپنے مفہوم کے مطابق مراد لے رہا تھا، جیسا وی پی مینن نے کہا ہے،

"نہرو محسوس کرتے تھے کہ کم از کم ایک سال تک کے لیے جنوبی ہند میں اس معاہدہ کے ذریعہ مصالحانہ آشتی خرید لی جائے گی" لاؤ ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ اس ایک سال کی مدت میں ٹھنڈے دل اور ٹھنڈے دماغ کے ساتھ حالات پر غور کرنے کے بعد دوسرے والیان ریاست کی طرح نظام انڈیا سے حیدر آباد کا الحاق منظور کر لیں گے۔ نظام اور ان کے مشیر اس فریب میں مبتلا تھے کہ معاہدۂ قائمہ نے انھیں ایک موقع فراہم کر دیا ہے، اس عرصہ میں زیادہ سے زیادہ اپنی قوت اور پوزیشن مستحکم کر لی جائے گی اور حیدر آباد کی کامل آزادی تسلیم کرالی جائے گی۔ سردار، حیدر آباد گورنمنٹ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے"

سفارتی تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملے گی کہ کوئی شخص سیاسی ایجنٹ بنا کر میری مانند ایک عجیب و غریب مشن پر عجیب و غریب طرح سے بھیجا گیا ہو، مجھے کوئی ہدایت نامہ نہیں دیا گیا تھا، از روئے معاہدہ ہندوستان اور حیدر آباد نے اپنے اپنے ایجنٹ کا تبادلہ اس لیے منظور کیا تھا کہ اس معاہدہ کو کامیاب بنانے کی وہ کوشش کریں،

میری حیثیت

از روئے معاہدہ میرے فرائض متعین کرنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی، نہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا تھا کہ ایجنٹ جنرل کا منصب سنبھالنے کے بعد مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے، نظام نے دفاع، معاملات خارجہ اور مواصلات کے صیغے انڈین یونین کو تفویض کر دیے تھے، لہٰذا حکومت ہند کے نمائندے کی حیثیت سے ان تین صیغوں پر مجھے وہی اختیارات حاصل تھے جو سابقہ عہد میں ریذیڈنٹ کو حاصل تھے، میرا یہ کام بھی تھا کہ یہ دیکھتا رہوں کہ معاہدہ قائمہ پر پوری طرح عملدرآمد ہوتا ہے یا نہیں، مجھ سے یہ توقع بھی کی جارہی تھی کہ نظام اور ان کے مشیروں کے دل بدلنے کی کوشش کروں تاکہ حیدر آباد اور ہندوستان میں مستحکم تعلقات استوار ہو سکیں،

گورنمنٹ آف انڈیا نظام کے اعلان آزادی سے واقف تھی، ہر شخص جانتا تھا کہ نظام نے معاہدۂ قائمہ پر محض وقت حاصل کرنے کیلئے دستخط کیے تھے، گاندھی جی اور سردار دونوں نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے مستقل سمجھوتہ کی کوشش مارچ ۱۹۴۸ء تک جاری رکھنی چاہیے، اس کے بعد یہ معاملہ ختم کر دیا جائے گا، میں اپنا ایک فرض یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ حکومت ہند کو حیدر آباد کی فوجی تعمیر و ترقی کے مراحل کے متعلق بھی جملہ معلومات مہیا کرتا رہوں، نیز غیر ممالک سے تعلقات استوار کرنے کی جو کوششیں کی جائیں ان سے بھی باخبر کرتا رہوں،

میری ایک ذمہ داری یہ بھی تھی کہ ریاست کی جملہ کیفیتوں سے خبردار رہوں اور حکومت ہند کو ان سے مطلع کرتا رہوں، خاص طور پہ رضا کاروں کی سرگرمیاں برابر حکومت ہند کے علم میں لاتا رہوں، میرا ایک کام یہ بھی تھا، اور یہ انسانی فریضہ بھی تھا کہ ان سراسیمہ اور دہشت زدہ لوگوں میں اعتماد اور حوصلہ پیدا کروں جنھیں رضا کاروں نے بہت زیادہ مرعوب کر رکھا تھا،

میں کیا تھا؟

ایک بات میرے نزدیک بہر حال یقینی تھی، وہ یہ کہ ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے میں محکمہ امور ریاست کا ایک معمولی افسر نہیں تھا جس کا کام صرف دفتری امور کا انجام دینا ہوتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو سردار ہرگز یہ منصب مجھے نہ سونپتے، گاندھی جی کسی طرح بھی یہ منصب قبول کرنے کی مجھے اجازت نہ دیتے، اور میں بھی قطعاً اس اعزاز کے قبول کرنے سے انکار کر دیتا،

میں نے کانگرس کی خدمت کی تھی، میں کانگرس کا مزاج شناس تھا، مجھے گاندھی جی اور سردار کا مکمل اعتماد حاصل تھا، یہ دونوں بزرگ اچھی طرح جانتے تھے کہ میں کئی سال تک کانگرس کی اس روش سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکا جس نے مسلم لیگ کو عروج بخشا اور جس کا نتیجہ تقسیم ہند کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن ۱۹۴۷ء میں متعدد وجوہ کی بنا پر مجھے تقسیم ہند کے اصول کا قائل ہو جانا پڑا، حالات پر نظر ڈالنے کے بعد میں اب بھی یہ رائے رکھتا ہوں کہ تقسیم کو قبول کر لینا بہترین چارۂ کار تھا، لیکن اس کے باوجود سردار اور گاندھی جی دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ تقسیم ہند کے بعد میں ہندوستانی مسلمانوں کی ان پرانی سرگرمیوں کا اور زیادہ مخالف ہو گیا تھا، جنھوں نے ہندوستان کو تقسیم کرایا تھا،

میں اپنی جگہ مطمئن تھا کہ اگر ہندوستان کو زندہ رہنا ہے تو ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستانی

قوم کا غیر منفصل حصہ بننے پر خوشی خوشی تیار ہو جانا چاہیے، کوئی جداگانہ مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، پاکستان سے کسی طرح کی خفیہ یا علانیہ وفاداری نہیں رکھنا چاہیے، ملک کے دوسرے عناصر کے خلاف کوئی جذبہ ان کے دلوں میں کارفرما نہ ہونا چاہیے، کم از کم سردار کے بارے میں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت پر زور طور پر وہ بھی یہی خیالات رکھتے تھے، پھر بھی اگر انھوں نے مجھے حیدرآباد بھیجا تو میں مطمئن تھا کہ وہ میرے نقطہ نظر سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود مجھے بھیج رہے ہیں،

ان حالات میں جب ایک اخبار نے مجھے ہندوستانی فوج کا ہراول قرار دیا تو میں ذرا بھی متعجب نہیں ہوا، ایک انگریز کالم نویس نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ حیدرآباد کے محاصرہ میں منشی ٹروجن ہارس (Trojan Horse) کا کام کر رہا ہے، میں جو کچھ بھی رہا ہوں ٹروجن ہارس کبھی نہیں رہا، میری زندگی میرا کام، میرا مطمح نظر ہر شخص کے علم میں تھا،

ابتدائی گفت و شنید میں جو لائق علی اور معین نواز جنگ نے مجھ سے کر ہم آسانی سے بعض معاملات پر متفق ہو گئے، مثلاً یہ کہ ہندوستان کے سرحدی علاقوں کا احترام کیا جائے، نظام کی فوج اور پولیس کو حکم دے دیا جائے کہ وہ سرحد پار تک ملزموں یا مجرموں کا تعاقب نہ کرے، نہ وہاں کے رہنے والوں کی خانہ تلاشی لے، نہ بھارت کے کسی علاقہ میں فائرنگ کرے، بھارت کے علاقوں میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے یا جنکی چیزیں ضبط کی گئی ہیں، وہ متعلقہ صوبائی حکومتوں کو واپس کر دی جائیں،

اس کے بعد ہم نے معاہدہ قائمہ کی پیچیدگیوں کو رفع کرنے کے لیے گفتگو شروع کی، ایک ایک دفعہ پڑھی گئی اور اس پر بحث و گفتگو ہوئی، مجھے اس انکشاف پر سخت حیرت ہوئی کہ یہ مفاہمت سرے سے مفاہمت ہی نہیں تھی، سارے معاہدہ میں ایک دفعہ بھی ایسی نہیں تھی جس کے مفہوم پر فریقین متفق ہوں،

میرے مشاہدات

میں دیکھ رہا تھا کہ یہ لوگ اس معاہدہ کی آڑ لیکر ٹریڈ ایجنٹ کے بھیس میں غیر ممالک سے سیاسی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اقتصادی طور پر حیدرآباد کو آزاد کرنے کی جدوجہد بھی جاری تھی، ریاست کے وسائل و ذرائع ہندوستان سے بے نیاز ہو کر مستحکم کیے جا رہے تھے، حیدرآباد نے اپنی پیداوار برآمد کر کے جو اسٹرلنگ کمائے تھے وہ غیر ممالک سے

رابطہ قائم کرنے میں صرف کیے جا رہے تھے، ان لوگوں کو یقین تھا کہ ہندوستان اقتصادی طور پر بہت جلد دیوالیہ ہو جائے گا لہذا اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے یہ پاکستان سے اقتصادی رابطہ پیدا کرنے کے درپے تھے،

ساتھ ہی ساتھ ان حضرات کا یہ مطالبہ بھی تھا کہ سکندر آباد سے ہندوستانی فوجیں فوراً واپس بلا لی جائیں اور ریاستی افواج کے لیے ساز و سامانِ جنگ مہیا کیا جائے،

میں نے واضح طور پر یہ بات بھی محسوس کی کہ میر لائق علی الفاظ کے ہر طرح کے ہیر پھیر کے باوجود سب سے زیادہ مسٹر جناح کے وفادار تھے اور پاکستان کے وزیر مالیات غلام محمد کو وہ اپنا رہنما سمجھتے تھے۔

معین نواز جنگ

حیدر آباد میں جن لوگوں سے مجھے ملنے کا موقع ملا ان میں معین نواز جنگ کو میں نے سب سے زیادہ چالاک اور ہوشیار پایا، میں نے محسوس کیا کہ مجلس اتحاد کا دماغ ہونے کی حیثیت سے انھیں جو شہرت حاصل تھی وہ بالکل صحیح تھی، انداز و اطوار اور گفتار میں نہایت نستعلیق، ہر حالت میں پرسکون رہنا ان کی سرشت تھی، ایک سیاسی شخصیت میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب ان میں موجود تھیں، لیکن ہندوستان کی دشمنی میں وہ اتنے سخت تھے، جیسے ایک چٹان، یہ بات انھوں نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں ظاہر کی، ان کے نزدیک حیدر آباد ایک مسلم علاقہ تھا اور کسی حالت میں بھی خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے وہ آزادی سے دستبردار نہیں ہو سکتا تھا، لائق علی کے دل و دماغ پر بھی انہی کا قبضہ تھا، جب کبھی لائق علی میں کچھ لچک پیدا ہوتی وہ معین جنگ تھے جو نہایت آسانی سے سابقہ موقف پر انھیں واپس لے آتے، جو یہ تھا کہ حیدر آباد ہر حالت میں ہندوستان سے آزاد رہے گا،

رضاکاروں کی بیہودہ سفاکیوں کے بارے میں اگر لائق علی اس کا اعتراف کر لیتے کہ واقعی فلاں بات تو بہت بری ہوئی تو معین نواز جنگ فوراً اس کی اصلاح کر دیتے اور تصحیح کرتے ہوئے کہتے کہ رضاکاروں کی زیادتیوں کا یہ افسانہ سراسر خیالی یا مبالغہ آمیز ہے، مجلس اتحاد تو صرف ہندوستان سے الحاق حیدر آباد کی مخالف ہے، باقی حیدر آباد گورنمنٹ سے اسے کوئی تعلق نہیں،

میرے راستہ میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ رضاکاروں کی دراز دستیوں اور سفاکیوں کے

واقعات جانچنے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا، لائق علی، معین نواز، نظام ریڈیو، اتحادی اخبارات مقامی حکام، سرکاری ترجمان سب اس پر مصر تھے کہ حیدرآباد میں کوئی ظلم و ستم نہیں ہو رہا ہے، دوسری طرف ہر ہندو اور غیر اتحادی مسلمان جس سے بھی میں ملا، اس نے ان مظالم کی تائید اور ان رپورٹوں کی تصدیق کی جو ہندوستانی اخبارات کے نمائندوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر حاصل کی تھیں

ان حالات میں آزادانہ تحقیقات ناممکن تھی، کوئی شخص خواہ کتنا ہی ذی رتبہ کیوں نہ ہو، اندرون ریاست کا دورہ مقامی حکام اور رضاکاروں کے جلو میں جائے بغیر نہیں کر سکتا تھا، اگر وہ تحقیق کے لیے پہنچ بھی جاتا تو دیہات کے لوگ اس سے الگ الگ رہتے، پھر بھی اگر وہ ان لوگوں سے ملنے کی جراءت کرتا تو اسے واپس جانے پہ مجبور کر دیا جاتا،

میرا دورہ

لائق علی سے مشورہ کرنے کے بعد جنوری میں، بیزواڑہ (اب وجے واڑا) کا میں نے دورہ کیا نظام گورنمنٹ کے ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس میرے ساتھ تھے، جب میرے دورہ کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو متعدد شہروں اور دیہاتوں کے ہندو لیڈروں نے، چند منٹ کے لیے اپنے ہاں مجھ سے چلنے پر اصرار کیا، میں نے یہ بات مان لی،

لیکن کتنی عجیب بات ہے، اگرچہ میں نے موٹر پر تقریباً دو سو میل کا سفر کیا، مجھے ایک ہندو بھی کہیں دکھائی نہیں دیا، صرف ایک جگہ ایک لرزہ براندام ہندو میرے سامنے پیش کیا گیا، جو پولیس افسر کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس نے مجھ سے کمیونسٹوں کی دراز دستیوں اور مظالم کی شکایت کی میں نے دیکھا، رضاکار سائیکلوں پر ہر جگہ مجھ سے پہلے پہنچ جاتے تھے۔

جب میں سکندرآباد واپس پہنچا، تو جن لوگوں نے اپنے شہر یا دیہات میں مجھے مدعو کیا تھا میرے پاس معذرت کرنے کے لیے آئے کہ کیوں میرا استقبال نہ کر سکے؟ انھوں نے بتایا کہ رضاکار آپ سے پہلے پہنچ گئے تھے، اور انھوں نے ہمیں متنبہ کر دیا تھا کہ اگر تم میں سے کوئی بھی غلشی کی پارٹی سے ملا، تو بڑا سخت بھگتان بھگتنا پڑے گا،

چند ماہ بعد ہولی طالع یار خاں درہ میں، بمبئی کے ایک صحافی حیدرآباد آئے تاکہ بچشم خود حالات کا مطالعہ کریں، انھوں نے رضوی سے ملاقات کی، جہاں ان کا پرجوش استقبال ہوا،

بیدر کے مظالم ابھی تازہ تھے، میں نے طالع یار خاں سے کہا، اگر اجازت مل جائے تو وہاں جا کر حالات کا مشاہدہ اور معائنہ ضرور کرو، چنانچہ جب رضوی نے ایک کار آفر کی کہ جہاں جانا چاہیں جایئے تو وہ بیدر جانے پر رضامند ہو گئے،

دوسری صبح رضوی کی کار رضاکاروں کا پرچم لہراتی طالع یار خاں کو بیدر سے جانے کے لیے دلکشنا سدن پہنچی، لیکن حیدرآباد سے دس میل آگے جانے کے بعد ڈرائیور نے کار روک دی اور کہا، میں آپ کو بیدر تو نہیں لے جا سکتا، البتہ نلگونڈا اور ورنگل لے جا سکتا ہوں تاکہ آپ کمیونسٹوں کے مظالم دیکھ لیں، طالع یار خاں غصہ میں بھرے ہوئے دلکشنا سدن واپس آ گئے،

آنجہانی امرت لال شیتھ جنم بھومی کے ایڈیٹر کو بھی ایک اسی طرح کا تجربہ ہو چکا تھا، وہ لائق علی سے ملے، انھوں نے بیدر کے مظالم کا انکار کرتے ہوئے دعوت دی کہ بذات خود وہاں جا کر حالات کا مشاہدہ کر لیجیے. صبح کار آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی،

میں نے امرت لال کو طالع یار خاں کا واقعہ بتا دیا، لہٰذا انھوں نے ایک مقامی وکیل کو بھی اپنے ساتھ لے لیا،

دوسری صبح ایک نہایت با اخلاق افسر امرت لال کے پاس آیا، جو حیدرآباد گورنمنٹ کے مہمان خانے گرین لینڈز میں ٹھہرے ہوئے تھے، اس نے کہا کہ چونکہ حیدرآباد اور ہندوستان کے تعلقات تلخ ہیں، لہٰذا آپ کو بیدر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اسی اثنا میں وہ وکیل جسے امرت لال اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے، گرین لینڈز میں پہنچ گیا، لیکن قبل اس کے کہ وہ احاطے میں داخل ہوتا رضاکاروں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا، بڑی مشکل سے ایک دکان میں چھپ کر اس نے اپنی جان بچائی،

بڑی مشکل

ان حالات میں مستند معلومات کا حاصل کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا، لیکن بہت جلد اضلاع سے صحیح معلومات مہیا کرنے کا میں نے بندوبست کر لیا۔ یہ کام میرے لئے اس لئے ضروری تھا کہ لائق علی صاحب بھی دہلی جاتے تو ان خبروں کے خلاف ضرور احتجاج کرتے جو رضاکاروں کے مظالم سے متعلق ہندوستانی اخبارات میں شائع اور آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتی تھیں، کیونکہ ان کے

نزدیک سراسر بے بنیاد تھیں،

نئی دہلی میں بارسوخ اصحاب کا ایک گروہ میرے خلاف ایک مورچہ قائم کیے ہوئے تھا۔ اس نے میرے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ حکومت ہند کو جو معلومات میں فراہم کرتا ہوں وہ ناقابل اعتماد ہیں۔

بہت سے وکیلوں نے حیدرآباد کی عدالتوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا، یہ اقدام رضاکاروں کی دراز دستیوں کے خلاف ایک احتجاج تھا۔

جو اطلاعات مجھے ملتی تھیں، ان کی تصدیق کرنا میرے لیے بہت مشکل کام تھا، لیکن رضوی کی مدد سے یہ مشکل کئی مرتبہ آسان ہو گئی، بعض پبلک جلسوں میں ایک ہیرو کی طرح اس نے اعلان کیا کہ رضاکاروں نے فلاں دیہات میں کیسے کارنامے انجام دیے ہیں، یہ تقریر دوسرے روز مجلس اتحاد کے اردو اخبارات میں شائع ہو گئی،

کیا میں جھوٹا تھا؟

اس کے باوجود لائق علی کا کہنا یہ تھا، اور جسے وہ مسلسل کہے جا رہے تھے کہ مظالم کے افسانے سراسر بے بنیاد ہیں، مجھے حیرت اس پر نہیں ہے کہ لائق علی نے ان واقعات و حقائق سے انکار کیا بلکہ صدمہ اس کا ہے کہ نئی دہلی کی بعض اہم اور سربرآوردہ شخصیتوں نے مجھے جھوٹا اور لائق علی کو سچا سمجھا،

حیدرآباد کے کئی آزاد خیال ہندوؤں اور مسلمانوں سے میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، یہ لوگ مجھ سے التجا کرتے تھے کہ دہشت انگیزی کی اس حکومت کو ختم کرنے کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھاؤں یہ لوگ اب تک اس غلط فہمی میں تھے کہ میں وہی اختیارات رکھتا ہوں جو ریذیڈنٹ تھے۔ ٭

کمیونسٹ میدان میں آتے ہیں

سوامی گروپ کے متحدہ محاذ میں جو کمیونسٹ لیڈر شریک تھے ان سے حیدرآباد پہنچنے کے بعد میں نے رابطہ قائم کیا، چونکہ تلگونڈا اور ورنگل میں یہ غیر معمولی اثر رکھتے تھے، میں نے سوچا حیدرآباد میں کمیونسٹ تحریک کو سمجھنے کی کوشش کروں۔

۱۹۳۷ء میں جب میں بمبئی کا وزیر داخلہ تھا اور بمبئی کمیونسٹوں کا گڑھ تھا، نہایت قریب سے ان کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔

کامریڈ ایسوسی ایشن

۱۹۴۰ء میں حیدرآباد کے کمیونسٹوں نے کامریڈ ایسوسی ایشن اپنے مخصوص سازشی انداز سے قائم کی، اس کے مقاصد اتنے مبہم تھے کہ نیشنلسٹ اور ترقی پسند کانگرسی اور مسلمان دونوں نے فیصلہ کر لیا کہ ایوان کامریڈ میں پہنچ جائیں۔

اس جماعت میں سب سے نمایاں کمیونسٹ نارائن ریڈی تھے، جنھوں نے ریاستی کانگرس کے ورکر کی حیثیت سے ۱۹۳۸ء میں ستیہ گرہ کرکے عوام میں ہر دل عزیزی حاصل کر لی، دوسرے سربرآوردہ کمیونسٹ مخدوم محی الدین تھے، ان دونوں نے بہت جلد کمیونسٹ پارٹی آف

ایک گارڈن پارٹی کا منظر

میر لائق علی - کے ایم منشی - نواب معین نواز جنگ
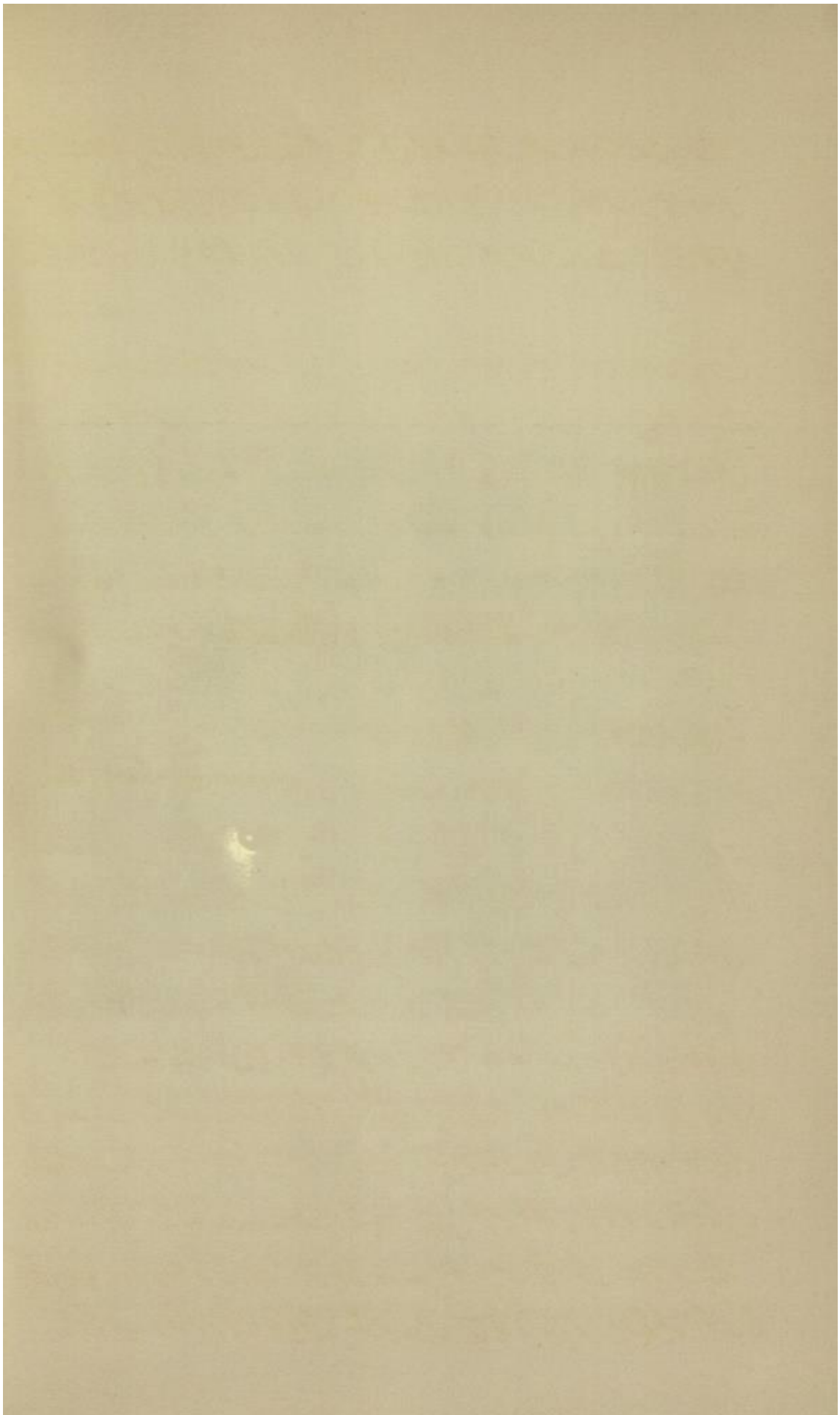
انڈیا سے رابطہ پیدا کر لیا جس نے ابھی حال میں آندھرا کو ایک علیحدہ صوبہ تسلیم کرایا تھا۔
کامریڈ ایسوسی ایشن ایک مرتبہ جب کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا حصہ بن گئی تو اس نے ٹروجن ہارس والی تکنیک استعمال کرنا شروع کر دی جس تکنیک سے دنیا اچھی طرح واقف ہے۔

جنگ ٹرائے میں جس کا نقشہ ہومر (Homer) نے کھینچا ہے یونانیوں نے ٹرائے پر فتح حاصل کرنے کا منصوبہ یہ بنایا کہ ایک چوبی گھوڑے میں کچھ ساونت اور سورما چھپا دیئے۔ ٹروجنس نے جو یونانیوں کے دشمن تھے۔ اس چوبی گھوڑے کو ایک مذاق سمجھا اور اسے محل میں لے گئے، قلعے میں داخل ہونے کے بعد یونانی گھوڑے محل سے باہر آئے اور ٹرائے کے دروازے اپنے کامریڈوں کے لئے کھول دیئے، ٹروجنس کا قتل عام کیا، قلعہ پر قبضہ کر لیا، جسے بارہ سال تک محاصرہ کرنے کے بعد بھی وہ سر نہیں کر سکے تھے، بالکل یہی کرتب ہزاروں مواقع پر دنیا کے مختلف مقامات میں کمیونسٹ اختیار کرتے رہے ہیں۔

کمیونسٹ تکنیک

حیدرآباد کے کمیونسٹوں نے اپنی تکنیک کے مطابق پہلے تو آندھرا مہا سبھا کے ترقی پسند لیڈروں کے ساتھ ربط ضبط شروع کیا جو اسٹیٹ کانگرس آرگنائزیشن کی حیثیت سے برسر عمل تھی، نرائن ریڈی بہت جلد اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور جوش کار کے باعث کانگرس کے سربرآوردہ لوگوں میں شمار ہونے لگا، لیکن جب وہ مہا سبھا کا صدر منتخب ہو گیا تو کمیونسٹوں نے ان تمام ممبروں کو نکال باہر کر دیا جو کانگرس سے وابستگی رکھتے تھے۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک کی مدت میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے روس کی بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹی کے حسب ہدایت بہت سی پیپائیاں اختیار کیں اور متعدد سمجھوتے کئے، دوسری جنگ عظیم جب شروع ہوئی تو ان کے نزدیک یہ سامراجی جنگ تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے بمبئی میں متعدد کمیونسٹ لیڈروں سے جنگ کے پہلے سال مجھے گفتگو کرنے کا موقعہ ملا جبکہ ہمیں یقین تھا کہ یہ مقامی کانگرس سے وابستہ ہو کر ہمارے پہلو بہ پہلو انگریزوں سے لڑیں گے۔
لیکن جب دفعتہً روس اتحادیوں کے کیمپ میں پہنچ گیا تو ساری دنیا کے کمیونسٹوں کی

نظر میں اور خود کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی نگاہ میں بھی یہ جنگ قومی جنگ بن گئی۔ اور عین اس وقت جب ہندوستان خالی کردو" کی تحریک کو کچلنے کے لئے پوری برطانوی مشنری حرکت میں آگئی تھی تو یہ کمیونسٹ صدق دل سے برطانوی حکومت کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔

کمیونسٹوں کی تلوّن کیشی

اور آخر کار جب انگریزوں نے ہندوستان خالی کر دینے کا فیصلہ کر لیا تو برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے حسب ہدایت ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے نہرو گورنمنٹ کی تائید شروع کر دی اور اعلان کر دیا کہ پاکستان کے مقابلہ میں نہرو گورنمنٹ بہت زیادہ ترقی پسند ہے۔

آندھرا مہا سبھا اور حیدر آباد کی کمیونسٹ پارٹی دونوں کی دونوں کمیونسٹ تھیں باہمی تعاون کے ساتھ مصروف عمل ہوگئیں، حیدر آباد کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی سرگرمیاں ٹریڈ یونینز، طلبہ کی جماعتوں اور مجلس اتحاد کے حلقوں میں شروع کر دیں، مہا سبھا نے دیہاتوں کی ذمہ داری اپنے سر لی اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ تنگا نہ اور ورنگل کے اضلاع میں جاگیرداروں اور نوابوں کے خلاف سرگرمیاں شروع کر دیں، دیہاتی لوگ دل و جان سے ان کے ساتھ ہوگئے۔

حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ جب سر مرزا کے ہاتھ میں آئی تو نظام گورنمنٹ نے کمیونسٹوں کی نیت کو قابو میں لانے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں ایک کمیشن بھی مقرر کر دیا گیا، نتیجہ یہ نکلا کہ بعض کمیونسٹ لیڈر سزا یاب ہوئے، تشدد کے الزام میں بعض کی زمینیں ضبط کر لی گئیں، فوراً ہی یہ لوگ زیر زمین سرگرمیوں میں منہمک ہوگئے، یا وجیواڑا میں بیٹھ کر تحریک کی رہنمائی کرنے لگے۔

متشددانہ سرگرمیاں

۴۸ء کے وسط میں کمیونسٹ پارٹی نے ملک کے متعدد مقامات پر متشددانہ سرگرمیاں شروع کر دیں، انہیں یقین تھا کہ جیسے ہی ہندوستان کو اختیارات منتقل [illegible] افراتفری اور طوائف الملوکی کا دور دورہ شروع ہو جائے گا اور نہرو حکومت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی اور اسٹالن کے جانشین کی حیثیت سے یہ ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے جنوبی ہند میں مضبوطی سے اپنے پاؤں جما لئے تھے، مدراس کی متعدد ملوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ اسٹرائکیں کرانے میں ناموری حاصل کر لی تھی۔ مالابار کی اسپیشل پولیس تک کو اسٹرائیک پر آمادہ کر لیا تھا، کینانور سنٹرل جیل کے وارڈنوں کو بھی انھوں

نے اسٹرائیک کا سبق کامیابی کیساتھ پڑھلیا تھا ۔جو یہ تھا کہ شہر مدراس کی پولیس کو اس پر آمادہ کرلیا تھا کہ وہ تنخواہ وصول کرنے سے انکار کردے ، مالا بار میں اس نے کسانوں کو ترغیب دی کہ دوسروں کی زمینوں پر قبضہ کرلیں او جب پولیس نظم و امن بحال کرنے کے لئے پہنچی تو بندوقوں اور نیزوں سے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا، تنجور میں کاشتکاروں کو نہ فصل بونے دی گئی ، نہ کاٹنے کی اجازت دی گئی۔

کانگرس سے اتحاد

جولائی ۱۹۴۷ء میں جب حیدرآباد میں کانگرس غیر قانونی جماعت نہ رہی تو کمیونسٹ فوراً اس کے ساتھ آملے کانگرس کی ہر دلعزیزی سے انھوں نے بھی اپنا حصہ وصول کیا، دیہاتوں میں یہ چھاگئے انھوں نے دیہات کے ان پڑھ اور اجڈ لوگوں کو منظم کرکے سرحدی دیہاتوں میں کسٹم کی چوکیاں جلادیں، جبراً روپیہ، ہتھیار اور ساز و سامان جنگ حاصل کیا، جن لوگوں نے مزاحمت کی انھیں قتل کردیا، ان کے گھروں میں آگ لگادی اور لوٹ لیا، جن لوگوں سے ذاتی عداوت تھی انھیں بھی خوب ستایا۔

دسمبر ۱۹۴۷ء میں کمیونسٹوں نے ایک نئی قلابازی کھائی، مجلس اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں یوکرین کو نشست نہ مل سکی، جس سے روس بھڑک اٹھا اور اس نے جمہوریتوں سے قطع تعلق کا فیصلہ کرلیا، اس موقع پر مغربی حکومتیں ایک مرتبہ پھر کمیونسٹوں کی نظر میں مردود قرار پائیں، انھیں سامراج پرستی کا طعنہ دیا گیا اور الزام لگایا گیا کہ یہ جمہوریتیں جنگ چاہتی ہیں اور نہرو گورنمنٹ بھی ان کا آلۂ کار ہے۔

رضاکاروں کی مدد سے نظام گورنمنٹ نے ریاستی کانگرس کی پابندیوں کو کچلنے کا جب فیصلہ کیا، تو رامانند تیرتھ کا گروپ ہندوستان کے ایک سرحدی دیہات میں چلا گیا، وہ نام نہاد ستیہ گرہ جو ریاستی کانگرس نے چلائی کسی طرح بھی گاندھی جی کے اصولوں کے مطابق نہ تھی، دیہاتی لوگوں کو رضاکاروں نے دہشت زدہ کیا، کمیونسٹوں نے نظام پولیس اور رضاکاروں کے خلاف جھٹ ایک متحدہ مورچہ بنالیا۔

کمیونسٹوں کی چالاکی

اسٹیٹ کانگرس کے کارکن کمیونسٹوں کے شانہ بشانہ کام کررہے تھے، لیکن کمیونسٹوں نے ان تحفظات پر انھیں قدم بھی نہ رکھنے دیا۔

جہاں انھیں غیر معمولی اقتدار حاصل تھا۔

رضاکاروں کی چیرہ دستیوں سے عاجز آ کر دیہاتیوں نے کمیونسٹوں کو اپنی مدد کے لئے بلایا اور انھیں ضروری ہتھیار بھی دیئے، اور پھر دیہات کے کمیونسٹ دستے مزاحمت کے مراکز قائم کرنے کے بعد ریاست کی مسلح فوجوں اور رضاکاروں کے ساتھ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

دنیا میں ہر مرحلہ پر کمیونسٹوں کے ساتھ اتحاد قومی مفاد کے لئے خطرناک ثابت ہوا، سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ بعد از جنگ کی مصیبتوں کا اکثر حصہ کمیونسٹوں ہی کا لایا ہوا تھا۔ میں چونکہ ان حقائق سے واقف تھا لہٰذا میں نے چند کانگرسی کارکنوں کو متنبہ کیا کہ کمیونسٹوں کے ساتھ مل کر مزاحمت کی تحریک کو سفاکانہ دہشت کا نمونہ بنا دینا حد درجہ خطرناک ہے۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں جب میں حیدرآباد پہنچا تو کمیونسٹ ایک بڑے علاقہ پر جو اضلاع نلگنڈہ اور ورنگل پر حیدرآباد میں اور کرشنا، گنٹور، مشرقی گوداوری اور مغربی گوداوری پر صوبہ مدراس میں مشتمل تھا قبضہ کر لیا تھا۔

جب میں دورے پر نکلا تو میں نے محسوس کیا کہ کانگرس نے کمیونسٹوں کو شامل کر کے جو متحدہ محاذ بنایا تھا، اس سے کمیونسٹوں نے بہت زیادہ فائدہ حاصل کیا ہے، حیدرآباد کے بہت سے ہندو اور مدراس کے تامل بولنے والے علاقہ کے اکثر کانگرسی اور کچھ سرکاری حکام اس بات کے سخت خلاف تھے کہ حکومت ہند یا صوبائی حکومت مدراس کے سرحدی اضلاع میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عاید کرے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر نے متحدہ محاذ قائم رکھنے پر اصرار کیا، ورنہ تلنگانہ کا علاقہ رضاکاروں کی دستبرد سے نہیں بچ سکے گا۔

بعض کمیونسٹ لیڈروں سے میری ملاقات

وجیواڑا میں چند کمیونسٹ لیڈروں سے ملنے اور گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملا، انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ اپنے مقاصد اور منصوبے بیان کئے، اگرچہ اپنی کامیابیوں کی جو داستان بیان کی وہ کافی مبالغہ آمیز تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم مکمل طور پر تامل بولنے والے اضلاع کو خواہ وہ حیدرآباد میں ہوں یا حیدرآباد سے باہر، اپنے قبضہ میں لے چکے ہیں، اور ان کے

قلوب اس یقین سے معمور تھے کہ اندھرا کا صوبہ کمیونسٹوں کا سب سے بڑا گڑھ ثابت ہوگا۔ میرے لئے یہ بات بہت زیادہ تکلیف دہ تھی کہ متعدد کانگرسی لیڈر اپنی سادہ لوحی کے باعث ان کی کامیابی کے متمنی تھے۔

رضاکار بجائے خود بھی ایک بہت بڑا خطرہ تھے لیکن سب سے بڑا خطرہ اس لئے تھے کہ ان کی وجہ سے کمیونسٹوں کو فروغ کا موقع مل رہا تھا۔

حلقہ ٹوٹتا ہے!

حکومت نظام نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں حیدرآباد میں سب سے الگ تھلگ رہوں۔ صرف دو شخص ایسے تھے جن سے میں رابطہ قائم رکھ سکتا تھا، میر لائق علی اور معین نواز جنگ۔

رضا کار میرا تعاقب کرتے تھے

یہ بات میرے لئے حد درجہ ناخوشگوار تھی کہ جہاں بھی جاؤں، جدھر کا رخ بھی کروں سائیکل سوار رضاکار میرے تعاقب میں چکر کاٹنے لگتے، صرف اس وقت رضاکار میرا پیچھا چھوڑتے تھے جب میں لائق علی سے ملنے جاتا تھا، میں نے اپنے آپ کو دلکشا سدن کا محصور بنا لیا تھا۔

میں نے سردار سے کہا کہ حیدرآباد میں میری مثال بالکل سیتا کی طرح ہے جو اشوکا دانا میں تنہا بیٹھی رہتی تھیں۔

لیکن جیسا کہ میں نے عنوان کی سرخی قائم کی ہے، وہ وقت قریب آرہا تھا جب یہ حلقہ جو میرے گرد باندھا گیا تھا ٹوٹنے والا تھا، میں خود تو باہر نہیں جاتا تھا لیکن متعدد لوگ تھے جن سے دلکشا سدن میں میری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ یہی لوگ میری آنکھ تھے اور یہی میرے کان۔ نظام جو کچھ کریں، لائق علی کی اور رضوی کی ہر حرکت اور جنبش کا علم چند لمحوں میں مجھے

ہو جاتا تھا۔

پرنس آف برار کی سعادت مندی

پرنس آف برار اور ان کے چھوٹے بھائی معظم جاہ کی خدمت میں مجھے شرف باریابی حاصل ہو چکا تھا، کچھ عرصہ پہلے جب شہزادی دُرِ شاہوار لندن سے واپس آئیں تو میری بیوی حیدرآباد ہی میں تھیں۔ میں نے پرنس آف برار کو اطلاع دی کہ ہم میاں بیوی ان سے اور شاہزادی دُرِ شاہوار سے ملنا چاہتے ہیں۔ جواب میں ایک بہت ہی دلچسپ قسم کا پیغام پرنس کے سیکرٹری نے بھیجا۔

"مہربانی کرکے آپ ہمارے پاس تشریف لانے کی زحمت نہ گوارا کیجئے۔ آپ ہندوستان کی ایک سربرآوردہ شخصیت ہیں، میں شہزادہ برار ہوں لیکن آپ سے اس بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ میں نہیں مل سکوں گا جس طرح میری خواہش ہے، ملنے سے پہلے میرے نظام سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہے اور اجازت اسی وقت ملے گی اگر ملاقات کے وقت ان کا جاسوس بھی ہمارے درمیان موجود ہے، یہ چیز ہم دونوں کے لئے تکلیف دہ ہے۔"

یہ سالار جنگ تھے

میں نے حیدرآباد کے جوٹی کے جاگیردار اور نہایت سربرآوردہ شخص سر سالار جنگ سے ملاقات کی، تھوڑی بہت واقفیت پہلے سے بھی تھی، سر سالار جنگ مجھے اپنے پرائیویٹ کمرہ میں لے گئے اور سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

"مسٹر منشی! یہ لوگ ہرگز الحاق منظور نہیں کریں گے۔ ہماری جان اور ہمارا مال رضوی کے رحم وکرم پر ہے، اگر آپ حیدرآباد کا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں تو سکندرآباد سے ہندوستانی فوج ہرگز نہ ہٹائی جائے، میں نے اس ریاست کی برسہا برس خدمت کی ہے، میں یہاں کا چوٹی کا رئیس ہوں لیکن ہر وقت مجھے اپنی جان کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

رخصت ہوتے وقت سر سالار جنگ نے مجھ سے کہا کہ جب بھی میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کروں گا آپ کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا، چند ماہ کے بعد انھوں نے اپنا وعدہ پورا کیا، وہ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے، وہ جذباتی طور پر بہت زیادہ بھڑکے

ہوئے تھے، انھوں نے مجھ سے کہا۔

"میں ہر وقت اپنے پاس پستول رکھتا ہوں کہ اگر حملہ کیا جائے تو بچاؤ کر سکوں"۔

وہ ہندو جاگیردار

ایک اور بہت بڑا ہندو جاگیردار مہذب تعلیم یافتہ اور شائستہ انسان اپنی شاندار لائبریری میں گوشہ نشین ہو گیا تھا۔ جب میں اس سے ملا، اس نے سرگوشی کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

"مسٹر منشی! وجہ آپ سمجھتے ہیں، ملاقات باز دید کے لئے میں نہیں حاضر ہو سکوں گا"۔

راجہ دھنراج گیر جی حیدر آباد کے سب سے بڑے ہندو جاگیردار مجھ سے ملے، یہ ایک نوجوان آدمی ہیں اور ہندوستان کے دل سے حامی، یہ کئی بار مجھ سے ملے۔

حیدر آباد پہنچنے کے چند ہی روز بعد مجھے معلوم ہوا کہ درباریوں اور حکام سرکار کو احکام بھیج دیئے گئے ہیں کہ مجھ سے کسی طرح کی راہ رسم کنگ کوٹھی سے اجازت حاصل کئے بغیر نہ رکھی جائے دین یار جنگ کو اجازت مل گئی کہ وہ میرے لنچ کی دعوت قبول کریں، لیکن ہوشیار جنگ کو یہ اجازت نہیں ملی، ریاست کے سربرآوردہ ہندو بھی شروع شروع میں مجھ سے ملتے ہوئے جھجکتے تھے۔

اس طرح سب سے کٹ جانے کے بعد حیدر آباد میں میرے لئے اپنی سرگرمیاں جاری رکھنا بالکل ناممکن تھا، اب میں نے دوسری ترکیب اختیار کی، نہایت اعلیٰ پیمانہ پر لنچ، ٹی پارٹی اور ڈنر کی ضیافتیں ترتیب دینے لگا، جب مہمان آجاتے تو میں لوگوں سے مذاق کے پیرایہ میں گفتگو چھیڑ دیتا، دلچسپ داستانیں بیان کرتا اور اس طرح دوستانہ تعلقات قائم کر لیتا

نظام ہمہ گیر پیمانہ پر جاسوسی نظام قائم کئے ہوئے تھا۔ ہر شخص کے ساتھ اس کے جاسوس لگے رہتے۔ اس کے بیٹے، اس کے وزراء، اس کے دشمن، اس کے سربرآوردہ حکام اس کے جاسوسوں سے گھرے ہوئے تھے، لیکن یہ لوگ بھی غافل نہ تھے، ان کے جاسوس بھی کنگ کوٹھی میں ہمہ وقت موجود رہتے، اور رتی رتی خبر پہنچایا کرتے۔

جاسوس بیوقوف بناتے تھے

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ عجیب اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ بعض جاسوس، جاسوسی کی تنخواہ بیک وقت کئی کئی

جگہوں سے لیتے تھے، نظام سے بھی اور دوسرے متعدد لوگوں سے بھی، ہر روز یہ لوگ اپنے مختلف آقاؤں کو نئی نئی خبریں پہنچاتے، نظام نے کس سے ملاقات کی اور کیا کیا باتیں ہوئیں ؟ اسی طرح دوسرے لوگوں کے بارے میں نظام کو بتایا جاتا کہ انھوں نے کس سے ملاقات کی اور کیا کیا باتیں کیں۔

ایک ہی مہینہ کے اندر مجھے اپنے تین ملازموں کو برخاست کر دینا پڑا جو میری جاسوسی کیا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک بہت ہی عجیب داستان میرے علم میں آئی، میں اس کی صداقت کی ذمہ داری تو نہیں لے سکتا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا سرچشمہ محل شاہی تھا، ایک موقع پر نظام نے اپنے پہرہ داروں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ٹفن کیریر کھول کر دکھائیں انھوں نے اپنے درباریوں سے کہا، ریذیڈنٹ کے زمانہ میں یہ لوگ ٹفن کیریر میں اچھا کھانا رکھا کرتے تھے، اس لئے کہ وہ اچھی تنخواہ دیتا تھا، لیکن یہ منشی ایک بنیا ہے، یہ بیچاروں کو کچھ نہیں دیتا، بھلا یہ بنیئے حکومت کرسلیں گے ؟

جاسوسوں کے نرغہ میں

نظام پولیس کی طرف سے بھی میرے اوپر جاسوس مقرر تھے، وکٹ ناسدن کی نگرانی کے لئے جو سب انسپکٹر متعین تھا وہ نہایت چوکسی کے ساتھ میری اور میرے ملنے والوں کی نگرانی کیا کرتا تھا اور میرے ملازموں کو تھوڑے تھوڑے راز اگلوانے کی سعی میں لگا رہتا تھا، کچھ سادہ پوش لوگ بھی تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر گھوما کرتے تھے، بکٹ سدن کے آس پاس رضوی کے آدمی بھی مصروف کار رہتے تھے۔

دوگانہ فرض

الاتحاد ملی وزارت سے اکثر لوگ شاکی تھے، ان میں وہ لوگ بھی تھے جو نظام کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے، نظام یا قاسم رضوی کے کئی معتمد میرے پاس ٹوہ لینے کے لئے آیا کرتے تھے اور یہاں آکر دوگانہ فرض ادا کرتے تھے، یہاں آکر وہاں کی باتیں بتاتے تھے، اور وہاں جاکر یہاں کی۔

اس زمانہ میں متعدد اصحاب جن سے میں نے دوستانہ روابط قائم کر لئے تھے تمام اہم

اور ضروری حالات سے مجھے باخبر رکھتے تھے۔

حیدر آباد کے تمام ہندو سوا چند اتحادی ہریجنوں کے یوم نجات کے منتظر تھے اور ہماری مدد پر ہر طرح سے آمادہ۔

بیچارہ ڈاکٹر کرنل واگھرے حیدر آباد کے کامیاب ڈاکٹر اور نظام کے معالج خاص میرے معالج بھی تھے، بہت جلد ہم دونو دوست بن گئے، سیاسی مباحث سے قطع نظر کرنل واگھرے نے کنگ کوٹھی کے اخلاقی حالات پر جو روشنی ڈالی وہ بہت ہی عجیب تھی، لیکن واگھرے کو میری دوستی کی قیمت جلد ہی ادا کرنی پڑی۔ چند ماہ بعد انھیں برخاست کر دیا گیا اور فضا اتنی ناساز گار ہوگئی کہ انھیں حیدر آباد چھوڑ کر اپنے وطن یوپی میں واپس جاکر اس دن کا انتظار کرنا پڑا کہ کسی خطرہ کے بغیر وہ پھر حیدر آباد واپس آسکیں۔

واگھرے حیدر آباد سے چلے گئے، میں نے ایک دوسرے بہت مشہور ڈاکٹر سے رجوع کیا، لیکن تین مرتبہ کی کوشش کے باوجود یہی معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ آخر آنجہانی سروجنی دیوی کے شوہر ڈاکٹر نائیڈو سے جو بہت دنوں سے پریکٹس چھوڑ چکے تھے رجوع کرنا پڑا۔

ریاست کا ایک بہت بڑا افسر جس کا نام لینا میں نہیں چاہتا، بہت دلیر ثابت ہوا، وہ نہایت بے باکی سے مجھ سے ملنے آتا رہا، گو اس نے مصائب جھیلے، لیکن بہادری کے ساتھ ہر خطرہ کا مقابلہ کیا، ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ نظام نے بنفس نفیس اسے ہدایت کی کہ مجھ سے نہ ملا کرے، لیکن وہ باز نہ آیا، اور قبل اس کے لائق علی اس کے خلاف کوئی سخت اقدام کرتے رخصت لے کر وہ بمبئی چلا گیا، لیکن بدقسمتی اس کے ساتھ تھی بمبئی پولیس نے نظام کا جاسوس سمجھ کر اسے جیل میں ڈال دیا۔ اس کی بیوی بے انتہا غصہ کی حالت میں ایک روز شام کو دکھشنا سدن پہنچی، اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے چیختے ہوئے کہا "یہ دنیا بھی کیسی عجیب جگہ ہے، حیدر آباد میں میرا شوہر ہندوستان کا جاسوس اور بمبئی میں حیدر آباد کا"۔

میں نے بمبئی کے ہوم منسٹر سے اس بارے میں مفصل گفتگو کی اور آخر کار اس نے اس بیچارے کو رہا کر دیا۔

پنالال پٹائی

حیدرآباد کا ایک نہایت ممتاز کاروباری شخص پنالال پٹائی سلجھے ہوئے دماغ اور حلیم مزاج کا آدمی تھا، ریاست کے سرکردہ ہندوؤں اور مسلمانوں سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے، وہ غیر معمولی اثر ورسوخ کا آدمی تھا، میں اس خاندان کو ۱۹۱۱ء سے جانتا ہوں جب پنالال بالکل بچہ تھا۔

اگر لکشمی نواس کی مدد شامل نہ ہوتی تو میں ہرگز اس حلقہ کو توڑنے میں کامیاب نہ ہوسکتا جو میرے گرد قائم کیا گیا تھا، وہ لکشمی نواس تھا جو مختلف ذرائع سے اہم خبریں حاصل کر کے مجھ تک پہنچایا کرتا تھا، ایک وقت ایسا بھی آیا جب ریاست کے کانگرسی حلقے بھی اسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے میرے اشارہ سے کر رہا ہے، ایک ایسا وقت بھی آیا جب لائق علی نے اسے وزارت پیش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔

راجہ بہادر آئینگر بجائے خود ایک طبقہ ہیں، ایک بلند پایہ ماہر قانون، ایک منجھا ہوا سیاستداں اور ایک بارسوخ انسان، نظام نے متعدد مواقع پر ان سے مشورے لئے، گو انھیں قبول کبھی نہیں کیا، حیدرآباد میں جو کچھ ہو رہا تھا آئینگر اس کے متعلق حیرت انگیز معلومات رکھتے تھے، ان کے فراہم کردہ اطلاعات اور مشوروں سے میں نے غیر معمولی فائدہ اٹھایا۔

شاستری کی کارگزاریاں

ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا، یونائیٹڈ پریس آف انڈیا کے نمایندے بھی دلیر اور ذہین نوجوان تھے، یہ بھی معلومات حاصل کرتے اور میری جھولی میں ڈالتے رہتے۔

ان نمایندگان پریس میں سب سے زیادہ باہمت شخص شاستری تھا، حیدرآباد کا ایک ہندو صحافی، عملی طور پر وہ ونکٹ راؤ ہریجن منسٹر کا محرم اسرار بنا ہوا تھا، ساتھ ہی ساتھ رضوی کا معتمد بھی۔

میرا جاسوس

فروری میں یہ نوجوان مجھ سے ملنے آیا، اس نے مجھ سے درخواست کی کہ حیدرآباد سے باہر کوئی کام اس کے لئے تلاش کر دوں،

اس نے مجھے بتایا کہ یہاں کے حالات سے میں تنگ آچکا ہوں اور اب ریاست سے باہر قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں، میں نے حیدرآباد کے قریب ہی مدراس میں ایک اخبار سے اسے وابستہ کر دیا، میں نے اس سے کہا کہ وہ ہندوستان کی اور میری بہت بڑی خدمت کریگا اگر وہ مجلس اتحاد کے اندرونی حلقوں سے کسی نہ کسی صورت میں ربط ضبط قائم رکھے، اس نے وعدہ کر لیا۔

اس کے بعد وہ اکثر و بیشتر خفیہ یا علانیہ طور پر میرے پاس آنے جانے لگا، رضوی اسے اپنا جاسوس سمجھتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آخر تک وہ وفاداری کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی خدمت کرتا رہا، اس نے کوئی صلہ نہیں طلب کیا، سقوط حیدرآباد کے بعد بھی نہیں۔

خودکشی کا راستہ

بہت سے حساس اور باشعور مسلمان سخت پریشان تھے کہ حیدرآباد کی قسمت مجلس اتحاد کے رحم و کرم پر ڈال دی گئی ہے، یہ لوگ یا تو وہ تھے جنھوں نے اپنی دوراندیشی سے سمجھ لیا تھا کہ آخر کار حیدرآباد ہارے گا، یا وہ جو موجودہ حکومت سے بے انتہا بے زار اور نالاں تھے، اور چند ایسے لوگ بھی جو اگرچہ نظام کے وفادار تھے لیکن یقین کامل رکھتے تھے کہ حیدرآباد کا بھلا ہندوستان سے الحاق میں ہے، یہ سب برابر مجھ سے ربط قائم رکھتے تھے۔

جو مسلمان شروع ہی سے یہ محسوس کر رہے تھے کہ حیدرآباد کی نجات اور نظام کی عافیت صرف ہندوستان سے الحاق میں ہے ان میں نواب منظور یار جنگ کو میں نے سب سے زیادہ باہمت آدمی پایا، وہ حساس، دوراندیش اور بے غرض انسان تھے، مجلس اتحاد سے انتہائی نفرت کرتے تھے، میرے حیدرآباد جانے سے پہلے انھوں نے کئی مرتبہ نظام کو متنبہ کیا تھا کہ جس راستہ پر وہ چل رہے ہیں وہ خودکشی کا راستہ ہے۔

منظور یار جنگ کا ذکر خیر

منظور یار جنگ اکثر مجھ سے ملا کرتے تھے، انھوں نے اپنے کئی دوستوں کو بھی مجھ سے متعارف کرایا، مثلاً دلدار حسین ایک ریٹائرڈ انجنیئر، دلدار حسین اور منظور یار جنگ کے خیالات بالکل یکساں تھے، مارچ میں اتحادی لیڈروں نے نظام کو مجبور کیا کہ کنگ کوٹھی میں منظور یار جنگ کی آمد و رفت

بند کر دی جائے، اس طرح بیچارے کو اپنی صاف گوئی کی بڑی گراں قیمت ادا کرنی پڑی، میں اس شخص کو جس کا دل صاف اور طبیعت استوار تھی بہت پسند کرتا تھا، افسوس پولیس ایکشن کے فوراً بعد اس شخص کا انتقال ہو گیا، اور جب گورنمنٹ آف انڈیا کے وزیر غذا کی حیثیت سے الحاق شدہ حیدر آباد کا میں نے دورہ کیا تو میں منظور یار جنگ کے گھر گیا اور ان کی بیوہ سے تعزیت کی۔

وہ منظور یار جنگ تھے جنھوں نے ایک بہادر اور قوم پرست مسلمان شعیب اللہ خاں ایڈیٹر "امروز" سے میرا تعارف کرایا تھا، یہ شعیب بھی غضب کا آدمی تھا، اپنے اخبار میں بڑی دیری سے مجلس اتحاد کی دھجیاں اڑایا کرتا تھا، آخر کار اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا، وہ قتل کر دیا گیا۔

ہوشیار جنگ کی سرگرمیاں

دوسرے مسلمانوں میں جو میرے لئے بہت زیادہ معین و مددگار ثابت ہوئے نظام کے مصاحب خاص نواب ہوشیار جنگ بھی تھے۔ وہ انھیں اپنا بدترین دشمن سمجھتے تھے، اردو زبان پر انھیں بے پناہ قدرت حاصل تھی، طنز و تعریض کے فن میں تو وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، نظام کو خوش رکھنے اور ہنسانے کے لئے وہ مسخرے بھی بن جایا کرتے تھے، غیر ذمہ دارانہ انداز گفتگو کے باوجود وہ دور اندیش اور سلجھے ہوئے آدمی تھے، اس ساری مدت میں نظام کے مفاد کے لئے وہ برابر کام کرتے رہے، کیونکہ دیانت داری کے ساتھ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ خاندان آصفیہ کی نجات صرف اس طرح ممکن ہے کہ انڈین یونین سے اس کے دوستانہ تعلقات ہوں سر مرزا بھی ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ انھیں حیدر آباد کی وزارت عظمیٰ ہوشیار جنگ کے اثر و رسوخ ہی کی بدولت ملی۔

نظام نے ہوش کو مجھ سے ملنے کی کبھی اجازت نہیں دی تھی، بہر حال ایک دفعہ دو بجے رات کو میرے اے ڈی سی نے مجھے جگایا اور بتایا کہ نواب ہوشیار جنگ بغرض ملاقات تشریف لائے ہیں، ذرا میری حیرت کا تصور کیجئے، میرے سامنے ایک شخص کھڑا تھا، سر پر ٹوپی ندارد، کرتے اور پاجامے میں ملبوس، بڑی مشکل سے جاسوسوں کی آنکھ بچا کر وہ کھسک آسکے، دن میں اس دروازے

سے داخل ہوا تھا جو نجی ملازمین کے لئے مخصوص تھا۔

ہوش بڑے اچھے آدمی تھے

صورت حالات پر بڑی دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے، یہ پہلا موقعہ تھا اور اس کے بعد برابر نظام کی ذہنی رو کا اندازہ ہوشیار جنگ کی وساطت سے مجھے ہوتا رہا، جو لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی تھی، ہوش کو نظام سے محبت تھی، وہ انھیں ہر ترکیب سے مجلس اتحاد کی گرفت سے بچانا چاہتے تھے، ان کی سرگرم کوشش یہ تھی کہ دین کو بے خبر رکھ کر نظام کو مجھ سے ملنے پر راغب کریں۔

نصف شب کے وقت

حسب معمول ایک مرتبہ آدھی رات کے بعد ہوش میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا، اگر نظام اپنی والدہ کی برسی کے موقع پر آپ کو ڈنر پر مدعو کریں تو کیا آپ قبول کرلیں گے؟

"ضرور قبول کروں گا" میں نے جواب دیا۔

ہوش نے ڈنر کا معاملہ مجھ سے طے کرنے کے بعد کہا کہ اس اہم موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیئے مجھے پھولوں کی ایک چادر ضرور پیش کرنی چاہیئے، دو تین روز میں دعوت نامہ آپ کو مل جائے گا، یہ کہہ کر ہوش چلے گئے۔

لیکن دعوت نامہ میرے پاس نہیں آیا، چند روز بعد ملاقات شبینہ میں ہوش نے مجھے بتایا کہ یہ اسکیم کیوں پروان نہ چڑھ سکی۔ انھوں نے کہا کہ نظام نے احکام صادر کر دیئے تھے کہ دعوت نامہ مجھے بھی بھیجا جائے لیکن لائق علی اور دین نے انھیں یہ احکام واپس لینے پر مجبور کر دیا۔

"منشی ایک خطرناک آدمی ہے، اس سے ملنا بے سود ہے۔" لائق علی اور دین نے نظام سے کہا، ہوش نے شکست قبول نہیں کی، اس نے کہا۔

"کیا اعلیٰ حضرت محسوس فرماتے ہیں کہ نواب صاحب کے اس ارشاد کے مضمرات کیا ہیں؟" ہوش نے خالص درباری اردو میں پوچھا "نواب صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت تنے کمزور اور سادہ لوح ہیں کہ اگر انھوں نے منشی سے گفتگو کی تو وہ فوراً

اس کی باتوں کے فریب میں آجائیں گے، کیا یہ اعلیٰ حضرت پر بد اعتمادی کی انتہا نہیں؟
لیکن بہر حال وین کو کامیابی ہوئی، میرا دعوت نامہ منسوخ کر دیا گیا۔

علی یاور جنگ کا تبصرہ

حیدرآباد کے سارے زمانہ قیام میں نظام نے مجھے ملاقات کا موقع کبھی نہیں دیا، نواب علی یاور جنگ جو وزیر امور دستور بھی رہ چکے تھے اور ایک سلجھے ہوئے مبصر بھی تھے، اس واقعہ پر بڑے دلچسپ انداز میں اپنی کتاب (Hyderabad in retrospect) میں تبصرہ کر چکے ہیں، انھوں نے اس تبصرہ کے دوران میں لکھا ہے، کہ

"دہلی میں حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل ہندوستان کے گورنر جنرل اور وزراء سے ملاقات کرنے میں بالکل آزاد تھا، کسی ملاقات کے موقع پر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی سکرٹری نے موجود رہنے کی کوشش کی ہو، لیکن حیدرآباد میں ہندوستان کے ایجنٹ جنرل مسٹر منشی پر نظام کے دروازے بند تھے، نظام نے جب منشی سے ملنے کا ارادہ کیا تو بڑی دیر تک نظام اور ان کے وزراء میں اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی، نظام منشی سے تنہائی میں ملنا چاہتے تھے، وزراء کا اصرار تھا کہ ان میں سے کوئی ایک اس موقع پر ضرور موجود رہے گا، وہ منظر بھی کتنا عجیب اور دلچسپ تھا جب نظام اس سلسلہ میں ایک کے بعد دوسری متبادل تجویزیں پیش کر رہے تھے مگر وہ نامنظور ہو رہی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر منشی نظام سے تنہائی میں اس روز تک ملاقات نہ کر سکے جب تک، ۱۷ ستمبر ۴۸ء کو حیدرآباد کی قسمت کا فیصلہ نہ ہو گیا۔ ۱۷ ستمبر کو آخر کار منشی اور نظام میں ملاقات ہوئی، اسی روز شام کو ایک لرزتی ہوئی آواز پہلی مرتبہ حیدرآباد ریڈیو پر شکست خوردہ حیدرآبادی لوگوں کو سنائی دی، جس کا پہلا لفظ تھا "میرے دوست مسٹر منشی......"

نواب علی یاور جنگ اپنی یکتا قابلیت کے اعتبار سے سارے حیدرآباد میں مشہور تھے، ایک حقیقت پسند آدمی کی حیثیت سے انھوں نے سیاسی جلا وطنی اختیار کر لی، اتحادی لیڈران سے سخت نفرت کرتے تھے، اس لئے کہ وہ شیعہ تھے، علی یاور جنگ نے محسوس

کر لیا تھا کہ حیدرآباد اور ہندوستان کی دوستی لازمی اور ضروری ہے، لہٰذا جلد سے جلد الحاق ہو جانا چاہیئے۔

بیگم علی یاور جنگ

علی یاور جنگ اور ان کی سحر طراز بیگم سے متعدد مرتبہ مجھے ملنے کا موقع ملا ہے، ان کے خسر سر مہدی یار جنگ حیدرآباد کے وزیر اعظم رہ چکے تھے، علی یاور جنگ کی بیوی اتنی خوبیوں کی خاتون تھیں کہ اپنی زندگی میں مجھے کبھی کسی ایسی ہستی سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان دونو میاں بیوی میں میں نے تہذیب و ثقافت اور عقل و فراست کا بڑا ستھرا امتزاج دیکھا جو حیدرآباد کے روایات تہذیب کا بڑا دل کش نمونہ تھا، لیڈی علی یاور جنگ وقار اور شائستگی کا مجسمہ ہیں، ان سے قبل ایسی مثال میری نظر سے کبھی نہیں گزری تھی، ان دونو میاں بیوی سے میرے تعلقات بے انتہا پاک اور خلوص کے تھے، ایک یا دو مرتبہ سر مہدی یار جنگ نے جو بہت بیمار اور کمزور تھے، مجھ سے کہا کہ حالات جس طرح رونما ہوئے ان سے وہ کس درجہ دل شکستہ ہیں۔

مہدی یار جنگ بستر مرگ پر

میں جب ان سے ملنے گیا تو وہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ انھوں نے مجھ سے تنہا ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"مسٹر منشی!" سر مہدی یار جنگ نے کہا "ضعوبی سے بڑھ کر اس کا دشمن کوئی اور نہیں وہ بدترین لوگوں میں گھرا ہوا ہے، خدا کے لئے اس کی مدد کیجئے" ان الفاظ میں وفاداری کا کتنا بے پناہ جذبہ جھلک رہا تھا، افسوس چند روز بعد مہدی یار جنگ کا انتقال ہو گیا۔

مہدی یار جنگ کی وصیت کی تعمیل بہت مشکل تھی، واقعی نظام نے عجیب دماغ پایا تھا۔

میری نئی قیام گاہ

کچھ روز بعد میں راک لینڈ میں منتقل ہو گیا، جو کبھی انگریز ریذیڈنٹ کی قیام گاہ تھی، لیکن فوراً ہی نظام نے اعتراض شروع کر دیا کہ راک لینڈس پر مجھے قبضہ کیوں دیا گیا؟ یہ عمارت شاہراہ عام پر واقع تھی، جس پر ہر جمعہ کو نظام کی سواری گزرا کرتی تھی، اور گزرتے ہوئے ہز اگزالٹڈ کی نگاہ ہندوستان کے قومی پرچم پر بھی پڑتی تھی، جو تکلیف دہ بات تھی۔

لائق علی کے مشورے اور اجازت سے میں نے راک لینڈس پر قبضہ کیا تھا، اب وہ

میرے پاس معذرت کناں تشریف لائے کہ میں اپنے قیام کے لئے کوئی دوسری جگہ منتخب کروں، مجھے معلوم تھا، راک لینڈس میں میرا قیام کیوں گوارا نہیں کیا جا رہا، میں نے لائق علی کی بات ماننے سے انکار کر دیا، اس معاملہ پر ہمارے اختلافات اسی دن رفع ہوئے جب حیدرآباد کی ہر پبلک عمارت پر ہندوستان کا قومی جھنڈا لہرانے لگا تھا۔

گاندھی جی کا قتل

میرے اسٹاف کے ممبر

میرا اسٹاف متنوع قسم کے افراد پر مشتمل تھا، رگھوپتی میرا پرائیوٹ سیکرٹری تھا، یہ اڑیسہ کا رہنے والا تھا اور ابھی ابھی آئی اے ایس میں کامیاب ہوا تھا، راجو ایک دیرینہ کار آئی سی ایس جسے حکومت مدراس سے مستعار لیا گیا تھا میرا سیکرٹری تھا میجر نندا ڈپٹی سیکرٹری! وِنکٹ وردھن افسر انچارج آف سول انٹیلیجنس، یہ صاف دماغ اور ہوشیار آدمی تھا، اِدھر اُدھر سے تمام ضروری اور اہم اطلاعات حاصل کر کے انھیں چھانٹتا اور پھر میرے ملاحظہ کے لئے پیش کرتا۔

ایک شرابی افسر

ایک افسر نے تھوڑے دنوں کے بعد ایک نہایت ہی نازک مسئلہ میرے لئے پیدا کر دیا۔، ان حضرت کا خیال یہ تھا کہ اعلیٰ پیمانے پر شراب پینے پلانے کے ذریعہ یہ اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکتے ہیں، ایک دن یہ معلوم کر کے میں دہشت زدہ رہ گیا کہ اس شخص نے نصف درجن وسکی کی بوتلیں سکندرآباد ملٹری کنٹین سے میرے نام پر خریدیں، یہ سوچ کر میں لرز گیا، باپو جو دہلی میں بیٹھے ہیں اگر یہ خبر کسی طرح ان تک پہنچ گئی کہ میں اپنی پوزیشن الفعل کے ذریعہ استعماٗ

کر رہا ہوں تو میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ ممکن ہے وہ احتجاجی برت شروع کر دیں، میں اس واقعہ پر بہت برہم ہوا، پانچ تولیں اب تک باقی تھیں، یہ واپس کر دی گئیں اور جو تولیں کھل چکی تھیں میں نے اسی افسر کے نام پر درج کرا دی۔

مسٹر "ایکس"

میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ مسٹر ایکس (X) کا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی حیدرآباد میں تشریف آوری ایک بہت بڑے مشن کے تحت ہوئی ہے، اپنی ذاتِ گرامی پر آپ کو غیر معمولی اعتماد تھا اور اس فریب نفس میں مبتلا تھے کہ دوسرے لیڈروں کے علاوہ گاندھی جی اور سردار کی نمایندگی بھی حیدرآباد میں یہ فرما رہے ہیں۔ قدرتاً انھوں نے میرے سیکرٹریٹ کا سب سے بڑا حاکم مجاز اپنے آپ کو تصور کرنا شروع کر دیا، راجہ نے ان حضرت کے سامنے نہایت سعادت مندی سے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

عجیب حرکت

بغیر میری اطلاع کے ایکس (X) نے لائق علی سے رابطہ بھی قائم کر لیا اور یہ تاثر پیدا کیا کہ وہی اصل آدمی ہیں جس سے گفت وشنید کی جا سکتی ہے، بہت جلد یہ راز مجھ پر منکشف ہو گیا کہ میرے پس پشت نہایت سنگین قسم کی کارروائیاں ہو رہی ہیں، کابینہ کے ایک ممبر نے مجھے پیغام بھیجا کہ مجھے بہت محتاط رہنا چاہیئے۔ کیونکہ لائق علی نے اپنے بعض رفقاء سے دہلی کی گفت وشنید کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ گاندھی جی کے ایک نہایت معتمد شخص سے جو ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کے دفتر میں موجود ہے وہ رابطہ قائم کر چکے ہیں، اور یہی شخص معاملات کو رو براہ کر سکتا ہے۔

میرے خلاف میرے دفتر میں محاذ

۲۷ جنوری کو جب میں دہلی کے لئے رختِ سفر باندھ رہا تھا، لائق علی نے کہا وہ بھی جا رہے ہیں ایکس (X) نے مجھ سے التجا کی کہ اسے ذرا مجھ سے پہلے چلا جانا چاہیئے، میں سمجھ گیا مقصد کیا ہے۔ وہ لائق علی اور گاندھی جی کے درمیان ملاقات کا انتظام کرنے جا رہا تھا جس روز لائق علی دہلی جانے والا تھا اس سے ایک دن پہلے یہ شخص اپنے کمرہ میں بیمار بن کر پڑ گیا۔ لائق علی مجھ سے ملنے آئے، پھر سیدھے اس کے کمرہ میں چلے گئے اور بڑی دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔

۲۹ جنوری کو صبح کے وقت میں دہلی پہنچا اور حسب معمول برلا ہاؤس میں ٹھہرا، گاندھی جی اور ان کے ساتھی بھی مہمان کی حیثیت سے یہیں ٹھہرے ہوئے تھے، البتہ میزبان یعنی مسٹر برلا موجود نہیں تھے۔

سردار سے میری شکایت

جب وی پی مینن اور سی سی ڈیسائی مجھ سے ملنے آئے تو انھوں نے بتایا کہ ایکس (×) نے میرے بارے میں سردار سے کہا ہے کہ میں نے بہت غلط راستہ اختیار کیا ہے اور وہ حالات کو رو براہ کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہے۔

شام کو میں گاندھی جی کی خدمت میں حیدرآباد میں اپنی کارگزاری کی رپورٹ دینے حاضر ہوا، وہ میری باتیں توجہ سے سنتے رہے، اپنے مخصوص دلآویز انداز میں جس نے ہم سب کے دل موہ رکھے تھے انھوں نے کہا "منشی! تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ گفت و شنید مصالحت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کروگے، تمہاری گفتگو سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ تم وہی کر رہے ہو جو کر سکتے ہو لیکن ایکس مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم غلط راستے پر جا رہے ہو، بھلا اس نے ایسا کیوں کہا؟"

میں نے سب کچھ بتادیا

میں نے بھی بہت صفائی کے ساتھ گفتگو کی اور ایکس کے متعلق سارے واقعات بتادیئے، میں نے کہا "باپو! آپ نے حکم دیا اور میں حیدرآباد چلا گیا اور بہت بڑا خطرہ اپنے سر مول لے کر گیا، میں ایکس کو اپنے ساتھ اس لئے لے گیا کہ ہم دونو میں آپ کی وفاداری مشترک تھی، اگر آپ میری کارگزاری سے مطمئن نہیں ہیں تو کہہ دیجئے، میں فوراً راستہ سے ہٹ جاؤں گا، لیکن اس سے تو آپ یقیناً اتفاق کریں گے کہ اپنے اسٹاف کے کسی آدمی کو میں ان کارروائیوں کی اجازت نہیں دے سکتا جو ایکس کر رہا ہے، یا تو حیدرآباد کے معاملات کا میں ذمہ دار ہوں یا ایکس! کیا آپ کے خیال میں اس کا یہ اسلوب کار صحیح ہے؟"

"مجھے خود حیرت ہے کہ یہ کیا بات ہے؟" گاندھی جی نے کہا۔

"تو کیا آپ کا خیال ہے کہ جن نازک حالات سے مجھے دوچار ہونا پڑ رہا ہے ان کی موجودگی میں بھی اس شخص کو اپنے ساتھ رکھوں؟"

"تم سردار سے کہو کہ اسے الگ کر دیں" گاندھی جی نے کہا۔

اتنے میں لائق علی آگئے، میں نے گاندھی جی سے ان کا تعارف کرایا اور رخصت ہو گیا۔ میری دوسری ملاقات، ۳۰ جنوری کو سات بجے شام کے وقت گاندھی جی سے طے پائی تھی، لیکن مقدر میں یہ ملاقات نہ تھی۔

سردار سے طویل گفتگو

۳۰ جنوری کو سہ پہر کے وقت حیدرآباد کے حالات پر سردار سے میں نے طویل گفتگو کی، میں نے محسوس کیا وہ بہت ناخوش اور برہم نظر آرہے ہیں، کئی دن سے وہ ناقابل برداشت ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے، تیس برس کی مدت میں پہلی مرتبہ ان کے اور گاندھی جی کے درمیان اختلافات ابھرنے لگے تھے، جن کا اپنی پرارتھنا کی تقریروں میں اشارتاً وہ حوالہ بھی دیتے رہتے تھے، خود سردار نے بھی بمبئی کی ایک تقریر میں ان اختلافات کی طرف اشارہ کیا تھا۔

سردار کو خراج تحسین

گزشتہ چند سالوں سے سردار اپنے دوش ناتواں پر بہت بڑا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے، انھوں نے کئی عظیم فیصلے کئے اور عزیمت و استقامت کے ساتھ انھیں بروئے کار بھی لائے، وہ پہلے شخص تھے، جنھوں نے تقسیم ہند کی مصلحت محسوس کر لی تھی اور اسے قبول بھی کر لیا تھا، متعدد وزارتوں کے امور ان کی نگرانی میں انجام پاتے تھے تقسیم کے نتیجہ میں جو پیچیدہ مسائل پیدا ہو گئے تھے ان کا حل کرنا سردار ہی کا کام تھا، پاکستان سے پناہ گزینوں کے جو قافلے ہندوستان میں آرہے تھے اس بوجھ کو سہار لینا بھی انہی کا کارنامہ تھا، نہایت تیزی اور مافوق البشر تدبر کے ساتھ جس کی مثال ہماری تاریخ میں نہیں مل سکتی، انھوں نے ہندوستان کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک جگہ جمع کر دیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، وہ سردار ہی تھے جنھوں نے ہندوستان کے والیانِ ریاست کو ہندوستان کا وفادار دوست بنا دیا، سردار کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انگریزوں نے جاتے وقت جس ٹوٹے پھوٹے ہندوستان کو چھوڑا تھا، اسے طاقتور انڈیا بنا دیا، وہی تھے جنھوں نے سول سروس کے ارکان میں وفاداری کا جذبہ پیدا کر دیا۔

سردار کے کارنامے

مزید یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سردار نے تمام صوبوں کے

وزراء اعلیٰ کے کاموں پر نظر رکھی اور بر وقت انھیں ہدایات دیتے رہے اور اس طرح ملک میں استحکام پیدا کر دیا، اور کانگریس کے اس عظیم الشان ادارہ کو جو اب گاندھی جی کی براہ راست رہنمائی سے الگ ہو چکا تھا خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلایا، یہ سارا بوجھ انھوں نے حوصلے اور ہمت کے ساتھ اٹھایا، لیکن یہ اختلافات جو ان کے اور گاندھی جی کے درمیان پیدا ہو گئے تھے انھیں برداشت کرنا ان کی طاقت سے باہر تھا، اگر میرے معلومات غلط نہیں ہیں تو انھوں نے چند دن پہلے گاندھی جی کو اپنا استعفا بھی لکھ کر بھیج دیا تھا۔

گفتگو کے اختتام پر ایکس کے متعلق میں نے وہ باتیں بتائیں جو مجھ سے اور گاندھی جی سے ہوئی تھیں۔ یہ سنتے ہی سردار بھڑک اٹھے، انھوں نے کہا کہ میں مینن سے کہدوں گا کہ وہ اسے علیحدہ کر دیں۔

گاندھی جی اور کانگریس

سردار کے پاس سے جب میں رخصت ہوا تو وہ برلا ہاؤس گئے اور گاندھی جی سے اس مورچہ بندی کے متعلق گفتگو کی جو ان کے خلاف جاری تھی۔ مخالفین نے ان کے بارے میں گاندھی جی کے کان بھر رکھے تھے کہ وہ بہت بڑے فرقہ پرست ہیں، گاندھی جی کو یقین دلایا گیا تھا کہ یہی وہ شخص ہے جس نے کانگریس کے عظیم کارناموں پر پانی پھیر دیا۔

اس زمانہ میں کانگریسی حلقوں کے اندر اس طرح کی سازشیں اور افواہ بازیاں عام تھیں، مخالفین جسے چاہتے فرقہ پرست کہہ کر ذلیل اور بدنام کر دیتے، اسے رجعت پسند مشہور کرتے، اسے کانگریس کا غدار قرار دیتے، بہت سے لوگ ایسی سازشوں کے شکار بنے لیکن اس مرتبہ بہت بڑے شخص کو قربانی کا بکرا بنایا جا رہا تھا۔ گاندھی جی خود بھی اس صورتحال سے بہت پریشان تھے، وہ چاہتے تھے کہ جواہر لال اور سردار میں تفرقہ نہ پیدا ہو، کیونکہ ان کا اتحاد ہی ملک کے مستقبل کا ضامن ہے۔

گاندھی جی اور سردار

گاندھی جی اور سردار کے مابین توقع سے زیادہ طویل گفتگو ہوئی، گاندھی جی وقت کے بہت پابند تھے پرارتھنا میں تاخیر پہ مجبور ہو گئے، جب زیادہ دیر ہو گئی تو وہ جلدی سے اٹھے اور پرارتھنا

کے لئے جانے کی تیاری کرنے لگے، حسب معمول انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے پوتے کی بیوی ابھا اور اپنی پوتی مانو کے کندھے پر رکھ لئے، پھر پچھلے دروازے سے نکل کر وہ پرارتھنا کے میدان کی طرف بڑھے۔

گاندھی جی کا قتل

دفعتاً ایک آدمی لوگوں کو پھلانگتا ہوا گاندھی جی کی طرف دونوں ہاتھ باندھے ہوئے بڑھا معلوم ہوتا تھا وہ ان کے قدموں کو بوسہ دے گا، ایک لڑکی نے اس حرکت سے اسے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن اس آدمی نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا، گاندھی جی کا عبادت نامہ اس کے ہاتھ میں تھا، وہ زمین پر گر پڑا، لڑکی اسے اٹھانے کے لئے جھکی۔

اب وہ آدمی گاندھی جی کے سامنے آچکا تھا، جھٹ سے اس نے ایک پستول نکالا اور تابڑ توڑ تین فیر ان پر جھونک دیئے، پہلی گولی پر وہ لڑکھڑائے، دوسری گولی کھا کر گر پڑے۔ ان کی زبان پر ان کے محبوب الفاظ رواں تھے ——— "ہے رام ———"

حملہ آور مغلوب ہو گیا

برلا ہاؤس کے مالی نے حملہ آور کو روکنے کی کوشش کی، کئی آدمیوں نے اسے مغلوب کر لیا، دو گولیاں گاندھی جی کے پیٹ کو چیرتی ہوئی پیٹھ سے نکل گئیں تیسری پھیپھڑوں میں اٹک گئی۔

اس طرح ایک عظیم ہستی سرنگوں ہو گئی۔

حسرت ناک منظر

سردار کے دفتر سے وزارت امور ریاست میں میں مینن سے ملنے چلا گیا، یہ ساڑھے پانچ بجے شام کا وقت تھا جب میں سیکرٹریٹ کے زینہ سے اتر رہا تھا برلا ہاؤس کا ایک شوفر دو دو سیڑھیاں پھلانگتا جلدی جلدی آرہا تھا۔ "جلدی چلئے، گاندھی جی قتل کر دیئے گئے" وہ چلایا، میں نے خیال کیا وہ پاگل ہو گیا ہے بہرحال ہم بھاگم بھاگ برلا ہاؤس روانہ ہوئے، جب میں گاندھی جی کے کمرہ میں پہنچا تو وہ خون میں تر بتر بستر پر پڑے تھے، سردار ان کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے۔ گاندھی جی کی پُرسکون میت سے لپٹی ہوئی ابھا اور مانو بے قرار اور بے تاب ہو ہو کر رو رہی تھیں، منی بن بھگوت گیتا کی تلاوت کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر جوراج گاندھی جی کے معائنہ سے فارغ ہو چکے تھے

پیارے لال پٹی سے لگے بیٹھے حسرت سے گاندھی جی کی طرف تک رہے تھے، کچھ لوگ بے ترتیبی سے ادھر ادھر بیٹھے تھے۔

"بس ختم!"

میں سردار کے پاس جاکر بیٹھ گیا، ڈاکٹر نے اپنے فیصلہ کا اعلان کردیا۔

"بس ختم!"

مجھ پر سکتہ سا طاری تھا، یہ جو کچھ ہو رہا تھا میرے تصور سے بالا تھا۔

مجھے آج صبح کا وہ منظر یاد آرہا تھا جب میں گاندھی جی سے ملنے آیا تھا، وہ کتنے خوش، کتنے ہشاش بشاس نظر آرہے تھے، وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھے، انھوں نے نظر اٹھاکر مجھے دیکھا، مسکرائے، مانوس انداز میں ہاتھ ہلاکر میرے نمسکار کا جواب دیا۔

اور اب!

"بس ختم ـــــــ

میری آنکھیں خشک تھیں، جو جذبہ دل کو ہلاتا، اور آنکھوں میں طوفان اشک لاتا ہے۔ خود سکتہ کے عالم میں تھا ـــــــ مبہوت، گم کردہ ہوش۔

کمرہ کا سکوت توڑنے والی صرف دو چیزیں تھیں، سسکیاں، اور بھجن۔

کانگرسی لیڈر، وزیر، اور دوسرے لوگ آنے لگے۔ برلا خاندان کا کوئی آدمی بھی اس وقت موجود نہ تھا، میں نے ملازموں کو جمع کرکے احاطہ کا دروازہ بند کرایا، کیونکہ مجمع دم بدم بڑھتا چلا جارہا تھا، کچھ دوستوں کو وہاں کھڑا کردیا کہ خاص خاص آدمیوں کو اندر آجانے دیں۔ اسی اثناء میں پولیس آگئی، اور اس نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

قاتل ہندو تھا

اس حادثہ کا پہلا تاثر نہایت خوفناک تھا، ہمیں بتایا گیا کہ حملہ آور ایک مسلمان ہے، اس کے معنی یہ تھے کہ دوسرے ہی روز ہندوستان اور پاکستان میں خون کی ایک نئی ندی بہنے لگتی، لیکن تحقیقات کے بعد برلا ہاؤس کے مالی نے مجھے یقین دلایا جس نے حملہ آور کو پکڑا تھا کہ قاتل ہندو ہے۔

میرے حافظہ میں یک بیک وہ گفتگو تازہ ہوگئی جو باپو نے چند ماہ پہلے ہم سے کی تھی۔

ہم میں سے ایک آدمی نے باپو سے کہا تھا کسی روز کوئی مسلمان آپ کو ضرور قتل کر دیگا۔
"مجھے کوئی مسلمان قتل نہیں کریگا" باپو نے کہا، "اگر میں قتل کیا گیا تو میرا قاتل ہندو ہوگا"
باپو کے یہ الفاظ پیغمبرانہ طور پر صحیح ثابت ہوئے۔

گاندھی جی کی وصیت

تھوڑی دیر کے بعد ہم میں سے چند لوگ لائبریری میں جمع ہوئے، مجھے یاد ہے لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جی، سردار، مولانا صاحب گیڈگل، بھوراج موجود تھے، کچھ اور لوگ بھی۔

ہمیں چند روز تک گاندھی جی کی لاش محفوظ رکھنی چاہیئے" لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز پیش کی "تاکہ ہر گوشہ ملک سے لوگ آکر آخری نذر عقیدت پیش کر سکیں"۔

میں نے کہا" یہ مناسب نہیں، اس طرح ہندوؤں کے جذبات سارے ملک میں بھڑک اٹھیں گے"۔

اتنے میں پیارے لال آئے اور انھوں نے کہا" باپو نے سختی کے ساتھ ہدایت کردی تھی کہ جب وہ مر جائیں تو ہندو رسوم کے مطابق ان کے مراسم انجام دیئے جائیں"۔ اس کے بعد گفتگو ختم ہوگئی اور طے پایا کہ دوسرے روز گاندھی جی کا جنازہ اٹھایا جائے۔

گاندھی جی کی لاش

آخر کار قومی جھنڈے سے ڈھک کر گاندھی جی کی لاش ٹرک پر رکھی گئی، سردار اور گاندھی جی کے صاحبزادے لاش کے قریب بیٹھے، سامنے کی نشست پر بلدیو سنگھ بیٹھے تھے، لڑکیاں لاش کے پاس کھڑی تھیں، وقت کا سب سے بڑا آدمی اس طرح دنیا سے رخصت ہوا کہ کم لوگ اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

گاندھی جی کی زندگی جتنی شاندار تھی موت بھی اتنی ہی شاندار ہوئی، پنڈت جی اور سردار نے ایک نئی ذمہ داری محسوس کی، یہ دونوں قوم کو جوان سے رہنمائی کی آس لگائے ہوئے تھی، تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے جس طرح زندگی میں گاندھی جی نے بہت سے معجزے دکھائے تھے اسی طرح مرتے مرتے بھی وہ ایک معجزہ دکھا گئے۔

یہ رضاکار!

ہم انتظار نہیں کریں گے

میرے حیدرآباد روانہ ہونے سے پہلے سردار نے وہاں کی صورتِ حالات پر گفتگو کرنے کے بعد میرے لئے ایک راہِ عمل متعین کر دی۔ نظام گورنمنٹ معاہدۂ قائمہ پر عمل کرنے سے ناکام رہی تھی۔ لہٰذا اس پر عمل درآمد کی گفت و شنید بیکار تھی، سر... نے مجھے ہدایت کی کہ ۱۸ر مارچ تک کوئی مستقل سمجھوتہ ہو جانا چاہیئے، اور اگر ایسا نہ ہوا تو ہم ہمیشہ انتظار نہیں کرتے رہیں گے۔ جون میں بارش شروع ہو جائے گی، اس سے پہلے پہلے ہمیں یہ مسئلہ طے کر لینا ہے۔

اسی اثنا میں رضوی نے شرافت اور شائستگی کے حدود بھی اس مجمع کو درہم برہم کرکے توڑ دیئے جو نظام کالج کے میدان میں گاندھی جی کے المناک حادثۂ قتل پر ماتم اور تعزیت کے لئے جمع ہوا تھا۔

معین نواز جنگ کا بیان

۸ر فروری کو معین نواز جنگ نے رضاکاروں کی حمایت میں ایک بیان دیا۔ میں نے لائق علی سے دریافت کیا کہ آئندہ اس طرح کے حادثات کی روک تھام کے لئے کیا کیا ہے، لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

رضاکاروں کا ریلے

بائیں طرف سے قاسم رضوی تیسرے نمبر پر
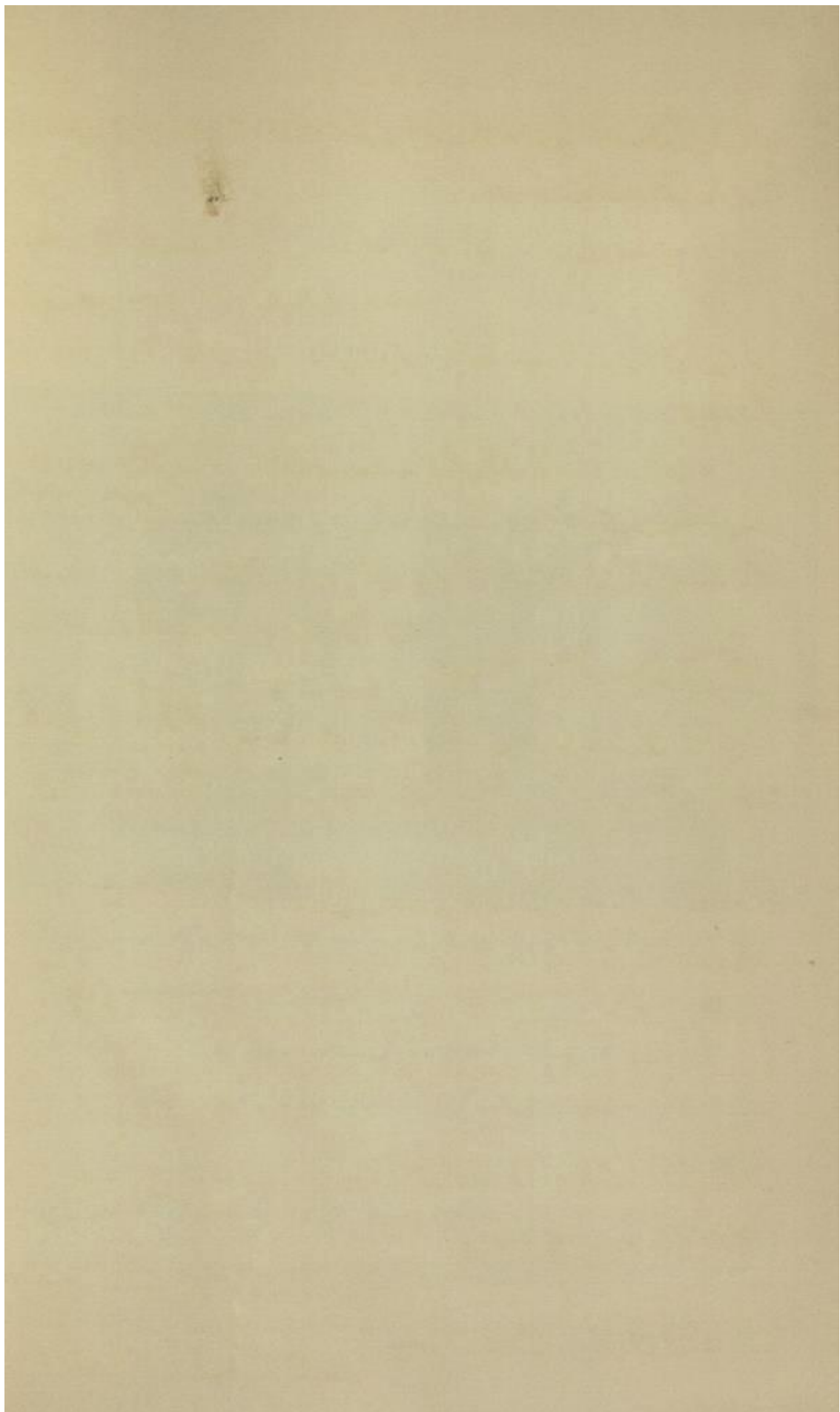
نئی دہلی میں یہ طے کیا گیا تھا کہ گاندھی جی کی خاک جو ہڈیوں کی ذرا فراسی کرچوں پر مشتمل تھی ان تمام دریاؤں میں بہائی جائے جو مذہبی اعتبار سے مقدس مانے جاتے ہیں، میں نے دیوداس گاندھی سے التجا کی تھی کہ وہ مجھے بھی تھوڑی سی خاک بھیج دیں کہ حیدرآباد کے قریب جہاں دو دریاؤں کا سنگم ہے میں بہا دوں۔

لائق علی اور نظام میں سے کوئی بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ حیدرآباد میں اس طرح کی تقریب منعقد ہو، لیکن سارے ملک میں غم اور صدمہ کی جو لہر دوڑی ہوئی تھی لہٰذا شائستگی کے ساتھ اس تقریب کو روکنا دونوں کے لئے ناممکن تھا۔

۱۰ فروری کو شریمتی گیان کماری حیدرآباد کی سرگرم کارکن گاندھی جی کی خاکستر لے کر سکندرآباد آئیں، میں نے اسٹیشن پر اس سلسلہ میں ایک تقریب منعقد کی، ایک بہت بڑا مجمع اظہار عقیدت کے لئے موجود تھا۔

گاندھی جی کی خاکستر

ایک دن تک یہ خاکستر دکھشنا سدن میں رکھی رہی مسلسل بھجن گائے جا رہے تھے اور بھگوت گیتا کی تلاوت ہو رہی تھی، متواتر چوبیس گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ خاکستر کے درشن کیلئے ہندوؤں اور مسلمانوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا ہوا تھا۔

اس انتہائی سنجیدہ اور غمگین ماحول میں بھی لطائف وظرائف کے کچھ پہلو شامل ہو گئے، جوشی گجراتی انداز میں ایک دھوتی باندھ کر اس سے اپنا سر ڈھکے ہوئے ماتم کے لئے آئے اور جتنا زیادہ چیخ سکتے تھے چیخ چیخ کر گریہ و ماتم کرتے رہے، خاکستر کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ میرے پاس آئے اور بڑی بلند آہنگی کے ساتھ گجرات کے پیشہ ور اور تجربہ کار ماتم گساروں کی طرح کلماتِ تعزیت ادا کرنے لگے۔

میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، میں نے کہا "براہ کرم زیادہ نہ چیخئے، اگر آپ کے دل میں گاندھی جی کی ذرا بھی جگہ ہوتی تو آپ رضا کاروں کے ساتھ نہ ہوتے جو بے گناہ اور معصوم دیہاتیوں پر بھی ستم توڑتے رہتے ہیں۔

جوشی اور لائق علی

میرے پاس سے جوشی سیدھے لائق علی کے پاس

گئے اور شکایت کی میں نے انھیں نظام گورنمنٹ سے الگ ہو جانے کا مشورہ دیا ہے ، لائق علی نے مجھ سے اس واقعہ کا ذکر کیا، میں نے انھیں سارا واقعہ بتا دیا جس سے ہم دونوں خوب محظوظ ہوئے۔

دوسرے روز حیدرآباد کے ایک پبلک پارک میں گاندھی جی کی خاکستر لاکر رکھ دی گئی، بھجن گائے جانے لگے اور گیتا کی تلاوت شروع ہو گئی ، یہ سلسلہ ایک شب و روز جاری رہا، مسلمانوں اور ہندوؤں کا بہت بڑا مجمع انبوہ در انبوہ اظہار عقیدت کے لئے آتا رہا۔

حسب قرارداد لائق علی میرے پاس اس دن زیر غور مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے آئے ، انھوں نے میری اس رائے سے اتفاق کیا کہ معاہدۂ قائمہ سے قطع نظر کرکے کوئی ایسا فارمولا تلاش کرنا چاہیئے جو مستقل مفاہمت کی بنیاد بن سکے۔

لائق علی عجیب شخص تھا

لائق علی کی شیریں گفتاری اور سیر چشمی کے باوجود کوئی چیز ان کی جگہ سے انھیں ہٹا نہ سکی ، وہ اس پر تیار تھے کہ دفاع کی ذمہ داری ہندوستان کو سونپ دیں لیکن اس پر تیار نہیں تھے کہ حیدرآباد آرمی پر ہندوستان کا کوئی کنٹرول ہو، نہ اس پر آمادہ تھے کہ حیدرآبادی فوج میں تخفیف کی جائے

انھوں نے اصرار کیا کہ گو حیدرآباد معاملات خارجہ انڈین یونین کو سپرد کرنے پر تیار ہے، لیکن داخلی طور پر نظم و انتظام اور آئین و قانون وغیرہ کی ذمہ داریاں اسی کو حاصل ہوں گی حیدرآباد کے شہریوں کو وہی بنیادی حقوق حاصل ہوں گے جو نظام منظور کریں، نہ کہ وہ جو ہندوستان کی مجلس دستور ساز نے وضع کئے ہیں ، غیر ممالک میں حیدرآباد کو اپنے ٹریڈ کمشنر مقرر کرنے کا اختیار بھی ہوگا، اور اپنے فارن ایکسچینج کو وہ خود جس طرح چاہے گا استعمال کرے گا اپنے اقتصادیات کو ہندوستان سے الگ رکھ کر وہ جس طرح چاہے گا فروغ دے گا ، اس فارن ایکسچینج کی مدد سے جو اس کے پاس ہے اور اس کے پاس ہوگا۔

میں نے صاف الفاظ میں لائق علی کو بتا دیا کہ اگر ان کا موقف یہی ہے تو کم از کم میرے لئے

تو بہت مشکل ہے کہ حکومتِ ہند کو نظام کے خلوص کا یقین دلا سکوں۔

خاکستر کا جلوس

دو دن بعد گاندھی جی کی خاکستر ایک جلوس کے ساتھ سنگم کی طرف روانہ ہوئی، عین وقت پر اگرچہ جلوس کا راستہ بدل دیا گیا تھا، لیکن ہندو اور مسلمان بڑی تعداد میں شریک جلوس ہوئے اور گاندھی جی کی جے کے نعرے لگاتے رہے، لائق علی، ان کے رفقاءِ وزارت، اعلیٰ سرکاری حکام، نوابان و جاگیرداران ریاست اور ہزار ہا ہزار لوگ سنگم پر موجود تھے، گھٹنوں گھٹنوں پانی میں اتر کر میں نے ویدک منتر پڑھتے ہوئے خاکستر بہانے کی رسم انجام دی، مجمع برابر گاندھی جی کا محبوب گیت گا رہا تھا۔

ایشور اللہ تیرا نام سب کو سمجھ دے بھگوان

لائق علی کافی متاثر تھے

لائق علی برابر میرے پہلو میں کھڑے رہے اور میرا خیال ہے کہ اس منظر سے وہ کافی متاثر تھے۔ یہ حیدرآباد کے لئے ایک بہت بڑا دن تھا، ہر شخص کی زبان پر گاندھی جی کا نام اور ان کا ذکر تھا۔ اسی رات لائق علی سے ان کے گھر پر میں نے ملاقات کی، جو رضاکاروں کے مسئلہ سے تعلق رکھتی تھی، میں نے ایک مرتبہ پھر اصرار کیا کہ ان پر کنٹرول کرنے کی سخت ضرورت ہے اور یہ کام وہی کر سکتے ہیں، انھوں نے کہا، اگر حکومتِ ہند سے کوئی سمجھوتہ ہو گیا اور اس نے فوج میں پچیس ہزار اور پولیس میں پینتیس ہزار نفری کی اجازت دیدی اور ان سپاہیوں کو مسلح رکھنے کے لئے سارا فوجی سامان بہم پہنچا دیا تو وہ ضرور رضاکاروں پر پابندیاں عائد کر دیں گے۔

لائق علی سے میری گفتگو

آدھی رات تک ہماری گفتگو جاری رہی، پھر میں رخصت ہوا، چلتے وقت میں نے سوال کیا "کیا رضاکاروں کو اپنے مطالبات منوانے کے لئے آپ نے ترپ کا پتا قرار دے رکھا ہے؟"

"آخر آپ ہر وقت حیدرآباد کے بارے میں کیوں فکرمند رہتے ہیں، کبھی کبھی تفریح بھی کر لیا کیجئے، آپ کلب کیوں نہیں جاتے؟" لائق علی نے کہا۔

"میں کلب کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا" میں نے جواب دیا۔
"کیا آپ کو برج سے بھی شوق نہیں ہے؟" لائق علی نے سوال کیا۔
"بہت دن ہوئے برج کھیلنا بھی چھوڑ چکا ہوں، اب ان مشاغل کے لئے میرے پاس وقت کہاں؟" یہ میرا جواب تھا۔
لائق علی کی آنکھوں میں طنز و مزاح کی روشنی چمک رہی تھی۔
"کیا آپ عورتوں کی مجالست سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتے؟" لائق علی نے پوچھا۔
"عورت! ہاں!" میں نے کہا "ایک ہی عورت ہے جس سے میں زندگی نبھا سکتا ہوں"
لائق علی نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "جی چاہتا ہے آپ کو اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں"
میں بھی ہنس پڑا، میں نے کہا "اگر آپ ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ضرور کیجیے، لیکن ابھی جو ہزارہا ہزار لوگ گاندھی جی کی خاک بہا کر آئے ہیں انھیں میرے جنازے میں شرکت کا موقع مل جائے گا۔ ہم نے مصافحہ کیا اور رخصت ہو گئے۔

مانکٹن سے میری ملاقات

۲۰ر فروری کو پہلی مرتبہ سر والٹر مانکٹن سے میری ملاقات ہوئی ہم دوستانہ انداز میں دو ایسے وکیلوں کی طرح گفتگو کرتے رہے جن میں سے ہر ایک اپنے موکل کے مقدمہ پر زور دیتا ہے، مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ سر والٹر کو میں نے ہمہ صفت موصوف پایا۔
دوسرے روز لائق علی نے مجھے ڈنر پر مدعو کیا۔ اس موقع پر مانکٹن اور معین نواز جنگ بھی موجود تھے، گفتگو چھڑی لائق علی اب بھی چٹان کی طرح اپنی جگہ جمے ہوئے تھے، ان کا جواب صرف ایک تھا "الحاق ناممکن!" صرف اتحاد اور رفاقت ممکن، رضاکاروں کی سرگرمیوں پر اس وقت تک کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی جب تک حکومت ہند حیدرآباد سے کوئی سمجھوتہ نہ کرے، کسی طرح کی دستوری تبدیلی عمل میں نہیں لائی جا سکتی جب تک مجلس وضع قوانین میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب پچاس پچاس فیصد نہ تسلیم کر لیا جائے۔
دوسری طرف سردار کے ہدایات یہ تھے کہ حیدرآباد میں جلد از جلد اور سب سے پہلے

ذمہ دار حکومت قائم کی جائے اور مجلس اتحاد جو سارے جنوبی ہند کے لئے خطرۂ عظیم بن چکی تھی فوراً ختم کر دی جائے، جب تک یہ دونوں باتیں عمل میں نہ آجائیں۔ حیدرآباد سے مستقل مفاہمت کے سلسلہ میں اطمینان بخش گفت وشنید مصالحت کا جاری رکھنا ممکن نہیں۔

ہم ایک دوسرے سے اب بھی اتنے ہی دور تھے جتنے اگست ۱۹۴۷ء میں۔

رضوی پھر خفا ہو گئے

گاندھی جی کی خاکستر کے سلسلہ میں باشندگان حیدرآباد نے جس عقیدت کا اظہار کیا تھا اس پر رضوی کا ردعمل قابلِ دید تھا مسلسل تین دن تک حیدرآباد کے ہندو اور مسلمان شانہ بشانہ گاندھی جی کی خاکستر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے، حیدرآباد کے درودیوار گاندھی جی کی جے کے نعروں سے گونجتے رہے، اس چیز نے رضوی کو ابو کھلا دیا۔ رضوی نے گرجتے ہوئے کہا۔

"جب ہندوستان میں اسمبلی ہال کے اندر آزادی کے ترانے گائے جا رہے تھے۔ بے جان مسلمانوں کی لاشیں سڑکوں پر بکھری پڑی تھیں، ہندوستان کی مرکزی حکومت ملک کا انتظام سنبھالنے کی قطعاً اہلیت نہیں رکھتی، اس فضا میں اور اس ماحول میں مجھ سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان اور حیدرآباد کے تعلقات بہتر بنانے میں مدد دوں، جو سوال میرے دماغ سے ٹکراتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کس سے تعلقات قائم کریں، پنڈت نہرو سے، سردار پٹیل سے، سرمایہ داری سے، اشتراکیت سے، مہا سبھا سے، راجپوتوں سے، سکھوں سے یا اندھیرا سے؟ حیدرآباد ایک مستقل وجود ہے۔ تم خود بتاؤ کہ تم کہاں ہو پھر حیدرآباد کی طرف توجہ کرو، پہلے اپنی خبر لو پھر ہماری طرف رُخ کرو"

حسبِ معمول اس خطیب نے مجھے فراموش نہیں کیا۔

"ریاست کی کانگرس پارٹی ذکن ہاؤس میں منتقل ہوگئی ہے، یہ ایجنٹ جنرل ہندوستان کا نمایندہ نہیں ہے، ریاستی کانگرس کا صدر ہے۔ یہ شخص جہاں بھی گیا تباہیاں اور بربادیاں اپنے ساتھ لیتا گیا، حیدرآباد اس شخص کے ساتھ بالکل نباہ نہیں کر سکتا"

تقریر کے آخر میں حاضرین سے ان الفاظ میں مخاطب کیا گیا۔

"اپنی حکومت سے مطالبہ کرو کہ دستاویز الحاق کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے، اس کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑا دے، دستاویز الحاق کی بہترین جگہ ردی کی ٹوکری ہے، جہاں تک حکومت ہند کا تعلق ہے، میں ایک مہینہ کی مہلت دیتا ہوں، پھر اس اعلان کو اعلانِ جنگ سمجھا جا سکتا ہے۔"

اس اثنا میں نظام گورنمنٹ بڑی تیزی کے ساتھ اپنی مکمل آزادی کے انتظامات روبہ عمل لاتی رہی، جو چیزیں حیدرآباد سے باہر جاتی تھیں ان کی برآمد بالکل بند کر دی گئی، معاہدہ قائمہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہندوستانی روپے کا چلن روک دیا گیا۔

ممالک غیر سے رابطہ کی کوشش

ایران، مصر، برطانیہ، امریکہ اور کنیڈا سے تجارتی تعلقات قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں، اسٹرلنگ کی صورت میں بڑی رقم برطانیہ میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل کی تحویل میں دے دی گئی تاکہ براہ راست غیر ملکی تجارت سے کاروباری معاملات طے کر سکے۔

معاہدہ قائمہ کی رو سے مواصلات کا محکمہ حکومتِ ہند کے پاس تھا، لیکن اس معاہدہ کو نظر انداز کر کے ٹاٹا کمپنی کو خریدنے کی جد و جہد کا آغاز کر دیا گیا جس کے دکن ایرویز میں کافی حصّے تھے، باقی حصص حکومتِ حیدرآباد کے قبضہ میں تھے، مقصد یہ تھا کہ دکن ایرویز کے لئے زیادہ سے زیادہ طیّارے حاصل کئے جائیں تاکہ فضائی راستے سے حیدرآباد کراچی اور چٹاگانگ سے رابطہ قائم رکھ سکے، ایک مرتبہ جب میری تحریک پر ہندوستان کی وزارت مواصلات نے ہندوستان کی ایک ہوائی کمپنی کو حیدرآباد میں سروس جاری کرنے کی اجازت دی تو معین نواز جنگ چلّا اٹھے کہ حیدرآباد کی علاقائی سلامتی کو اس طرح نقصان پہنچایا گیا ہے۔

۲۱ر فروری کو نئی دہلی میں سردار پٹیل کی زیرِ صدارت ایک اہم کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں بمبئی، مدراس اور صوبہ جات متوسط کے وزراء اعلیٰ اور وزراء داخلہ، نیز متعلقہ وزارتوں کے سکریٹری شریک تھے، میں بھی موجود تھا، اس کانفرنس میں طے کیا گیا کہ نہایت سختی کے ساتھ رضاکاروں کو ہندوستانی علاقے میں داخل ہونے سے روکا جائے اور اگر وہ آجائیں تو انھیں

گرفتار کر لیا جائے۔

اس کانفرنس میں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ رضاکاروں نے مظالم کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے آل انڈیا ریڈیو کے نشریات میں ان کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی جائے۔

(اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آل انڈیا ریڈیو نے اپنا یہ فرض اتنی مستعدی سے انجام دیا کہ غیر تو غیر اپنے بھی چیخ اٹھے، ہٹلر کا اصول یہ تھا کہ اتنا جھوٹ بولو کہ لوگ سنتے سنتے اسے سچ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں، آل انڈیا ریڈیو نے تواتر اور تسلسل کے ساتھ اتنا "سچ" بولا کہ لوگ سنتے سنتے اسے جھوٹ سمجھنے لگے — (مترجم)

بلارم ریزیڈنسی میں میرے شب و روز

حیدرآباد میں میری نجی زندگی بھی ایک مستقل دردسر کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

میری مصروفیتیں

میرے سیکرٹری اور ڈپٹی سیکرٹری پاس کے ایک مکان میں بغرض اقامت منتقل ہو گئے تھے، وکھتا سدن میں صرف دفتری امور انجام دینے کے لئے آیا کرتے تھے۔ رگھوپتی جو میرے پرائیوٹ سیکرٹری اور ذاتی مددگار تھے اور میجر رندھیر سنگھ جو میرے اے ڈی سی تھے، میرے ساتھ مقیم تھے۔ ہم لوگ شاید ہی آپس میں کبھی کچھ نجی قسم کی باتیں کرتے ہوں کیونکہ ہمیشہ لنچ، ٹی اور ڈنر پر باہر کے کچھ لوگ موجود ہوتے تھے، اور ہماری گفتگو پھیر پھیر کر حیدرآباد ہی کے متعلق سارے دن جاری رہتی تھی۔

فروری کے بعد کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں کہیں کسی اور جگہ مدعو کر لیا جاتا۔ جب کبھی کوئی دعوت نامہ مجھے ملتا میں بے تامل اسے قبول کر لیتا، کیونکہ میں جانتا تھا میزبان نے یہ جرأت بڑا خطرہ مول لے کر کی ہے، اس نے اپنے آپ کو مجھے مدعو کر کے نظام اور مجلس اتحاد دونوں کا معتوب بنا لیا ہے، اب اس پر کم سے کم جو الزام لگے گا وہ جاسوسی کا ہو گا، سرکاری مقاصد

کے ماتحت لائق علی سے میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، ان کے علاوہ جن لوگوں سے میں ملنے جایا کرتا تھا، وہ تھے راجہ بہادر آئینگر اور سروجنی دیوی کے شوہر اور بچے جو میرے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آیا کرتے تھے۔

میری بیوی

جولائی تک یہ معمول رہا کہ میری بیوی ہر مہینہ چند روز کے لئے آجایا کرتیں، وہ بیچاری کبھی بھی یہاں سے خوش ہو کر نہیں گئیں۔ دکھنا سدن کی زندگی میں نشاط و مسرت کا کوئی دخل نہ تھا، دن کا بڑا حصہ لوگوں سے ملاقاتوں میں صرف ہو جاتا یا خط و کتابت کرنے اور اطلاعات فراہم کرنے میں، وہ بیچاری اگر کہیں باہر نکلتیں تو پولیس اور رضاکاروں کے دستے میری قیام گاہ کے گرد دیکھ کر نڈھال ہو جاتیں، اور سب سے بڑھ کے یہ کہ جن حالات میں میں گھرا ہوا تھا ان سے وہ بہت مضطرب تھیں، رضاکاروں کی دراز دستیوں اور سفاکیوں کی اطلاعات جو ہر روز آتی رہتی تھیں ان سے بھی وہ بہت غمگیں اور پریشان ہوتیں۔

کارپرہندوستانی پرچم

ایجنٹ جنرل کی کارپر ہندوستان کا جھنڈا لہراتا رہتا، وہ جب بھی رضاکاروں کی کسی لاری کے پاس سے گزرتی تو ان کے یہ نعرے اور گیت ضرور سنائی دیتے

نظام کے قدموں پہ نہرو کو جھکا دیں گے
پٹیل اور منشی کو قبروں میں گاڑ دیں گے

جب کبھی ہم اخبار بیچنے والے چھوکروں کی طرف سے گزرتے تو میری کار کا قومی جھنڈا دیکھتے ہی وہ زور سے پکارنے لگتے۔

تازہ خبریں!
سردار پٹیل مر گئے!
ایک آنہ!

میں تو ان باتوں سے لطف لیتا تھا لیکن میری بیوی دکھ اور صدمہ محسوس کرتی تھیں

میری جان لینے کی تیاریاں

جب کبھی یہ اطلاعات آتیں کہ میری جان لینے کی تیاریاں

ہو رہی ہیں تو میری بیوی اور پریشان ہو جاتیں، ایک مرتبہ جب وہ بلارم میں میرے پاس ٹھہری ہوئی تھیں آدھی رات کے بعد کوٹھی میں شور و غل ہوا، معلوم ہوا کوئی شخص کمپاؤنڈ کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ان تمام واقعات و حادثات نے میری بیوی کو خود اپنے بارے میں بھی فکرمند کر دیا تھا اور وہ اپنی حفاظت کے وسائل بھی سوچا کرتیں، پولیس ایکشن کے بعد جب میں بمبئی واپس پہنچا تو اس سلسلہ میں بعض عجیب واقعات مجھے معلوم ہوئے، عورتوں کے اغوا اور بے آبروئی کے جو کارنامے رضاکار انجام دیتے رہتے تھے انھوں نے میری بیوی کو مجبور کر دیا کہ وہ سائینائیڈ کی ایک شیشی اپنے پاس رکھا کریں، جب کبھی وہ حیدرآباد آتیں تو یہ نہایت مہلک زہر ان کے ہینڈ بیگ میں موجود رہتا، بے آبرو ہونے سے مر جانا بہتر ہے، یہ ان کا خیال تھا۔

اکتوبر میں جب یہ واقعہ مجھے معلوم ہوا تو میں نے زہر کی شیشی توڑ پھوڑ کر پھینک دی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس زہر ہلاہل کا غلط استعمال نہیں ہوا کیونکہ یہ چھوٹی سی مقدار ایک پوری رجمنٹ کا صفایا کر دینے کے لئے کافی تھی۔

میرے بچے میرے لڑکوں اور لڑکیوں کو صرف ایک مرتبہ حیدرآباد آنے کا موقع ملا، یہ بات ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی کہ آخر میں حیدرآباد میں کیوں پڑا ہوا ہوں؟

باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ میرے لئے صرف ٹیلی فون رہ گیا تھا، تقریباً ہر روز ٹیلی فون پر سردار سے میری باتیں ہوا کرتی تھیں، سوا ان ایام کے جب وہ اتنے بیمار ہوں کہ بات نہ کر سکیں، یہ گفتگو میرے لئے ٹانک کا کام دیتی تھی، برسہا برس سے ہم دونوں ایک دوسرے سے ٹیلی فون پر ملک اور دنیا کے مخصوص معاملات و مسائل پر ایسی زبان میں گفتگو کرتے تھے جو ہماری ایجاد کردہ تھی، بظاہر ہم گجراتی میں گفتگو کرتے تھے لیکن اس میں ایسے الفاظ ٹھونس دیتے تھے جن کا مطلب دوسرے لوگوں کے لئے ناقابل فہم تھا۔ ہر زیر بحث شخص کا ایک مرموز نام تھا اسی طرح ہر زیر بحث موضوع کا افسانہ بھی مرموز ہی ہوتا تھا۔

فون پر گفتگوئیں ٹیلی فون پر اکثر وی پی مینن، راما سوامی موڈیار، دیوان علی مدراس

مرارجی ڈیسائی (وزیر داخلہ بمبئی)، ڈی پی مصرا (وزیر داخلہ مدھیاپردیش) اور ڈاکٹر بدھاچندرائے (وزیر اعلیٰ بنگال) سے باتیں کیا کرتا تھا، علاوہ ازیں حیدرآباد سے باہر کچھ اور لوگوں سے بھی فون پر گفتگو جاری رہتی تھی، کہ جن ویگنوں اور ٹرکوں پر حیدرآباد میں فوجی ساز و سامان پہنچ رہا ہے ان کا پتہ چلایا جائے اور جاسوسوں کے ذریعہ ان کا تعاقب کیا جائے۔

مطالعہ اور تحقیق سے دلچسپی

میری یہ عادت ہے کہ اپنے سرکاری فرائض کے علاوہ مطالعہ اور تحقیق کا کام بھی جاری رکھتا ہوں، اس زمانہ میں میں سقوطِ گجرات کے اسباب و عوامل پر تحقیق کر رہا تھا۔ یہ واقعہ ۱۲۹۹ء میں پیش آیا تھا۔ گجرات کے سابق بادشاہ کی مہارانی کملا دیوی اور اس کی نہایت خوبصورت بیٹی دیول دیوی گرفتار کرکے دہلی لے جائی گئی تھیں۔ تاریخی نقطۂ نظر سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ دونوں صرف امیر خسرو کے شاعرانہ تصورات کی اُپج کی حیثیت رکھتی ہیں، دو اور آدمی ملک کافور اور خسرو (جو مبارک خلجی کا جانشین تھا)، دہلی پہنچائے گئے تھے، یہ چاروں ہندو غلام تھے جو گجرات سے پکڑے گئے اور دہلی پہنچائے گئے جہاں ان کے ساتھ حد درجہ ذلت اور فضیحت کا برتاؤ کیا گیا جسے سفاکی اور بے حیائی کا ریکارڈ کہنا چاہیئے۔

خلجی کی یاد

اس عہد پر میں نے ایک ناول لکھنا بھی شروع کیا تھا جس کی ہیروئن دیول دیوی تھیں لیکن حیدرآباد کی فضا اتنی ناسامد تھی کہ وہاں یہ کام چل نہ سکا، پھر ۱۹۵۳ء میں لکھنؤ کے دورانِ قیام میں اس کا پہلا حصہ میں نے مکمل کیا۔

اب یہ بات ناممکن تھی کہ ہندوستان کی چھوڑی ہوئی کچھ مسلح کاریں اور ٹینک سکندرآباد چھاونی میں مزید عرصہ تک رہنے دیئے جاتے، میں نے انھیں جھانسی بھیج دیا، اس موقع پر ہندوستانی فوج کے اس بقیہ حصہ کو رخصت کرتے وقت ایک تقریب منعقد کی، یہ اس فوج کا آخری حصہ تھا جو سکندرآباد پر لارڈ ولزلی کے زمانہ سے اب تک قائم رہی تھی جس نے ہندوستان میں امن اور وحدت ڈیڑھ سو برس تک قائم رکھی۔ رخصتی کے اس موقع پر میں خوش نہ تھا، میں نے یہ خواہش کی کہ وہ دن جلد آئے گا کہ جب ہندوستانی

فوج سکندر آباد چھاؤنی میں ایک مرتبہ پھر اپنے ڈیرے ڈالے گی۔

بعض اتحادی لیڈروں نے اس تقریب کے سلسلہ میں غم و غصہ کا اظہار کیا کہ اس طرح نظام کی توہین کی گئی ہے۔

میرے الفاظ دکھشا سدن ہی کے اندر محدود رہتے تھے، شام کے وقت بعض دوست آجاتے اور ہم جی کھول کر باتیں کیا کرتے۔

تحقیر و تذلیل

یہ سارے مہینے میرے لئے بڑے کرب و اذیت کے اور بعض دفعہ انتہائی تحقیر و تذلیل کے ثابت ہوئے، ان سے بعض وقت میں اتنا متاثر ہوتا کہ میری عبادت اور گیان دھیان میں بھی خلل پڑتا، ہر روز دو تین مرتبہ بھگوت گیتا کی تلاوت میرے فرائض میں داخل تھی، کرشن مہاراج سے میں حوصلہ اور طاقت کی بھیک مانگا کرتا تھا، میں اقرار کرتا ہوں کہ کبھی کبھی میں اتنا دل برداشتہ ہو جاتا کہ سردار سے التجا کرتا مجھے اس مصیبت سے نجات دیجئے، میری جیب خالی ہو چکی تھی۔ فرائض کی گراں باری پریشان کن تھی مستقبل غیر متعین، ایجنٹ جنرل کے منصب پر متعین ہونے سے پہلے نئی دہلی کے بعض اونچے حلقوں میں مجھے سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اب ان کی نگاہ میں میں اور زیادہ نامرغوب ہو گیا تھا، پھر ہر وقت اس بات کا بھی امکان تھا کہ نہ جانے کب یہ رضاکار مجھے جنت میں پہنچا دیں۔

ان صبر آزما اور ناساعد حالات کے باوجود بھگوان نے مجھے حوصلہ دیا اور میں اپنے کام سے چمٹا رہا۔

برہمنوں نے سنسکرت کے ذریعہ ہندوستان کو ثقافتی طور پر متحد کر دیا، انھوں نے سیاسی وحدت کا خواب بھی دیکھا، لیکن نہ چندر گپت موریا نہ اشوک، نہ سمدر گپت نہ اکبر اس جلیل و عظیم مقصد میں کامیاب ہو سکے۔

بھگوان کا عطا کیا ہوا شرف

وحدتِ ہند کا خواب میں نے بھی دیکھا اور اس سلسلہ میں کچھ تھوڑا بہت کام بھی کیا، لیکن اب ایک ایسا طاقت ور انسان ابھرا جس نے اس ملک کو اس طرح ایک بنا دیا جیسا وہ پہلے کبھی

نہ تھا، بھگوان نے مجھے یہ نادر شرف بھی عطا کیا تھا کہ مجھے اس کا اعتماد حاصل تھا، اور میں اس کی کچھ خدمت کر سکا، میرا حیدرآباد آنا مرضی الہٰی کا تابع تھا جس کے سامنے سر جھکا دینا میرا فرض تھا، اگر میں کامیاب ہوگیا تو حیدرآباد ہندوستان کی وحدت میں رخنہ نہیں بن سکے گا، اگر وحدتِ ہند کی جد وجہد کرتے ہوئے میں نے اپنی جان قربان کر دی تو کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ میں اپنے پیچھے ایک شاندار روایت چھوڑ جاؤں گا۔

آخری دوستانہ گفتگو

سنگین اور فوری خطرہ

میرے لائق علی اور معین نواز جنگ کے مابین تھکا دینے والی طویل بحث و گفتگو کے بعد بھی کوئی مشترک بنیاد مفاہمت کی نہ پیدا ہو سکی۔ یہ حضرات نہایت مضبوطی کے ساتھ دو باتوں پر قائم تھے۔ جن سے انھیں منحرف کرنا ممکن نہیں تھا، اور یہ دونو باتیں حد درجہ سنگین اور فوری خطرہ کا سبب بن سکتی تھیں۔

لائق علی نے نہایت صفائی کے ساتھ یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ نظام گورنمنٹ پر حکومتِ ہند نگرانی کرنے یا کنٹرول کرنے کا کوئی حق رکھتی ہے، دفاعی معاملات میں حیدرآباد بالکل آزاد ہے۔

لائق علی کی ہٹ دھرمی

اس کے معنی یہ تھے کہ معاہدہ قائمہ کی سب سے اہم دفعہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا، لائق علی کی یہ بات اگر تسلیم کر لی جاتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ حیدرآباد دشمن کا مخالف کیمپ بن جائے اور حکومتِ ہند دور کھڑی چپ چاپ یہ تماشہ دیکھتی رہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ لائق علی نے رضاکار سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کرنے یا اس جماعت کو ختم کر دینے سے اس وقت تک انکار کر دیا جب تک حکومتِ ہند فوجی سامان پورے طور پر حیدرآباد کے حوالے نہ کر دے، وہ بھی اس مقدار میں جتنا لائق علی طلب کریں۔

مختصر طور پر پوزیشن یہ تھی کہ حکومتِ ہند یا تو فوجی اعتبار سے حیدرآباد کو پورے طور پر مضبوط بنا دے، اور اس سلسلہ میں الحاق کا نام تک نہ لے اور یا حالات کو زیادہ سے زیادہ ابتر ہو جانے دے اور جنوبی ہند کو تباہ و برباد ہو لینے دے۔

لائق علی کے نام میرا خط

ان مسائل پر میں نے سردار اور وی پی مینن سے گفتگو کی، پھر ۲۷ فروری کو لائق علی کے نام ایک خط لکھا جس میں صورتِ حالات کی وضاحت کر دی۔

"میں آپ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجلسِ اتحاد ریاست کے داخلی اور سرحدی علاقوں کے امن و امان کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی ہے جسے آپ کی حکومت کی مکمل سرپرستی حاصل ہے اور جس کا نظریہ یہ ہے کہ حیدرآباد میں بالادستی کا حق صرف وہاں کے مسلمانوں کو حاصل ہے، مجلس اتحاد کے رضاکاروں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہے، اور قاسم رضوی نے ابھی حال میں ساڑھے تین لاکھ رضاکاروں کی عوام سے اپیل کی ہے۔ یہ رضاکار پوری ریاست میں ریاستی پولیس اور فوج کا مکمل تعاون حاصل کئے ہوئے ہیں۔ ریاست کے غیر مسلم باشندوں کو انھوں نے دہشت زدہ اور سراسیمہ کر رکھا ہے اور یہ بات ہر شخص کے علم میں ہے کہ گویہ وسیع پیمانہ پر قتل و غارت اور لوٹ مار کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن قانون کی تعزیر سے بچے رہتے ہیں، ریاستی فوج اور پولیس کی مدد سے بھارت کے سرحدی علاقوں پر بھی یہ تاخت و تاراج کرتے رہتے ہیں۔

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور ہر غیر جانب دار بھی رائے قائم کرے گا کہ رضاکار ایک پرائیویٹ فوج کی حیثیت رکھتے ہیں، اور جو نہ صرف حیدرآباد بلکہ آس پاس کے بھارتی علاقوں کے لئے بھی ایک مستقل خطرہ بنے ہوئے ہیں اور اس

طرح ان کا وجود ہندوستان کے امن وامان کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے جو مشترک طور پر حکومتِ ہند اور حکومتِ نظام کے زیرِ غور آنا چاہیئے۔

مجلس اتحادالمسلمین کے صدر قاسم رضوی نے ابھی حال میں پانچ لاکھ رضاکاروں کے لئے اپیل کی ہے جس کے صاف معنی ہندوستان سے اعلانِ جنگ کے ہیں۔ انھوں نے بار بار اعلان کیا ہے کہ حیدرآباد ایک اسلامی ریاست ہے اور ریاست کی بالادستی مسلمانان حیدرآباد کا حق ہے۔ قاسم رضوی نے رضاکاروں سے مطالبہ کیا ہے کہ مسلمانانِ ہند کو حکومتِ ہند کے ظلم وستم سے نجات دلائیں جس مجلس کے صدر کے یہ غیر ذمہ دارانہ اعلانات ہیں آپ کی کابینہ کے متعدد افراد اس مجلس کے وفادار ہیں۔

لہٰذا میں آپ سے اس بات کا تیقن چاہتا ہوں کہ آپ کی حکومت حکومتِ ہند سے مجلس اتحادالمسلمین کو اور رضاکاروں کی جماعت کو ختم کرنے کے لئے پورا پورا تعاون کرے گی۔ حکومتِ ہند کی خواہش ہے کہ یہ جماعت غیر قانونی قرار دے دی جائے ۔"

حیدرآباد ڈیلی گیشن

مارچ کے آغاز میں حیدرآباد ڈیلی گیشن جو لائق علی، سر والٹر مانکٹن اور معین نواز جنگ پر مشتمل تھا پھر دہلی گیا، گفتگو کے دوران میں لائق علی کا رویہ وہی تھا جو چلا آرہا تھا۔ یعنی نہ حیدرآباد میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے پر تیار تھے نہ الحاق پر آمادہ تھے، انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہندو اکثریت کی حکومت کا حیدرآباد میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، رضاکاروں کی سفاکیوں کے واقعات انھوں نے غلط قرار دیئے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز پیش کی کہ رضاکار جماعت توڑ دی جائے، اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

لائق علی نے گورنر جنرل کو متاثر کیا

سر والٹر مانکٹن کی پشت پناہی سے لائق علی نے گورنر جنرل کے قریبی حلقہ پر یہ تاثر پیدا کر دیا کہ حیدرآباد میں کوئی غلط بات نہیں ہو رہی، وہ صرف ہندوستان کا ایجنٹ جنرل ہے جو حیدرآباد اور

ہندوستان کی دوستانہ گفت و شنید کے راستہ میں حائل ہے۔ لائق علی نے کہا کہ وہ براہِ راست ..... مدراس، بمبئی اور سی پی کے وزرائے اعلیٰ سے گفتگو کرنے پر تیار ہیں، لیکن یہ معلوم کرکے انھیں بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ گفتگو صرف ایجنٹ جنرل کی وساطت سے ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے۔

نئی دلی کے سرکاری حلقے مجھ سے خفا تھے

ایک مرتبہ لائق علی نے جب پھر پچاس پچاس فیصد ہندو مسلم تناسب پر زور دیا تو میں نے تلخ لہجہ میں کہا "یہ بات بار بار دہرانے سے کیا حاصل ہے، اگر آپ اپنے ارادہ میں مخلص ہیں تو آغاز کار کیوں نہیں کر دیتے" نئی دہلی میں یہ بات اس طرح پہنچائی گئی کہ گویا میں نے ریاستی مجلس آئین ساز میں آدھوں آدھ کا فارمولا تسلیم کر لیا ہے۔

حیدرآباد ڈیلی گیشن کا دہلی میں یہ ورود حسبِ معمول خوشگوار طور پر انجام کو پہنچا۔ نئی دہلی میں اس بات پر مسرت کا اظہار کیا جا رہا تھا کہ حیدرآباد سے گفت و شنید کا سلسلہ منقطع نہیں کیا۔ حیدرآبادی یوں خوش تھا کہ مزید وقت مل گیا۔ لائق علی نے وعدہ کر لیا کہ پاکستان کو بیس کروڑ روپے کی جو سیکورٹیز دی گئی ہیں معاہدہ قائمہ کے دوران میں، ان کی بازیابی نہیں ہوگی۔

سردار پٹیل کا دورہ

اس سلسلہ میں جو بیان حکومت کی طرف سے شائع ہونے والا تھا وہ نہ شائع ہو سکا، کیونکہ ۵ مارچ کو سردار پٹیل کا دورہ پڑا اور وہ بستر علالت پر دراز ہو گئے، ذہنی دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ سردار کا مضبوط جسم بھی اسے نہ سہار سکا۔ جس زمانہ میں یہ گفتگو ہو رہی تھی میں بھی دہلی میں تھا۔ سردار اچھی طرح محسوس کر رہے تھے کہ لائق علی صرف ٹال مٹول کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا "مارچ کا مہینہ ختم ہوتے ہی کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا"۔ انھوں نے مجھے اور مینن کو ہدایت کی کہ معاہدہ قائمہ کی جو خلاف ورزیاں حیدرآباد نے کی ہیں ان کی تفاصیل تیار کر کے رضاکاروں کو خلاف قانون جماعت قرار دینے کا مطالبہ کیا جائے، اگر لائق علی یہ مطالبہ نہ مانے تو سرحدیں بند کر دی جائیں۔

سردار کی ہدایت

سردار نے وی پی مینن کو یہ ہدایت بھی دی کہ اپنے ساتھ میجر جنرل ہمت سنگھ جی ملٹری ایڈوائزر وزارت امورِ ریاست کو اور مجھے لے کر لارڈ ماونٹ بیٹن کے پاس جائیں اور ان سے صاف صاف گفتگو کریں۔

۶ مارچ کو وی پی مینن مجھے اور میجر جنرل ہمت سنگھ جی کو لے کر لارڈ ماونٹ بیٹن کے پاس گئے۔ لارڈ ماونٹ بیٹن سے گفتگو کے دوران میں جس طرح قانون اور نظم و امن کی ہتک حیدرآباد میں پیدا ہو رہی تھی میں نے ایک ایک کی تفصیل بیان کی، رضاکاروں نے دیہاتوں میں قتل و غارت کا جو سلسلہ شروع کر رکھا تھا اسے بھی پیش کیا، میجر جنرل ہمت سنگھ جی نے فوجی نقطۂ نظر سے اپنے تاثرات پیش کئے، میں نے گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا کہ حکومتِ نظام صرف وقت گزاری کر رہی ہے۔ مفاہمت کرنا نہیں چاہتی۔

ماونٹ بیٹن سے میری گفتگو

میں نے لارڈ ماونٹ بیٹن سے بڑی صفائی کے ساتھ گفتگو کی، میں نے کہا کہ میں اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کا مرتکب ہوں گا اگر صحیح واقعات سے آپ کو آگاہ نہ کر دوں، لیکن جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو میرا احساس یہ تھا کہ میری باتیں چکنے گھڑے پر پانی کی بوند ثابت ہوئیں، اور اب کیمبل جانسن کی کتاب پڑھنے کا جو موقع ملا تو اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔

لائق علی بدل گئے

بمارم واپس آنے کے بعد میں نے دیکھا لائق علی بالکل بدلے ہوئے ہیں، ان میں اب وہ خود اعتمادی نظر آ رہی تھی جو کبھی نہیں نظر آئی تھی۔ مقامی لیڈروں کی گول میز کانفرنس جس کے منعقد کرنے کا وعدہ پبلک طور پر لائق علی نے کیا تھا اب ایک بھولی بسری بات بن گئی تھی کیونکہ رضوی نے اس میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ کانگرس بھی رامانند تیرتھ کی رہائی کے بغیر شرکت پر آمادہ نہ تھی اور لائق علی بھی اسے رہا کرنے پر تیار نہ تھے، یہ خالی خولی ایک وعدہ تھا، صرف نہ پورا کرنے کے لئے۔

لائق علی کی یہ غیر معمولی خود اعتمادی مجھے متعجب کئے بغیر نہ رہ سکی، اس کی تہ میں یقیناً

متعدد عوامل کار فرما تھے اور خاص طور پر ان کی وہ گفتگو جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ہوئی تھی۔ لائق علی غالباً اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے گفت و شنید کی آہستہ خرامی وہ جب تک چاہیں گے قائم رکھ سکیں گے اور ان کا یہ خیال بھی تھا کہ سردار کی یہ خطرناک علالت ایک خدائی انعام ہے جس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

لائق علی کا صاف جواب

حیدر آباد واپس پہنچنے کے بعد ایک مرتبہ میں نے پھر لائق علی سے رضا کاروں کے بارے میں اپنا مطالبہ دہرایا، انھوں نے جواب دیا کہ وہ میرا مطالبہ صرف اس صورت میں مان سکتے ہیں، اگر ریاستی پولیس اور فوج کی نفری میں اضافہ ہو جائے، اور انھیں جو سامان چاہیئے وہ حکومتِ ہند فراہم کرے، اس صورت میں دس پندرہ ہزار رضا کاروں کو وہ افواج باقاعدہ اور پولیس میں بھرتی کرینگے اور پھر رضا کار ایک علیحدہ طاقت کی حیثیت سے باقی نہیں رہیں گے۔ لائق علی کا یہ صاف مطالبہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ سمجھ رہے تھے سردار کی علالت نے مجھے اتنا ہراساں کر دیا ہے کہ میں نظام آرمی اور پولیس کی طاقت میں اضافہ کی تجویز اور رسائل و سامان کی فراہمی کا مطالبہ منظور کرنے کی سفارش کر دوں گا۔

یہ ہماری آخری دوستانہ گفتگو تھی، دوسرے دن میں دہلی چلا گیا اور سردار کو لائق علی کی تجویز سے مطلع کرتے ہوئے میں نے مشورہ دیا کہ ان کا جواب صرف استرداد ہو سکتا ہے۔

لائق علی مطمئن تھے

بہر حال لائق علی کا تاثر یہ تھا کہ حکومتِ ہند ان کے مطالبہ کا جواب حسب دل خواہ دے گی، ہر روز وہ ٹیلی فون پر دریافت کیا کرتے تھے کہ میں حیدر آباد کب واپس آرہا ہوں اور یہ کہ میرے اور ان کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ ظاہر ہے اس سوال کا واضح جواب نہیں دیا جا سکتا تھا۔

کمیونسٹوں اور رضاکاروں کے بے پناہ مظالم

یوتھ کانفرنس کلکتہ

فروری کے آخر میں ساؤتھ ایسٹ ایشین یوتھ کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی، جو کمیونسٹوں کا ایک ادارہ تھا، اس میں چین، برما، ملایا اور انڈونیشیا کے کمیونسٹ لیڈر شریک ہوئے، ان لوگوں نے نہرو گورنمنٹ کو برطانیہ اور امریکہ کا آلہ کار قرار دیا اور طے کیا کہ آیندہ نہرو گورنمنٹ کی حمایت نہ کی جائے، نیز ہندوستان کے دستور کو بھی انھوں نے مردود قرار دیا کہ وہ رجعت پسندانہ اور غیر جمہوری ہے۔

کمیونسٹوں کے اسلوب کار میں اختلاف

اس فیصلہ نے حیدرآباد کی کمیونسٹ پارٹی کے اسلوب کار میں انقلاب پیدا کر دیا، ایک خفیہ سرکلر کے مطابق اندھرا کو جہاں کمیونسٹوں کو غیر معمولی رسوخ حاصل تھا خالص سویت سرزمین بنانے کا فیصلہ کیا گیا، جہاں سے سارے ہندوستان کو آزاد کرانے کی مہم کا آغاز ہونا تھا۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ایک نئی پالیسی وضع کی گئی۔ اور اب کمیونسٹوں نے یہ پروپگنڈا شروع کیا کہ حیدرآباد کا معاہدۂ قائمہ نظام پٹیل سازش کا بدترین نمونہ ہے۔ اسٹیٹ کانگرس

غیر جمہوری اور رجعت پسند جماعت ہے، کمیونسٹ اور رضاکار اس نکتہ پر گلے مل گئے کہ نہرو گورنمنٹ بدترین دشمن ہے۔ اسٹیٹ کانگرس کے کارکن جواب تک کمیونسٹوں کے اتحادی تھے دشمن قرار پائے، اب ان پر سرِراہ حملے کئے جاتے اور کمیونسٹ علاقوں سے مار مار کر انھیں نکال باہر کیا جاتا۔

مارچ کے وسط میں مَیں نے وہ تفاصیل فراہم کیں جو رضاکاروں اور کمیونسٹوں کی مشترک سفاکیوں پر مشتمل تھیں، صورتِ حال بہت ہی نازک اور خطرناک ہو گئی تھی، کمیونسٹوں نے تلگو بولنے والے اضلاع میں ایک کے بعد دوسرے دیہات پر رضاکاروں کی مزاحمت کو آڑ بنا کر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔

"حیدرآباد میں کمیونسٹوں کے جرائم" اس عنوان سے حکومتِ حیدرآباد نے ایک رپورٹ شائع کی جس میں درج تھا۔

> ۱۵ راگست ۱۹۴۶ء سے ۱۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء تک کمیونسٹوں نے تقریباً دو ہزار آدمی نہایت بے دردی سے قتل کئے، بائیس پولیس چوکیوں پر حملہ کیا، سرکاری کا غذات پر قبضہ کر لیا یا انھیں ضائع کر دیا، دیہاتی حکام پر دراز دستیاں کیں۔ چنگی کی چوکیوں کو جلا دیا، دو سو تیس گنوں پر قبضہ کر لیا۔ کھڑی فصلیں کاٹ دیں یا لوٹ لیں یا ضائع کر دیں، دس لاکھ روپے کے نقد یا زیورات پر قبضہ کر لیا۔ مواصلات کا سلسلہ منقطع کر دیا، سڑکیں توڑ پھوڑ دیں، گوریلا جنگ کی تکنیک پر عمل شروع کر دیا۔"

رضاکاروں نے بھی اپنی سرگرمیاں اسی تناسب سے بڑھا دیں، لیکن دونوں کے حلقے الگ الگ تھے، کمیونسٹ رضاکاروں سے تعرض نہیں کرتے تھے، رضاکار کمیونسٹوں سے نہیں الجھتے تھے، اگرچہ بظاہر دونو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔

رضاکاروں اور کمیونسٹوں کی تکنیک ایک تھی

رضاکاروں کی تکنیک بھی وہی تھی جو کمیونسٹوں کی تھی، مثلاً دس مارچ کو کمیونسٹوں نے ورنگل ضلع کے دو دیہاتوں پر حملہ کیا، مردوں کو مارا اور عورتوں سے بدسلوکی کی، ان میں سے کچھ مسلمان بھی

تھے، ۱۲، ۱۱، اور ۱۳ تاریخ کو رضاکاروں نے اس دیہات پر حملہ کر دیا، تین سو گھر جلا دیئے غلہ کا بہت بڑا انبار بھی نذرِ آتش کر دیا۔ بائیس آدمیوں کو ہلاک کر دیا، اٹھارہ آدمیوں کو ایک بازار کے اندر کھڑا کیا اور گولی مار دی، سولہ رہڑے بیلوں سمیت آگ میں جلا دیئے۔

اس طرح چند روز کے اندر نو دیہات مٹی کے ڈھیر بن گئے، ہزاروں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے، بہت سی عورتیں بے آبرو ہوئیں، بہت سے گھر اور انبار غلے جلا کر خاکستر کر دیئے گئے۔

۲۹ جنوری کو حیدرآباد کے ہریجن وزیر ونکٹ راؤ نے ایک کھلی کانفرنس میں برہمنوں بنیوں اور لنگایت پر شدید حملے کئے جو بیدر کے ضلع میں اناج کے سب سے بڑے بیوپاری تھے، انھوں نے کہا کہ لنگایت جرائم پیشہ لوگ ہیں، اچھوتوں کی ساری ذلتوں اور تباہیوں کے ذمہ دار یہی ہیں، ونکٹ راؤ نے ہریجنوں سے اپیل کی کہ ان برہمنوں، بنیوں اور لنگایتوں کو ختم کر دو۔

ہریجن ہمارے ساتھ نہ تھے

فروری سے مئی تک بیدر کے اتحادی ہریجنوں نے رضاکاروں کی پشت پناہی اور پولیس کی مدد سے اپنے لیڈر کی ہدایت پر عمل کر دکھایا۔ انھوں نے ایک سو تیس دیہات خاک میں ملا دیئے، ایک ہزار سے زیادہ گھر جلا ڈالے۔ لاکھوں روپے کی مالیت لوٹ لی، سینکڑوں دیہاتی مردوں اور عورتوں کو قتل کر دیا اور درجنوں عورتوں کی عصمت دری کی۔

ان اور اس طرح کے دوسرے حادثات کے اطلاعات پبلک کے سربرآوردہ لوگوں نے مجھ تک پہنچائے، میں نے اپنے آدمیوں کے ذریعہ بھی تحقیقات کی، بعض وکیلوں نے ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کی، جو گورتا کے حوادث پر مشتمل ہے، جسے ۱۰ مئی کو برباد کیا گیا تھا، اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ

"سارے دیہات میں مویشیوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں، جو اب سڑنے لگی تھیں، بہت سے آدمیوں کے پنجر اور ہڈیاں اور کچھ ادھ جلی لاشیں اِدھر اُدھر پڑی تھیں، سارے دیہات میں ایک مکان بھی سلامت نہ تھا، یہاں بہت سے

دولت مند ہندو رہا کرتے تھے، یہاں کی آبادی ڈھائی ہزار افراد پر مشتمل تھی اور چار سو گھر تھے، لیکن اب اچھوتوں اور مسلمانوں کے سوا ایک ہندو بھی نظر نہیں آتا تھا، تقریباً سب تہ تیغ کر دیئے گئے تھے، یہاں کے ہندوؤں کو تقریباً ستر لاکھ روپے کا نقصان پہنچا۔

ایک مرتبہ جب سب انسپکٹر عبدالحمید خاں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ گوتا کا ایک باشندہ جو کہیں باہر جا کر پناہ گزیں ہو گیا تھا اپنے مویشی تلاش کرتا ہوا آیا، وہ بہت سہما ہوا تھا، اس سے تسلی اور دل دہی کی جو باتیں کی گئیں تو وہ رونے لگا، اس نے بتایا کہ دو سو سے زیادہ آدمی بڑی بے رحمی سے قتل کر دیئے گئے اور ان کی لاشیں جلادی گئیں، اس نے اشارہ سے وہ جگہ بھی بتائی۔ وہاں ہم پہنچے تو بہت سے پنجر اور ہڈیوں کے ڈھیر نظر آئے۔

بحرِ عمیق!

کیمونسٹوں کی تخریبی سرگرمیاں

کیمونسٹوں کی تخریبی سرگرمیوں نے رضاکاروں کے لئے غیر کیمونسٹ علاقوں میں دہشت پھیلانے کی سہولتیں وافر طور پر مہیا کر دیں۔ نظام گورنمنٹ حکومتِ ہند سے استعانت کے بغیر دونوں سے کسی کا بھی مداوا نہیں کر سکتی تھی اور حکومتِ ہند اس کے نزدیک دشمن نمبر ایک تھی۔

۲۰ مارچ کو دہلی میں میں نے اور وی پی مینن نے صورتِ حالات کا نہایت احتیاط سے جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب تک رضاکار جماعت ختم نہیں کی جائے گی کیمونسٹوں کی طاقت بڑھتی جائے گی اور اس اثنا میں حکومتِ نظام کمزور سے کمزور تر ہوتی جائے گی نتیجہ یہ ہو گا کہ ادھر ان پر کیمونسٹوں کا مکمل قبضہ ہو جائے گا اور اسی اثنا میں ماؤنٹ بیٹن اور نظام گورنمنٹ کی بے نتیجہ گفتگو جیسا کہ بادی افواج کو مسلح کرنے اور ساز و سامان جنگ کے کارخانے قائم کرنے کی سہولتیں بہم پہنچاتی رہے گی۔ ساتھ ہی ساتھ حکومتِ نظام غیر ممالک کی ہمدردیاں بھی حاصل کرتی رہے گی اور انگلینڈ میں قدامت پرست پارٹی کا تعاون حاصل کرنے میں بھی ممکن ہے کامیاب ہو جائے، اور پھر وقت مناسب دیکھ کر لیاقت اور کے ایوان

میں پہنچ جانا اس کے لئے مشکل نہ ہوگا۔
اس اثنا میں کہ جنوبی ہند تیزی سے بدامنی کا گہوارہ بنتا جا رہا تھا، وہ شخص بستر علالت پر دراز تھا جو تن تنہا اس طوفان کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ میں اور مینن اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب حکومت حیدرآباد کو ایک الٹی میٹم دے دینا چاہیئے۔
میں نے خط کا مسودہ تیار کیا، وی پی مینن نے اس پر نظر ثانی کی

نظام سے مطالبہ اس مکتوب میں معاہدہ قائمہ کی جو خلاف ورزیاں نظام گورنمنٹ نے کی تھیں انھیں تفصیل سے بتایا گیا اور نظام سے مطالبہ کیا گیا کہ :۔

(۱) پاکستان گورنمنٹ کو چوبیس کروڑ روپے قرض دیئے گئے ہیں وہ فوراً واپس لئے جائیں۔

(۲) ایک مشترک کمیشن قائم کیا جائے جو دفاع سے متعلق معاہدہ تیار کرے۔

(۳) ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے نظام پولیس کی جو تعداد تھی اور جو سامان اس کے پاس تھا اس کی تفصیل بتائی جائے۔

(۴) رضاکار جماعت کو خلاف قانون جماعت قرار دے دیا جائے۔

(۵) نظام گورنمنٹ اپنا وہ آرڈی ننس واپس لے لے جس کی رو سے ریاست میں انڈین کرنسی غیر قانونی سکہ قرار دی گئی ہے۔

(۶) وہ احکام منسوخ کردیئے جائیں جن کی رو سے، سونے اور مونگ پھلی وغیرہ کی برآمد ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔

(۷) یونائیٹڈ پریس آف امریکہ سے اگر کوئی معاہدہ غیر ملکی خبریں حاصل کرنے یا بھیجنے کیلئے کیا گیا ہے تو اسے فوراً منسوخ کردیا جائے۔[ط]

یہ خط تیار کر کے ہم نے سردار کی خدمت میں پیش کیا جس پر انھوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی، ان کی ہدایت کے مطابق پنڈت جی کو بھی یہ خط دکھایا گیا، انھوں نے بھی اسے منظور کرلیا۔

ط White Paper on Hyderabad (Supplement), p. 22

لائق علی کی غلط فہمی

حیدرآباد میں لائق علی بیتابی سے میری واپسی کا انتظار کر رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ میں اپنے ساتھ سردار کی طرف سے ان کی تجویزیں منظور کرنے کا پروانہ لے آؤں گا۔

۲۶ مارچ کو میں حیدرآباد پہنچا اور سیدھا لائق علی کے دفتر میں گیا، وی پی مینن کا خط میں نے ان کے حوالے کیا اور کہا۔ وزارت امور ریاست نے آپ تک یہ خط پہنچانے کا مجھے مجاز بنایا ہے، انھوں نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور اشتیاق کی نظروں سے اسے پڑھنا شروع کیا لیکن جب پڑھ چکے تو چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا۔

لائق علی کو خدا حافظ کہہ کر میں رخصت ہو رہا تھا کہ انھوں نے مجھ سے التجا کی کہ ابھی نہ جاؤں، سراسیمگی کے اس عالم میں انھیں چھوڑ کر جاتے ہوئے مجھے دُکھ ہو رہا تھا، لہذا ان کی خواہش کے مطابق میں بیٹھ گیا، کچھ دیر تک وہ اس طرح ساکت رہے گویا حیران تھے کہ کیا کہیں؟

پھر انھوں نے مجھ سے سوال کیا۔

"کیا پنڈت جی نے بھی اس خط کا مسودہ منظور کر لیا ہے؟"

میں نے جواب دیا "یہ سرکاری مراسلہ ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے پنڈت جی اور سردار دونوں کی منظوری سے لکھا گیا ہے!"

"لیکن اس فوری تبدیلی کا کوئی سبب بھی تو ہوگا؟" لائق علی نے سوال کیا۔

"اگر نظام انڈین یونین کے دوست ہیں" میں نے کہا "تو انھیں جنوبی ہند کا امن و امان درہم برہم کرنے سے رضاکاروں کو روکنا چاہیئے، نیز انڈین یونین کے خلاف مسلمانان ہند کو صف آرا کرنے کی کوشش بھی ترک کرنی چاہیئے۔"

لائق علی کی برہمی

تھوڑی دیر تک ہم دونوں میں گفتگو ہوتی رہی، آخر لائق علی نے جوش اور برہمی کے عالم میں کہا "نظام نے شہادت کا فخر حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، دو لاکھ مسلمان حیدرآباد کی آزادی کے لئے اپنا خون بہانے کیلئے تیار ہیں، میں آپ کے سامنے موجود ہوں مجھے گولی مار دیجئے۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہو گا، آپ زندہ رہیں گے اور سالہا سال تک وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز رہیں گے" یہ کہکر میں چلا آیا۔

حسب معمول اپنی قیام گاہ پر واپس آنے کے بعد میں نے آج کی گفتگو نوٹ کر لی۔

خفیہ کانفرنس

۲۹ مارچ کو اونچی سطح پر لائق علی، رضوی اور بعض دوسرے اتحادی لیڈروں کی کانفرنس منعقد ہوئی زیر بحث یہ موضوع تھا کہ حکومتِ ہند کے مراسلہ پر کیا رویہ اختیار کیا جائے، کانفرنس اس نتیجہ پر پہنچی کہ حکومتِ ہند کشمیر کے محاذ پر اتنی الجھی ہوئی ہے کہ حیدرآباد کے خلاف کوئی اقدام کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی، اور اگر اس نے ایسی حماقت کی تو مسلمانانِ ہند، ہند وؤں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے، سردار لب گور ہیں، ان کے مرتے ہی منشی کو یہاں سے جانا پڑے گا، اور حسب سابق گفت و شنید پھر سے شروع ہو جائے گی۔

مارچ کا مہینہ ختم ہو گیا، وہ مدت ختم ہو گئی جو سردار نے مستقل الحاق کے لئے مقرر کی تھی۔

جیسے ہی حکومت کا مراسلہ میں نے لائق علی کو دیا فوراً لائق علی، معین نواز جنگ اور رضوی نے مکمل طور پر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے، اور نظام کی کوئی حیثیت باقی نہ رہ گئی، دین یار جنگ بر سر اقتدار جماعت کے سگِ خانہ کی حیثیت سے نظام پر ہر وقت مسلط رہتے حتیٰ کہ اب سر والٹر مانکٹن بھی نظام کے پاس آزادانہ آنے کے حق سے محروم ہو گئے۔ اب تک معمول یہ تھا کہ تمام کاغذات نظام کے سامنے پیش کئے جاتے، اب لائق علی کاغذات پیش کرنے کے بجائے صرف زبانی اطلاع دے دیتے تھے۔ ہوش بو جو ہر وقت نظام کی مصاحبت میں رہا کرتے تھے اب قصرِ شاہی میں ان کا داخلہ بھی ممنوع تھا۔

۲۹ مارچ کو میں سر والٹر مانکٹن سے ملا، وہ اب تک پر اُمید تھے، میں نے انہیں حیدرآباد اور ہندوستان کے بگڑتے ہوئے تعلقات کی تفصیل بتائی، پہلی مرتبہ سر والٹر نے مجھ سے پوچھا، کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ الحاق کا لفظ استعمال کئے بغیر دونوں میں اتحاد کی کوئی صورت نکل سکے؟" میں نے کہا "اس کا فیصلہ حکومتِ ہند ہی کر سکتی ہے"۔

میری پریشانی

جس چیز نے مجھے بہت زیادہ پریشان کر رکھا تھا وہ یہ تھی کہ حیدرآباد بڑی تیزی سے فوجی کیمپ بنتا جا رہا تھا، بھرتی جاری تھی، فوجی کارخانے بن رہے تھے، ایک برین گن فیکٹری بھی قائم ہو گئی تھی۔

الحاق کا مطالبہ حیدرآباد نے بالکل نامنظور کر دیا تھا، معاہدۂ قائمہ ردی کا پرزہ بن چکا تھا۔

رضاکار پہلے سے ایک لاکھ گنا زیادہ مضبوط ہو چکے تھے، ریاست کی زندگی ان کے ہاتھ میں تھی، قتل و غارت ان کا روزمرہ کا معمول تھا، اپریل ۱۹۴۷ء سے مارچ ۴۸ء تک انھوں نے ریاست کے دو سو پچاس دیہاتوں کو جلا دیا یا لوٹ لیا، چار ہزار گھروں میں آگ لگا دی، پانچ سو آدمی ہلاک یا زخمی کر دیے، چار سو پچاس عورتوں کو بے آبرو کر دیا، لیکن حیدرآباد ریڈیو ان تمام حقائق کو جھوٹ کا طومار قرار دے رہا تھا۔

نظام کی فوج اور پولیس میں اضافہ

نظام گورنمنٹ نے فوج اور پولیس کی تعداد میں اضافہ کر لیا تھا، انڈین آرمی کے کئی سابق انگریز افسر اس لیے ملازم رکھ لیے گئے تھے کہ حیدرآبادی فوج کو مردِ میدان بنا دیں، چھوٹے قسم کے جنگی ہتھیار خود حیدرآباد میں ڈھالے جا رہے تھے، ایک سابق برطانوی افسر کلکتہ میں اسی کام پر مامور تھا کہ فوجی سامان کسی طرح سے اسمگل کرتا رہے، متعدد غیر ملکوں سے روابط قائم ہو چکے تھے، پاکستان، انگلستان اور امریکہ میں وسیع پیمانے پر ہندوستان کے خلاف پروپیگنڈا ہو رہا تھا۔

حیدرآباد کے باشندوں پر بے حوصلگی طاری ہو چکی تھی، وہ گھبرائے ہوئے تھے، پریشان تھے، اپنی جان کی فکر میں گھلے جا رہے تھے، ان کی نگاہیں بار بار حکومتِ ہند کی طرف اٹھتی تھیں۔ سردار کی ذات ان کی امیدوں کا مرکز تھی، لیکن آہ! میں ان کے اس اعتماد کو تقویت پہنچانے سے قاصر تھا۔

رضوی کی پُراسرار تقریر

میرے خلاف سازشیں میں اتنا بُرا آدمی تھا کہ مجھے کسی طرح بھی حیدرآباد سے نکال باہر کر دینا چاہیے تھا۔

بڑی خوبی سے میرے گرد ایک جال پھیلایا گیا تھا۔ ۸ر مارچ کو میرے دفتر میں ایک خط آیا جو میرے نام وی پی مینن سکریٹری محکمۂ امور ریاست نئی دہلی کے توسط سے بھیجا گیا تھا اور وہاں سے پتہ کاٹ کر حیدرآباد روانہ کیا گیا تھا، جو رام چندر راؤ حیدرآباد کانگرس کی مجلس عمل کے ممبر کی طرف سے مجھے لکھا گیا تھا، اس خط میں بتایا گیا تھا کہ میری تجویز کے مطابق ۲۶ر فروری کو حیدرآباد کانگرس ایک ریلوے ٹرین کو تباہ کر دے گی۔

کمیونسٹوں کی شرارت واقعہ یہ تھا کہ یہ کارنامہ کمیونسٹوں نے انجام دیا تھا، ریاستی کانگرس کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا، رام چندر راؤ سے صرف ایک مرتبہ جنوری میں مجھے ملنے کا اتفاق ہوا تھا، میرے دفتر نے رام چندر راؤ سے دریافت کیا، آیا یہ خط انھوں نے لکھا تھا؟ انھوں نے صاف انکار کر دیا، اس جعلسازی

کا مقصد یہ تھا کہ وی پی مینن اس خط کو پڑھیں اور اپنے ایجنٹ جنرل کو حیدرآباد سے واپس بلالیں۔

۷ راپریل کو سردار نے مجھے دہلی طلب کیا، اور ۲۶ رمارچ کو میرے اور لائق علی کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی اس کی روئداد میرے سامنے رکھی، یہ روئداد نظام نے لارڈ ماونٹ بیٹن کو بھیجی تھی اور انھوں نے سردار کو۔

یہ روئداد بڑی چالاکی سے تحریر کی گئی تھی، کمال یہ تھا کہ جو گفتگو ہوئی تھی، اس کا ذکر تک نہ تھا، بلکہ کچھ فرضی مکالمے میرے منہ میں ڈال دیئے گئے تھے، بعض جذباتی باتیں میری طرف منسوب کردی گئی تھیں، مثلاً یہ کہ انڈیا ایک ہندو ملک ہے، حیدرآباد ایک ہندو علاقہ ہے۔ اور انڈیا کی ہندو حکومت کا ایک حصہ

مجھ سے خلاصی کی سعی

خوش قسمتی سے اس گفتگو کی جو روئداد میں نے سردار کو بھیجی تھی وہ بھی ان کے پاس موجود تھی، جو فرقہ پرستانہ باتیں میری طرف منسوب کی گئی تھیں، اگر میں پاگل ہوتا تبھی یہ باتیں میرے منہ سے نکل سکتی تھیں، ایک مہاسبھائی بھی ایسی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔

دراصل مقصد یہ تھا کہ کسی طرح مجھ سے خلاصی حاصل کی جائے، اور اگر نئی دہلی کا کوئی سربرآوردہ آدمی ان خرافات کا یقین کرے تو مجھے مستعفی ہونے پر مجبور کردیا جائے گا، اس طرح کی باتیں رضوی گروپ ہی کرتا رہتا تھا۔

ہفتۂ اسلحہ

۳۱ رمارچ کو حیدرآباد میں ہفتۂ اسلحہ تزک واحتشام کے ساتھ دارالسلام میں منایا گیا، جو مجلس اتحاد کا صدر دفتر تھا، اس موقع پر اسلحہ کی نمائش کی گئی، اضلاع اور مضافات کے تمام رضاکار مارچ پاسٹ کرتے ہوئے گزرے اور رضوی نے سلامی لی، "لندن ٹائمز" کا نمائندہ برٹر (Britter) بھی اس موقع پر موجود تھا۔

رضوی کی آتشیں تقریر

ریلے ختم ہونے کے بعد رضوی دارالسلام کے ہال میں چلا گیا، اور یہاں اضلاع کے چند نہایت سربرآوردہ کارکنوں

کے سامنے اس نے ایک زبردست تقریر کی، اس تقریر کے بعض خاص حصے ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

"حیدرآباد ایک اسلامی ریاست ہے، یاد رکھو ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہماری طرف امید اور آرزو کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ کب ہم اسلامی جھنڈا لہراتے ہیں۔

مجلس اتحاد المسلمین ہر مسلمان سے توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے گا، مجھے خوشی ہے کہ مسلمان خواتین بھی رضاکاروں کی مدد کے لئے کمربستہ ہو چکی ہیں، گزشتہ آٹھ سو سال سے ہم دکن پر حکومت کر رہے ہیں اور حکومت ہند پسند کرے یا ناپسند ہم حکومت کرتے رہیں گے۔

ایک ہزار سال کے بعد انڈین یونین کے ہاتھ میں عنانِ اقتدار آئی ہے، یہ لوگ فرماں روائی کیا جانیں؟ اگر سکتے ہوتے تو مسلمانوں کے ہاتھ میں فرماں روائی کیسے آتی؟ اور اب کہ یہ اقتدار کے مالک بنے ہیں، دھمکیوں اور سفاکیوں سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔

انڈین یونین نے اگر ہمارے خلاف کوئی جارحانہ اقدام کیا تو یاد رکھو ہندستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان علم بغاوت بلند کر دیں گے۔

میں جانتا ہوں تم میں سے ہر ایک جوشِ جہاد سے دیوانہ ہو رہا ہے، کربلا کو یاد رکھو، ایک مسلمان پیدائشی جنگجو ہوتا ہے، اس سے کوئی نبرد آزما نہیں ہو سکتا ہندوستان کی تاریخ مسلمانوں کے شاندار مجاہدانہ کارناموں سے معمور ہے، آج ہندوستان اگر آزاد ہے تو یہ مسلمانوں ہی کے جوشِ جہاد کا ثمرہ ہے مسلمان جنگ سے نہیں کتراتا، کمزور کی حمایت اس کا شعار ہے، صحیح مقصد کے لئے جنگ کرنا اس کی زندگی کا منتہا ہے، قرآن کی رہنمائی میں وہ آگے بڑھتا ہے، پس اے میرے مسلمان بھائیو! اٹھو اور آگے بڑھو، خبردار! پیٹھ نہ دکھانا، تلواروں کو اس وقت تک نیام میں نہ کرنا، جب تک تمہارا مقصد حاصل نہ ہو جائے، اس وقت

تک تمہارے قدم نہ رکیں جب تک ساحل مراد تک نہ پہنچ جاؤ (دہلی چلو کے نعرے) جو دشمن سامنے آئے اسے کچل دو، اس کے ساتھ ہرگز رحم کا برتاؤ نہ کرو جو چیتیں آئیں مردانہ وار انھیں سہو، ہمارا بھروسہ خدا پر ہے، خدا کے سوا ہمارا کوئی دوست نہیں، اس اسلامی مملکت کی تخلیق اسی نے کی ہے اور وہ کبھی ہمیں مایوس نہ کرے گا۔ ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن ہے، دوسرے میں تلوار، ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے، دشمنوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہیئے، اور اپنی اسلامی بالادستی قائم کر کے دم لینا چاہیئے۔

انڈین یونین کے بے سہارا مسلمانوں کے حالات سے میں واقف ہوں۔ وہ ہندوستان میں ہمارے پانچویں کالم کی حیثیت سے مصروف کار ہوں گے، انڈین یونین ہمارے اندر سے پانچویں کالم کے لوگ تلاش کر رہی ہے، لیکن بہت جلد اسے معلوم ہو جائے گا، کہ مسلمان کا کردار کیا ہوتا ہے؟ ایک کافر ہندو جو پتھر اور بندر کو پوجتا ہے (قہقہہ) جو گائے کا پیشاب پیتا اور گوبر کھانا جزو مذہب سمجھتا ہے (مزید قہقہہ) اور جو تہذیب اور انسانیت سے ناآشنا ہے، ہم پر حکومت کرنا چاہتا ہے، حیرت، تعجب،

میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے، دہلی میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا جس طرح قتل عام کیا تھا، وہی یہاں بھی کرنا چاہتے ہیں، ان کا جواب صرف ایک ہے ——— شمشیر آب دار، آج میں یہاں موجود ہوں ممکن ہے کل کام آجاؤں، لیکن میرے بھائیو! میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر تم قاسم رضوی سے ملنا چاہو، زندگی اور موت کی کش مکش میں اگر تم مجھ سے دوچار ہونا چاہو تو وہ تمھیں نجارا ہل کی شاندار اور فلک پیما عمارتوں، پر بہار ٹی پارٹیوں اور مجالس طرب میں نہیں بلکہ میدان جنگ میں خاک و خون میں لتھڑا ہوا نظر آئے گا (اللہ اکبر اور صدیق دکن زندہ باد کے نعرے) تم مجھے دیکھو گے کہ میں قتل کر رہا ہوں گا، یا قتل ہو رہا ہوں گا، اس حالت میں کہ تلوار میرے ہاتھ

یں ہوگی اور قرآن میرے سینہ پر۔"

شاستری کا کارنامہ

شاستری اس موقع پر ہال میں موجود تھا، اس نے اپنی شارٹ ہینڈ بک سے دوسرے روز یہ تقریر مجھے پڑھ کر سنائی میں نے ٹائپ کرا کے سردار کی خدمت میں بھیج دیا۔

۷ر اپریل کو سر والٹر مانکٹن گفت و شنید مفاہمت کے سلسلہ میں دہلی آئے۔ ۲۲ر مارچ کے الٹی میٹم کے بعد یہ آمد بڑی اہمیت رکھتی تھی، اسی روز ہندوستان ٹائمز نے رضوی کی یہ تقریر شائع کر دی، یہ بکواس پڑھ کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جی غضبناک ہوگئے، پارلیمنٹ میں سوالات ہوئے اور گورنمنٹ میں ہے دے، بیچارے سر والٹر کا چہرہ اتر گیا۔

۹ر اپریل کو حیدرآباد کے ڈپٹی ایجنٹ جنرل متعینہ دہلی نے لائق علی کو ٹیلی فون پر بتایا کہ اس تقریر نے گفت و شنید کا سلسلہ روک دیا ہے، اور جب تک رضوی کی زبان بند نہ کی جائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کسی طرح کی بات چیت نہیں کریں گے۔

مانکٹن کی برہمی

سر والٹر مانکٹن غصہ میں بھرے ہوئے حیدرآباد واپس آئے، نظام کا یہ عالم تھا کہ رضوی کا نام سن کر بھڑک اٹھتے تھے، ۱۰ر اپریل کو ان کی طرف سے لائق علی کے مشورہ سے ایک تردیدی بیان شائع ہوا کہ نہ کوئی ریلے ہوا، نہ سلامی، نہ جلسہ، نہ تقریر، یہ صرف مسٹر منشی کی اُپج ہے۔

لیکن میرے قبضہ میں شاستری کی نوٹ بک تھی جو ہربچن وزیر و نکٹ راؤ کا ایک ماتحت تھا، اس موقع پر اس نوجوان نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا اس کی تحسین پر میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں، اس نے ایک طرف تو اپنے آپ کو تمام شبہات سے نہایت صفائی کے ساتھ بچا لیا، نیز رضوی اور ونکٹ راؤ کا اپنے اوپر اعتماد قائم رکھا اور دوسری طرف اپنی نوٹ بک میرے حوالے کر دی، البتہ اتنی تاکید کر دی کہ اگر کبھی اس بیان اور نوٹ بک شائع کرنا چاہوں تو صرف ایک دن پہلے اسے اطلاع کر دوں، تاکہ وہ حیدرآباد سے کھسک جائے۔

رضوی کا ہندو معتمد علیہ

ڈاکٹر شریدھارانی جو امرت بازار پتر کا کے نمایندہ تھے

انھوں نے پنڈت جی کو یہ رپورٹ دی۔

"ہندو ہونے کے باوجود شاستری قاسم رضوی کا معتمد علیہ ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ مارچ پاسٹ کے موقع پر موجود تھا، آپ اس بات کو اچھی طرح محسوس کریں گے کہ کسی ایسی حکومت سے تعلقات کا قائم رکھنا جو ایسی تقریروں کی اجازت دیتی ہو اور ایسے اقدامات کی پشت پناہی کرتی ہو جو مہذب اور معقول طریق کار کی نفی ہیں، کس طرح ممکن ہے؟"

۷ اپریل کو رضوی کے اخبار نے یہ خبر شائع کی کہ ریاستی کانگرس نظام سے مفاہمت کی جو گفتگو کر رہی تھی اسے میں نے ناپسند کیا ہے، اسی اخبار نے یہ بھی لکھا تھا کہ امن پسند ہندو حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں مسٹر منشی کی روز افزوں بڑھتی ہوئی مداخلت کو سخت ناپسند کرتے ہیں، مجلس اتحاد کے ایک سربرآوردہ لیڈر نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ حقیقتاً حیدرآباد کانگرس کے صدر مسٹر منشی ہیں اور انھیں فوراً دہلی بلا لینا چاہیے۔

اوپر جس گفتگوئے مصالحت کا ذکر کیا گیا ہے وہ راماکرشنا راؤ سے منسوب کی گئی تھی لیکن ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ کرشنا راؤ ہر روز مجھ سے ملتے رہتے تھے اور رابطہ قائم رکھتے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن فارمولا اور اس کا حشر

الحاق سے انکار

۵ اپریل ۱۹۴۸ء کو لائق علی نے وی پی مینن کے مکتوب مورخہ ۲۳ مارچ کا جواب پنڈت جی کی خدمت میں ارسال کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ اپنے موقف پر قائم ہیں اور الحاق پر آمادہ نہیں ہیں۔

اس موقع پر سر والٹر نے نظام اور لائق علی کو واضح طور پر بتا دیا کہ حیدر آباد میں نئی حکومت کی تشکیل ہونی چاہیئے، جس کے مسلمان وزراء مجلس اتحاد سے تعلق نہ رکھتے ہوں اور ہندو وزراء نئی دہلی کے لئے ناقابل قبول نہ ہوں، حیرت ہے کہ سر والٹر جیسے جہاں دیدہ اور روشن دماغ شخص نے یہ حسن ظن قائم کر لیا کہ اُن کی تجویز مانی جا سکتی ہے اگر یہ تجویز قابل قبول ہو سکتی تھی تو رضوی اور لائق علی کہاں جاتے؟

ایک حیدر آبادی علاقہ کا اعلان آزادی

وسط اپریل میں حیدر آباد کے ایک علاقہ پرتیال نے جو صوبہ مدراس میں واقع تھا آزادی کا اعلان کر دیا، نظام گورنمنٹ نے اس علاقہ پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی فوج ہمارے علاقہ سے گزارنی

چاہی، ظاہر ہے اس کی اجازت نہیں ملی۔
سر والٹر مانکٹن نے حالات کو درو براہ کرنے کے لئے ایک نیا فارمولا پیش کیا جو یہ تھا۔
(۱) نظام رضاکاروں کے جلوسوں اور مظاہروں پر پابندیاں عائد کرکے رضوی کو عضوِ معطل بنادے۔
(۲) حکومت حیدرآباد کی از سر نو تشکیل کی جائے جو ترقی پسند عناصر پر مشتمل ہو۔
(۳) ایک مجلس دستور ساز قائم کی جائے۔ مگر فوراً!"
(۴) جیسے ہی مجلس دستور ساز عالم وجود میں آئے حکومت کو اس کے سامنے جواب دہ قرار دیا جائے۔

سردار کی منظوری

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جی نے بڑی خوشی سے یہ فارمولا منظور کرلیا۔ سردار نے بھی اسے قبول کرلیا، انھوں نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نظام سے یہ فارمولا منظور کرالیں تو میں حیدرآباد کے الحاق پر زور نہیں دوں گا" واقعہ یہ ہے کہ سردار کا طنز بڑا لطیف اور عمیق ہوتا تھا۔

رضوی نے مانکٹن فارمولا میں اپنی موت محسوس کی، حسب عادت نہایت صفائی کے ساتھ رضاکاروں کے ایک مجمع سے اس نے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"اگر انڈین یونین کا ایک سپاہی بھی اگر حیدرآباد میں داخل ہوا تو میرے رضاکار مرد اس میں گھس جائیں گے اور سو برس تک حیدرآباد کے لئے جنگ کرتے رہیں گے۔"

انڈین یونین برہمنوں اور بنیوں کی یونین ہے، پہلے الحاق کا نعرہ لگایا گیا، اس میں ناکامی ہوئی تو اب ذمہ دار گورنمنٹ کا نعرہ لگایا جارہا ہے، ایک دفعہ ذمہ دار گورنمنٹ قائم ہوگئی تو اسی دن حیدرآباد ہندوستان سے ملحق ہوجائے گا، اور مجلس اتحاد المسلمین اپنے رضاکاروں سمیت ختم ہوجائے گی، صرف تم ہی اس پلان کو ناکام بنا سکتے ہو۔"

تقریر کے خاتمہ پر رضوی کو مجاہد اعظم کا خطاب دیا گیا۔

مجاہدِ اعظم کا اعلان

غالباً اسی دن مجاہد اعظم نے بڑے قنوطی انداز میں اعلان کیا کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ جب خلیج بنگال کی لہریں سلطانِ دکن کے قدموں کو بوسہ دیں گی۔

اس موقع پر بھی رضوی نے مجھے معاف نہیں کیا، اس نے اپنی تقریر میں کہا۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو حیدرآباد کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام نہیں کرنا چاہتے، وہ اس تعطل کو جلد پُرامن ذرائع سے حل کرنے کے لئے بیتاب ہیں، یہی حالت گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کی ہے، لیکن مسٹر منشی کا حال کیا ہے؟ وہ اپنی اہمیت ختم ہوتی محسوس کر رہے ہیں، بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسٹر منشی جیسا بلند پایہ سیاست داں حیدرآباد جیسی بڑی ریاست کے مفاد کو اپنی سربلندی کے لئے قربان کرنے کے لئے تیار ہے، یہ کتنا بڑا المیہ ہے؟"

پنڈت جی کا بیان

چند روز بعد پنڈت جی کی ایک تقریر پر بھی رضوی صاحب برس پڑے۔ انھوں نے ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا۔

"ہندوستانی عوام کا رجحان مہاتما گاندھی کے قتل، اور راسٹریا سیوک سنگھ و ہندو مہاسبھا کی خون آشامیوں سے ظاہر ہے، پنڈت جی آزاد ہیں کہ وہ اپنے ملک کے عوام کی رائے کے سامنے سر جھکائیں، لیکن حیدرآباد پنڈت جی کے عوام کے رجحان و میلان کو اپنی سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا، ہندوستان کے وہ عوام جن کی تائید حاصل کرنے کے لئے حیدرآباد میں ذمہ دار حکومت کے قیام پر پنڈت جی زور دے رہے ہیں، وہی عوام ہیں جنھوں نے ہندوستان میں پانی کی طرح مسلمانوں کا خون بہایا، اور اب حیدرآباد میں بھی یہی کرنا چاہتے ہیں۔"

۱۹ اپریل کو سر والٹر مانکٹن نظام کو اپنا فارمولا قبول کرنے کا مشورہ دے کر انگلینڈ چلے چلے گئے، ایک اطلاع کے مطابق انھوں نے نظام سے کہا کہ اب وہ اس وقت حیدرآباد واپس آئیں گے جب ذمہ دار گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔

واقعہ یہ تھا کہ نظام، اور نہ صرف نظام، بلکہ لائق علی، معین نواز جنگ اور دین یار جنگ مل کر بھی مجلس اتحاد کو قابو میں لانا چاہتے، تو ناممکن تھا، کیونکہ فوج اور پولیس پر مجلس کا اثر غالب تھا۔

ماؤنٹ بیٹن فارمولا ختم

آخر یہ فارمولا اپنی موت آپ مرگیا، کیونکہ اس کی بنیاد فریب پر تھی، کوئی ہندو بجز ان ہندوؤں کے جو مجلس کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے، نظام گورنمنٹ میں شرکت پر تیار نہ تھا۔

جیسے ہی سر والٹر رخصت ہوئے، نظام اور لائق علی نے اس فارمولا کو مسترد کر دیا۔ وجہ یہ بیان کی کہ اپنے معاملات وہ خود بہتر سمجھتے ہیں، نئی دہلی کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

۲۲ر اپریل کے فرمان میں نظام نے اس عہد کا اعادہ کیا کہ ریاست کے تمام طبقوں سے وہ مساویانہ برتاؤ کریں گے۔

لائق علی بھی اپنی شیریں گفتاری اور خوش خوئی کے ساتھ اس فیصلہ پر اٹل تھے، حیدرآباد لیجسلیٹو کونسل کے سامنے تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہم باعزت مقام چاہتے ہیں لہٰذا الحاق کو کسی طرح منظور نہیں کر سکتے، معمولی واقعات کو ہندوستانی پریس بڑھا چڑھا کر شائع کر رہا ہے، ورنہ حیدرآباد میں سب خیریت ہے، حیدرآباد کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی گئی ہے، اور اس کے خلاف زبردست پروپگنڈا ہو رہا ہے، ہم حق اور راستی پر ہیں، اگر ہمارے خلاف طاقت استعمال کی گئی تو ہم پوری قوت سے مقابلہ کریں گے، لائق علی نے اپنی تقریر میں ماؤنٹ بیٹن فارمولا کو اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ اس کا ذکر کرتے۔

برق رفتار فوجی تیاریاں

اس اثنا میں نظام گورنمنٹ تیز رفتاری کے ساتھ فوجی تیاریاں کرتی رہی، ریاستی افواج کی اسکیم کے مطابق حیدرآباد کو سات ہزار سپاہیوں کو رکھنے کا حق تھا۔ ۱۹۴۷ء میں یہ تعداد تیرہ ہزار ہو گئی، اپریل ۱۹۴۸ء میں بائیس ہزار تین سو ترانوے، علاوہ ازیں سات ہزار

آدمی زیر تربیت تھے اور چار ہزار آٹھ سو ستر مختلف ناموں سے تربیت پا رہے تھے نظام گورنمنٹ نے تین ڈویژن فوج رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اسی طرح پولیس فورس میں بھی اندھا دھند اضافہ ہو رہا تھا مسلح رضاکاروں کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ تھی۔

جنگی کارخانے

ریاست میں آٹھ کارخانے سامانِ جنگ تیار کر رہے تھے، بڑے پیمانے پر پٹرول کے ذخیرہ خانے تعمیر کر لئے گئے تھے، پاور الکحل ہر روز تین ہزار پانچ سو گیلن تیار کر رہی تھی، فوجی بارکوں میں بائیس ہزار آدمیوں کی گنجائش تھی، مزید پچیس ہزار آدمیوں کے لئے نئی بارکیں تیار ہو رہی تھیں۔

ہوائی فوج زیر تربیت تھی نئے ہوائی اڈے بیدر میں تعمیر ہو رہے تھے، ایک مہم جو شخص جس کا نام سڈنی کاٹن تھا اس کام پر مامور تھا کہ فضائی ذریعہ سے اسلحہ اسمگل کرے۔

یہ اطلاع بھی ہمیں ملی کہ سلطان مکلا سے ایک معاہدہ ہو گیا تھا کہ عربوں کی ایک بڑی تعداد حیدرآباد میں درآمد کی جائے، مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک سے اسلحہ اور سامانِ جنگ کی خریداری کا معاہدہ بھی ہو گیا تھا اور طے پایا تھا کہ یہ سامان مکلا میں رکھا جائے۔

پنڈت جی کی جنبشِ لب

پنڈت جی سے میری ملاقات

۴ر اپریل کو بمبئی میں پنڈت جی سے میری ملاقات ہوئی، جہاں وہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسہ میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے، جنوری سے اب تک میں ان سے کئی مرتبہ دہلی میں مل چکا تھا۔ ان تمام مواقع پر وہ ملے اچھی طرح، لیکن کچھ زیادہ منہ نہیں لگایا، بلکہ کچھ پھٹے پھٹے رہے۔ حتیٰ کہ حیدرآباد سے متعلق بات چیت کرنے میں میری حوصلہ افزائی بھی انھوں نے نہیں کی۔ مسئلہ حیدرآباد انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سردار پر چھوڑ دیا تھا، صرف خاص خاص معاملات میں مشورہ دیدیا کرتے تھے۔

اس موقع پر میں نے حیدرآباد کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ پنڈت جی کے گوش گزار کیے، اور انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ اقدام کا وقت بہت قریب ہے۔

کانگرس کا خفیہ اجلاس

راماچاری، راماکرشنا راؤ، پنالال پی ٹی، رنگا ریڈی اور روعوت کا بھی میں نے پنڈت جی سے تعارف کرایا، یہ لوگ بڑی دیر تک اکیلے میں پنڈت جی سے گفتگو کرتے رہے اور حیدرآباد میں

جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب کچھ انھیں بتایا۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ایک خفیہ اجلاس میں حیدرآباد سے متعلق حکومتِ ہند کی دورخی پالیسی پر خوب لے دے کی گئی۔ اس اجلاس میں مجھے شرکت سے منع کر دیا گیا تھا۔

پنڈت جی نے اپنی جوابی تقریر سے سب کو مطمئن کر دیا، ان کے موقف نے سارے ملک کا حوصلہ بڑھا دیا، انھوں نے ہندی میں تقریر کی، ان کی تقریر خواہ غلط سمجھی گئی ہو، یا غلط رپورٹ کی گئی ہو، بہرحال اخبارات نے یہ لکھا کہ پنڈت جی نے اپنی تقریر میں حیدرآباد کے لئے دو ہی راستے تجویز کئے ہیں، جنگ، یا الحاق؟ اس تقریر نے سارے ملک میں کھلبلی ڈال دی۔

کیمپبل جانسن کے بیان کے مطابق لارڈ ماؤنٹ بیٹن یہ تقریر پڑھ کر دہشت زدہ ہو گئے، اور پنڈت جی کو اس کے نتائج کی طرف متوجہ کیا،[۱] نتیجہ یہ ہوا کہ پنڈت جی کی تقریر کا تصحیح شدہ متن شائع کرنا پڑا۔

حکومتِ ہند کا موقف ۲۶ اپریل کو پنڈت جی کے اعزاز میں بمبئی کے صحافیوں نے ایک استقبالیہ دیا، اس موقع پر پنڈت جی نے حکومتِ ہند کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر رضاکاروں کی سرگرمیاں باشندگان حیدرآباد کے تحفظ کے لئے خطرہ ثابت ہوئیں تو بلاشبہ حکومت ہند مداخلت کرے گی، وقت آگیا ہے کہ یہ معاندانہ طرزِ عمل ترک کیا جائے۔ اگر حکومتِ حیدرآباد رضاکاروں کا فتنہ نہیں روک سکتی تو دوسرے طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔"

حیدرآباد کے ہندو لیڈر بھی بمبئی میں پنڈت جی سے ملے اور انھوں نے کافی غور و فکر کے بعد فیصلہ کیا کہ اگر نئی حکومت میں انھیں شرکت کی دعوت دی گئی تو وہ صرف اس شرط پر شامل ہوں گے کہ مجلس آئین ساز میں ہندو اکثریت ہو، تناسب آبادی کی بنیاد پر مجلس دستور ساز قائم کی جائے اور رضاکار جماعت خلاف قانون قرار دے دی جائے۔

[۱] Mission with Mountbatten

سردار کی خود اعتمادی

میں نے ان حیدرآبادی لیڈروں کو مشورہ دیا کہ دہرہ دون میں سردار سے بھی مل لیں، یہ لوگ وہاں پہنچے، سردار نے ان سے کہا "مت پریشان ہوں، حیدرآباد کے بارے میں آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، یہ میرا کام ہے"۔ سردار کی یہ خود اعتمادی مقدس ثابت ہوئی، یہ لوگ اس طرح واپس آئے کہ ان کے حوصلے بلند تھے۔

اپریل کے آخر میں نظام گورنمنٹ نے حکومت ہند کے خلاف وسیع پیمانے پر غیر ممالک میں پروپیگنڈے کی مہم شروع کی جس کا سلسلہ ستمبر تک جاری رہا، کلاڈ اسکاٹ، جو پہلے "ٹائمز آف انڈیا" سے وابستہ تھا، حیدرآباد کے محکمہ اطلاعات کا انچارج بنا دیا گیا، برطانیہ میں ایک قابل پبلسٹی ایجنٹ مامور کیا گیا جس نے اپنا کام شروع کر دیا، متعدد بین الاقوامی پبلسٹی ایجنسیوں کا تعاون حاصل کیا گیا۔

نظام گورنمنٹ کا سب سے بڑا سہارا غیر ملکی صحافیوں کا وجود تھا، جن کی ایک جماعت سرکاری مہمان خانے میں نہایت شاندار طور پر لوازم ضیافت سے بہرہ ور ہوا کرتی تھی، ان کے دسترخوان پر نہایت اعلیٰ درجہ کے کھانے ہوتے ان کی مزاج پرسی کے لئے سحر طراز عورتیں موجود تھیں، جو انھیں گھمانے اور گشت کرانے لے جایا کرتیں۔

بعض غیر ملکی صحافی از راہِ کرم مجھ سے ملنے بھی کبھی کبھی آجایا کرتے، یہ لوگ ہندوؤں کے کیس کو توجہ سے سنتے، جو دستاویزات میں ان کے سامنے پیش کرتا، انھیں ملاحظہ کرتے، لیکن معمولی سی چائے کی پیالی جو میں انھیں پیش کرتا۔ ظاہر ہے اس کا وہ اثر نہیں ہو سکتا تھا جو شمپین کی ان بوتلوں کا ہو سکتا تھا جو گرین لینڈ کے گسٹ ہاؤس میں پیش کی جاتی تھیں، ان میں سے اکثر مجلس اتحاد کی زبان میں بولتے اور کہتے کہ ہندوستان نہایت واہیات طور پر حیدرآباد کو آزادی سے محروم کرنے پر تلا ہوا ہے۔

شرارت!

ایک غیر ملکی نامہ نگار نے حیدرآباد کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے رویہ کی بڑے دلچسپ انداز میں وضاحت کی، اس نے کہا ہماری ہمدردیاں ہندوؤں کے ساتھ نہیں ہیں، ایک مسلمان کو ہم زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

وہ ہمارے ساتھ مل جل کر کھانے میں عذر نہیں کرتا۔ ہم سے عزت اور احترام کا برتاؤ کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک ہندو کا سمجھنا ہمارے لئے ناممکن ہے گو وہ ہم سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ہم سے نفرت کرتا ہے، اس کی یہ روش ہماری نظر میں اسے حقیر بنا دیتی ہے وہ ہمیں سبک سمجھتا ہے۔

اپریل کے ختم ہوتے ہوئے رضاکاروں کا وجود ایک نہایت سنگین قومی خطرہ کی صورت اختیار کر گیا، اب مخدوم محی الدین جیسے لوگ بھی مجلس اتحاد کے ساتھ تھے، ۴ مئی ۱۹۴۸ء کو نظام گورنمنٹ نے کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندیاں ہٹالیں، نارائن ریڈی اور دوسرے کمیونسٹوں کے وارنٹ گرفتاری منسوخ کر دیئے۔ اس کارروائی پر اتحادی اخبارات بھی حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔

فوراً ہی حیدرآباد کی کمیونسٹ پارٹی نے ایک پمفلٹ شائع کیا، اس نے اعلان کیا کہ حیدرآباد کا ہندوستان سے الحاق اور حیدرآباد میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ غلط ہے، حکومت ہند سرمایہ داروں کی حکومت ہے، اس سے نہ الحاق ہونا چاہیئے نہ یہ صحیح معنوں میں جمہوریت پسند ہے، عام طور پر یہ افواہ گرم تھی کہ نظام گورنمنٹ اور کمیونسٹوں میں سمجھوتہ ہو گیا ہے، مغربی بنگال کے کمیونسٹ رضاکاروں کو اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔

نظام اور کمیونسٹ

کمیونسٹ پارٹی اب نظام کی اتحادی بن چکی تھی۔ ہندوستان کے خلاف جو محاذ قائم تھا اس میں برابر کی شریک تھی۔ ہندوستان میں جو کمیونسٹ زیر زمین چلے گئے تھے اب وہ حیدرآباد میں نمودار ہونے لگے، جو وزراء اور حکام سے ربط ضبط قائم کر رہے تھے اور نظام سے یہ سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے کہ کابینہ میں ان کا بھی ایک نمائندہ شریک کر لیا جائے۔

نظام گورنمنٹ سے اس اتحاد کے بعد کمیونسٹوں کی طاقت اور بڑھ گئی اور جن مقامات پر ان کا پہلے سے رسوخ تھا، ان کے علاوہ دوسرے اضلاع میں بھی وہ حاوی ہو گئے، اپریل کے بعد بعض بیانات کے مطابق لوگوں کا غلہ اور ان کے مویشی

کمیونسٹوں سے ہمدردی رکھنے والے کسانوں کو تقسیم کر دیئے گئے۔

کمیونسٹوں کو توقع یہ تھی کہ اگر حکومتِ نظام انڈین یونین سے دوستانہ تعلقات کی ہر تجویز کو مسترد کرتی رہی تو اس کا اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔ حیدرآباد کا نظم و امن ختم ہو جائے گا، پھر نہایت آسانی سے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا حیدرآباد کی وارث بن جائے گی۔

تخویف اور دہشت پسندی

میں یہ سوچ کر حیران ہوا کرتا تھا کہ وہاں میں جو لوگ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر نظام کے دستخط کرانے کے لئے بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں اس خطرہ کا مقابلہ کریں گے؟ وہ کون سی طاقت ہے جو نظام کو معاہدہ کرنے پر آمادہ کر دے گی، جبکہ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ معاہدہ قائمہ کی ہر دفعہ توڑی جا رہی تھی، وہ کون سی تدبیر ہو سکتی ہے جو نظام کو استصواب رائے یا کم از کم ہندوؤں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے پر راغب کر سکتی ہے؟ وہ کیونکر ہندوستان کا دوست بن سکتا ہے؟ اور کیوں نہیں کم از کم اقتصادی طور پر پاکستان سے ملحق ہو جائے گا؟

اسی اثنا میں کمیونسٹ نہایت سرگرمی کے ساتھ تخویف اور دہشت پسندی سے کام لے کر آندھرا کے علاقہ کو اشتراکی بنانے کے درپے بنے ہوئے تھے۔

اسی زمانہ میں حکومتِ ہند کشمیر میں فوجی اقدامات کر رہی تھی، جو ممکن تھا پاکستان سے باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر لیتے۔

کیمپبل جانسن حیدرآباد میں

ماؤنٹ بیٹن کی خوش فہمیاں اپنے عہدہ کی میعاد ختم ہونے سے پہلے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے حیدرآباد اور ہندوستان کے معاملات رو براہ کرنے کی ایک اور کوشش کی، ۹ مئی کو انھوں نے نظام کے نام ایک مکتوب لکھا کہ آیا ان کے لندن جانے سے پہلے نظام ملاقات کی غرض سے نئی دہلی آسکتے ہیں؟

دسمبر میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے پہلی مرتبہ جب میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ نظام دہلی آجائیں، پھر دہلی میں دستاویز الحاق پر ان سے دستخط کرانا کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔

نظام نے جواب میں خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو حیدرآباد آنے کی دعوت دے دی۔ اور دہلی آنے سے معذرت کا اظہار کر دیا۔

اسی اثنا میں سر والٹر مانکٹن نظام کے لیے لیبر گورنمنٹ سے لندن میں سرگرمی کے ساتھ مصروف گفتگو تھے۔

سر مرزا کی تجویز لارڈ ماؤنٹ بیٹن جب بنگلور گئے تو سر مرزا اسمٰعیل نے گورنر جنرل اور نظام

کہ اس ملاقات کی تجویز پیش کی۔[ل] سر مرزا کا رابطہ براہ راست وینز ہوش کی وساطت سے میرے ساتھ بھی قائم تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ سر مرزا جیسا منجھا ہوا سیاست دان اپنے دماغ میں اعلیٰ حضرت کا کتنا غیر واقعی تصور رکھتا ہے۔

مئی کے کچھ دن سر مرزا کے ساتھ میں نے مسوری میں بسر کئے جہاں وہ بحالی صحت کے لئے مقیم تھے۔

سردار کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی تھی کہ میرے بجائے کسی فوجی افسر کو ایجنٹ جنرل بنا کر حیدرآباد بھیجا جائے۔ نئی دہلی کے بعض حلقوں کا خیال تھا کہ اگر میں اس عہدہ سے ہٹا دیا جاؤں تو معاملات حیدرآباد کا آسانی سے تصفیہ ہو سکتا ہے، یہ لوگ اس بات پر بہت ناخوش تھے کہ سردار مجھ پر اعتماد کئے جا رہے ہیں اور اس تجویز کو ماننے پر آمادہ نہیں ہیں۔ انھوں نے یہ ساری کہانی زہر خند کرتے ہوئے مجھے سنائی، اور اس تجویز سے متعلق اپنا ردعمل بھی بیان کیا۔

جاسوس بیگمات

کچھ عرصہ تک وزارت دفاع سے بھی میں نے اپنا تعلق قائم رکھا۔ خاص طور پر چیف آف دی جنرل اسٹاف میجر جنرل چودھری کے ساتھ، تاکہ جو تیاریاں ہو رہی تھیں، ان کا مجھے اندازہ ہو سکے۔

گرمی کے زمانہ میں کچھ دنوں کے لئے میں بنگلور چلا گیا، اگر کوئی حادثہ رونما ہوا تو میرا دفتر مستقل طور پر یہاں آ سکتا ہے۔ میں نے سردار اور سردار بلدیو سنگھ پر جو وزیر دفاع تھے بار بار زور دیا کہ میسور میں چار بٹالین ہر وقت موجود رہنی چاہئیں، کیونکہ اگر انڈین یونین اور حیدرآباد کے معاملات طے بھی پا جائیں تو رضا کار اور وہ ہزار ہا مسلمان جو ادھر ادھر سے لا کر جمع کئے گئے تھے، آسانی کے ساتھ اس انقلاب کو تسلیم نہیں کریں گے، اس صورت میں حیدرآباد کی کوئی حکومت بھی نئی پالیسی کو اس وقت تک بروئے کار نہیں لا سکتی، جب تک کم از کم دس ہزار سپاہ پوری وفاداری کے ساتھ نظم و امن برقرار رکھنے کے لئے موجود نہ ہو۔

[ل] Mission with Mountbatten, p. 112

بنگلور میں مجھے ایک نہایت دلچسپ تجربہ ہوا، ایک عمر رسیدہ بیگم کی اتالیقی میں حیدرآباد کی چند نوجوان اور طرحدار لڑکیاں ہمارے فوجی حکام کی سوسائٹی میں گھلنے ملنے کی کوشش کرنے لگی تھیں، ان کے گھر کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے، اعلیٰ پیمانے پر دعوتوں اور ضیافتوں کا سلسلہ جاری رہتا، رقص، پھر ڈنر، پھر رقص، اور آخر میں طعام شبینہ۔

حیدرآباد کی ایک حسین جاسوسہ

بنگلور جنوبی ہند کی گرمائی نزہت گاہ ہے، حیدرآباد کے امراء اور ہندوستانی فوج کے زیر رخصت حکام فرصت کے لمحات یہاں بسر کرنے پچھلے سال تک برابر آیا کرتے تھے، لیکن ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک تبدیلیاں ہوئیں۔ بہت سے فوجی حکام جوان پارٹیوں میں شریک ہوتے، وہ ان گہرے اختلافات کا اندازہ ہی نہ کر سکتے جو پیدا ہو چکے تھے، وہ بے تکلفی سے باتیں کرتے، محکمہ خفیہ کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی باتیں زیادہ تر فوجی نقل و حرکت سے متعلق ہوتی تھیں۔

ایک اطلاع مجھے یہ ملی کہ حیدرآباد کی ایک نوجوان اور خوبصورت خاتون بمبئی کے مقام قلابہ میں ایک فلیٹ لے کر مقیم ہیں، یہ بھی ہمارے فوجی افسروں سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہی تھیں، ان صاحبہ کو یہ معلوم کرنے کی دھن تھی کہ بمبئی، پونہ اور شولاپور کے فوجی حلقوں میں کیا کچھ ہو رہا ہے، مرارجی ڈیسائی بمبئی کے ہوم منسٹر نے اس عورت کو شہر سے چلتا کر دیا، یہ احتجاج کرنے لگی چیخی چلائی، لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا، اس عورت کی ماں انگلینڈ سے آئی اور آتے ہی اس نے غصہ کی حالت میں دکھشنا سدن کا محاصرہ کر لیا، میں نے اس سے کہا، نوجوان لڑکیوں کے باپ کی حیثیت سے میرا تجربہ یہ ہے کہ کسی نوجوان خاتون کا ماں باپ سے الگ رہنا خطرناک ہے، میں نے کہا میں آپ کی مامتا سے اپیل کرتا ہوں کہ اس برائی سے بچیے، لیکن میں اس کا غصہ کم نہ کر سکا، بعد میں وہ نوجوان خاتون گرین لینڈ گسٹ ہاؤس کے غیر ملکی صحافیوں کی ضیافت اور میزبانی کے فرائض ادا کرنے پر مامور ہو گئی۔

خفیہ مشورے

اس زمانہ میں نظام دشمنوں کے حلقہ میں گھرے ہوئے تھے اور بے انتہا پریشان تھے، طے یہ ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اٹیچی خاموشی کے ساتھ شاہی پیامبر بن کر حیدرآباد جائیں جس کا نتیجہ الحاق کی صورت میں یقیناً برآمد ہوگا، وہ نظام کو یقین دلادیں کہ حکومت ہند ہر قیمت پر انھیں دشمنوں سے بچائے گی۔ اس مشورہ میں حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل متعینہ دہلی بھی شریک تھا۔[1]

میں ان امیدوں میں شریک نہیں تھا، لیکن سردار کی طرف سے مجھے پیام ملا کہ کیمبل جانسن حیدرآباد آرہے ہیں، میں ان کی پذیرائی کروں۔

میں فوراً حیدرآباد پہنچا، اتنے بڑے شخص کی زیادہ سے زیادہ پرتپاک پذیرائی میرا فرض تھا، میرے سیکرٹری نے ہوائی اڈے پر ان کا استقبال کیا اور دلکشا سدن میں رات کے کھانے پر میری طرف سے انھیں مدعو کر لیا، کیمبل جانسن کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ میں حیدرآباد میں موجود ہوں وہ لائق علی کے مہمان تھے اور بغیر ان کی اجازت کے ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کی دعوت نہیں قبول کر سکتے تھے۔

حکومت ہند مجھے ذلیل کرتی تھی

یہ کتنی عجیب صورت حال تھی، سربراہِ مملکت کا ایلچی جس کا میں ایجنٹ تھا، حیدرآباد آتا ہے، اور مہمان حیدرآباد کے وزیر اعظم کا بنتا ہے، جو اب تک ہر دوستانہ تجویز کو مسترد کرتا رہا تھا، وہ لائق علی کی شاندار ضیافت سے بہرہ ور ہوتا ہے، اور میں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل سرکاری طور پر اس سے بھی ناواقف نہیں کہ وہ کیوں آیا ہے؟ کھلی ہوئی بات ہے، میں جس طرح نظام کی نظر میں غیر پسندیدہ تھا اسی طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی نظر میں بھی۔

جانسن کی نظام سے ملاقات

کیمبل جانسن حیدرآباد آئے، نظام سے ملے، لیکن لائق علی کی موجودگی میں جو امید لے کر وہ دہلی سے چلے تھے وہ پوری نہ ہوئی، نظام نے کہا، میں دہلی نہیں جا سکتا، اور چونکہ گورنر جنرل حیدرآباد وقت نہیں نکال سکتے، لہذا الوداع کہنے کے سوا اور میں کیا کر سکتا ہوں؟

[1] Mission with Mountbatten, p. 323

نظام کا ٹکا سا جواب

نظام نے اس موقع پر اپنے ظرافت پسند ہونے کا اچھا ثبوت دیا، انھوں نے کہا، میں مجبور ہوں، میں تو حیدرآباد کا صرف ایک دستوری سربراہ ہوں، کابینہ کے مشورہ کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا، ذاتی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا،

کیمپبل جانسن رات کو مجھ سے ملے، انھوں نے مجھ سے کہا، کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے نظام سے رسمی ملاقات کے لئے میں یہاں آیا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ راہ راست پر نہیں آسکتے، میں نے کہا، میری رائے یہ ہے کہ نظام اب بھی سب کچھ کر سکتے ہیں، سب کچھ انہی کے اختیار میں ہے، میں نے یہ بات بھی محسوس کی کہ کیمپبل جانسن کو باشندگانِ حیدرآباد کے ان مصائب سے ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے جو موجودہ حکومت اور کمیونسٹوں نے ان پر توڑے ہیں۔

جانسن کے دورہ کا اثر

دوسرے روز جانسن نے لائق علی، رضوی اور العیدروس سے دوستانہ ملاقات کی، اس موقع پر میرے خلاف کئی باتیں ان کے گوش گزار کی گئیں، پھر جنرل العیدروس کے ساتھ ورنگل گئے اور ۲۰ تاریخ کو نئی دہلی واپس چلے گئے۔

کیمپبل جانسن کی اس آمد نے حیدرآباد کے حکمران طبقہ میں اس یقین کو اور زیادہ مستحکم کر دیا کہ انڈین یونین کوئی اقدام کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔

۱۵ رمئی کو وزارتِ امورِ ریاست نے حکومتِ نظام سے مطالبہ کیا کہ رضاکاروں کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کی جائے، اسی روز لائق علی کی ضیافت سے بہرہ ور ہونے والے جانسن نے اس خیال کا اظہار کیا کہ گفت و شنید مصالحت پھر سے شروع ہونی چاہیئے۔ ان باتوں سے مجلس اتحاد اس کے سوا اور نتیجہ بھی کیا نکال سکتی تھی کہ دہلی قوت سے محروم ہے لوگ برملا انڈین یونین پر الزام لگا رہے تھے، کہ وہ انہیں چھوڑ چکی ہے، لوگوں کا اعتماد دہلی کے اوپر سے اٹھتا جا رہا تھا، رضوی بدستور اپنے کام میں مصروف تھا، جلسے، جلوس، مظاہرے پندرہ ہزار پناہ گزیں زیر تربیت تھے۔

رضوی کا تکبّر ۱۱ر مئی کو رضوی نے فوجی لباس پہن کر تیس ہزار رضاکاروں کی سلامی لی، اس نے کہا کہ نظام ان مہاراجاؤں کی طرح نہیں ہے کہ جو راج پر مکھ بننا قبول کرلیں، تجاویز مصالحت کا ذکر اس نے نہایت حقارت کے ساتھ کیا۔

رضوی کی ایک اور تقریر ہریجن وزیر ونکٹ راؤ نے بھی اپنے سردار کی ہاں میں ہاں ملائی، اس نے عوام کو یقین دلایا کہ حیدرآباد کے مسلمان اور اچھوت جان کی بازی لگا کر بھی آزادی کا پرچم بلند رکھیں گے۔

رضوی نے ذمہ دار حکومت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تقریر میں ہندوستان کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"تم نے کس طرح کی آزادی حاصل کی ہے؟ دنیا کے سامنے آزادی پر وعظ کہتے ہو، لیکن اپنے گریبان میں منہ ڈالو، اپنی حالت دیکھو، پاکستان تمہارا پڑوسی ملک ہے، اس سے سبق لو، وہ تمہیں قانون اور دستور کا سبق دے سکتا ہے، قانون کا مقصد ہوتا ہے امن اور عافیت، ہندوستان میں ہر طرف انارکی پھیلی ہوئی ہے، اس ملک میں نہ امن ہے نہ تحفظ، قتل و غارت گری روزمرہ کے واقعات ہیں۔"

۹ر جون کو رضوی نے تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"مسلمانوں نے اپنا جغرافیہ ہمیشہ خود بنایا ہے، بہت جلد حیدرآباد کی سرحد دہلی سے بھی پرے پہنچ جائے گی، اور آصفیہ پرچم دہلی پر لہرائے گا۔"

۱۰ر جون کو اس نے ایک اور تقریر میں کہا:۔

"صدر اول کے مسلمانوں کا نمونہ پیش نظر رکھتے ہوئے ہم صرف پاکستان کے چھوٹے سے ٹکڑے پر قناعت نہیں کرسکتے، ہم محمود غزنوی کے اخلاف ہیں اور بابر کی یادگار ہیں۔"

۱۲ر جون کو پھر اس نے ایک تقریر میں کہا:۔

"ہندوستان کے ارباب کار کہتے ہیں، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہندوستان سے جاتے ہی قتل عام پھر شروع ہو جائے گا، میرے ہندو بھائیو! مسلمانوں نے تم پر تو سو برس تک حکومت کی، لہذا مجھے تم سے ہمدردی ہے، اگر میں چاہتا تو تمھیں نیست و نابود کر دیتا۔"

رضوی کی ان تمام تقریروں کے مواقع پر لائق علی وزارت کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور موجود ہوتا۔

مزید رعایتیں

نواب زین یار جنگ

نواب زین یار جنگ نئی دہلی میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے مقیم تھے، وہ حیدرآباد کے طبقہ امراء میں ایک وضعدار اور معاملہ فہم شخصیت کے مالک تھے، ان کے دل لبھا دینے والے انداز نے نئی دہلی کے بعض حلقوں میں، اور خاص طور پر جنرل بوچر کمانڈر انچیف کے دل میں گھر بنا لیا تھا، ان کی یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی تھی کہ رضاکاروں کی سرگرمیوں کے افسانے مبالغہ پر مبنی ہیں، ہندوستان سے حیدرآباد کے الحاق کے سلسلہ میں انھوں نے جو معقول تجویز پیش کی تھی، اس نے یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ وہ حیدرآباد کی حکمران جماعت کے نمائندہ ہیں۔

ماؤنٹ بیٹن کی خوش فہمیاں

کچھ عرصہ تک لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ زین یار جنگ کو لائق علی کی جگہ بٹھا کر تمام معاملات سلجھائے جا سکتے ہیں، دہلی میں صرف چند آدمی ایسے تھے جو اس حقیقت سے واقف تھے کہ زین یار جنگ مجلس اتحاد المسلمین کی بلیک لسٹ پر تھے، اگر لائق علی اور معین نواز نے انھیں دہلی میں ایجنٹ جنرل بنا کر بھیجا تھا تو اس لئے کہ حیدرآباد میں ان کی

موجودگی انھیں کھٹکتی تھی۔

لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہر قیمت پر مفاہمت کر لینے کے متمنی تھے کیمپبل جانسن کا حیدرآباد جانا سارے ہندوستان کے پریس نے غیر پسندیدہ قرار دیا تھا، لیکن ماؤنٹ بیٹن کے عزم پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑا۔

۲۳ رمئی کو لائق علی دہلی گئے، مجھے ان کی روانگی پر کوئی تعجب نہیں ہوا کیمپبل جانسن کی حیدرآباد میں آمد کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔

دفعتاً وی پی مینن کو ٹیلی فون پر گفتگو کے دوران میں میں نے کچھ اکھڑا اکھڑا سا محسوس کیا، میں نے فوراً بھانپ لیا کہ یہ لائق علی کی کارروائی ہے، وہ وی پی مینن سے ملے اور ان سے التجا کی کہ اپنے زرخیز دماغ سے کام لے کر کوئی حل پیدا کریں، بعد میں جب میں نے سردار سے فون پر گفتگو کی تو انھوں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

ذمہ دار حکومت کا مطالبہ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن اب جس چیز کی لائق علی کو ترغیب دے رہے تھے وہ یہ تھی کہ حیدرآباد میں جلد از جلد ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے اور الحاق کے مسئلہ پر استصواب عام کرایا جائے۔ لائق علی نے نہایت نرم لہجے میں یہ بات ماننے سے انکار کر دیا، ذمہ دار گورنمنٹ خارج از بحث تھی کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ الحاق کی صورت میں نکلتا، اسی طرح استصواب عام بیکار تھا، کیونکہ اس طرح نظم و قانون کی مٹی اور زیادہ پلید ہوتی "میں اپنے عہدہ سے استعفاد ے سکتا ہوں اگر کوئی دوسرا شخص حیدرآباد کو الحاق پر آمادہ کر سکے" لائق علی نے کہا۔

لائق علی کو اس بات پر اصرار تھا کہ ہندوستان اور حیدرآباد کے مابین دفاع، معاملاتِ خارجہ اور مواصلات سے متعلق ایک معاہدہ ہو جانا چاہیے، لیکن اس معاہدہ کے معنی یہ نہ ہوں گے کہ انڈین یونین کوئی ایسا قانون ان امور سہ گانہ سے متعلق بنا سکے گی جو حیدرآباد پر لاگو ہو سکے، یہ بات حیدرآباد پر چھوڑ دینی چاہیئے کہ ان امور سہ گانہ سے متعلق انڈین یونین جیسے قواعد د وہ خود بنائے، لائق علی خود کوئی ضمانت دینے کے لئے تیار نہیں تھے لیکن ہم سے عہد لینا

چاہتے تھے۔

لائق علی کا رویہ بدل گیا

دو روز کے اندر اندر لائق علی کے رویہ میں معجزہ نما تبدیلی ہوئی، وہ ایسی باتیں ماننے پر تیار ہو گئے جن کی ان سے ذرا بھی توقع نہیں تھی، ۲۶ مئی کو ایک کانفرنس میں جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، پنڈت جی اور وی پی مینن موجود تھے انھوں نے وہ مسودہ منظور کر لیا جو وی پی مینن نے تیار کیا تھا، جن معاملات پر لائق علی نے اتفاق کا اظہار کیا وہ یہ تھے۔

(۱) دفاع، معاملات خارجہ اور مواصلات پر انڈین یونین کو مکمل اختیار حاصل ہوگا، حتیٰ کہ قانون بنانے کا بھی،

(۲) حیدرآبادی افواج کی تعداد بیس ہزار سپاہیوں سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہوگی جس میں ساٹھ فیصد غیر مسلم ہوں گے، اور حکومتِ ہند کی اسٹیٹ فورسز اسکیم حیدرآباد پر بھی لاگو ہوگی، افواج بے قاعدہ منتشر کر دی جائیں گی۔

(۳) غیر ممالک سے حیدرآباد کسی طرح کے سیاسی تعلقات نہیں رکھے گا۔

(۴) ایک عارضی حکومت جس میں کم سے کم چالیس فیصد غیر مسلم وزراء ہوں گے فوراً قائم کر دی جائے گی۔

(۵) یکم جنوری ۱۹۴۹ء تک ایک مجلس دستور ساز کا قیام عمل میں لایا جائے گا، جس کے ساٹھ فیصد ممبر غیر مسلم ہوں گے۔

مینن سردار کے پاس

وی پی مینن یہ شرائطِ صلح لے کر سردار کے پاس مسوری پہنچے، انھوں نے اگرچہ یہ مسودہ منظور کر لیا، لیکن اپنے پیام میں صاف صاف کہدیا کہ وہ لائق علی سے گفتگو کرنے پر آمادہ نہیں ہیں، جو ہر مرتبہ حیدرآباد صلاح و مشورہ کے لئے جاتے ہیں اور پھر دہلی واپس آجاتے ہیں، یہ معاہدہ لائق علی کے حیدرآباد پہنچنے کے چوبیس گھنٹے کے اندر منظور ہو جانا چاہیئے۔

نئی دہلی کے حلقوں میں اس کارنامے پر نہایت اطمینان کا اظہار کیا گیا، سمجھ لیا گیا کہ اب حیدرآباد کا مسئلہ طے ہے، لائق علی کے سر پہ تدبر کا تاج رکھ دیا گیا، لیکن انھوں نے اپنے

بائیں سے دائیں   مسٹر راجو، مسٹر پنگل دنیکٹ رانا ریڈی، میر لائق علی - کے، ایم، منشی
نواب معین نواز جنگ، نواب علی یاور جنگ، نواب دین یار جنگ
مسٹر جوشی
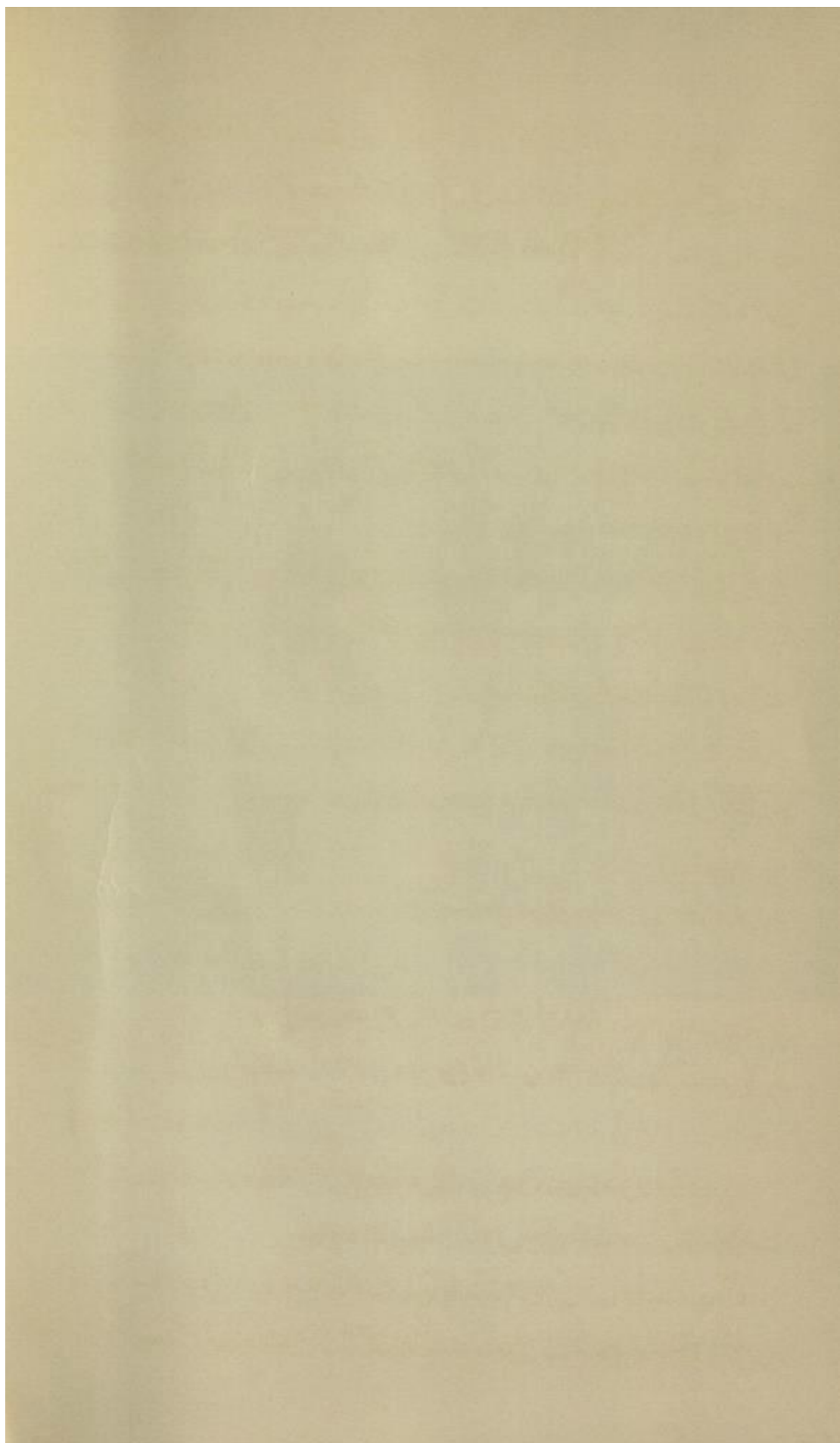
رنقار سے صلاح ومشورہ کے لئے حیدرآباد جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔

لائق علی پھر بدل گئے

۲۸ مئی کو لائق علی نے مجھے ڈنر پر مدعو کیا جس تپاک سے انھوں نے میرا استقبال کیا اس سے میں بہت متحیر ہوا کیونکہ گزشتہ چند ہفتوں سے ہمارے تعلقات خاصے کشیدہ چلے آرہے تھے۔ انھوں نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ الحاق برطانیہ کی بالادستی سے زیادہ بدترین چیز ہے۔ الحاق کے مقابلہ میں موت انھیں منظور رہے۔ پھر انھوں نے اس گفتگو کی تفصیل بتائی جو ان کے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے مابین ہوئی تھی، انھوں نے کہا کہ ذمہ دارانہ حکومت ساٹھ اور چالیس کے ہندو مسلم تناسب سے قائم ہونی چاہیئے، لیکن مسلمانانِ حیدرآباد کو اس پر آمادہ کرنا مشکل ہے، نظام کو اس پر کوئی اعتراض نہیں، قاسم رضوی بھی دانشمند آدمی ہیں، وہ بھی اتفاق کریں گے، لیکن ان کے بعض متبعین سے یہ بات منوانا مشکل ہے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے، جب لائق علی نے التجا کے لہجہ میں مجھ سے کہا "منشی مجھے تمہارا تعاون درکار ہے، میں ایک بہت بڑا تجربہ کر رہا ہوں، میں ہندوستان اور حیدرآباد کے تعلقات کو پختہ تر کر دینا چاہتا ہوں مجھے ایک موقع دو کہ میں ثابت کر سکوں کہ حیدرآباد ہندوستان کی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ میں جانتا ہوں تم بری طرح مجھ پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہو۔ میرے راستہ میں کئی مرتبہ سنگِ گراں بن کر تم حائل ہو چکے ہو، خدا کے لئے میری مدد کرو، سردار کو سمجھاؤ کہ وہ آڑے نہ آئیں۔

مجھے بیوقوف بنایا گیا

لائق علی کے اس طرزِ تکلم نے مجھے مبہوت کر دیا، میں صرف اتنا کہہ سکا کہ حیدرآباد نے اگر واقعی دوستی کا ثبوت دیا تو میں ہر مدد کرنے کے لئے تیار ہوں"

لائق علی نے مجھ سے پوچھا "ان تجاویز صلح کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟"

میں نے کہا "اس کا فیصلہ دہلی کے ہاتھ میں ہے، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ نظام گورنمنٹ کو دوستی کے نئے باب کا بغیر تاخیر کے آغاز کر دینا چاہیئے" پھر میں نے پوچھا "آپ اتحادی اخبارات کو سب و شتم کرنے سے کیوں نہیں روکتے اور سوامی رامانند تیرتھ کو کیوں نہیں

رہا کر دیتے؟ لائق علی نے جواب دیا "سوامی جی کی رہائی ناممکن ہے، میرے پاس ثبوت موجود ہے کہ انھوں نے متشددانہ تحریک میں حصہ لیا ہے۔"

عجیب و غریب ماحول

آج کی گفتگو نہایت ہی عجیب و غریب ماحول میں ہوئی، لائق علی سے میں کبھی بھی اس کی توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ اتنی گرم جوشی کا مجھ سے برتاؤ کریں گے، میں ساری زندگی اس کا تصور نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجوزہ صلحنامہ کو منظور کر لیں گے۔

نظام نے سر والٹر مانکٹن کو انگلینڈ سے پھر طلب کیا، اور مجوزہ صلحنامہ پر یا لائق علی کو الگ کرنے پر رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔

سر والٹر مانکٹن ۳ر جون کو ہندوستان پھر تشریف لائے اور لائق علی کے ساتھ دہلی پہنچے جادوگر اپنا کرتب دکھانے پھر آگیا، اور ایک نئے معاہدہ کا مسودہ اپنے ساتھ لایا جسے وی پی مینن نے فوراً مسترد کر دیا۔

پنڈت جی لائق علی سے عاجز آگئے

گفت و شنید از سر نو شروع ہوئی ۱۹ر کو سر والٹر ایک نیا مسودہ پیش کر دیتے، پنڈت جی کو اب لائق علی پر کوئی اعتماد نہیں رہ گیا تھا، انھوں نے لائق علی سے ملاقات بھی نہیں کی، سردار نے مینن کو ہدایت کر دی کہ وہ کوئی جوابی تجویز نہ پیش کریں، انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جی کو لکھا کہ اب صرف الحاق اور ذمہ دار حکومت کے قیام پر زور دینا چاہیے، اس معاملہ میں جتنی تاخیر ہوگی ہندوستان سیاسی اور فوجی اعتبار سے گھاٹے میں رہے گا۔

۲۳ر جون کو طویل بحث و تمحیص کے بعد معاہدہ اور فرمان کا ایک نیا مسودہ تیار ہوا، جو یہ تھا:۔

(۱) یونین پارلیمنٹ کو امور سہ گانہ سے متعلق قانون سازی کے مکمل اختیارات ہوں گے۔

(۲) رضاکار جماعت خلاف قانون قرار دیدی جائے گی۔

(۳) حیدرآبادی فوج بیس ہزار سپاہیوں سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہوگی۔

(۴) نظام گورنمنٹ کو اجازت ہوگی کہ وہ تجارتی اور اقتصادی تعلقات غیر ممالک سے استوار کرے، لیکن ہندوستانی سفرا کی زیر نگرانی۔

(۵) ایک عارضی حکومت جلد از جلد قائم کی جائے گی جس میں ہندو اور مسلمان وزیر مساوی تعداد میں ہوں گے۔

(۶) یکم جنوری ۱۹۴۹ء تک مجلس دستور ساز کا قیام عمل میں آجائے گا جس کے چالیس فیصد ممبر مسلمان اور ساٹھ فیصد غیر مسلم ہوں گے۔

(۷) مجلس دستور ساز کے قیام کے ساتھ ہی کابینہ وزارت کو اس کے سامنے جوابدہ قرار دیا جائے گا جس میں ساٹھ فیصد غیر مسلم اور چالیس فیصد مسلمان ہوں گے۔

(۸) مجلس دستور ساز مسلمانوں کے ثقافتی اور مذہبی تحفظات دس سال تک قائم رکھنے کے متعلق ایک دفعہ منظور کرے گی۔

(۹) سرکاری ملازمتوں میں یکم جنوری ۱۹۵۳ء تک فرقہ وارانہ تناسب ساٹھ اور چالیس فیصد کا رہے گا۔

(۱۰) الحاق کا فیصلہ استصواب کے ذریعہ ہوگا۔

(۱۱) انڈین یونین کو ہنگامی حالات میں اختیار ہوگا کہ وہ حیدرآباد میں فوج بھیج سکے۔

نظام نے پھر انکار کر دیا

لائق علی نے حسب معمول یہ شرائط بھی منظور کر لئے۔ ۸ ارتاریخ کو لائق علی، اور سر والٹر مانکٹن حیدرآباد پہنچے تاکہ نظام کی منظوری حاصل کریں، وہی ہوا جس کی توقع تھی، نظام نے مجلس دستور ساز اور عارضی حکومت کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا، نہ انڈین یونین کا حق قانون سازی تسلیم کیا۔

۱۲ ارجون کو سر والٹر نئی تجاویز لے کر پھر دہلی پہنچے۔ ۱۳ ارجون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن پنڈت جی اور مینن کے ساتھ سردار سے ملنے دہرہ دون گئے، جہاں بحالی صحت کے لئے وہ مقیم تھے۔ سردار نے معاملہ کے تمام پہلوؤں پر بحث و گفتگو کرنے کے بعد بعض مجوزہ اقدام منظور کر لئے ۱۳ ارجون کو مانکٹن نے وفد حیدرآباد کے بقیہ ممبروں کو مکمل اختیارات کے ساتھ دہلی طلب کیا۔

وفد آگیا مزید بحث وگفتگو پھر شروع ہو گئی۔

نظام کے شرائط صلح

نظام کے شرائط یہ تھے:۔

(۱) مجلس دستور ساز اور عارضی حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا تناسب کیا ہو؟ اس کا فیصلہ انہی پر چھوڑ دیا جائے۔

(۲) حیدرآبادی فوج کی تعداد میں مزید آٹھ ہزار کا اضافہ کیا جائے۔

(۳) رضا کاروں کو فوراً منتشر نہ کیا جائے بلکہ تین مہینہ کی مدت میں یہ کام انجام دیا جائے۔

(۴) حکومتِ ہند صرف اس صورت میں اپنی فوج بھیج سکتی ہے جب مجموعی طور پر سارے ہندوستان کے امن وامان کو خطرہ لاحق ہو، ورنہ نہیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب میں لائق علی کو متنبہ کر دیا کہ دو ہی صورتیں ہیں، نظام یا تو اس مسودہ کو منظور کر لیں یا مسترد کر دیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن رخصت ہوتے ہیں!

موقع ہاتھ سے نکل گیا دوسرے ہی روز نظام اور ان کے مشیروں کے بارے میں میری وہ رائے نمایاں ہو گئی جس سے ثابت ہوتا تھا کہ یہ لوگ ناقابل اعتماد ہیں۔

لائق علی یہ وعدہ کر کے حیدرآباد روانہ ہوئے کہ ۱۵ تاریخ کو ساڑھے سات بجے شام تک وہ اطلاع دیں گے کہ نظام نے سمجھوتے پر دستخط کر دیئے ہیں۔

مقررہ وقت پر نئی دہلی کے تمام متعلقہ اشخاص ٹیلی فون پر کان لگا کر بیٹھ گئے، خود میں بھی سراپا گوش بنا بلارم میں بیٹھا تھا؟ نازک گھڑی آئی اور گزر گئی، پھر نظام کا پیام موصول ہوا "مجھے مزید وقت چاہیئے، اپنی کونسل سے مشورہ کئے بغیر میں کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا"۔

۱۶ تاریخ کی شام کو نظام نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک تار بھیجا کہ وہ مجوزہ سمجھوتے پر دستخط نہیں کر سکتے، انھوں نے اپنے پیام میں چند نئے سوالات اٹھائے، لطف کی بات یہ ہے کہ نظام کے اٹھائے ہوئے ان جدید نکات سے لائق علی تک ناواقف رکھے گئے

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب میں جو تار بھیجا، وہ کافی درشت الفاظ میں تھا، سر والٹر

مانکٹن نے ماؤنٹ بیٹن کو تار بھیجا۔

"موقع ہاتھ سے نکل گیا"

میں نے اپنے آپ سے پوچھا یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟ ــــ یقیناً یہ حرکت نہ باشندگان حیدر آباد کی ہو سکتی ہے نہ انڈیا کی!

سر والٹر کی تمام ترکیبیں ناکام رہیں، نہ وہ نظام کو رام کر سکے، نہ اتحاد المسلمین کے دل میں اپنی بات بٹھا سکے مجلس اتحاد کے کارفرما تجارتی آزادی کے پردے میں حیدر آباد کو پاکستان سے ملحق کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے، نظام نے اختلافی معاملات میں ثالثی پر جو زور دیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ انڈین یونین جب کسی سخت اقدام پر مجبور ہو تو ثالثی کی کنجی سے قفل بند کر دیا جائے، اور اسے بے بس کر دیا جائے، اور مجلس اقوام متحدہ کے لئے مداخلت کا سر و سامان پیدا کر دیا جائے، یا بین الاقوامی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ حیدر آباد کو آزاد رکھنا چاہتے تھے، چنانچہ اب نظام نے ایک اور نکتہ اٹھایا، یعنی انڈین یونین کسی حالت میں بھی اپنی فوجیں حیدر آباد میں متعین نہیں کر سکتی۔ خواہ سارے ہندوستان میں ہنگامی حالات کیوں نہ رونما ہو جائیں۔

نہرو کی پریس کانفرنس

۱۸ جون کو پنڈت جی نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی۔ اور اس میں ساری خط و کتابت پبلک کے سامنے رکھ دی، اور فرمایا "اب ہندوستان مزید گفت و شنید کے لئے تیار نہیں ہے۔"

۱۹ جون کو سر والٹر مانکٹن نے ہمیشہ کے لئے دہلی کو الوداع کہا، ــــ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ۔

مجھے معلوم ہے کہ سر والٹر نظام سے کس طرح جدا ہوئے، ممکن ہے میری اطلاع پورے طور پر صحیح نہ ہو، لیکن اس سے دونوں (سر والٹر اور نظام) کے انداز کا ایک نقشہ ضرور سامنے آ جاتا ہے۔

"مجھے امید ہے آپ جلد واپس آئیں گے" نظام نے سر والٹر کے الوداعی الفاظ کے جواب میں کہا۔

"مجھے امید ہے دوبارہ جب میرا حیدرآباد آنا ہوگا، تو آپ بدستور نظام حیدرآباد ہوں گے" سروالٹر نے جواب دیا۔

کسی موکل کو سروالٹر مانکٹن جیسا وکیل دستیاب ہونا آسان نہیں، اور کسی وکیل کو بھی نظام جیسا موکل بہم پہنچنا قسمت ہی کی بات ہے جس نے قدم قدم پر اپنے وکیل کو بڑی بے دردی سے زچ کیا اور کسی موقع پر بھی اسکی ایک نہ چلنے دی۔

ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے طویل تار میں نظام سے استدعا کی کہ وہ اتحادی گروہ پر حیدرآباد کے اعلیٰ مفادات قربان کر دینے کے جرم کا ارتکاب نہ کریں۔

کیا مسٹر جناح ڈوری ہلا رہے تھے

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ لائق علی مفاہمت کے بارے میں اتنے سرگرم کیوں نظر آنے لگے تھے؟ پھر ۱۴ تاریخ کے شرائط پر کس طرح راضی ہو گئے تھے؟ اور پھر یک بیک اپنے موقف سے ہٹ کیوں گئے تھے؟ کیا راز تھا اس میں؟ اس گتھی کو سلجھانے کی میں نے بہت کوشش کی، کئی لوگوں سے تبادلۂ خیالات کیا، حتیٰ کہ لائق علی کے سیکرٹری ظہیر احمد کو ٹٹولا، لیکن کسی سے بھی اصل حقیقت منکشف نہ ہو سکی۔

ایک افواہ یہ تھی کہ یہ سب کچھ مسٹر جناح کے حسب ہدایت ہو رہا تھا۔ ایک خبر یہ بھی گرم تھی کہ لائق علی قبل اس کے دہلی چھوڑیں انھیں "اوپر" سے ایک ہدایت نامہ ملا تھا۔ جس کی تعمیل انھوں نے کی۔

لیکن میرے خیال میں صحیح ترین نقطۂ نظر اس باب میں یہ ہے کہ لائق علی چاہتے تھے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن جب تک انڈیا سے رخصت نہ ہولیں، وقت گزاری کی جائے کیونکہ ان کی موجودگی میں گفت و شنید مصالحت ٹوٹنے کے معنی یہ ہیں کہ خود ان سے راہ و رسم منقطع ہو جائے، اور ان سے راہ و رسم منقطع ہونے کا مطلب یہ تھا کہ سروالٹر مانکٹن سے ہاتھ دھوئے جائیں، اور مجلس اتحاد کی پالیسی یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن اور سروالٹر مانکٹن میں سے کسی کو دشمن نہ بنایا جائے۔

بہر حال خدا کا شکر ہے کہ انڈیا بال بال تباہی سے بچ گیا۔

ماؤنٹ بیٹن سے میری الوداعی ملاقات ۱۹؍جون کو میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے الوداعی ملاقات کی، وہ بڑے اخلاق اور شائستگی سے ملے۔

میں نے ماؤنٹ بیٹن کے ان خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا، جو انھوں نے اس ملک کے لئے انجام دیئے تھے، برطانوی راج کے سارے طویل دور میں ہندوستان کو ایسا مخلص اور بے لوث دوست کوئی نہیں ملا تھا، انتقالِ اختیارات کا مرحلہ اس آسانی کے ساتھ ہرگز طے نہ ہوسکتا، اور نہ برطانیہ، ہندوستان کے تعلقات اس درجہ دوستانہ اور خوشگوار بنیادوں پر مستحکم ہوسکتے تھے، اگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہستی درمیان میں نہ ہوتی۔

میرے ان اعترافات کے جواب میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بھی بڑی صفائی سے گفتگو کی، انھوں نے اپنی اور لائق علی کی گفتگو پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا

"میں نے زندگی میں بڑے بڑے مرحلوں سے مجھے دوچار ہونا پڑا ہے، لیکن حیدرآباد کی طرف سے جو جھٹکہ لگا ہے، اسے میں زندگی بھر فراموش نہ کرسکوں گا"

لاٹ صاحب کی یہ بات سن کر مجھے بھی موقع مل گیا، میں نے کہا۔

"یور ایکسی لینسی! گزشتہ مارچ کا واقعہ ہے، آپ یہاں اسی میز پر بیٹھے تھے، جب میں نے عرض کیا تھا، حکومت نظام ہرگز معاملات کو روبراہ کرنا نہیں چاہتی، مجھے خوشی ہے کہ بالآخر آپ بھی اسی نتیجہ پر پہنچ گئے، جس پر میں پہنچا تھا"

میں نے یہ بھی عرض کردیا۔

"اگر آپ کا رویہ ذرا سخت ہوتا، اور سر والٹر پر اعتماد کا اظہار آپ کی طرف سے ذرا کم ہوتا، تو یقیناً مارچ میں معاہدۂ الحاق پر حیدرآباد نے دستخط کردیئے ہوتے"

اس گفتگو کے بعد ہم رخصت ہوگئے۔

ماؤنٹ بیٹن کی نظام کو تنبیہ ۲۱؍جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کا ساحل چھوڑ دیا۔ رخصت ہوتے وقت ایک

مرتبہ پھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نظام کو متنبہ کیا:-

"آپ اور میں اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ آپ جیسی حیثیت کا فرماں روا آخری فیصلہ کی ذمہ داری سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا، اب یہ آپ کا اور صرف آپ کا کام ہے کہ جو کچھ کرنا ہے کر گزریں، اب یہ آپ کے ہاتھ میں ہے کہ تاریخ میں اپنا نام کس طرح باقی رکھنا چاہتے ہیں؟ ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے ایک باعزت اور آبرومندانہ پیش کش ٹھکرادی یا ایسے شخص کی حیثیت سے جو جنوبی ہند میں امن قائم رکھنے کا سبب بنا، جس نے اپنی عظیم الشان ریاست کو اور اپنے عالی مرتبت خاندان کو سنگِ حوادث سے بچا لیا؟ آخری صورت میں ہندوستان کی ممنونیت، اور اخلاص کو آپ ہر کا ب پائیں گے!"

یہ آخری مشورہ ہے جو میں آپ کو دے سکتا ہوں، یہ آخری مدد ہے جو میں آپ کو پہنچا سکتا ہوں، میں بہر حال آپ کا مخلص دوست ہوں۔"

"ابھی ابھی آپ کا تار ملا، جس کے لئے میرا شکریہ قبول فرمائیے، مجھے اندیشہ ہے کہ میں اپنے فیصلہ اور رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا، نہ میری حکومت اس کے لئے تیار ہے!"

۱۹ر جون کو سکرٹریٹ سطح پر ایک کانفرنس نئی دہلی میں منعقد ہوئی، جس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا، اس کانفرنس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا، اور طے کیا گیا کہ حیدرآباد کی اقتصادی ناکہ بندی اور زیادہ سخت کر دی جائے۔

ظہیر احمد سیکرٹری وزارت خارجہ

۲۸ر مئی کے ڈنر کے بعد سے لائق علی سے میرے تمام روابط ختم ہو گئے تھے، لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے رخصت ہو جانے کے چند روز بعد حیدرآباد کے محکمۂ خارجہ کے سیکرٹری ظہیر احمد مجھ سے آکر ملے۔

"میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے آپ پر بھروسہ ہے!" ظہیر احمد نے گفتگو کا آغاز کیا: "میں ہمیشہ کارفرمایانِ حیدرآباد سے کہتا رہا ہوں کہ وہ واحد شخص جو بہت مفا

اور مصالحت کرا سکتا ہے، وہ آپ اور صرف آپ ہیں، لیکن افسوس میری ان باتوں پر کسی نے کان نہیں دھرا۔"

"ظہیر، میں نے کہا "تم بھی جانتے ہو، اور میں بھی جانتا ہوں، کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے شرائط صلح طے کر کے ان سے منحرف ہو کر تم نے وہ آخری موقع کھو دیا، جو قسمت نے دیا تھا۔"

"لیکن از راہ کرم ہماری مدد کیجئے۔" ظہیر احمد نے کہا "اب صرف چار نکتے ایسے رہ گئے ہیں، جن پر اختلاف قائم ہے، اور صلح نہیں ہو سکتی ہے، صرف آپ ہی یہ گتھی سلجھا سکتے ہیں۔"

میں نے صاف صاف گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں میرے افکار و خیالات کا علم ہے۔ میں ان شرائط سے اختلاف رکھتا تھا، جو طے پائے تھے، لیکن چونکہ میری حکومت نے انھیں منظور کر لیا تھا، مجھے بھی سر جھکانا پڑا، بہر حال تم اب بھی مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو، اگر ہندوستان سے الحاق پر حیدر آباد تیار ہو جائے!"

سردار کا فرمائشی قہقہہ

دوسرے روز فون پر سردار کی آواز سنائی دی، جو سرور و مسرت کی ترجمان تھی۔

"کھونشی! اچھے تو ہو؟ امید ہے سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگا، ہاں! تمہارے اعلیحضرت نظام کا کیا حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک ہے!" میں نے کہا۔

پھر میں نے اپنی اور ظہیر کی گفتگو دہرا دی، اور ایک ایک حرف بتا دیا۔

"سمجھوتہ؟ مفاہمت؟" جیسے سردار ان الفاظ سے گوش آشنا ہی نہیں تھے "کیسی مفاہمت؟ کیسا سمجھوتہ؟"

سردار کا یہ اندازِ تکلم اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ اب وہ صرف اپنے آپ کو حالات کا آمر سمجھ رہے تھے۔

"وہی ماؤنٹ بیٹن والی مفاہمت!" میں نے بتایا۔

"اچھا وہ؟ کہہ کیوں نہیں دیتے وہ سمجھوتہ تو ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ انگلستان روانہ

ہوگیا، یہ کہکر سردار نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

ستون منہدم ہونے لگے

گو حیدرآباد کا سرکاری طبقہ اب بھی بلند آہنگی کے ساتھ شہادت، ایثار اور قربانی کے نعرے لگا رہا تھا لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ نہایت تیزی کے ساتھ باشندگان حیدرآباد میں بے حوصلگی پیدا ہوتی جا رہی تھی، بیدر میں لنگایت کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، اس نے حکمران طبقہ میں ہراس پیدا کر دیا تھا، لائق علی کابینہ میں لنگایت وزیر ملکارجو نپا نے مجھ سے رابطہ قائم کر لیا تھا، اس کے فرقہ نے حکم صادر کیا تھا، کہ وہ وزارت سے مستعفی ہو جائے۔

وزیر تجارت جوشی ان لوگوں میں تھا جو خطرہ کی بو میلوں پہلے سے سونگھ لیتے ہیں۔ جس روز ماؤنٹ بیٹن سے گفت و شنید ناکام ہوئی، اسی دن اس نے سردار کو تار دے کر ملاقات کی استدعا کی، اور سردار کی بے پناہ زد سے نہ بچ سکا۔

۳۰ رجون کو جوشی مجھ سے ملا" سردار مجھ سے ملاقات کے لئے آمادہ نہیں ہوئے، یہ تار ملاحظہ کیجئے"، جوشی نے کہا" میری اندرونی آواز مجھے حکم دے رہی ہے کہ حکومتِ نظام سے قطع تعلق کر لوں، میں سردار سے صرف اس لئے ملنا چاہتا تھا کہ انھیں بتا دوں کہ میں مستعفی ہو رہا ہوں، اگر آپ ملاقات کا بندوبست کر دیں"

"لیکن آپ سردار سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" میں نے سوال کیا" وہ وقت یاد ہے جب میں نے اشارۃً آپ سے کہا تھا کہ غدار قسم کے لوگوں میں آپ پھنس گئے ہیں، ان سے کنارہ کشی کیجئے، تو بجائے میرا مشورہ ماننے کے آپ لائق علی کے پاس پہنچے اور شکایت کر دی کہ میں آپ کو مستعفی ہو جانے کا مشورہ دے رہا ہوں، آپ اپنے منصب سے چمٹے رہے — پھر اب میں کیوں آپ کی مدد کروں؟"

"مہربانی کر کے سردار کو لکھ دیجئے کہ مجھے ملاقات کا موقع دیں"، جوشی نے کہا۔

"لیکن میں ایسا کیوں کروں؟" میں نے کہا" تمام نازک مراحل پر آپ نے رضوی کا ساتھ دیا، اور اس کے رفیق و ہمدم بنے رہے، میں سردار سے ملاقات کا بندوبست صرف اس صورت میں کر سکتا ہوں کہ جب پبلک مفاد اس کا متقاضی ہو"

جوشی نے لٹکے ہوئے منہ سے کہا۔

"بہر حال میں نے استعفا دے دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"لیکن مجھے یقین نہیں ہے" میں نے کہا۔

"میں آج ہی استعفا دے رہا ہوں، میں پھر واپس آؤں گا، کم از کم سردار کو اس واقعہ کی اطلاع تو دے دیجئے۔"

ساڑھے نو بجے رات کو جوشی میرے پاس آیا اور اس نے اپنے استعفا کا مسودہ دکھایا اس نے کہا۔

"میں جالنا جا رہا ہوں، وہیں سے استعفا بھیجوں گا۔"

جالنا میں جوشی کی ایک فیکٹری تھی،

جوشی کا استعفا

۲ جولائی کو وہ واپس آیا، اب اس نے اپنے تمام معاملات رو براہ کر لئے تھے، اپنا سارا روپیہ بمبئی منتقل کر دیا تھا، اور ساری تیاریاں مکمل کر لی تھیں، اس نے کہا۔

"میری زندگی خطرہ میں ہے، اندیشہ ہے کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا، میرا استعفا ممکن ہے دبا دیا جائے، کیا مہربانی کر کے میرے استعفا کی نقل اپنے پاس رکھ لیں گے؟ پھر بمبئی وغیرہ میں جو مظالم ہوئے ہیں ان کی جو تفصیلات میں نے جمع کی ہیں، انھیں بھی اور اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو ان سب تفصیلات کو شوق سے استعمال میں لائیے

استعفا کا مسودہ بہت دلچسپ تھا۔

"میں حیدرآباد کا، اور اپنے محبوب فرماں روا کا دل و جان سے وفادار ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس اقدام پر میں اپنے تئیں مجبور پاتا ہوں، میں نے وزارت اس لئے قبول کی تھی کہ فرقہ وارانہ اتحاد قائم رہے، اس اتحاد کے لئے میں اب بھی اپنی جان کی بازی لگا سکتا ہوں، اور ہر قربانی پر تیار ہوں، میری جگہ عوام میں ہے۔"

آگے چل کر جوشی نے کہا تھا۔

"ہر مسلمان بھائی کی زبان پر جنگ کا نعرہ ہے، اضلاع کا دورہ کرتا ہوا میں جہاں بھی

گیا، ہندوؤں کے لٹکے ہوئے اور زرد چہرے مجھے نظر آئے، جو میرے پاس اپنی تباہیوں، بربادیوں اور ہلاکتوں کی داستان لے کر آتے تھے، اغوا اور آبرو ریزی تو روزمرہ کے واقعات بن گئے ہیں!"

جوشی کا استعفا پاکر لائق علی بہت برہم ہوئے، انھوں نے محسوس کرلیا، جہاز ڈوب رہا ہے، انھوں نے اس استعفا کو دبانے اور چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن دہلی کے ریڈیو نے بلفظہ اسے نشر کر دیا۔

اٹیلی سے نظام کی استدعا ۴ر جولائی کو نظام نے پرائم منسٹر اٹیلی کو ایک خط لکھکر مداخلت کی استدعا کی، ساتھ ہی ساتھ پنڈت جی نے بھی ایک نہایت سخت خط اٹیلی کو لکھکر حیدرآباد کے حالات سے باخبر کیا، اٹیلی نے نظام کو افسوس کے ساتھ اطلاع دی کہ وہ مداخلت نہیں کر سکتے، واقعہ یہ ہے کہ برطانوی حکومت نے اس ساری مدت میں ہندوستان کے ساتھ بڑا دوستانہ اور قابل احترام رویہ اختیار کیا۔

حیدرآباد اب فوجی کیمپ بن گیا۔

جنگی تیاریاں گوا سے اور کراچی سے سامانِ جنگ دھڑا دھڑ پہنچ رہا تھا، طیاروں کے بیڑے کے بیڑے حیدرآباد سے کراچی اور کراچی سے حیدرآباد پرواز کر رہے تھے، اور چھوٹے اسلحہ پہنچا رہے تھے، اسلحہ کی نمائش خود بخود ہو رہی تھی، وہ چھپائے نہیں چھپتے تھے، اس سلسلہ میں نارائن راؤ، آریہ سماج کے بہادر صدر تھے، اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر بڑے اہم معلومات فراہم کر لیتے تھے، ان اسٹیشنوں کا سراغ بھی لگا لیا تھا، جہاں جانا تھا، اور جہاں سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔

نیا ہوائی اڈہ بیگم پیٹھ کے ہوائی اڈہ کی تعمیر صبح و شام جاری تھی، جہاں سے ساری دنیا کے ساتھ فضائی رابطہ قائم کرنے کا پروگرام بن چکا تھا، حیدرآباد کے خزانہ کا دروازہ کھول دیا گیا تھا، لندن کی متعدد پارٹیوں کو لاکھوں پونڈ اپنا ہم نوا بنانے کے لئے بھیجے جا رہے تھے، اسی طرح پاکستان کے لئے بھی تھیلیوں کے منہ کھول دیئے گئے تھے، لندن میں پاکستان کے ہائی کمشنر کے نام پر پندرہ لاکھ پونڈ سے زیادہ رقم

منتقل کردی گئی تھی، لائق علی کے تصرف میں ایک بڑی رقم اس مقصد کے لئے رکھدی گئی تھی کہ وہ لوگوں کو ممالک غیر کی سیاحت کے لئے بھیجیں جو وہاں جاکر حیدرآباد کی حمایت میں پروپگنڈا کریں، اور انڈیا کو صلواتیں سنائیں، کچھ لوگ اس سلسلے میں مصر گئے، کچھ عراق۔

امریکہ میں پروپگنڈا

ڈسمنڈ ینگ (Dismond Young) سابق ایڈیٹر پاینیر لکھنو (Pioneer) کو غیر معین فنڈ خرچ کرنے کا اختیار دے کر امریکہ بھیج دیا گیا کہ وہاں جاکر حیدرآباد کا مسئلہ امریکی عوام کے سامنے رکھے، اور رائے عامہ کو ہموار کرے، ینگ کے امریکہ جاتے ہی وہاں کے اخبارات کے کالم کے کالم مسائل حیدرآباد کے لئے وقف ہوگئے، امریکہ کے سربرآوردہ اصحاب کا تعاون حاصل کرکے اس مسئلہ کو مجلس اقوام متحدہ میں پیش کرنے کی بھی ینگ نے کوششیں شروع کردیں۔

طاؤسی فضائی دستہ

زین یار جنگ جو دہلی میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل تھے اور جنھوں نے حیدرآباد اور بھارت کے مابین مفاہمت کرانے کی زبردست جد وجہد کی تھی اب علانیہ غدار قرار دے دیئے گئے تھے، یہ وہی زین یار جنگ تھے جو دل قریب تقسیم کو کام میں لاکر میری اطلاعات کی تردید کیا کرتے تھے، اور رضا کاروں کی تائید کیا کرتے تھے، اب معتوب ہوکر حیدرآباد جارہے تھے، کہ بچشم خود میری اطلاعات کی تصدیق کریں۔

حیدرآباد کے مسلمانوں کا ایک وفد لائق علی سے ملا جس نے زور دیا کہ بھارت سے الحاق کرلیا جائے، لائق علی نے کہا۔

"اگر ہندوستان نے ہمارے خلاف کوئی اقدام کیا تو ایک لاکھ نئے آدمی ہماری فوج میں بھرتی ہونے کے لئے تیار رہیں جنوبی عرب میں، ہمارے ایک سو بمبار موجود ہیں۔

طاؤسی، فضائی فوج!

بے حوصلگی

سردار کا فیصلہ کن اعلان

سمجھوتہ کی بات چیت ٹوٹنے کے بعد پنڈت جی بہت دل گرفتہ ہوئے، لائق علی اور ان کے گروپ پر سے ان کا اعتماد بالکل اُٹھ گیا، سردار دہلی واپس آچکے تھے، اب ان کی صحت بہت اچھی تھی، پٹیالہ اینڈ ایسٹ پنجاب اسٹیٹس یونین کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر میں ارشاد فرمایا۔

"بہت سے لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ حیدرآباد میں کیا ہونے والا ہے؟ سوال کرنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جوناگڑھ میں تقریر کرتے ہوئے میں نے بالفاظ واضح کہہ دیا تھا کہ اگر حیدرآباد ٹھیک طرح راہِ راست پر نہ آیا تو اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو جوناگڑھ کا ہو چکا ہے، یہ الفاظ اپنی پوری معنویت کے ساتھ اب بھی قائم ہیں، اور میں نے جو کچھ کہا تھا میں اب بھی اس پر پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ قائم ہوں۔"

سردار کے اس اعلان نے ملک میں ایک نئی فضا پیدا کر دی اور حیدرآباد میں تو

تہلکہ بر پا ہو گیا۔

اب حیدرآباد جنگ کے دہانہ پر کھڑا تھا، قدرتاً اس موقع پر افواج حیدرآباد کے سپہ سالار اعلیٰ جنرل العیدروس زیادہ نمایاں ہوئے۔

یہ تھے کمانڈر انچیف العیدروس

تقریباً چھ فٹ کے قد اور چوڑے شانے والے جنرل العیدروس ایک ممتاز اور نمایاں شخصیت کے مالک تھے، ڈرائنگ روم کی گفتگو میں وہ صرف ایک سپاہی نظر آتے تھے، ان کے انداز و اطوار میں ایک خاص قسم کی دل کشی تھی، سوشل طور پر وہ بہت مقبول تھے، ان سے اور ان کی بیوی سے متعدد تقریبات کے موقع پر دکھشناسدن میں مجھے ملاقات کے مواقع میسر آئے۔ میرے ساتھ ان کا برتاؤ بہت شائستہ اور خلیقانہ تھے۔

شروع شروع میں عیدروس کے تعلقات مجلس اتحاد المسلمین کے ساتھ حد درجہ دوستانہ تھے، لائق علی تو غیر معمولی طور پر انھیں مانتے اور ان پر اعتماد کرتے تھے، جب تک عیدروس کو یہ امید رہی کہ گفت و شنید مصالحت کامیاب ہو گی، وہ مجلس اتحاد کو بھڑکی دیتے رہے، ان کی فوجی رائے جو حیدرآباد میں اور مجلس کے حلقوں میں عام طور پر مقبول اور تحسین کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی یہ تھی کہ ہندوستانی فوج نیا فوج ہے اور حیدرآباد چھ مہینہ تک تو بڑی آسانی سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے، لیکن اب کہ جنگ اپنے ہولناک چہرے سے نقاب الٹ رہی تھی، عیدروس کی خود اعتمادی بھی متزلزل ہونے لگی تھی۔

جو رپورٹ مجھے ملی وہ اگر صحیح تھی تو اب لائق علی انھیں نا وفادار سمجھنے لگے تھے، مجھے بتایا گیا کہ لائق علی عیدروس کو برطرف کرنے کا تہیہ کر چکے تھے، لیکن وہ صرف پاکستان کے فوجی ماہرین تھے جنھوں نے ایسے نازک مرحلہ پر اتنا دور رس قدم اٹھانے سے لائق علی کو باز رکھا۔

اور اب کہ حیدرآباد اور بھارت کی فوجیں سرحد پر آمنے سامنے پڑی تھیں عیدروس کو احساس ہوا کہ اپنی فوج کا حوصلہ قائم رکھنے کی جد و جہد کریں جیسے رضاکاروں کے

غیر ذمہ دارانہ اطوار نے کمزور کر دیا تھا۔ ان رضا کاروں کا حال یہ تھا کہ کوئی غیر مسلم عورت سڑک پر آزادی کے ساتھ چلنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی، اور اگر ایسا کرتی تو بے آبرو ہونے سے نہیں بچ سکتی تھی۔

میرا لڑکا رضا کاروں کے نرغہ میں

مئی کے آغاز میں رضا کاروں کی شقاوت اور سفاکی نے ذاتی طور پر مجھے کئی گھنٹے تک حواس باختہ کیا، میرا لڑکا جگدیش اپنی بیوی کے ساتھ چند روز میری معیت میں بسر کرنے کے ارادہ سے حیدرآباد آیا، یہ دونوں بنگلور سے بمبئی جا رہے تھے کہ حیدرآباد کے آخری اسٹیشن گنگاپور پر کسی نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روک دی، فوراً ہی رضا کاروں نے حملہ شروع کر دیا، بہت سے مسافر لوٹ لئے گئے، اور ان کے ساتھ نہایت ہی بیہودہ برتاؤ کیا گیا، گیارہ آدمی سنگین طور پر مجروح ہوئے، دو آدمی قتل کر دیئے گئے، تیرہ لاپتہ ہو گئے، جن میں چار عورتیں اور دو لڑکے بھی تھے، بڑی مشکل سے ڈرائیور گاڑی کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہو سکا،

اس ٹرین پر حملہ کی جب مجھے اطلاع ملی تو میرے دل کی حرکت بند ہوتے ہوتے رہ گئی اگر حملہ آوروں نے جگدیش کو پہچان لیا تو باپ کی سزا بیٹے کو دیئے بغیر ہرگز نہیں رہیں گے، خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا، ٹرین جب شولاپور پہنچی تو ملٹری آفیسر نے مجھے تار دیا کہ جگدیش خیریت کے ساتھ بھارت کے علاقہ میں داخل ہو گیا۔

رضا کاروں سے عیدروس کی اَن بَن

رضا کاروں کی عام سرگرمیوں سے قطع نظر عیدروس کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ رضا کار اس کی فوجی تدبیروں میں بھی دخل دیتے تھے، رضوی اور عیدروس کے مابین تلخی کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب کرنل گراہم (COLON. GRAHAM) جو عیدروس کے بڑے گہرے دوست تھے، میرے پاس آئے، کرنل گراہم میوک گارڈ کے انچارج تھے۔ یہ اب حیدرآباد میں رہنے پر تیار نہیں تھے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ہرگز حیدرآباد میں اس وقت تک رہنے پر تیار نہیں ہیں جب تک رضوی کی

سرگرمیوں پر پابندیاں نہ عائد کر دی جائیں، اور آرم ایکٹ نافذ نہ کر دیا جائے جس کی رو سے بغیر لائسنس ہتھیار کا استعمال کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے، اور چونکہ ایسا نہیں ہو سکتا لہذا وہ انگلستان واپس جا رہے ہیں۔

یادش بخیر کرنل گراہم

کرنل گراہم ایک دلکش شخص ہیں، دوسری جنگِ عظیم میں اٹلی کے مورچہ پر دادِ شجاعت دے چکے ہیں، انھوں نے کئی سر برآوردہ اطالوی افسروں کو گرفتار کیا، ان سے جو ریوالور چھینے تھے ان میں سے ایک یادگار کے طور پر ہمیشہ اپنے پاس رکھتے تھے، یہ ریوالور بھی وہ اپنے ساتھ لائے تھے

"اگر اسے اپنے ساتھ بمبئی لے گیا تو یہ ضبط کر لیا جائے گا" کرنل گراہم نے کہا "کیا آپ از راہِ کرم اسے قبول کر لیں گے؟ اگر کبھی ہم دونوں ملے تو مجھے خوشی ہوگی۔ اگر آپ اسے واپس کر دیں"

میں نے وعدہ کر لیا۔

کرنل گراہم جب انگلینڈ جانے لگے، میں نے حکومت بمبئی سے استدعا کی کہ ان کی آسائش کا پورا پورا خیال رکھا جائے، اور انھیں ذرا بھی پریشان نہ کیا جائے حکومت بمبئی نے میری استدعا پر عمل کیا، اس نے نہ صرف کرنل گراہم کی مہمانداری کی بلکہ رخصتی تحفہ کے طور پر وہ ریوالور بھی واپس کر دیا جو انھیں بہت عزیز تھا اور جسے میرے پاس امانت کے طور پر وہ رکھوا گئے تھے۔

رضوی اور عیدروس میں کھٹ پٹ

عیدروس رضوی کی پیہم مداخلتوں سے بہت عاجز اور برہم تھے، وہ سیدھے نظام کے پاس پہنچے اور ان سے مطالبہ کیا یا تو رضاکاروں کی جماعت توڑ دی جائے ورنہ ان کی تحویل میں دے دی جائے، انھوں نے لائق علی سے مطالبہ کیا کہ سڈنی کاٹن جتنا اسلحہ لایا ہے وہ بھی ان کے حوالے کر دیا جائے ——— نظام عیدروس کا مطالبہ نہ مان سکنے پر مجبور تھے، اور لائق علی کسی طرح بھی اسے ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

میرا ایک کارنامہ اگست کے شروع میں ریونڈر ڈبلو، لی کالوٹ ایڈورڈس (REV.W.Le cotoEDWARDS) چرچ آف سار متحدہ انڈیا کے سربراہِ اعلیٰ میرے پاس تشریف لائے، میں نے سوچا، حکومتِ نظام کے پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب اگر صاحب موصوف سے حاصل ہو جائے، تو غیر ممالک میں ہندوستان کا کیس کافی مضبوط ہو سکتا ہے، کیونکہ ان کی حیثیت ایک غیر جانبدار اور مقدس شخص کی ہے۔

میری تجویز پر صاحب موصوف نے ایک مکتوب مورخہ ۵ راگست ۱۹۴۸ء کو میرے حوالے کیا، جو مشنری سوسائٹیز کے صدر دفتر کو لکھا گیا تھا، اس خط کے مندرجات تین حصوں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) لاقانونی کے عام واقعات حیدرآباد میں۔

(۲) علانیہ مقابلے اور ہنگامہ آرائیاں۔

(۳) مستحکم بنیادوں پر بغاوت کی تیاریاں۔

ان عنوانات سے متعلق بہت سی مثالیں اس مکتوب میں درج تھیں۔

اس مکتوب کی ایک نقل میں نے محکمۂ امور ریاست کو بھیج دی، اور اصل خط برطانیہ میں ہندوستان کے ہائی کمشنر کو ارسال کر دیا۔

پرنس آف برار اور عید روس میں چل گئی نظام کے بڑے بیٹے پرنس آف برار حیدرآبادی افواج کے سپریم کمانڈر انچیف تھے وہ تساہل پسند شخص تھے، اور فوجی امور سے نہ کوئی لگاؤ رکھتے تھے نہ دلچسپی، لیکن اب یک بیک وہ چوکس نظر آنے لگے، اور فوجی صدر دفتر میں وقت بے وقت موجود پائے جانے لگے، یہ ایسا "معجزہ" تھا جو اس سے پہلے کبھی ظہور میں نہیں آیا تھا، ۳ راگست کو انھوں نے جنرل عید روس کے نام فرمان صادر کیا کہ اپنے فوجی منصوبوں کی ایک نقل فراہم کریں، تاکہ وہ بطور خود حالات کا اندازہ لگا سکیں۔

اس فرمان نے عید روس کو ہکا بکا کر دیا، انھوں نے وعدہ کیا کہ جلد تعمیل ارشاد کی

جائے گی، پھر سیدھے لائق علی کے پاس پہنچے کہ ان کا حکم کیا ہے؟ انھوں نے کہا ایسا ہرگز نہ کرنا۔

پرنس آف برار نے غیظ و غضب سے بھرا ہوا ایک خط لائق علی کو لکھا، اور ان کی اس روش پر سخت احتجاج کیا، انھوں نے لکھا اگر جنرل عیدروس نے فوراً تعمیل حکم نہ کی تو یا تو بحیثیت ماتحت کے انھیں رخصت ہونا پڑے گا، یا پھر میں خود ہی اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔

پرنس آف برار کے اس الٹی میٹم کے پیش نظر جنرل عیدروس نے ۱۴ اگست کو اپنا استعفا براہ راست وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پرنس نے پھر احتجاج کیا، جنرل کو ہرگز یہ حق نہیں تھا کہ وہ اپنے افسر اعلیٰ کو نظر انداز کر کے براہ راست وزیر اعظم کے پاس پہنچ جائے، استعفا ان کے ذریعہ پیش ہونا چاہیے، جنرل نے اب اپنا استعفا پرنس کو بھیج دیا، لیکن لائق علی نے پرنس کو اطلاع دے دی کہ جنرل عیدروس کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔

نظام اور پرنس آف برار

نظام نے پرنس آف برار کو ایک خط لکھا کہ وہ فوجی معاملات میں دخل نہ دیں، اس کے جواب میں پرنس نے استعفا دے دیا، لائق علی نے نظام سے مشورہ کیا، پھر یہ تمام باتیں پردہ میں چھپا دی گئیں۔

لیکن شام ہی کو آل انڈیا ریڈیو کے نشریہ میں سب سے پہلی خبر انہی استعفوں کی تھی۔ اس خبر کا نشر ہونا تھا کہ سارے حیدرآباد میں بے حوصلگی کی فضا پیدا ہو گئی، لائق علی کی بر ہمی قابل دید تھی۔

نظام کا ایک اور فرزند سعادت مند

اگست کے آغاز ہی میں پرنس معظم جاہ نے جو نظام کے محبوب بیٹے تھے باپ کو ایک خط لکھ کر الزام لگایا کہ وہ حیدرآباد کو تباہی کے راستہ پر لئے جا رہے ہیں، انھوں نے پانچ کروڑ روپئے کا مطالبہ کیا، تاکہ وہ حیدرآباد چھوڑ کر بھارت چلے جائیں اور وہیں رہیں معظم جاہ نے لکھا تھا۔

"ماؤنٹ بیٹن ہمارا دوست تھا، لیکن وہ بد دل ہو کر رخصت ہوا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن

حیدرآباد کے بہترین دوست تھے، آپ نے انھیں دشمن بنالیا۔ مسٹر منشی دوست کی حیثیت سے یہاں آئے تھے، میں انھیں سر اکبر حیدری کے زمانہ سے جانتا ہوں، ان سے بڑی مدد مل سکتی تھی، لیکن آپ نے ان کی دوستی بھی دشمنی سے بدل دی۔ میں پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ نے انھیں بھی دشمن بناکر چھوڑا۔ اگر آپ انڈین یونین سے معاملات روبراہ کریں تو حیدرآباد عافیت کی زندگی بسر کرے گا، حیدرآباد محفوظ رہے گا۔ اور آصفیہ خاندان باقی رہے گا۔"

پنگل وینکٹ راما ریڈی حیدرآباد کے نائب وزیر اعظم نے آرام کی ضرورت محسوس کی اور بنگلور چلے گئے۔

اب رضوی گروپ کے سامنے ایک بڑا مرحلہ یہ تھا کہ نظام کو لائق علی منسٹری کے برخاست کرنے سے روکے!۔

کنگ کوٹھی میں طوفان

ہوش اور نظام

نظام نے جب یہ دیکھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن گئے اور سر والٹر ناقابل حصول ہو گئے ہیں تو انھیں وہ خطرہ نمایاں طور پر نظر آنے لگا، جو ان کے ارد گرد منڈلا رہا تھا، اب انھوں نے اس زندان کو توڑنے کی آخری کوشش کی جو اپنے لئے خود ہی انھوں نے تعمیر کیا تھا۔

اس سلسلہ میں پہلا کام یہ کیا کہ ہوش سے صاف صاف باتیں کیں، دو گھنٹے کی اس طویل گفتگو میں ہوش نے مشورہ دیا کہ وہ مجھ سے ملیں، وزارت بدل دیں، ہندوستان سے الحاق کریں، نئی دہلی سے فوجی اعانت اور پشت پناہی حاصل کر کے رضاکار تحریک کو ختم کر دیں ——— اس ملاقات اور گفتگو نے نظام کے اعصاب کو مفلوج و معطل کر دیا۔

سر مرزا اسماعیل پردہ کے پیچھے!

ہوش یار جنگ نے سر مرزا اسماعیل سے رابطہ قائم رکھا، اور انھیں حالات کی رفتار سے برابر مطلع کرتے رہے، سر مرزا نے مشورہ دیا کہ حیدرآباد کا معاملہ مجلس اقوام متحدہ میں ہرگز پیش نہیں ہونا چاہیئے۔

اس موقع پر نظام نے علی یاور جنگ کو طلب کیا، جو الگ تھلگ حالات کے تماشائی بنے بیٹھے تھے، نظام نے انھیں ترغیب دی کہ مجلس اقوام متحدہ میں حیدر آباد کا کیس پیش کریں۔ انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"حیدر آباد میں جب تک مکمل طور پر مطلق العنانی رائج ہے اور رضا کار اپنے طرزِ عمل میں آزاد ہیں اس وقت تک میں مجلس اقوام متحدہ کا سامنا نہیں کر سکتا"

علی یاور جنگ کی ساز باز

اسی اثنا میں علی یاور جنگ کا مجھے پیام ملا، کہ نظام موجودہ وزارت بدلنے کے لئے تیار نہیں، لیکن یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا حکومتِ ہند اس طرح کا اعلان کرنے پر تیار ہے کہ وہ لائق علی وزارت سے گفت و شنید جاری رکھنے پر تیار نہیں ہے؟ میں نے جواب دیا، پنڈت جی اس طرح کا اعلان پہلے ہی کر چکے ہیں، کہ لائق علی وزارت سے وہ کسی طرح کی بات چیت کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔

عین اس وقت جب مسلح تصادم کے امکانات روشن تر ہوتے جا رہے تھے، سات بہادر مسلمانوں نے جو زیادہ تر پنشنر اصحاب پر مشتمل تھے، ایک بیان شائع کیا، جس میں رضا کاروں کی سرگرمیوں پر تلخ نکتہ چینی کی گئی تھی، اور انڈین یونین سے حیدر آباد کے الحاق کی زبردست تائید کی گئی تھی، اس بیان نے ایک طوفانی کیفیت پیدا کر دی، بہت سے لوگوں نے تند و ترش لہجہ میں اس پر نکتہ چینی کی بعض نکتہ چینوں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ آخر اس بیان کے پس پشت کونسا جذبہ کام کر رہا ہے؟ کس کی تحریک پر یہ دیا گیا ہے؟ ایک بیٹے نے اپنے باپ کو —— جس کے اس بیان پر دستخط تھے —— میر جعفر کا خطاب تک دے ڈالا، یہ تفصیل علی یاور جنگ نے اپنی کتاب —— (Hyderabad in retrospect) —— میں قلمبند کی ہے۔

لائق علی اور مجلس اتحاد المسلمین نے اس بیان پر بہت برہمی کا اظہار کیا، اور مطالبہ کیا کہ ایسے لوگوں کی پنشن ضبط کر لی جائے، لیکن نظام نے کہا، انھیں معاف کر دینا چاہیئے، جس سے کارپردازانِ مجلس کو یقین ہو گیا کہ اس بیان کی پشت پر اعلیٰ حضرت کی دعائے خیر و برکت کام کر رہی ہے۔

سر مرزا اسمٰعیل نظام کے ایلچی بنکر دہلی گئے

اس شبہ نے اور زیادہ تقویت حاصل کرلی، جب نظام نے سر مرزا اسمٰعیل سے مدد چاہی، وہ دہلی گئے، اور گورنر جنرل راج گوپال آچاری کے مہمان کی حیثیت سے کئی روز مقیم رہے، اور یہ تاثر لے کر آئے کہ نئی دہلی کا رویہ اب حیدرآباد کے بارے میں بہت سخت ہوگیا ہے، گفت وشنید کا سررشتہ اب تمام تر صرف سردار کے ہاتھ میں ہے، اور اب ماؤنٹ بیٹن کے مسودہ مفاہمت کی بنیاد پر گفت وشنید کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

خطرہ کی سنگینی محسوس کرکے سر مرزا نے، جو بہرحال نظام کے دوست تھے، مشورہ دیا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن ڈرافٹ پر دستخط کردیں، خواہ وزراء سے مشورہ لئے بغیر ہی ایسا کیوں نہ کریں۔ سر مرزا نے یہ اطمینان بھی دلایا کہ اگر ضرورت ہوئی تو انڈین یونین کی فوجیں فوراً مدد کو پہنچ جائیں گی۔

سر مرزا کا یہ خطاب کر نواب زین یار جنگ حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل متعینہ نئی دہلی حیدرآباد آئے، جنھیں پہلے ہی غدار قرار دیا جاچکا تھا۔

۲۹ جولائی کو سر مرزا نے پھر ایک تار بھیجا کہ حالات حد درجہ نازک ہوچکے ہیں، لائق علی کو فوراً دہلی آنا چاہیئے اور سمجھوتہ کی کوشش کرنی چاہیئے، ہوش یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ لائق علی وزارت بہت جلد برخاست کردی جائے گی۔

اتحادی حلقوں میں اضطراب پیدا ہوا، یہ ہوش سے نفرت کرتے تھے، نہ صرف ہوش سے بلکہ سر مرزا اور زین یار جنگ سے بھی، ان کا خیال تھا یہ لوگ درپردہ حکومتِ ہند سے مفاہمت کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں، انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ دہلی کا مطالبہ ہے کہ لائق علی وزارت برطرف کردی جائے، اور یہ کہ نظام اس مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو تیار ہیں۔

اتحاد المسلمین کی جارحانہ کارروائیاں

مجلس اتحاد نے فوراً جارحانہ کارروائیاں شروع کردیں ایک اتحادی اخبار "پرچم" نے براہ راست نظام پر الزام لگایا کہ وہ اپنی وزارت کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ رضاکاروں کی برہمی اور بڑھ گئی،

وہ تلواریں چمکاتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے؛ زین یار جنگ کو واضح الفاظ میں بتا دیا گیا کہ اگر نظام نے حکومتِ ہند سے مدد لینا چاہی، تو حکومتِ ہند سے مدد کے خواستگار نظام کا وجود ہی نہیں باقی رہے گا تا کہ وہ مدد لے سکے۔

لائق علی کا چیلنج

۲ راگست کو حیدر آباد لیجسلیٹو اسمبلی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے لائق علی نے انڈین یونین کو چیلنج کیا۔

"ہم نے ہر پہلو کو جانچ لیا ہے، اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانی خون بہانے کو روکنے کے لیئے اور انسانی جان بچانے کے لیئے ہمیں کسی اقدام سے گریز نہ کرنا چاہیئے، حیدر آباد نے طے کر لیا ہے کہ وہ مجلس اقوام متحدہ میں اپنا کیس پیش کرکے رہے گا اور امید ہے کہ اس طرح موجودہ تعطل کا پُرامن حل دستیاب ہو جائے گا"

اس تقریر میں لائق علی نے حکومتِ ہند کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:-

"حکومتِ ہند ہمیں ہدفِ ستم بنا سکتی ہے، وہ ہم پر بے محابا ظلم توڑ سکتی ہے، وہ اپنی فوجی طاقت سے ہمیں پامال کر سکتی ہے، لیکن ہم اپنے موقف سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتے، ہم آزادی سے دست بردار نہیں ہو سکتے، بڑی بڑی کٹھنائیوں سے حیدر آباد سرخرو ہو کر نکلا ہے، پہلے سے زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ پہلے سے زیادہ قوت ور ہو کر، اخلاقی اور مادی اعتبار سے توانا اور مضبوط تر، کہیں زیادہ منظم اور مستحکم، اور اب بھی اسے اپنا مستقبل ہمیشہ سے زیادہ تابناک اور روشن نظر آ رہا ہے"

نظام لائق علی سے بگڑ گئے

نظام ریڈیو نہ صرف سر مرزا کو اور زین یار جنگ کو غدار قرار دے رہا تھا، بلکہ اعلان کر رہا تھا کہ لائق علی اس وقت تک دہلی سرزمین پہ قدم نہیں رکھیں گے، جب تک باعزت مفاہمت کا امکان روشن نہ نظر آئے نظام ریڈیو نے اس بات کی بھی تردید کی کہ سر مرزا نظام کی طرف سے دہلی میں گفت و شنید کر رہے ہیں۔

لائق علی کی تقریر نے نظام کو برانگیختہ کر دیا، اب وہ میدان میں آنے پر تیار ہو گئے، وہ اپنے وزیر اعظم کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے، نئی وزارت کی تشکیل پر انھوں نے ہوش سے مشورہ کیا، انھوں نے سر مرزا کے نام دو خط لکھے، ایک سرکاری، دوسرا نجی، جس میں استدعا کی گئی تھی کہ وہ فوراً حیدرآباد آئیں۔

سر مرزا کا مجھ سے مشورہ

سر مرزا نے فون پر اس پیش کش سے متعلق مجھ سے مشورہ طلب کیا، میں نے کہا، نظام نئی وزارت بنانے کا فیصلہ کر چکے ہیں، انھیں فوراً حیدرآباد آنا چاہیئے، شام کو ہوش نے مجھے اطلاع دی کہ سر مرزا نہیں آئیں گے، کیونکہ ان کی زندگی کو خطرہ ہے۔

مجلس اتحاد کے پیچ و تاب کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نظام کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بیدر میں ایک متوازی حکومت قائم کر دی جائے، بے حوصلگی اپنے تمام مراحل طے کر چکی تھی۔

۳ تاریخ کو نظام نے لائق علی سے کہا۔

"تم نے مجھے برباد، اور ریاست کو تباہ کر دیا۔"

لائق علی نے فوراً استعفا پیش کر دیا، اس استعفا نے نظام کو جوشِ مسرت سے سرشار کر دیا، ۴ر اگست کو لائق علی اور رضوی نے مشترک طور پر نظام سے ملاقات کی - اس ملاقات نے نظام کو ایک مرتبہ پھر بدل دیا، اور اس نے نعرہ لگایا۔

"کچھ بھی ہو میں کسی قیمت پر بھی ماؤنٹ بیٹن ڈرافٹ پر دستخط نہیں کروں گا۔"

خطرہ ٹل گیا۔

لائق علی کو فتح حاصل ہو گئی۔

اس گفتگو میں لائق علی نے نظام سے نہایت فروتنی اور عاجزی کے ساتھ کہا تھا۔

"اگر اعلیٰ حضرت نے ماؤنٹ بیٹن ڈرافٹ پر دستخط کر دیئے تو فوج، پولیس رضاکار، سب قابو سے باہر ہو جائیں گے، اور ہم تحفظ جان کی ذمہ داری نہیں لے سکتے۔"

رضوی نے فوراً ایک انتباہی اعلان شائع کیا:

"اگر کوئی ہاتھ ریاست کے خلاف اٹھا، وہ کاٹ ڈالا جائے گا، نہ صرف وہ ہاتھ قطع کر دیا جائے گا، بلکہ وہ ہاتھ بھی جو اس کی تائید میں ہوں گے۔"

لائق علی سے میری ملاقات

۹ اگست کو لائق علی پھر نہایت اطمینان سے وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر متمکن تھے، انھوں نے شاہ منزل میں مجھے ڈنر پر مدعو کیا، مقصد یہ تھا کہ مجھے باور کرایا جائے، استعفا کے بارے میں جو خبریں اڑ رہی تھیں بے بنیاد تھیں۔

لائق علی دیر تک اپنے اور نظام کے تعلقات کی صفائی دیتے، اور سر مرزا کو ملاحیاں سناتے رہے، پھر انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں کہا

"ہمیں تصادم سے بہر حال گریز کرنا چاہیئے، میں چاہتا ہوں آپ اس سلسلہ میں میری مدد کریں۔"

لائق علی نے جب کبھی بھی مجھ سے مدد چاہی اپنی آستین میں دشنہ پنہاں رکھ کر، حیدرآباد میں یہی تجربہ میں نے حاصل کیا تھا۔

"جب آپ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے مصالحت کی بات چیت کر رہے تھے، تو آپ نے استدعا کی تھی کہ میں اپنا وزن مفاہمت کے خلاف نہ استعمال کروں" میں نے کہا میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور کوئی ایسی بات نہیں کی، لیکن آپ ہی نے اس سمجھوتہ کو سرسبز نہ ہونے دیا، اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ میری حکومت آپ کی وزارت پر ذرا بھی اعتماد نہیں کرتی۔"

لائق علی نے کہا "مسٹر منشی جب تک میں زندہ ہوں کسی طرح بھی دستاویز الحاق پر اپنے آپ کو دستخط کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔"

میں نے جواب دیا "ذرا ان تباہ کن نتائج پر بھی غور کر لیجیے، جو آپ کے اس بے لچک طرزِ عمل سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔"

یہ سن کر لائق علی نے آسمان کی طرف دیکھا، اور جذبۂ شہادت سے سرشار ہو کر کہا۔

ایک چیز ابھی باقی ہے ـــــ شہادت، قربانی!"

"نظام سے ملیئے" لائق علی کی ہدایت

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اندازہ کرلیا کہ لائق علی کا اندازِ فکر کیا ہے؟"

۱۰ اگست کو لائق علی نے اصرار کیا کہ نظام سے تقریبِ عید کے سلسلہ میں ملاقات کر دوں، یا کم از کم انھیں تہنیتی پیام بھیج دوں، ـــــ،

میں نے جواب دیا، "نظام نے میرے ساتھ اب تک جو خلاف اخلاق رویہ میرے حیدر آباد میں قدم رکھنے کے دن سے اختیار کر رکھا ہے اس کی روشنی میں میرے لئے ناممکن ہے کہ ایسا کرسکوں!"

یہ جواب دے چکنے کے بعد پھر بھی احتیاطاً میں نے فوراً ہی سردار کو فون کر کے اس سلسلہ میں ان سے ہدایات طلب کئے، اور ان کے حسب ہدایت لائق علی کو مطلع کر دیا۔

"نظام سے ملاقات صرف اسی طرح ممکن ہے کہ وہ خود ملنے کی خواہش ظاہر کریں، ورنہ بطور خود انھیں عید کی مبارکباد دینے، یا ملاقات کی استدعا کرنے، یا تہنیتی خط لکھنے پر میں آمادہ نہیں ہوں، کیونکہ اس طرح میرے بارے میں غلط فہمیاں پیدا ہوسکتی ہیں!"

بے حوصلگی خود ہمارے کیمپ میں

ہندو ملازموں کی بھگدڑ

حیدرآباد میں حکومتِ ہند کے ملازمین کی تعداد آٹھ سو سے کم نہ تھی، ان میں سوا دو سو کے قریب غیر مسلم اور غیر حیدرآبادی تھے، یہ سب سخت دہشت اور سراسیمگی کے عالم میں تھے، ان کے ایک وفد نے مطالبہ کیا کہ حیدرآباد سے ان کا انخلا کر دیا جائے، ان کا کہنا تھا ہم یہاں حکومت کی خدمت کے لئے آئے ہیں نہ کہ جان دینے اور مرنے، محکمۂ ڈاک و تار کے ملازمین نے تو ایک بالکل ہی نیا شوشہ چھوڑا، ان کا مطالبہ تھا کہ ان کے دفاتر بند کر دیئے جائیں۔

اطلاعیں مل رہی تھیں کہ حکومتِ نظام بہت جلد محکمۂ ڈاک، تار، ٹیلی فون اور مواصلات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گی، ٹیکنیکل افراد کا خیال تھا کہ اس صورت میں انھیں حکومتِ ہند کے خلاف کام کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

اسی اثنا میں رضاکار ٹولیوں کو اس بات کی کھلی چھٹی دیدی گئی تھی کہ ہندو مملوں میں "دشمن" کے ساتھ وہ جس طرح کا برتاؤ چاہیں روا رکھیں، رضاکاروں کے نام گشتی خطوط و ہدایات جاری کئے گئے تھے کہ تمام غیر وفادار عناصر کا خاتمہ کر دیں۔

میری یقین دہانی

میں نے حکومتِ ہند کے ملازمین کو اطمینان دلایا کہ وہ دہشت زدہ اور سراسیمہ نہ ہوں، ان کے تحفظ مال و جان کے لیے میں جو بیٹھا ہوں، لیکن میری باتیں ان کے ہراس میں کمی نہ کر سکیں، میں نے انھیں باور کرایا کہ انتظامات کر لیے گئے ہیں کہ اتنے آدمی جو پانچ طیاروں میں سما سکیں، یہیں حیدرآباد میں ہنگامی حالات کے دوران میں رہیں گے، اور جیسے ہی نازک صورتِ حال پیدا ہوئی انھیں طیاروں میں بٹھا کر محفوظ مقامات پر بھیجدیا جائے گا۔

ہند و ملازمین کی ہم پر بے اعتمادی

"فوجی تصادم سے پہلے آپ تو پرواز کر جائیں گے اور ہمیں یہاں مرنے کے لیے چھوڑ جائیں گے"

حیدرآباد میں مقیم ملازمین حکومتِ ہند کے وفد نے کہا۔

میں نے ان سے عہد کیا کہ جب تک ان لوگوں میں سے ایک ایک آدمی کا انخلا عمل میں نہ آجائے گا، میں حیدرآباد سے باہر قدم نہیں نکالوں گا، اب جا کر یہ لوگ ذرا مطمئن ہوئے، میں نے سردار سے اپنے اس عہد کا ذکر کیا، اور عرض کیا خواہ کچھ بھی ہو ایسے حالات نہیں پیش آنے چاہئیں کہ میں اپنے عہد پر عمل نہ کر سکنے پر مجبور ہو جاؤں۔

ہند و ملازمین کا ناقابل برداشت بوجھ

حکومتِ ہند کے ان افسران و حکام کا وجود میرے لئے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن گیا تھا، میں نے ہیڈ وزیر کس کو ایک قلعہ بند کیمپ میں تبدیل کر دیا، جہاں چند روز کا راشن بھی ذخیرہ کر لیا گیا، تاکہ اگر محاصرہ کی کیفیت پیدا ہو تو حالات کا مقابلہ کیا جا سکے۔

بہت بڑا المیہ

بہت بڑا المیہ یہ تھا کہ خود میرے ذاتی اشاف کے اندر بھی بے حوصلگی عروج پر تھی، تین پولیس افسروں میں سے دو میرے پاس آنسو بہاتے ہوئے آئے اور التجا کی کہ انھیں رخصت دیدی جائے، اگرچہ ان لوگوں کے اس بیہودہ طرز عمل سے میں سخت آشفتہ خاطر تھا، اور قطعاً ان کی یہ التجا رد کر دیتا، لیکن یہ سوچ کر کہ اس طرح یہ میرے اشاف کے دوسرے افراد میں بھی سراسیمگی پیدا کر دیں گے، میں نے انھیں رخصت کر دینے ہی میں عافیت سمجھی، یہ ایک بروقت اقدام تھا۔ زائد اشاف کا میں نے دوسری جگہ تبادلہ کرا دیا۔

اور جو اسٹاف رہ گیا تھا، اس کے کنبوں کو ان کے وطن میں بھیج دیا۔

میں نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو اڑیسہ واپس کر دیا۔

میجر سنگھ سے پوچھا "کیا آپ بھی جانا چاہتے ہیں؟"

اس وفادار سکھ افسر نے جواب دیا۔

"میری ڈیوٹی یہ ہے کہ آپ کے ساتھ رہوں، میں بھلا کہاں جا سکتا ہوں؟ میں تو ہمہ وقت آپ کے ساتھ ہی رہوں گا۔"

ایک امریکی صحافی

اس مرحلہ پر "سہا" میرے پاس آیا، یہ ایک امریکی صحافی تھا، جسے میں دہلی سے جانتا تھا، یہ ان امریکیوں میں تھا جن کا عقیدہ ہے کہ دنیا کے ہر معاملہ میں اپنی ٹانگ اڑانے کا انھیں حق حاصل ہے۔ یہ نہایت چالاک شخص تھا، یہ برابر مجھ سے ملتا رہا، لیکن لائق علی اور رضوی سے بھی مسلسل ملاقاتیں کرتا رہا، جب کبھی بھی یہ مجھ سے ملنے آتا، غایت درجہ بے تکلفی سے میرے بٹن پر انگلی رکھ کر مجھے "کے، ایم" کہکر مخاطب کرتا، پھر فرمائش کرتا کہ میں یہ کروں، وہ کروں، ایسا کروں، ویسا کروں، بہر حال تھا دلچسپ آدمی۔

بیوی کے نام آخری سربمہر خط

دس اگست کے بعد میں نے اپنے بہت سے کاغذات اور فائل بمبئی بھیجدیئے، ان میں میرا ایک سربمہر لفافہ بھی تھا، جو بیوی، بچوں کے نام الوداعی خطوط پر مشتمل تھا، اس میں میری ذاتی ڈائری کے چند ورق بھی تھے، میں نے این ایم اے جوائنٹ سکریٹری محکمہ امور خارجہ کو لکھا تھا کہ اگر جنگ حیدرآباد میں، میں کام آجاؤں تو یہ خطوط اور کاغذات میری بیوی کو سونپ دیئے جائیں۔

میری ڈائری کے چند اوراق

اپنی بیوی کے نام، ... کی معرفت میں نے جو خط اور کاغذات بھیجے تھے، ان میں میری ذاتی ڈائری کے چند اوراق بھی تھے، جو یہ تھے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۸ء

آج صبح ریڈیو پر میں نے راجہ جی کی آواز سنی۔

ہمارا دفتر نظام، پرنس آف برار، معظم جاہ، اور بسالت جاہ کو یوم آزادیٔ ہند کی تقریب پر مدعو کرنا بھول گیا، تلافی کے طور پر میں نے ذاتی خطوط حکمران حضرات کو مدعو کیا۔

میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں جھنڈے کو سلامی دینی تھی۔

تین بجے سہ پہر سے مہمان آنا شروع ہو گئے، میں نیچے اترا تو جنرل اور مسز عیدروس، تین دوسرے احباب سے ملاقات کی، اس موقع پر پانچسو کے قریب مہمان تشریف فرما تھے۔

گیان کماری نے دوسروں کے ساتھ مل کر "جانا گانا، مانا" گایا۔

پھر ہم شامیانہ میں آئے، العیدروس، بیگم عیدروس، دین یار جنگ، اثر علی یاور جنگ یہاں موجود تھے، لائق علی اور معین نواز جنگ آئے، لیکن تاخیر سے۔

اسی اثنا میں اطلاع ملی کہ بعض کانگریسیوں پر رضاکاروں نے حملہ کیا ہے، جو ٹرین سے اس تقریب میں شرکت کے لئے آرہے تھے، ان میں دو زخمی کانگریسی ڈرائنگ روم میں پہنچا دیئے گئے، میں گیا اور ان سے ملا۔ ایک سنگین طور پر مجروح تھا، خون اب تک رس رہا تھا، عیدروس، دین یار جنگ، پنگل ریڈی بھی انہیں دیکھنے آئے؛ اور ان کے بارے میں تحقیق احوال کرنے لگے "۱۴۸"، امریکی صحافی نے کیمرہ سنبھالا، اور فوٹو لینے لگا۔

اس حادثہ نے تقریب کی ساری خوشی خاک میں ملادی، لائق علی اور معین نواز جنگ زخمیوں کو دیکھنے نہیں آئے، لیکن دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے، کچھ لوگوں نے لائق علی کو گھیر لیا۔ اور حادثہ کے بارے میں برہمی کے ساتھ بازپرس کرنے لگے، لیکن میں نے اس الجھن سے لائق علی کو بچا لیا۔

رات کو مجھے فون ملا کہ گائیکواڑ (مہاراجہ بڑودہ) مجھ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں، میں نے سردار کو فون کیا، انھوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا، چنانچہ دوسرے روز میں نے بمبئی جانے کا فیصلہ کرلیا۔

۱۶ / اگست ۱۹۴۸ء

سوا پانچ بجے سہ پہر کو میں بمبئی پہنچ گیا۔

اس موقعہ پر نہایت افسوس اور تلخی کے ساتھ ہز ہائی نس پرتاب سنگھ گائیکواڑ (مہاراجہ بڑودہ) کے معاملات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، میں نے بڑودہ کالج میں تعلیم حاصل کی تھی، اور مہاراجہ پرتاب کے دادا میرے بڑے مربی اور سرپرست تھے، مہاراجہ پرتاب سنگھ نے جب سیتا دیوی سے دوسری شادی کی تو مصائب میں مبتلا ہوگئے اور متعدد معاملات میں میری اعانت کے خواستگار ہوئے۔

پاکیزہ سرشت، نیک خو اور تساہل پسند مہاراجہ کو سوا گھوڑوں کے کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی، سیتا دیوی مکمل طور پر ان کی حاکم بالادست تھیں، یہ ایک معصوم بچے کی طرح ان کے اشاروں پر چلتے تھے، سیتا دیوی کے آوردوں میں سے جب کوئی شخص کسی کاغذ پر دستخط کے لئے کہتا، یہ بے چون وچرا دستخط کر دیتے۔

اس جگہ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بڑودہ کے الحاق میں میرا کافی حصہ تھا، اس موقع پر میں ۱۶ اور ۱۷ اگست کو بمبئی میں مقیم رہا، میں نے گائیکواڑ کی کافی مدد کی، اور وہ دیرینہ تلخی جوان میں اور سردار میں چلی آرہی تھی دور کر دی۔

۱۸ اگست ۱۹۴۸ء

ساڑھے دس بجے صبح بلارم ریذیڈنسی (حیدرآباد) پہنچ گیا، محکمہ ڈاک و تار کے ملازمین سخت دہشت زدہ تھے، ان کا ایک وفد مجھ سے ملنا چاہتا تھا، جس طریقہ پر وزارت امور ریاست نے مجھے اور میرے دفتر کو پیش آنے والے واقعات سے بے خبر رکھا تھا، وہ نہایت تکلیف دہ طرز عمل تھا، بچ نے مجھے بتایا کہ وہ راج کوٹ جا رہے ہیں، میں نے آیچ۔ ایم پٹیل کو فون کیا، انھوں نے کہا، محکمۂ ڈاک و تار کے ملازمین کا انخلا فوراً ممکن نہیں ہے، ایک ہفتہ سے پہلے اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

رات کو گفتگو کے دوران میں میجر سنگھ نے کہا کہ اگر ہم دونوں گرفتار ہو گئے، تو نندا اور آینگر سول انٹیلی جنس آفیسرس گرفتار بلا ہو جائیں گے، جو کام یہ کر رہے ہیں، اس کی بنا پر سفارتی مراعات سے انھیں محروم رہنا پڑے گا، یہ واقعی ایک سنگین خطرہ تھا میں نے فوراً ایک کانفرنس طلب کی، راجو نے تجویز پیش کی کہ میجر نندا اور آینگر کو فوراً رخصت پر بھیج دیا جائے، مجھے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ تھا، لیکن میں نے یہ ضروری سمجھا کہ ایسے کٹھن اور نازک مرحلہ پر اس اقدام کے جو نتائج ہوں گے انھیں بھی سامنے رکھنا چاہیئے، اور اس کا جو اثر ان لوگوں کے مستقبل پر پڑے گا، اسے بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے میں نے ان دونوں سے کہا، اگر آپ دونوں واقعی رخصت ہونا چاہتے ہیں تو بہتر یہ ہوگا کہ سرکاری طور پر کسی دوسری جگہ آپ کو چند روز کے بعد بھیج دوں گا۔

۱۹ اگست ۱۹۴۸ء

نندا اور آینگر میرے پاس آکر گویا ہوئے کہ ہم کہیں باہر جانے پر یہیں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، میں بہت خوش ہوا، میں نے کہا۔

اگر تم اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہو تو میں تمہارے لئے چھٹی کا بندوبست کر سکتا

ہوں، لیکن ایک دوست کی حیثیت سے میری خواہش یہ ہے کہ اپنی جگہ سے چپکے رہو، اور مستقبل کے ہندوستان کے لئے ایک روایت قائم کردو، ایسے معاملات وحوادث میں صرف ذاتی امور کو پیش رکھ کر کوئی فیصلہ مناسب نہیں۔

جنرل راجندر سنگھ جی نے فون پر مجھ سے استدعا کی کہ بیگم العیدروس کو پونا جانے کیلئے ضروری سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

سردار سے فون پر گفتگو ہوئی۔

ایک بجے دوپہر کو معین نواز جنگ کا ایک خط آیا جس میں لائق علی کا ایک خط بھی نتھی تھا، جو انھوں نے پنڈت جی کے نام تحریر کیا تھا، اور جس میں کہا گیا تھا کہ حکومتِ نظام اپنا مقدمہ ہے کر مجلس اقوام متحدہ میں جانے کا فیصلہ کر چکی ہے، میں نے فوراً پنڈت جی اور سردار کو وائرلس سے مطلع کر دیا، نظام گورنمنٹ نے بہر حال ایک اور سیاسی فتح حاصل کرلی، ظہیر احمد اس مقصد کے لئے لندن جارہے ہیں۔

دہلی میں درگا داس کو میں نے فون کیا، وہاں جناح کے انتقال کی خبریں گرم ہیں۔

سر مرزا کو بھی میں نے فون کیا، نظام نے لائق علی کی طرف سے انھیں لکھا ہے کہ میں نے ان کے دہلی جانے کو سخت ناپسند کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی لائق علی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے ہیں۔

۲۰ اگست ۱۹۴۸ء

وزارت امور ریاست ہمیں اعتماد میں نہیں لیتی، شاید اس لئے کہ خفیہ قسم کی نقل وحرکت کا ہمارے علم میں لانا مناسب نہیں سمجھتی۔

راجہ راجا پرتی اور محبوب کرن سکریٹری پرنس آف برار سے ملا۔

سہ پہر کو میں نے ایک تار راجہ جی کی خدمت میں بھیجا، جو بنگلور آئے ہوئے تھے، گوپال سوامی آینگر سے فون پر بات چیت کی، اور پوچھا "کیا نظام گورنمنٹ کے مجلس اقوام متحدہ میں جانے سے ہمارے "پروگرام" میں کوئی تبدیلی ہوگی؟ انھوں نے جواب دیا "ہرگز نہیں!"

سر والٹر مانکٹن کا مشورہ ہے کہ حیدرآباد کو مجلس اقوام متحدہ میں جانا چاہیئے، لیکن معاہدۂ قائمہ نہ توڑنا چاہیئے، اس طرح فوجی اقدام میں حکومتِ ہند تاخیر پر مجبور ہو گی۔

ایک اطلاع مجھے یہ ملی ہے کہ مجلس اقوام متحدہ میں حیدرآباد کا جانا اس دن تک بیکار ہے جب تک معاہدۂ قائمہ ختم نہیں کر دیا جاتا، اس نظریہ کی پاکستان کی طرف سے پشت پناہی ہو رہی ہے، اس صورت میں پاکستان ممکنہ فوجی امداد دے گا، کیونکہ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ بن جائے گا۔

سڈنی کاٹن کے ذریعہ، شاہ حجاز، شاہ شرق اردن اور شاہِ مصر کی خدمت میں حیدرآباد اپنے نمایندے بھیجنے کے لئے پر تول رہا ہے۔

جال کستا جاتا ہے

میری ڈائری کا سلسلہ ابھی جاری ہے:۔

۲۱ر اگست ۱۹۴۸ء

سردار سے فون پر گفتگو ہوئی، وہ محکمۂ ڈاک و تار کو بند کردینے کے مخالف ہیں، اس کی اجازت دیدی ہے کہ کمزور طبع ملازمین کو رفتہ رفتہ حیدرآباد سے منتقل کردیا جائے۔

بشپ وہائٹکار (Whitekar) کو شکایت ہے کہ حیدرآباد کے مشن کو طبی سہولتیں حکومت ہند کی طرف سے مہیا نہیں کی گئیں، انھوں نے غیر ملکی نامہ نگاران اخبارات سے شکایت شروع کردی، میں نے انھیں تار بھیجکر وضاحت کی۔

دعوت ملاقات کے لئے آئے، ہم انھیں "ناز" کہتے ہیں، یہ نواب ذوالقدر جنگ کے رشتہ دار ہیں، اور ان کا پیام لے کر آئے تھے کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے حالات حاضرہ پر نظام سے گفتگو بھی کی ہے، جو سخت پریشان ہیں اندھی اضطرابی الجھن میں مبتلا ہوچکے ہیں۔

سردار کو میں نے فون کیا، ستیہ نرائن سنہا اور جی ڈی برلا دونوں کی رائے ہے کہ مجلس

اقوام متحدہ میں حیدرآباد کا جانا ہمارے "پروگرام" پر اثر انداز نہیں ہوسکتا، لیکن بارش جلد شروع ہونے والی ہے کہیں یہ کمبخت ہمارا راستہ روک کر نہ کھڑی ہوجائے۔

معلوم ہوا ہے راجہ جی نے نظام کو، اور مدلیار نے لائق علی کو خط لکھا ہے۔

شعیب اللہ خاں، امروز کے بہادر اور نوجوان ایڈیٹر نے رضوی پر، اور رضا کاروں پر بڑی بے خوفی سے نکتہ چینی کی ہے، یہ اس بیان کے دستخط کنندگان میں شامل ہیں جو منظور جنگ اور ان کے احباب نے شائع کیا ہے، رضوی مستحق بھی ایسے ہی سخت بیان کا تھا۔

۲۲ اگست ۱۹۴۸ء

امروز کے ایڈیٹر شعیب اللہ خاں کو گولی مار دی گئی، اور ان کے ہاتھ قطع کر دیئے گئے، ان کے سالے بھی بری طرح زخمی ہوئے ہیں، اتحادی زعما اپنے دشمنوں کا کاسۂ سر کے عزیز پر صفایا کر رہے ہیں۔

منظور جنگ اور اکبر علی گرفتار کرکے جیل بھیج دیئے گئے۔ (بعد میں یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی) اس طرح حکومت کے تمام مخالفوں سے چھٹکارا پا لیا جائے گا۔

نواب ذوالقدر جنگ پہنچ بر آئے، اندازہ ہوا نہایت قابل اور صاف دماغ آدمی ہیں، حیدرآباد میں ان خوبیوں کے کسی آدمی سے آج تک میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، میں جانتا تھا، یہ نظام یا دین یار جنگ کی طرف سے گفتگو کرنے آئے ہیں، انھوں نے استفسار کیا، اگر حیدرآباد بھارت سے الحاق کرے تو کیا آصفیہ خاندان قائم رکھا جائیگا؟ اور مسلمانوں کو جو امتیازی حیثیت حاصل ہے وہ باقی رکھی جائے گی؟ پھر اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی کہ موجودہ حکومت کو کن وسائل اور طریقوں سے برطرف کیا جائے گا۔

۲۳ اگست ۱۹۴۸ء

اطلاع ملی ہے کہ ۱۹ اگست کو بلارم کی مسجد میں اعلان کیا گیا ہے کہ رضا کاروں کا صدر دفتر اس شخص کو پچاس ہزار روپے انعام دے گا، جو میرا خاتمہ کر دے۔

پنا لال ملنے کے لئے آیا، اس نے بتایا کہ شعیب اللہ خاں کے قتل کے بعد سے علی یاور جنگ

اور دوسرے لوگوں نے موجودہ حکومت کو بدلنے کی جد وجہد سے دلچسپی لینا ترک کر دیا ہے۔

دو بجے رات کو سنتریوں کو شبہ ہوا کہ چند شخص ہماری عمارت کی دیوار پھلانگنے کی کوشش کر رہے ہیں، فوراً الارم دیا گیا، یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔

۲۴ اگست ۱۹۴۸ء

راجو اور آئینگر نے اپنی تحقیقات کا نتیجہ اس خبر کے بارے میں جو میرے قتل کے لئے پچاس ہزار روپے کے انعام پر مشتمل تھی پیش کیا، ہم نے بیٹھ کر غور کیا کہ آیا وزارت امور ریاست کو اس واقعہ کی اطلاع دی جائے یا نہیں؟ مجھے ذرا تامل تھا، کیونکہ اس طرح شبہ ہو سکتا تھا کہ میں گھبرا گیا ہوں، لیکن راجو کو اصرار تھا کہ وزارت امور ریاست کو ایسے اہم واقعہ سے بے خبر رکھنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا۔

پاٹھک کا تار آیا ہے، میری ان کوششوں کا شکریہ ادا کیا ہے جو میں نے گائیکواڑ کے لئے کی تھیں، فری پریس (Free Press) نے اس موضوع پر ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا کہ میں نے بغیر کسی صلہ کے اتنا بڑا مرحلہ طے کرا دیا، یہ مقالہ یہاں "میزان" نے بھی شائع کیا۔

راجہ رانا پرتی ملنے آئے لائق علی انہیں انگلینڈ بھیجنا چاہتے ہیں، انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں ان کے لئے بندوبست کیا ہے، راجہ نے پاسپورٹ اور فارن ایکسچینج کے لئے درخواست دی، میں نے کہا میں لائق علی کا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا۔

مینن کا جواب میں نے لائق علی تک پہنچا دیا، غیر معمولی طور پر پیام کا مضمون عمدہ اور شستہ ہے۔

جدید اطلاعات

دین یار جنگ ذاتی طور پر نظام کے وفادار ہیں، لیکن لائق علی کو برطرف کرانے کیلئے بے چین ہیں، جو جناح کے اشارے پر رقص کر رہے ہیں، ماؤنٹ بیٹن ڈرافٹ محض اس لئے مسترد کر دیا گیا کہ جناح نے لائق علی کو ہدایت کی تھی کہ انڈیا سے کوئی مفاہمت نہ کی جائے، اس سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ لائق علی نے جناح سے مشورہ طلب کیا، جناح نے کہا، جب تک یہ وعدہ نہ کر لیا جائے کہ ان کے مشورہ پر پوری طرح عمل کیا جائے گا، وہ

کوئی مشورہ دینے پر تیار نہیں ہیں، لائق علی نے اطلاع دی کہ ان کے احکام کی پوری پوری تعمیل کی جائے گی، نظام کے قریبی حلقوں کا خیال ہے کہ جناح کے احکام حاصل کر کے لائق علی ریاست کے مفاد کے خلاف برسرِ کار ہیں۔

راجہ رمیٹ ڈنر پر آئے، پرانے طرز کے جاگیردار ٹائپ کے آدمی ہیں، بیچارے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں؟ اس دن کے منتظر ہیں جب انڈین یونین حیدرآباد کو ان مصیبتوں سے نجات دلائے گی۔

لنچ سے بات چیت ہوئی، انھوں نے کہا میرے سر کی جو قیمت لگائی گئی ہے، اسے وزارت امور ریاست کے علم میں لے آنا چاہیئے۔

۲۵ر اگست سنہ ۱۹۴۸ء

"م" آیا، مختلف مباحث پر گفتگو ہوتی رہی، رضوی نے اسے جیت لیا ہے، یہ بار بار ایک ہی بات دہراتا ہے کہ ذاتی طور پر یہ میری بہت بڑی سیاسی فتح ہوگی، اگر میں رضوی کو اس بات پہ آمادہ کر لوں کہ تمام "تنو مند رضا کار فوج میں شامل ہو جائیں، اور حکومتِ ہند کو جتادوں کہ فوجی تصادم کی صورت میں کمیونسٹ خطرہ کا روکنا اور سنبھالنا مشکل ہو جائے گا، رضوی اور لائق علی "م" کی ضیافت اور مہمانداری بڑے شاندار پیمانے پر کیئے جارہے ہیں تاکہ امریکہ میں وہ ان کا بہترین دوست ثابت ہو سکے، یہ جہاں گشت صحافی، ایک عالمی ادارہ کی صورت اختیار کر چکے ہیں، جو افراد اور معاملات پر غیر معم [illegible] رکھتے ہیں۔

پروفیسر ہادی حسن لنچ پر آئے، یہ پروفیسر حبیب کے بڑے گہرے دوست ہیں، ان کی شخصیت غیر معمولی طور پر دل کش ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ تن تنہا انھوں نے سینتالیس لاکھ روپے علی گڑھ یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے لئے جمع کئے، ان کی گفتگو طنز، لطیف اور شوخی سے بھرپور ہوتی ہے، حیدرآباد کے معاملات سے بھی ملول ہیں، کہنے لگے کہ اگر حیدرآباد کے معاملات خوبی کے ساتھ انڈیا سے نمٹ جائیں تو جی چاہتا ہے یہیں رہ پڑوں! فارسی شاعری پر گہری اور وسیع نظر رکھتے ہیں "شکنتلا" کا فارسی میں جو ترجمہ کیا ہے اس کے بعض حصے سناتے رہے، ۳۰ر تاریخ کو لنچ پر پھر آرہے ہیں۔

۲۶ راگست ۱۹۴۸ء

لائق علی کی طلبی پر ایس ایم رضوی اور زین یار جنگ آئے ہوئے ہیں، یہ لائق علی اس تکنیک میں اپنا جواب نہیں رکھتا کہ دوسروں سے مدد کی دہائی دیتا رہتا ہے، لیکن مجال ہے جو اپنی جگہ سے ذرا بھی کھسک جائے، نظام نے مجلس اقوام متحدہ میں اپیل دائر کر دی ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ فی الحال حیدر آباد کے خلاف کوئی اقدام حکومتِ ہند نہیں کر سکے گی۔

۲۸ راگست ۱۹۴۸ء

معلوم ہوا ہے کہ ایس ایم رضوی نئی دہلی سے کچھ خطوط لے کر آئے ہیں، ایک خط حکومتِ ہند کا بھی ہے، جس پر کابینہ میں غور کیا گیا اور جواب خود حکومتِ ہند کو ملزم بنا کر بھیج دیا گیا، یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ایس ایم رضوی بعض اہم تجاویز بھی اپنے ساتھ لائے ہیں، لیکن لائق علی نے کہا، انھیں لکھ کر باقاعدہ طور پر بھیجو پھر غور کیا جائے گا۔

۳۰ راگست ۱۹۴۸ء

سردار اور مینن کی طرف سے دو فون آئے، لیکن کچھ ایسے پُر اسرار طور پر کہ گتھی اب تک نہیں سلجھ سکی۔

ذوالقدر جنگ کل نظام سے دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے، نظام نے ہدایت کی کہ اس گفتگو سے مجھے اور میرے تاثرات سے انھیں جلد از جلد مطلع کر دیں، ذوالقدر نے انھیں مجھ سے ملنے کا مشورہ دیا، نظام نے شکوہ کیا کہ میں ہر مہینہ ان سے کیوں نہیں ملتا جیسا کہ ریذیڈنٹ ملا کرتا تھا، نظام نے کہا، یہ تو مشکل ہے کہ وہ مجھے بلائیں، لیکن اگر میں ایک دو مرتبہ شرف باریابی حاصل کر لوں تو معاملہ آسان ہو جائے گا۔

ذوالقدر جنگ نے نظام کو یہ بھی بتایا کہ لائق علی پاکستان کی انگلیوں پر ناچ رہے ہیں، نظام خاموش ہو رہے، کوئی جواب نہیں دیا، یہ بوڑھا آدمی سازشوں کا جال اب تک اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہے، ذوالقدر جنگ نے مجھے پیام بھیجا کہ کسی بہانے سے بھی مجھے نظام سے مل لینا چاہیئے۔ میں نے جواب دیا، ایسا کرنا میرے بس میں نہیں ہے۔

ذوالقدر جنگ نے نظام سے ملنے کا جو مشورہ مجھے دیا تھا، اس پر میں نے سردار سے فون پر گفتگو کر لی تھی، انھوں نے مجھے نظام سے ملاقات کی اجازت نہیں دی، البتہ اگر نظام خود ملنا چاہیں تو اجازت تھی، ذوالقدر جنگ سے میں نے یہی کہدیا۔

ڈاکٹر ہادی حسن پنج پر آئے۔

شاستری نے مجھے بتایا کہ مجلس اتحاد کی ورکنگ کمیٹی میں رضوی نے ایک خفیہ تقریر کی تھی، شاستری نے تفصیل سے یہ بھی بتایا کہ حکومتِ نظام اور حکومتِ پاکستان کے مابین روابط قائم ہیں، اور یہ کہ رضوی اس وقت لائق علی کے آلۂ کار ہیں، اور لائق علی پاکستان کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔

ایک نہایت ہی اہم رپورٹ "خاموش آواز ______ (Sound Silent) سے ملی۔

افواج نظام کا ایک نہایت ممتاز اور ذمہ دار افسر جسے ہم "خاموش آواز" کے نام سے پکارتے ہیں گزشتہ کچھ عرصہ سے برابر ہم سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہے، کبھی ایک بار کبھی دو مرتبہ وہ مجھ سے ملاکرتا ہے۔ میری درخواست پر اس افسر نے ایک مفصل رپورٹ تیار کر کے مجھے دی ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ اس سے ہماری فوج کو بہت کافی مدد ملے گی۔

۳۱ر اگست ۱۹۴۸ء

سردار سے وائرلس پر عرض کیا کہ حیدر آباد کے خلاف فوجی کارروائی فوراً ہونی چاہیئے اور اگر فوراً یہ ممکن نہ ہو تو مکمل ناکہ بندی تو کر ہی لی جائے۔

ریڈیو پر سردار کے وہ شاندار جوابات سنے جو انھوں نے پارلیمنٹ میں دیئے تھے، انھوں نے کہا تھا، حیدر آباد کے خلاف بہت جلد اقدام کیا جائے گا۔ جب یہ سوال کیا گیا کہ حیدر آبادی وفد کو مجلس اقوام متحدہ میں جانے کی سہولتیں حکومتِ ہند دے گی؟ تو سردار نے جواب دیا " ہاں کیوں نہیں؟ ___ بالکل اسی طرح جیسے زمینداری بل کے خلاف مدراس کے زمینداروں کو یو۔این۔او میں جانے کی اجازت دے سکتے ہیں۔

سردار نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لئے مجھ سے دریافت کیا، کہ آیا میں نے ان کے

جوابات سُن لئے ؛ انھوں نے کہا حالات تیزی کے ساتھ جنبش میں آرہے ہیں، ایک دن کے لئے بھی مجھے حیدرآباد سے باہر نہ جانا چاہیئے۔

یہ سارا مہینہ میں نے "دھیان" اور "جپ" (ورد و ذکر) میں گزارا۔ ان چیزوں نے روح کے ساتھ ساتھ میرے ہاضمہ اور نیند پر بھی بڑا اچھا اثر کیا، گیتا کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔

نظام کے بارے میں ایک بڑا شاندار اور دلچسپ لطیفہ معلوم ہوا۔

پہلے معمول تھا کہ انگریز ریزیڈنٹ ہر مہینہ نظام کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ نظام نے ملاقات کا وقت دو بجے کا مقرر کیا، اس وقت کے وزیر اعظم نے کہا، یہ بے تکا وقت ہے، دو کے بجائے چار بجے کا وقت مقرر کر دیجئے، نظام نے کہا نہیں نہیں ——— اگر وہ چار بجے آیا تو اسے چائے پلانی پڑے گی۔"

معلوم ہوا ہے کہ نظام نے آٹھ کروڑ کی قیمت کی چاندی ابھی حال میں ریاست کے حوالے کی ہے، سونا اور دوسرے قیمتی پتھر بینک آف انگلینڈ میں بھیج دیئے ہیں، یہ واقعہ بھی تازہ ہے کہ ایک شخص نے نظام سے اس کی دولت کے متعلق سوال کیا، اس نے جواب دیا۔

"دولت؟ ——— دولت میرے پاس کہاں؟ میں تو ایک غریب آدمی ہوں!"

یکم ستمبر ۱۹۴۸ء

"W W" ملنے آیا، بڑے غصہ میں تھا، اسے نظام کا فوٹو لینے کی اجازت نہیں دی گئی نظام کے اعصاب جواب دے چکے ہیں، اب تک اسے یہ باور کرایا جاتا رہا کہ سب خیریت ہے، کل شام اس کا گزر ایک دیہات کی طرف ہوا، جسے فوج کے سپاہیوں اور رضا کاروں نے لوٹ کر جلا دیا تھا، یہ منظر دیکھ کر وہ کانپ گیا، اب وہ اپنی حکومت سے سخت برہم اور نالاں ہے، اور یہ حکومت بھی اس سے خلاصی پانے کے لئے ہر جتن کر رہی ہے، کیونکہ اب محسوس ہونے لگا ہے، نظام غیر معمولی طور پر سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔

ڈگلس براؤن (Douglas Brown) نمایندہ ڈیلی ٹیلیگراف، اور پوٹر (Potter) نمایندہ ڈیلی ایکسپرس مجھ سے ملنے آئے، دو گھنٹے تک ہمارے مابین گفتگو ہوتی رہی، میں نے حکومت ہند کا نقطۂ نظر تفصیل سے واضح کیا، لیکن یہ بات چھپ نہ سکی کہ براؤن

ہندوستان کے خلاف ہے، ایک یا دو مرتبہ اس نے ہمیں جفا کار ہونے کا طعنہ بھی دیا۔
حیدرآباد نے بین الاقوامی طور پر پروپیگنڈے کا انتظام بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے کر لیا ہے۔

۱۲ر ستمبر ۱۹۴۸ء

نظام سخت بدحواس ہے۔
سر مرزا اسماعیل سے نظام نے خط و کتابت جاری کر رکھی ہے۔
دین یار جنگ، لائق علی اور العید روس دونوں سے خفا ہیں۔
براؤن نے ڈیلی ٹیلیگراف کو زہر سے بھرا ہوا ایک تار بھیجا ہے، انڈیا کو نازی جرمنی سے، مجھے ربن ٹراپ سے، اور حیدرآباد کو سرزمین امن سے تشبیہ دی ہے، کاش براؤن نے اس سرزمین امن کے بارے میں یہ بھی لکھ دیا ہوتا کہ یہاں غیر ملکی نمایندگان اخبارات کی شاہانہ دعوتیں ہوتی ہیں، اور یہی نہیں بلکہ دوسرے "مواقع" بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔

۱۳ر ستمبر ۱۹۴۸ء

مرارجی ڈیسائی سے ڈاکٹر ہادی حسن اور بیگم عید روس کے سلسلہ میں فون پر گفتگو کی میں نے کہا شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ بیگم عید روس سے بہت اچھا برتاؤ کیا جائے، مرارجی اس پر تیار نہیں تھے کہ بیگم عید روس کو بمبئی آنے دیں، لیکن آخر کار میری بات مان گئے۔
قمر حیدری جیل سے رہا ہو کر اپنے چچا کے ساتھ میرے پاس آئے اور میرے گلے میں ہار ڈالے۔
کلاڈ اسکاٹ (Claude Scott) نے ڈسمنڈ ینگ (Dismond Young) کو حیدرآباد کا پروپیگنڈا کرنے کے لئے انگلستان اور فرانس کا علاقہ سونپا ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ پروپیگنڈے کے میدان میں ہمیں شکست پر شکست مل رہی ہے۔

۱۴ر ستمبر ۱۹۴۸ء

بین الاقوامی اساس پر حیدرآباد نے جس شاندار اور قابلِ رشک پیمانے پر پروپیگنڈا

شروع کیا ہے، میں تو اس سے بدحواس ہو گیا ہوں۔
ایک خاص پیام ملا۔

۵ ستمبر ۱۹۴۸ء

لائق علی نے کل جو تقریر کی تھی وہ دراصل اعلانِ آزادی ہے۔
شام کو نظام کا جوابی خط وائرلس کر کے راجہ جی تک پہنچا دیا۔
کیا خط ہے، داد نہیں دی جا سکتی۔
"حیدرآباد میں کسی طرح اندرونی بدامنی اور بے چینی نہیں ہے، سرحدی حادثات صرف انڈیا کے پیدا کردہ ہیں، مرزا حیدرآباد کو نہیں سمجھ سکتے، کبھی اور کسی حالت میں ہندوستان کی فوج حیدرآباد میں متعین نہیں کی جا سکتی، کوئی اقدام بھی کابینہ کے علم و اطلاع کے بغیر میں نہیں کر سکتا۔

۶ ستمبر ۱۹۴۸ء

صبح "ماز" نے ملاقات کی، ذوالقدر جنگ اپنے مساعی میں کامیاب نہ ہو سکے، دین بھی اب اتنے مضبوط نہیں رہے جتنے پہلے تھے۔
حیدرآبادی وفد کو مجلس اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے سڈنی کاٹن اڑا کر لے جائے گا، اس وفد کے سربراہ معین نواز جنگ ہیں، پارلیمنٹ میں صدر نے جو بیان وفد حیدرآباد کے بارے میں دیا تھا اس کے بعد، اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا کہ یہ لوگ چپکے سے اڑ جائیں۔ گزشتہ چند روز سے سڈنی کاٹن یہیں موجود ہے، معلوم ہوا ہے پاکستان میں حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل مشتاق علی بھی پاکستان کے چند فضائی افسروں کے ساتھ یہیں مقیم ہیں۔
کلاڈ نے ہمارے قرطاس ابیض کا جواب تیار کیا ہے۔

۷ ستمبر ۱۹۴۸ء

پنڈت جی نے نظام سے آخری مطالبہ یہ کیا ہے کہ رضاکار منتشر کر دیئے جائیں، اور بھارتی فوج کو سکندرآباد میں قیام کی اجازت دیدی جائے۔
نظام نے لام بندی کا حکم جاری کر دیا ہے۔

وزارت امور ریاست نے ایک حادثہ کی اطلاع دی کہ چند بھارتی فوجیوں کو حیدرآبادی سپاہیوں نے ایک سرحدی جھڑپ میں گرفتار کر لیا ہے۔ نو بجے رات کو میں نے ایک احتجاجی مراسلہ لائق علی کو بھیج دیا۔

۸ ر ستمبر ۱۹۴۸ء

حیدرآباد پر سراسیمگی طاری ہے۔

رو ۸۱ "ملنے آئے، ان کے ساتھ مس ——— بھی تھیں ——— غلامی کے دن ابھی تک نہیں گئے۔

آٹھ بجے شب کو سردار سے فون پر گفتگو کی، یورپینوں کا انخلا کل سے شروع ہو جائے گا۔

نظام گورنمنٹ نے ان افسروں اور سپاہیوں کی رہائی کا مطالبہ کیا ہے جنہیں ہمارے سپاہیوں نے گرفتار کر لیا ہے۔

۹ ر ستمبر ۱۹۴۸ء

ہلچل شروع ہو گئی۔

وزارت امور ریاست فوجی صدر دفتر دہلی اور سدرن کمانڈ پونہ سے بیانات وصول ہوئے۔

رات کو سردار سے فون پر گفتگو ہوئی۔

۱۰ ر ستمبر ۱۹۴۸ء

ایک سو تیرہ برطانوی افراد کا انخلا عمل میں آگیا، دس خاندان ٹرین سے گئے ہیں سارے شہر پر دہشت چھائی ہوئی ہے۔

شام کو نظام گورنمنٹ کا انکاری جواب باقاعدہ طور پر مل گیا، جسے ٹرانسمیٹر پر میں نے دہلی پہنچا دیا۔

سوا گیارہ بجے شب کو راجہ جی کا ایک پیام نظام کے نام آیا، لیکن معلوم ہوا استراحت فرما رہے ہیں۔

بی او سی کے طیارے انگریزوں کے انخلا کا کام تیزی سے کر رہے ہیں، اب تک

دو سو سے زیادہ آدمی جا چکے ہیں۔ فوج میں جو برطانوی افسر تھے انھوں نے حیدر آباد چھوڑنے سے انکار کر دیا، وہ سول افسر کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ——— مکار!

ان لوگوں کی جیب اتنی بھری جا چکی ہے کہ یہ کسی قیمت پر بھی حیدر آباد سے جانا نہیں چاہتے۔

ایک امریکی طیارہ "W" اور اس کے کتے کو بھی اڑا ے گیا معلوم ہوا ہے کہ کنگ فاروق حیدر آباد کی مدد کرنے پر تیار ہیں، مجھے حیرت ہے کیا ایسا ممکن ہے؟

نظام نے شاہ برطانیہ ——— اپنے یار غار ——— کو بھی ایک تار بھیجکر دہائی دی ہے۔

ساڑھے سات بجے شام کو حکومتِ ہند کا الٹی میٹم نظام کو پہنچا دیا۔

فون پر سردار سے بات ہوئی، ہماری فوجیں بس اب حیدر آباد میں داخل ہوا ہی چاہتی ہیں۔

آج رات کو معین نواز جنگ دی جینیس (The Genius) سڈنی کاٹن کے طیارے میں بیٹھکر مجلس اقوام متحدہ میں حیدر آباد کا کیس پیش کرنے روانہ ہو گئے، اپنے ساتھ بیوی بچوں اور ساز و سامان کو بھی لے گئے ہیں، شاید اس دور اندیش شخص نے سمجھ لیا ہے کہ کیا ہونیوالا ہے؟ غالباً اس نے محسوس کر لیا ہے کہ اس کا خواب، خواب پریشاں ثابت ہو رہا ہے ——— اور وہ وقت سر پر آ گیا ہے جب ریاست حیدر آباد اور نظام کی آرزوئیں ویرانہ میں دفن ہو جائیں گی۔

پولیس ایکشن کا آغاز اور میری گرفتاری

۱۲ر ستمبر کی صبح کو فون پر سردار سے خاصی دیر تک بات چیت ہوئی، انھوں نے اشارے میں بطرز رمز گجراتی زبان استعمال کرتے ہوئے بتایا کہ حالات کی رفتار سرعت اختیار کرتی جارہی ہے

جناح کی وفات، پرانی یادیں

ریڈیو پر جناح کی خبر وفات نشر ہوئی ہے، مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب ہم دونوں کے تعلقات حد درجہ خوشگوار اور دوستانہ تھے، تحریک ہوم رول لیگ کی قیادت جس شان اور دبدبے سے انھوں نے کی تھی، وہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی، جناح کے ساتھ ہی میں نے بھی کانگرس سے قطع تعلق کر لیا تھا، اور جب کانگرس سے بے تعلق ہو کر انھوں نے ایک آزاد پارٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا، میں نے ان کی قیادت کے آگے سر جھکا دیا، پھر مجھے وہ زمانہ بھی یاد آیا، جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے، اور وہ زمانہ بھی جب انھوں نے ہندوستان کی قومیت پر کاری ضرب لگائی، اور جب انھوں نے انگریز اور ہند کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پاکستان قائم کر دیا۔

میجر سنگھ نے میڈوس بیرک (Meadows Barracks) کا ایک چکر لگایا، انھوں نے

سردار کا اپنے مشیروں کے مسئلہ حیدر آباد پر راز و نیاز
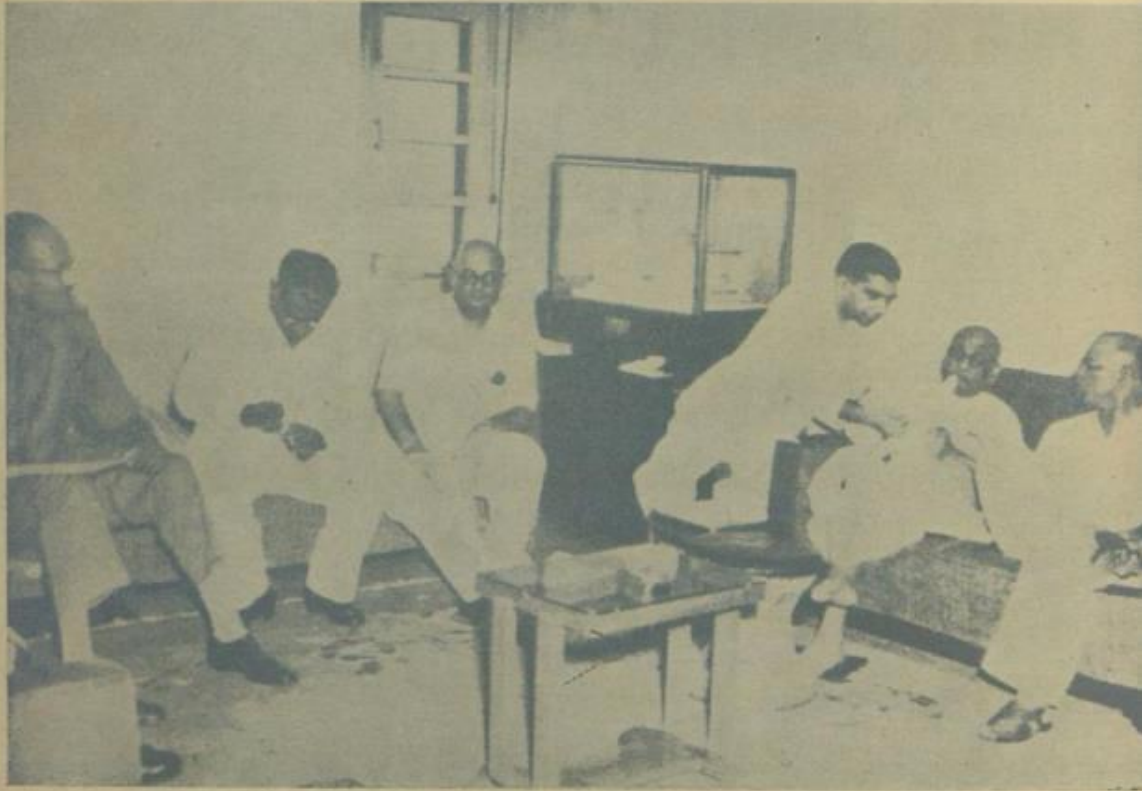
بائیں سے دائیں :
میجر جنرل چوھدری - ایم کے ولودی - آئی سی ایس - این ایم بچ - آئی سی ایس -
سردار پٹیل، وی پی مینن -
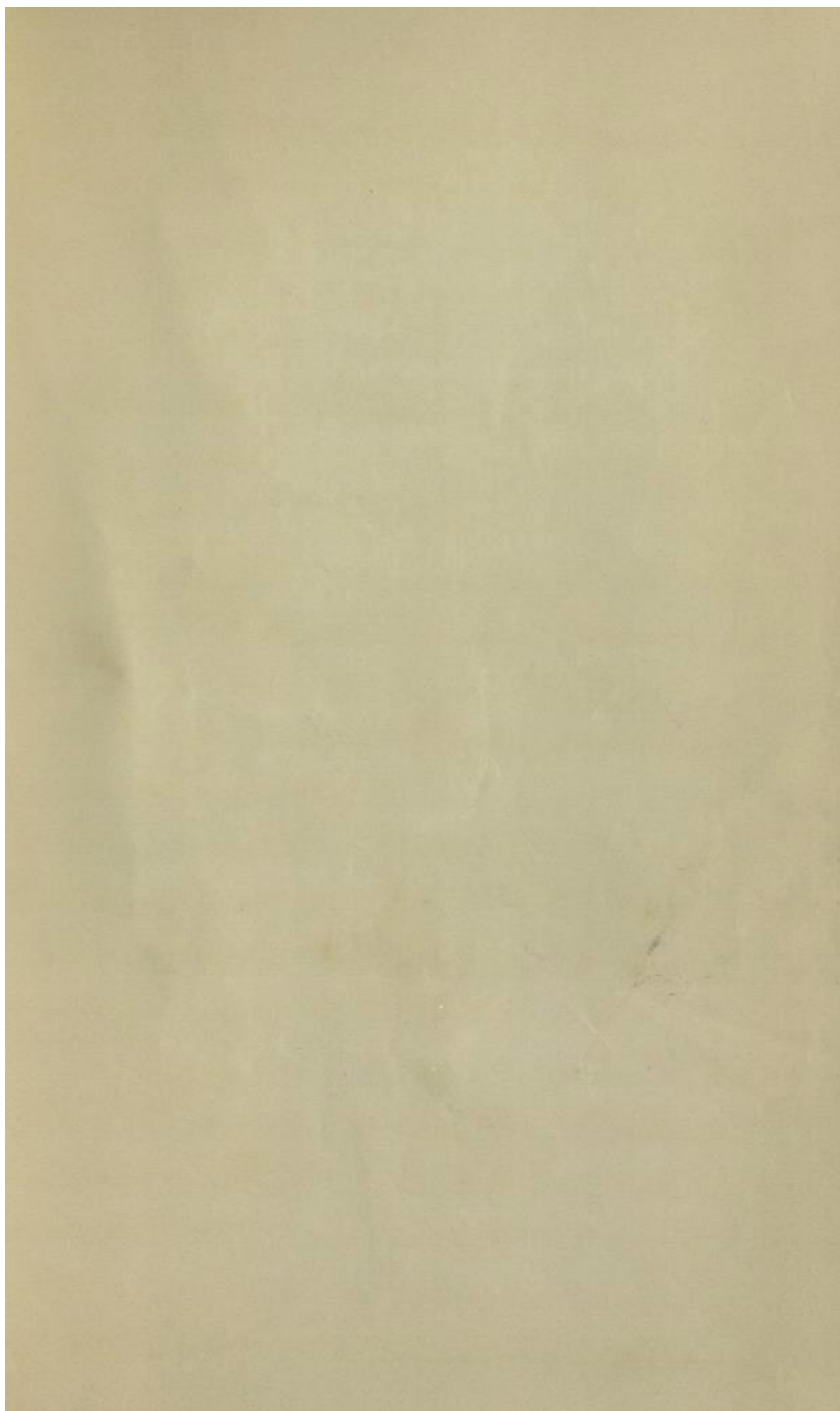
اطلاع دی سب ٹھیک ہے، شام کو بعض احباب یہ رپورٹ لائے کہ رضوی کے کیمپ میں اشتعال پھیلا ہوا ہے، شاستری آیا اور اس نے ان احکام کی تفصیل سنائی جو رضوی نے نافذ کئے ہیں، اس نے یہ بھی بتایا کہ ۱۵ ستمبر کو بھارتی فوج کا حیدرآباد پر حملہ متوقع ہے اور رضاکاروں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کے آنے سے پہلے پہلے تمام پل اڑا دیں، طاؤسی فضائی بیڑے کا ذکر بھی رضوی کی زبان پر بار بار آتا تھا۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ کئی میل تک حیدرآباد کے راستہ میں سرنگیں بچھادی گئی ہیں تاکہ ہندوستانی فوج کے داخلہ میں رکاوٹ پیدا ہو۔

لائق علی کی دعوت ملاقات

لائق علی کی دعوت پر ——— جو میرے لئے حیرت انگیز نہ تھی، ——— میں ان کے ہاں ڈنر پر گیا، ہم دونوں نے سب سے پہلے جناح کے حادثہ وفات پر گفتگو کی، میں نے اپنے ان دیرینہ تعلقات کا حوالہ دیا جو جناح سے میرے تھے۔ لائق علی کوئی شبہ نہیں جناح کے نہایت ہی عقیدت کیش تھے۔

اس گفتگو کے بعد لائق علی نے مجھ سے کہا کہ کچھ واقع ہونے سے پیشتر جس قدر جلد ممکن ہو میں حیدرآباد سے رخصت ہو جاؤں، انھوں نے کہا۔

"آپ کی موجودگی ہمارے لئے کافی دردسر کا باعث بن جائے گی، اگر آپ چاہیں تو میں طیارے کا انتظام کر سکتا ہوں"

"لائق علی صاحب آپ کا شکریہ" میں نے کہا "میری جگہ حیدرآباد میں ہے، اور میں یہیں رہوں گا"

پھر ہم میں یہ بندوبست طے پایا کہ اگر کوئی فوجی تصادم بھارت سے ہوا ——— لائق علی کو امید تھی ابھی دور دور تک کوئی اقدام بھارت کی طرف سے نہیں ہو گا ——— تو حکومتِ ہند کے ملازمین میڈوز بیرکس میں نظر بند کر دیئے جائیں گے، اپنے اور اپنے اسٹاف کے بارے میں میں نے کہا "ہم جہاں آپ رکھیں رہنے کو تیار ہیں"

لائق علی نمایاں طور پر ناخوش نظر آرہے تھے، رخصت ہوتے وقت ——— اور میرا خیال تھا، جس حیثیت سے ہم دونوں اب تک ملتے رہے تھے یہ آخری ملاقات تھی ———

میں نے ایک آخری اپیل یہ جانتے ہوئے بھی کرڈالی کہ یہ بے اثر رہے گی، میں نے کہا۔

"لائق علی، کیوں ہر چیز کو داؤں پر لگا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تم نے؟ کیا تمھیں اندازہ نہیں ہے کہ حسب دلخواہ سودا کرنے کے لئے تم نے کتنے بڑے خطرہ کو دعوت دے ڈالی ہے؟ اب بھی اگر تم چاہو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، تم ایک حساس اور ذمہ دار آدمی ہو، تمہارا رویہ ذرا میری سمجھ میں نہیں آتا۔

"نہیں، نہیں، ہرگز نہیں، کیا حیدرآباد کو میں ہندوستان سے ملحق ہو جانے دوں گا؟" پھر انھوں نے اپنا محبوب لفظ دہرایا "شہادت"!

بھارتی فوجوں کا مارچ

۱۳ر ستمبر کو ریڈیو نے خبر دی کہ ہماری بھارتی فوجیں حیدرآباد کے علاقہ میں داخل ہو گئیں، یہ سن کر ہم ششدر رہ گئے، ہم نے تمام اہم کاغذات جمع کئے، اور پٹرول چھڑک کر ان میں آگ لگا دی۔

فوراً ہی محکمۂ ڈاک، تار، اور ٹیلی فون کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر دی گئی، اور ہدایت کی گئی کہ جو کچھ ہو اس کی اطلاع مجھے برابر ملتی رہے، اس کا انتظام پہلے ہی کر لیا گیا تھا کہ اگر حیدرآبادی فوج قبضہ کرنے کی کوشش کرے تو ٹیلی فون اور ٹیلی فون کنٹرول روم دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔

چند چیزیں جو میں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا پاس رکھ لیں، سردار اور اہلیہ کو فون پر حالات کی خبر دی۔ چند منٹ کے بعد کرشنا سوامی جو فون پر بیٹھا تھا حالات کی خبر مجھے دیتا رہتا تھا، ٹیلی فون کنٹرول روم کے جو لوگ انچارج تھے، وہ بے حد گھبرائے ہوئے، اور حواس باختہ نظر آ رہے تھے اور چاہتے تھے کہ میں حکم دیدوں کہ کنٹرول کو ناکارہ بنا دیا جائے۔

اس سارے عرصہ میں رضا کاروں سے لدے ہوئے ٹرکوں اور لاریوں کا سلسلہ دلکشا سدن کے سامنے سے جاری رہا۔ یہ لوگ جنگی نعرے لگا رہے تھے، چمکتے ہوئے اسلحہ ان کے ہاتھ میں تھے اور نیزوں کی نوک دلکشا سدن کی طرف کئے ہوئے تھے، بارہ بجے دوپہر کو جلدی جلدی ہم نے کھانے سے فراغت کی۔

واپس جانے کی پیش کش

تقریباً دو بجے حکومتِ نظام کے دو افسر لائق علی کا ایک خط

لے کر آئے، جس میں شب گزشتہ کا حوالہ تھا، انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میرے ذاتی باڈی گارڈ اپنے اسلحہ ان افسروں کے حوالہ کر دیں، اور خود ہیڈ ذ بیرکس میں رہیں جس کی رکھوالی بھی یہی دونوں افسران کریں گے، پھر انھوں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم آپ کا پروگرام کیا ہے، اگر آپ واپس جانا چاہیں تو اب بھی میں طیارہ کا انتظام کر سکتا ہوں، خود آپ کی سلامتی کے پیشِ نظر میری تجویز یہ ہے کہ اپنے ذاتی اسٹاف کے ساتھ گرین لینڈز گسٹ ہاؤس میں آجایئے، تاکہ ہم آپ کی حفاظت کے فرائض سے خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برا ہو سکیں۔"

دونوں افسر جو یہ خط لے کر آئے تھے اپنے ساتھ واضح ہدایات نہیں رکھتے تھے، میں نے کہا، اپنے ساتھ میجر سنگھ کو لائق علی کے پاس لے جایئے، اور مشتبہ معاملات د امور کی وضاحت کر لیجئے۔

بیوی سے الوداعی گفتگو پھر کنٹرول روم نے اطلاع دی کہ اب قریب ہی نقل و حرکت نظر آرہی ہے، میں نے جلدی سے اپنی بیوی کو فون کر کے الوداع کہا، سردار کو فون کر کے خدا حافظ کہا، اور بتایا کہ اب چند لمحوں کے اندر فون ناکارہ بنا دیا جائیگا فوراً ہی مینن کی کال آئی۔

"ہیلو منشی!" مینن نے اپنے خوش طبعی کے مخصوص انداز میں کہا "گھبرانا مت، میری حکومت نے مجھے ہدایت کی ہے کہ تمھیں بتا دوں، تشویش کی ذرا بھی ضرورت نہیں ہے، اسے آپ پر مکمل اعتماد ہے، اور وہ تمہارے ہر اقدام کی پشت پناہ ہے۔"

لائن ٹوٹ گئی، ٹیلی فون بند ہو گیا، میں نے مینن کی خوش فہمی پر قہقہہ لگایا، کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ اب ہم محاصرہ میں تھے۔

میری گرفتاری بریگیڈیر حبیب چار پانچ لاریوں میں سپاہی لادے ہوئے پہنچے، اور سنگین تانے ہوئے دکھشا سدن میں داخل ہو گئے، جیسے یہ لوگ پہنچے کمپنی مقابلہ پر تُل گئی، ہمارے چند سپاہی زخمی ہوئے، یہ بڑی کٹھن گھڑی تھی، میں برآمدہ میں پہنچا، اور چیخ کر اپنے آدمیوں سے کہا۔

"ہتھیار ڈال دو!"

میرا اشارہ پا کر میجر سنگھ بھی دوڑے، اور دونوں مقابل کمپنیوں کے بیچ میں بہادری کے ساتھ کھڑے ہوگئے، اور ایک نہایت سنگین قسم کا تصادم بالآخر رفع دفع کر دیا۔

جیسے میرے گارڈس پیچھے ہٹے، فوراً حیدرآبادی سپاہی اندر داخل ہوگئے، یہ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

"پکڑو! مارو!"

ان سپاہیوں میں کافی تعداد رضاکاروں کی بھی تھی۔

نظام کے سپاہی ہر کمرہ میں دھما چوکڑی مچاتے ہوئے پہنچے، اور تمام ملازمین کو جو گراؤنڈ فلور پر ملے، گرفتار کر لیا، اس اثنا میں کہ یہ کارروائیاں جاری تھیں برگیڈیر حبیب عمارت کی پہلی منزل پر آئے، دو سپاہی سنگین تانے ہوئے ساتھ تھے، وہ میرے پاس پہنچے، انداز یہ تھا کہ گویا مجھے گرفتار کرلیں گے اور درشت لہجہ میں حکم دیا کہ بغیر کسی تاخیر کے مجھے فوراً گرین لینڈس چلنا چاہیئے۔

برگیڈیر حبیب سے میری جھڑپ

میرا ضبط جواب دے گیا، میں نے برگیڈیر حبیب کو اس انداز تکلم پر پھٹکارا۔

"اس بیہودگی سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ ابھی ابھی میرے پاس لائق علی کے بھیجے ہوئے دو افسر آئے تھے کہ میں ان کے ساتھ گرین لینڈس چلا جاؤں، انھوں نے میرے سپاہیوں کو غیر مسلح کر دیا، پھر آپ کو مسلح سپاہی لے کر میرے کمرے میں آنے کا اور اس انداز میں گفتگو کرنے کا کیا حق تھا؟ میں ہر اس جگہ جانے کو تیار ہوں جہاں لائق علی مجھے بھیجنا چاہیں، لیکن اگر آپ کا رویہ نہ بدلا، اور آپ کے یہ سپاہی اس کمرہ سے باہر نہ گئے، تو میں ہرگز اس کمرہ سے نہ ہلوں گا۔

میری باتیں سن کر حبیب چکرا گیا، پھر اس نے اپنے سپاہیوں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ میں نے میجر سنگھ سے کہا کہ وہ حبیب کے ساتھ جائیں، اور ریڈوس بیرکس کا چارج دے دیں، میں یہاں انتظار کر رہا ہوں۔

برگیڈیر حبیب میجر سنگھ کو ساتھ لے کر نیچے گئے، پھر فون پر لائق علی سے گفتگو کی۔

فوجی پہرے میں

پانچ بجے شام کو فوجی پہرہ میں، مجھے اور میرے ذاتی اسٹاف کو گرین لینڈس میں پہنچا دیا گیا، راستہ میں رضاکاروں کے گروہ ملے، جن کے ہاتھوں میں اسلحہ تھے، اور زبان پر فتحمندی کے ترانے۔

گرین لینڈس میں کچھ غیر ملکی صحافی اب تک موجود تھے، اور ایک وہ بدقسمت ہندو بھی جو ابھی دو دن ہوئے جوش کے استعفا کے بعد وزیر مقرر ہوا تھا، یہ لوگ پولیس ایکشن پر سخت برہم تھے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی تفصیل انھیں بتاؤں، لیکن میں جانتا ہی کیا تھا جو بتاتا؟۔

بیگم عیدروس کی معذرت

سات بجے شام کو بیگم عیدروس اپنے شوہر کی طرف سے برگیڈیر حبیب کے طرز عمل پر معذرت کرنے آئیں، ان کا انداز حد درجہ دوستانہ تھا، انھوں نے سرگوشی کرتے ہوئے اپنے شوہر کے بارے میں کہا کہ وہ فرشتۂ غیب ہے، اور اس کی رائے یہ ہے کہ تین دن سے زیادہ مدت تک یہ پولیس ایکشن جاری نہیں رہ سکے گا ——— کتنی مزے کی بات تھی!۔

رات کا کھانا جیسے تیسے ہم نے کھایا، میجر سنگھ میری حفاظت کے خیال سے چوکنے تھے میرے ذاتی اسٹاف کو اس طرز پر سلایا گیا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص بھی میرے قریب آنے کی کوشش کرتا تو یہ لوگ فوراً حاضر ہو جاتے،

علی یاور جنگ کی ملاقات

ساڑھے گیارہ بجے رات کو علی یاور جنگ میرے پاس آئے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا لائق علی کی اجازت سے آئے ہیں، ہمارے مابین عام قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ علی یاور جنگ نے بتایا رضوی کی اسکیم یہ ہے کہ حیدرآباد کی ہندو آبادی کا اتنی ہی تعداد میں بھارت کی مسلم آبادی سے تبادلہ کر لیا جائے۔

۱۴ ستمبر کی صبح کو ہمیں لیک ویو (Lake Wiew) میں پہنچا دیا گیا، یہ بڑا شاندار سرکاری مہمان خانہ ہے، انکمٹن یہیں رہا کرتے تھے، پہلی منزل سے جہاں ہمیں رکھا گیا تھا، جھیل کا دلفریب منظر دکھائی دیتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نظر بند تھے، ایک ملٹری آفیسر ہمارا انچارج تھا، ہر چہار طرف، اوپر اور نیچے کی منزل میں نگرانی اور نگہداشت پر سپاہی مامور تھے جب ہم کھانے پر بیٹھے ـــــ اگرچہ بھوک زیادہ نہ تھی ـــــ چار سپاہی ہماری نگرانی کر رہے تھے۔

نہ ہم باہر جا سکتے تھے، نہ ہم تک کوئی آ سکتا تھا، ٹیلی فون بھی ناکارہ کر دیئے گئے تھے۔ باہر کی دنیا کا حال صرف ریڈیو سے معلوم ہوتا تھا، لیکن ہندوستانی نشریات سننا ناممکن بنا دیا گیا تھا، حیدرآباد ریڈیو صاف آ رہا تھا، اور بار بار یہ آواز آ رہی تھی۔

"انشاءاللہ حیدرآباد کی فوج امروز فردا میں فتح حاصل کرے گی"

لائق علی کی آمد

لائق علی صاحب بھی تشریف لائے، انھیں میرے آرام کا بڑا خیال تھا، اس امر پر معذرت کر رہے تھے کہ مجھے لیک ویو سے باہر جانے کی اجازت نہ دے سکنے پر مجبور تھے، رضاکاروں نے میری جو توہین و تذلیل کی تھی، اس کی ذمہ داری قبول کرنے کا خطرہ بھی نہیں لینا چاہتے تھے، میں نے کہا، مجھے صورتِ احوال کا اندازہ ہے۔

"یہ کیا لغویت ہے کہ آپ کی فوجیں تین طرف سے حیدرآباد میں داخل ہو رہی ہیں؟"

لائق علی نے بڑے ترش لہجہ میں پوچھا۔

"کیا آپ کو یہ توقع ہے کہ ہماری فوجیں آپ سے مشورہ کر کے حیدرآباد میں داخل ہوں گی؟" جواب میں ایک سوال میں نے خود کر ڈالا۔

میں نے اپنے باورچی کے بارے میں کہا کہ وہ مجھے ملنا چاہیئے جس غریب کو ہیڈ وزیر کس میں رکھا گیا ہے، شکر ہے شام کو باورچی میرے پاس پہنچا دیا گیا، لیکن زار و نزار حالت میں معلوم ہوا کہ اسے اور دوسرے ملازمین کو بری طرح زد و کوب کیا گیا ہے۔

میرا شوخ طبع باورچی

لیکن یہ میرا باورچی تھا بڑا دلچسپ اور شوخ طبع آدمی، جب سپاہیوں نے اسے نرغہ میں لے کر پوچھ گچھ شروع کی، اور معلوم کرنا چاہا کہ میرے پاس کون کون لوگ آیا کرتے تھے، اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندی بنگالی میں کہا۔

"جو لوگ صاحب کے پاس آیا کرتے تھے ان سب کے نام تو مجھے نہیں معلوم البتہ ایک شخص کو جانتا ہوں جو میرے صاحب کے پاس اکثر آیا کرتا تھا، اور وہ نظام تھا"

"کیا کہتا ہے، نظام؟" پوچھ گچھ کرنے والے پولیس افسر نے چیختے ہوئے پوچھا۔

"جی نظام! فقط نظام!"

"تو نے کس طرح جانا وہ نظام تھے؟"

"کیا ان کی تصویریں جگہ جگہ نہیں ٹنگی رہتیں؟"

یہ سارا زمانہ جو لیک ویو میں گزرا، میں نے "دھیان" یا بھگوت گیتا کی تلاوت میں گزارا، یا پھر ریڈیو سنتا رہتا، اور اپنے ساتھیوں سے گپ شپ کرتا رہتا، جو بڑی وفاداری سے میرے ساتھ دکھ جھیل رہے تھے۔

مجھ پر نزول مصیبت

۵ ار ستمبر کو حیدرآباد ریڈیو نے برق رفتار فتحمندیوں کی داستان سنائی، اور بھارتی نشریہ میں نلدرگ کی فتح کا حال تھا۔ اب دونوں رپورٹوں میں کون سچی اور کون جھوٹی؟ اس کا فیصلہ کرنا بڑا دشوار ہو گیا۔

سوا چھ بجے شام کو میں لان پر چہل قدمی کے لئے گیا، جب کرشن سوامی کے ساتھ میں نیچے اترا تو ایک گارڈ نے ہاتھ کے اشارے سے واپس جانے کی ہدایت کی، لیکن میں نے پروا نہ کی اور لان کی طرف بڑھنے لگا۔

"اندر چلے جاؤ، مجھے حکم ملا ہے۔"

میں چند قدم آگے بڑھ کر سبزے تک پہنچ گیا، کرشنا سوامی مجھ سے چند قدم پیچھے تھا، ایک افسر غصے میں بھرا ہوا اپنے آدمیوں کو ساتھ لے کر میری طرف بڑھا اسٹین گن تان لی اور پھر چلایا:

"اندر جاؤ، اندر جاؤ!"

میں وہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا

"مجھ سے اس طرح باتیں نہ کرو اپنے افسر کو بلاؤ، وہ اندر ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے پھر برہم لہجہ میں کہا "میں حکم دیتا ہوں، اندر جاؤ۔"

"میں تمہارا قیدی نہیں ہوں!" میں نے جواب دیا "میں اندر جانے سے انکار کرتا ہوں۔"

افسر نے گن میری طرف تان لی، میں چپ کھڑا رہا، تقریباً دس منٹ اس طرح گزر گئے۔

"اندر جاؤ" وہ پھر دہاڑا۔

کسی شخص نے ـــــ غالباً بلیک ویو کے منیجر نے ـــــ دیکھ لیا، یہاں کیا ہو رہا ہے؟ وہ دوڑا دوڑا آیا، اسی اثنا میں کوئی اور آدمی آیا، اس نے اس افسر کے کان میں کچھ کہا، جسے سن کر اس نے بندوق جھکا لی، اور مجھ سے صرف نظر کر کے ٹہلنے لگا۔

ذرا دیر میں میجر سنگھ، میجر جین آفیسر انچارج کے ساتھ آئے، انھوں نے معذرت کر لی، لیکن جب میں نے میجر سنگھ کو کہا کہ وہ لائق علی کو فون پر اس حادثہ کی تفصیلات بتا دیں، تو حسن نے فون کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ دوسرے روز میں نے لائق علی کو ایک خط لکھکر ان حالات کی اطلاع دی، وہ فوراً آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔

میں نے ایک خطرناک صورت کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کر لیا تھا، لیکن کھانے کے بعد جب میں تنہا تھا تو یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ میں نے یہ کیا کیا، رضا کار ویسے ہی میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں بلیک ویو میں ان مسلح سپاہیوں کے لئے اس سے بڑھ کر باعث مسرت کیا ہو سکتا تھا کہ گولی میرے سینہ کے پار کر دیں۔

یادوں کا ہجوم

خیالات کی رو دوڑی تو دوڑی، یادوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا، میرے نہاں خانۂ دماغ میں، مجھے یاد آیا کس طرح آج کے دن تک ایک ایک قدم پر مجھے سخت جد وجہد کچھ حاصل کرنے کیلئے کچھ بننے کے لئے کرنا پڑی، مجھے اپنے پتا یاد آئے جو میرے قدر شناس تھے، ماتاجی یاد آئیں جو بے پناہ محبت کرتی تھیں مجھ سے، لکشمی (مرحومہ بیوی) یاد آئی جس نے مجھے خوش رکھنے کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا، لیلاوتی (موجودہ بیوی) یاد آئی، جو گویا عالم نزع میں مبتلا ہو کر موجودہ حالات کو برداشت کر رہی تھی، اس کا دل یہ سوچ سوچکر دھڑک رہا ہو گا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے؟ ـــــ

اور پھر میرے بچے!ان کی یاد!

میں بھگوت گیتا لے کر بیٹھ گیا، جیسے دل میں کہہ رہا تھا اب میں یہاں سے سلامت واپس نہیں جا سکوں گا ـــــ لیکن کچھ عجیب طرح کی ذہنی آسودگی بھی ساتھ ہی ساتھ میں نے محسوس کی۔ میں نے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ وہ کیا جو کر سکتا تھا، مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں اپنے فرض سے محبت کرتا ہوں۔ اس پر جان دے سکتا ہوں۔ رات کے تین بجے میں سونے کے لئے لیٹا، لیکن طبیعت کا بوجھ اتر چکا تھا۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی، مجھے بخار تھا، ٹمپریچر ۱۰۰ تک پہنچا ہوا تھا۔

میرا اور حیدرآباد کا سقوط ساتھ ساتھ!

۱۶ ستمبر کو میرا ٹمپریچر سو سے ایک سو تین تک پہنچ گیا، ریڈیو کی خبریں حوصلہ افزا نہیں تھیں، حیدرآباد ریڈیو فتح کی خوشخبریاں سنا رہا تھا۔

پرنس آف برار کا ایلچی

سہ پہر کو پرنس آف برار کی طرف سے راجہ محبوب کرن ملنے آئے۔ انھوں نے بتایا، نلدرگ پر بھارتی فوجوں نے چند گھنٹوں میں قبضہ کرلیا، حالانکہ حیدرآباد کے فوجی مبصرین و ماہرین کی اس کے استحکام کے بارے میں یہ رائے تھی کہ مہینوں مزاحمت کر سکے گا۔

رات گئے دین یار جنگ آئے، اور انھوں نے کہا، نظام مجھ سے مشورہ کے طالب ہیں، نظام کے پاس العیدروس گئے اور انھوں نے کہدیا اب وہ تاب مقاومت نہیں رکھتے، حیدرآبادی فوجیں بھارتی فوجوں کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتیں۔

لائق علی کو طلب کر کے مستعفی ہونے کی ہدایت کی گئی، لیکن انھوں نے استعفا دینے سے انکار کر دیا، اور مزید دس روز کی مہلت طلب کی، نظام سخت پریشان ہیں کہ کیا کریں؟ کیا آپ ازراہِ کرم کوئی مشورہ دینے کی زحمت گوارا کریں گے؟''

میں جن حالات میں گھرا ہوا تھا، ان کے باعث نئی دہلی سے رابطہ قائم کرنا میرے لئے ناممکن تھا، میں جو مشورہ بحالت موجودہ دے سکتا تھا وہ یہی تھا کہ نظام حکومت ہند کے مطالبات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، جنگ نہ کرنے کا اعلان کر دیں، پولیس ایکشن کا خیر مقدم کریں۔ لائق علی وزارت کو برطرف کر دیں۔ رضوی کی گرفتاری کا حکم صادر کریں، سوامی رامانند تیرتھ کی رہائی کا حکم صادر کریں، جملہ کانگرسی کارکنوں کو جیل سے آزاد کر دیں۔

پھر عیدروس

۱۷ ستمبر کی صبح کو العیدروس میرے پاس آئے، انھوں نے کہا کہ وہ نظام سے گفتگو کر چکے ہیں، اور صاف صاف بتا چکے ہیں کہ بھارتی فوجوں کی مزاحمت اب ذرا بھی نہیں کی جا سکتی، آج نظام کے حسب ہدایت لائق علی نے استعفا دے دیا۔ حالانکہ کل انکار کر چکے تھے۔

جنرل عیدروس، یادین یار جنگ، یا دونوں نے مجھ سے کہا کہ نظام چار بجے مجھے ملاقات کی دعوت دیں گے، اور مجھ سے ہدایت طلب کریں گے، ذرا دیر بعد راجہ محبوب کرن تشریف لائے، انھوں نے بھی یہی کہا، لائق علی کے استعفا کی خبر حیدر آباد کے اکثر باشندوں کے لئے پیام راحت ثابت ہوئی۔

گیارہ بجے خود لائق علی ایک دیو میں مجھ سے ملنے آئے، اور اپنے استعفا کی خبر دی، پھر رخصت ہوتے ہوئے کہا کہ مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے ہیں، وہاں سے ایک بجے پھر واپس آئیں گے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ اس تمام عرصہ میں حیدر آباد ریڈیو یہی کہتا رہا کہ حیدر آبادی فوجیں ظفر مندانہ طور پر آگے بڑھ رہی ہیں، اور ان کا رُخ گوا کی طرف ہے، ہندوستان کی نشریات کی آواز اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ بات اب شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ بھارتی فوجیں حیدر آباد کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

اسی اثنا میں مجھے برابر خبریں ملتی رہیں، معلوم ہوا کہ استعفا کے بعد لائق علی اور ان کے وزراء شاہ منزل میں جمع ہوئے، اور تمام اہم کاغذات جلا کر خاکستر کر دیئے۔

لائق علی کا استعفا

ایک بجے لائق علی آئے، اور انھوں نے مجھے نظام کا ایک خط دیا کہ یہ فوراً راجہ جی ——— ہمارے گورنر جنرل ——— کو ٹرانسمٹ کر دیا جائے۔

خط کا مضمون یہ تھا:۔

"میری حکومت مستعفی ہو گئی ہے اور مجھ سے استدعا کی ہے کہ مکمل طور پر تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لے لوں۔

اس استدعا کے جواب میں کابینہ وزارت سے میں نے کہا، مجھے افسوس ہے کہ یہ کام پہلے نہیں کیا گیا، اور اب میرے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ اس نازک مرحلہ پر کچھ کر سکوں، بہرحال میں یور ایکسی لنسی کو مطلع کرتا ہوں کہ میں نے اپنی افواج کو جنگ بند کرنے کا آج شام کو حکم دیدیا ہے، اور رضاکاروں کو منتشر کرنے کا فرمان بھی صادر کر دیا ہے، میں نے بھارتی افواج کو سکندرآباد اور بلارم بیرکس پر قابض ہونے کی اجازت دیدی ہے۔"

اپنے اس پیام میں نظام نے یہ بھی کہا تھا کہ انھوں نے پرانے قومی خدمت گزاروں پر مشتمل ایک نئی کابینہ نامزد کر دی ہے، اور سر مرزا اسماعیل کو کونسل کی صدارت قبول کرنے کی دعوت دی ہے، یہ اقدام اس تجویز کے مطابق کیا گیا ہے کہ جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پیش کی تھی، یعنی یہ کہ سر مرزا کو حیدرآباد کا وزیر اعظم بنایا جائے، اور اگر راجہ جی نے اس اقدام کو منظور کر لیا، تو وہ ایک چارٹرڈ طیارہ سر مرزا کو حیدرآباد لانے کے لئے بھیجیں گے، تاکہ وہ گفت و شنید کے مراحل طے کر سکیں، اس خط کے بعض مندرجات سے مجھے اتفاق نہ تھا، انھیں حذف کر کے میں نے یہ خط راجہ جی تک پہنچا دیا۔

لائق علی کا نشریہ فوراً ہی ریڈیو پر لائق علی کی آواز سنائی دی۔

"آج صبح کابینہ نے یہ محسوس کیا کہ انڈین یونین کی افواج قاہرہ کے مقابلے میں انسانی خون کی مزید قربانی لاحاصل ہے، چنانچہ کابینہ نے طے کر لیا کہ استعفا دیدے، اور سارے اختیارات حکمران اعلیٰ نظام کو سونپ دے، یہ استدعا نظام نے منظور کر لی ہے، اور سارے اختیارات بہ نفسِ نفیس سنبھال کر نئی کابینہ نامزد کر دی ہے، جو کل سے کام شروع کرے گی۔"

اس طرح لائق علی اپنے رفقا کے ساتھ اسٹیج سے روپوش ہو گئے۔

سوال یہ تھا کہ نظام کا پیغام دہلی تک کس طرح پہنچایا جائے؟ کیونکہ گزشتہ چند روز

سے حیدر آباد اور دہلی کے مابین جملہ مواصلات کا سلسلہ منقطع کیا جا چکا تھا، دلکشا سدن میں جو وائرلس تھا، مجھے شبہ تھا کہ وہ بھی ناکارہ ہے، ایک کار مجھے دی گئی، میڈوز بیرکس سے آپریٹر طلب کیا گیا، ہیجر سنگھ اور آپریٹر کو لے کر میں دلکشا سدن پہنچا۔

حیدر آباد اور سکندر آباد کا پورا راستہ سنسان پڑا تھا، دلکشا سدن خود ایک ویرانہ بنا ہوا تھا، پردے پھاڑ ڈالے گئے تھے، فرنیچر توڑ پھوڑ ڈالا گیا تھا، تصویریں ٹوٹی پڑی تھیں نظام کے سپاہی جو یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کے استعمال کے برتن بکھرے پڑے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ لائق علی وزارت کے مستعفی ہونے کی خبر سنتے ہی یہ لوگ افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

وائرلس روم تبدپڑا تھا، اسے توڑا گیا، اور آپریٹر نے دہلی سے تعلق قائم کر کے راجہ جی اور پنڈت جی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

نظام کا خط میرے نام ذرا دیر بعد ــــــ جب سے بھارت کا ایجنٹ جنرل ہو کر میں حیدر آباد آیا تھا، پہلی مرتبہ ــــــ مجھے نظام کا خط ملا۔

ڈیر منشی،

آج چار بجے سہ پہر کو آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوگی، کیا آپ از راہِ کرم مطلع کریں گے کہ کنگ کوٹھی آپ تشریف لا سکتے ہیں؟"

چار بجے جب میں کنگ کوٹھی پہنچا، نظام تصویرِ یاس بنے نظر آئے، ان کے اعصاب جواب دے چکے تھے، انھوں نے کہا، یہ بدمعاش گئے، بتایئے اب میں کیا کروں؟ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے انھوں نے لائق علی کا استعفا مجھے تھما دیا۔

مجھے سب سے زیادہ فکر حیدر آباد کے غیر مسلح شہریوں کی تھی، شہر میں اب تک کئی ہزار مسلح رضا کار بکھرے پڑے تھے، اور قاسم رضوی نے انھیں چھ ہزار رائفلیں اس مقصد کیلئے دیدی تھیں کہ جتنے ہندو ہلاک کئے جا سکیں، کر دیئے جائیں۔

"یور ہائی نس، سب سے پہلے یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ فی الحال حیدر آباد میں کوئی حکومت موجود نہیں ہے" میں نے کہا" حیدر آباد سے سکندر آباد تک کے راستہ میں یہ منظر مجھے نظر آیا!

سوامی راما نند تیرتھ - کے ایم منشی - میجر جنرل چوہدری
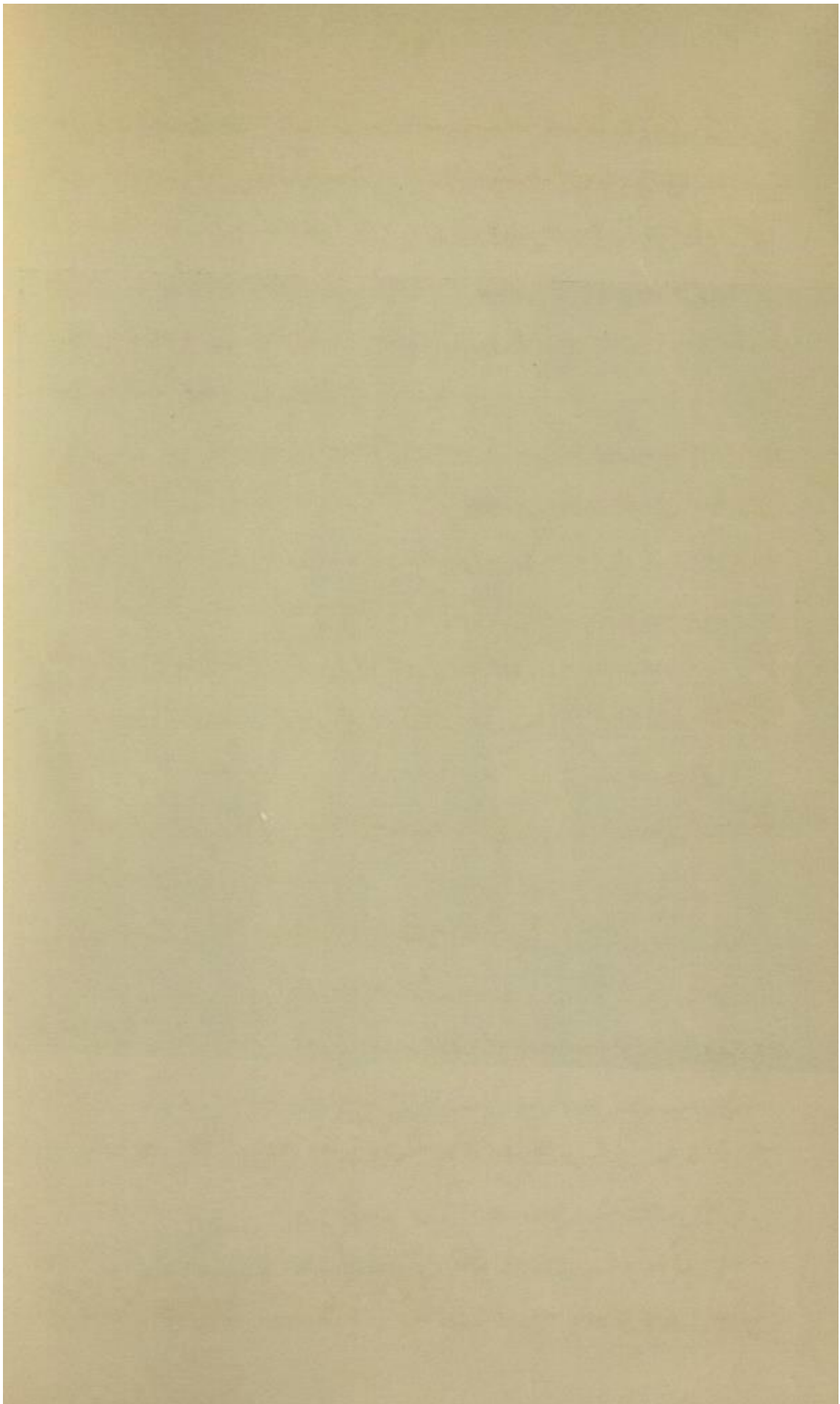
کہ نہ پولیس کام کر رہی ہے، نہ فوج، حتیٰ کہ دکھشا سدن کے گارڈ تک بھاگ چکے ہیں، میجر جنرل چوہدری کو یہاں تک پہنچنے میں ایک دن تو لگ ہی جائے گا۔ ممکن ہے اس سے زیادہ مدت لگ جائے، شہر کے آس پاس کے علاقے بری طرح سرنگوں سے بھرے ہوئے ہیں، لہٰذا یور ہائی نس جنرل عیدروس کو طلب کر کے حکم دیں کہ نظم و انتظام کی بحالی کا کام وہ اپنے ذمہ لیں، اگر انھوں نے فوراً چارج نہ لیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ شہر میں خوفناک طوفان اٹھ کھڑا ہوگا، اور بے گناہ ہلاک کر ڈالے جائیں گے!"

نظام کا حال زار

نظام نے فوراً عیدروس کو طلب کیا، جب تک وہ نہیں آئے، ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے رہے، وہ سخت اعصابی اختلال میں مبتلا تھے، جب جنرل عیدروس آئے، میں نے ان پر واضح کیا کہ شہر کا امن و امان بحال رکھنا کتنا ضروری ہے؟ نظام نے پوچھا "تم کیا کہتے ہو" عیدروس نے جواب دیا کہ ایسے حالات میں، جب ایک فاتح ہو، دوسرا مفتوح، تو مفتوح فوج کے کمانڈر انچیف کو شہر کی کمان اپنے ہاتھ میں لے کر میجر جنرل چوہدری فاتح فوج کے کمانڈر کو حوالے کر دینا چاہئے"۔

فوراً ہی نظام نے حکم صادر کیا کہ عیدروس شہر کے نظم و امن کے انچارج ہیں۔

"میں ایک چارٹرڈ طیارہ سر مرزا کو لانے کے لئے بھیج رہا ہوں، جو آتے ہی حکومت کا کاروبار سنبھال لیں گے" نظام نے کہا۔

اب تک میں اپنی حکومت سے کوئی رابطہ نہیں قائم کر سکا ہوں" میں نے کہا "میں نہیں کہہ سکتا کہ سر مرزا کی وزارتِ عظمیٰ حکومتِ ہند قبول کرے گی یا نہیں؟ لیکن بہر حال اس اثناء میں نظم و امن کی بحالی کا کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور ہونا چاہیئے، تاکہ بے گناہوں کا خون نہ بہایا جا سکے"۔

"میں عیدروس اور دین یار جنگ کو فی الحال حکومت کا سربراہ بناتا ہوں" نظام نے جواب دیا۔

ہندوؤں کو بھی میں نے وزارت دلائی

میں نے یہ بات پسند نہیں کی کہ شہر کے لاکھوں ہندوؤں کی جان و مال کی

رکھوالی ان دو شخصوں کو سپرد کر دی جائے جن پر میں ذرا بھی بھروسہ نہیں کرتا تھا، ابھی چند روز پہلے تک عیدروس اتحادیوں کا کھلونا بنے ہوئے تھے، یہی حال دین یار جنگ کا بھی تھا، جب تک چند قابلِ اعتبار ہندو بھی ان کے شریک کار نہ بنائے جائیں، آنے والے اڑتالیس گھنٹوں میں ہزاروں بے گناہوں کے قتل و ہلاکت کا اندیشہ تھا۔

"جو وزارت بھی آپ بنائیں، وہ وزارت امور ریاست کی مرضی کے تابع ہونی چاہئے" میں نے کہا "اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب میجر جنرل چوہدری یہاں آجائیں، اور حیدرآباد اور دہلی کے مابین مواصلات کا سلسلہ پھر سے قائم ہو جائے، اس اثناء میں عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کچھ ہندو بھی عیدروس اور دین یار جنگ کے ساتھ شریک کر لئے جائیں"

آپ کے خیال میں وہ ہندو کون ہو سکتے ہیں" نظام نے سوال کیا۔

میں جانتا تھا راماچار، اور پنالال پٹائی کو عام ہند۔ ووُں کا اعتماد حاصل تھا، میں نے ان ہی کا نام پیش کر دیا۔

نظام کی حاضر دماغی اس وقت بھی کام کر رہی تھی، اس نے تڑسے کہا، "مگر مسلمانوں سے بھی ایک پبلک مین ابوالحسن علی کو کیوں نہ لیا جائے؟"

میں ابوالحسن علی سے اچھی طرح واقف تھا، وہ ایک وسیع القلب اور روشن دماغ شخص تھے، میں نے اس نام سے اتفاق کر لیا، اور مشورہ دیا کہ پرنس آف برار کو اس نئی حکومت کا سربراہ مقرر کیا جائے۔

جب تک ہماری فوج نہ آجائے یہ مشترک مجلس شہر کا نظم و امن قائم رکھے گی۔

مجلس اقوام متحدہ میں حیدرآباد کا مقدمہ

اسی اثنا میں مجلس اقوام متحدہ کا اجلاس بمقام پیرس جاری تھا، اور معین نواز جنگ بھارت کے خلاف حیدرآباد کا کیس پیش کر رہے تھے، میں نے نظام کو مشورہ دیا کہ ریڈیو پر ایک تقریر کریں کہ وہ پولیس ایکشن کو حق بجانب قرار دیتے ہیں، اور یہ کہ خود انھوں نے بھارت کی فوجوں کو حیدرآباد میں داخل ہونے اور نظم و امن برقرار رکھنے کے لئے مدعو کیا ہے، اور یہ کہ سیاسی

کونسل میں حیدر آباد کا جو مسئلہ درپیش ہے اسے وہ واپس لیتے ہیں، جسے لائق علی وزارت نے پیش کیا تھا۔

ریڈیو پر نظام کی بے بسی نظام تیار ہو گئے، لیکن معلوم ہوا براڈ کاسٹنگ اسٹیشن اب تک کبھی جانے کا انھیں اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔

"آپ کس طرح براڈ کاسٹ کرتے ہیں؟" نظام نے سوال کیا۔

"یہ تو بہت آسان ہے!" میں نے کہا "بس اس ٹیوب کے سامنے منہ کر کے بولتے چلے جایئے!"

نظام کی استدعا پر میں بھی چند لفظ ریڈیو پر بولنے پر آمادہ ہو گیا، تقریر کا مسودہ میرا منظور شدہ تھا، اس میں نظام نے شکر گزاری کے ساتھ میری امداد و اعانت کا ذکر بڑھا دیا۔

کنگ کوٹھی سے میں شاہ منزل لائق علی سے ملنے گیا، میں ان کی بعض عنایتوں کا شکر گزار تھا، وہ کھوئے کھوئے سے نظر آئے، رخصت کے وقت ہم دونوں اسی گرم جوشی اور دوستی کے ساتھ جدا ہوئے جس طرح ایک موکل اور وکیل کی حیثیت سے ہم دونوں پہلے پہل ملے تھے۔

پھر میں عیدروس سے ملا، میں جانتا تھا حیدر آباد کے ارد گرد سرنگوں کا جال بچھا ہوا ہے، میں نے ان سے کہا اس بلا کو یہاں سے جلدی ہٹا لیجئے۔

پرنس آف برار کا مجھے ساتھ رکھنے پر اصرار مجھے فوجی آداب و اطوار کا کوئی اندازہ نہیں تھا، مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میجر جنرل چوہدری کا استقبال جب وہ حیدر آباد میں داخل ہوں گے کس طرح کیا جائے گا؟ نہ اس کا کوئی امکان تھا کہ دہلی سے ہدایات حاصل کر سکوں، لہذا ہم نے طے کیا کہ العیدروس پرنس آف برار کے ساتھ، جو سپہ سالار اعلیٰ تھے رسمی طور پر ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیں میں نے پرنس سے استصواب کیا، وہ تیار ہو گئے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں بھی ہمرکاب رہوں، میں نے جنرل راجندر سنگھ جی کو وائرلیس سے مطلع کر دیا کہ ہم نے کیا طے کیا ہے؟

میرا اور نظام کا نشریہ اب میں وائرلیس اسٹیشن پہنچا، اور اپنی نشر ہونے والی تقریر کا

مسودہ تیار کیا، ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے نظام بالکل نہ جان سکے کہ انھیں کس طرح بولنا چاہیئے
ان کی آواز لرز رہی تھی، ان کی گھبراہٹ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میرا نام تک غلط
لے گئے وہ کے، ایم، صاحب، منشی صاحب"، بہر حال نظام نے اپنے نشریہ میں وہی باتیں کہیں،
جن کی میں نے انھیں ہدایت کی تھی، اور جن کا ابھی ابھی میں ذکر کر چکا ہوں، نظام کے بعد میں
نے تقریر کی، اس تقریر میں دوسرے امور پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔

"میں باشندگان حیدرآباد سے خاص طور پر یہ کہدینا چاہتا ہوں، اب ان
کی قسمت ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہو چکی ہے۔ ہم ایک قوم ہیں، اور کبھی جدا
نہیں ہو سکتے، میں آپ کو ایک بات کا یقین دلاتا ہوں، یہ یقین ہمارے
وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی کئی بار دلا چکے ہیں کہ بھارت ایک غیر مذہبی
حکومت ہے، اس کی نظر میں مذہب اور نسل کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ ہر شخص
کو وہ شہریت کے مکمل حقوق دیتی ہے، نہ مسلمانوں کے لیئے، نہ ہندوؤں
کے لئے اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا ہونے کی کوئی گنجائش ہے، میں
آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ہراساں نہ ہوجیئے، حیدرآباد میں بھارتی
فوج کا داخلہ خالص دوستانہ انداز میں ہوگا، اب نہ قانون شکنی برداشت کی
جائے گی، نہ کسی پُر امن شہری کو ہدفِ ستم بننا پڑے گا۔ ہندوستانی فوج
دوستوں کی فوج ہے، جو حیدرآباد کو ان مصائب سے نجات دلائے گی
جن میں گزشتہ بارہ ماہ سے وہ مبتلا تھا"

جوش سے بھرے ہوئے ہندو

واپسی میں دلکشا سدن جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ حیدرآباد اور سکندرآباد کی سڑکیں
جوش سے بھرے ہوئے ہندوؤں سے پٹی پڑی ہیں، جو پر جوش نعرے لگا رہے تھے،
بڑے بڑے جلوس قومی جھنڈا ہاتھ میں لئے گشت کر رہے تھے۔ بعض مقامات پر میں کار
سے اترا اور مختصر تقریر بھی کی، اور انھیں تشدد پر عمل پیرا ہونے سے روکا۔

حکومتِ ہند کا عجیب حکم

سوا آٹھ بجے اپنی قیام گاہ پر پہنچا تو پنڈت جی کا پیام میرا

تظار کر رہا تھا۔

ریڈیو پر کوئی تقریر آپ کو آج رات نہ کرنی چاہیئے، نہ حکومتِ ہند کی طرف سے کوئی وعدہ کرنا چاہیئے۔

حیدرآباد آرمی باقاعدہ طور پر ہمارے آرمی کمانڈر کے سامنے ہتھیار ڈالے گی جب تک مزید ہدایات نہ موصول ہوں ہمارا آرمی کمانڈر جملہ انتظامات کا انچارج ہوگا۔

ہتھیار ڈالنے کی رسم بالکل فوجی انداز میں ہوگی جس میں آپ کو شرکت کی اجازت نہیں ہے، نیز فوجی دستوں کی آمد کے وقت سکندرآباد میں نہ داخل ہونا چاہیئے۔"

حکومتِ ہند کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہ تھی

اس پیام کا مطلب اس کے سوا کیا تھا کہ حکومتِ ہند اپنے نمائندے کی حیثیت سے فوجی تقاریب میں میری شرکت پسند نہیں کرتی تھی، پیام کے لب ولہجہ نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ——— بہت زیادہ۔

میں نے جواب فوراً دیا۔

"آپ کا دائرس مجھے اس وقت ملا جب ریڈیو پر میری تقریر براڈکاسٹ ہو چکی تھی، میں نے کسی طرح کا کوئی وعدہ نہیں کیا ہے۔ تقریب میں شرکت کے پروگرام منسوخ کر دیے ہیں، اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو درگزر کیجیئے!"

یہ بات میں نے اسی وقت محسوس کر لی، اور بعد میں اس کی تصدیق بھی ہوگئی کہ ان تین دنوں میں میں نے جو کچھ کیا تھا، نئی دہلی کے بعض سرکاری حلقوں میں اسے سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، میرے اس اقدام کے بارے میں سوچا یہ گیا کہ میں نے نظام کو بچالیا، نیز یہ کہ محض میری وجہ سے حکومتِ ہند کی آزادیٔ عمل میں رکاوٹ پیدا ہوگئی، اور وہ نظام کے ساتھ من مانی نہ کر سکی، یہ صورتِ احوال خالص فوجی تھی، فوجی حکام و افسران ہی کو اس سے نپٹنا چاہیئے تھا، میرے لئے یہ مناسب نہ تھا کہ کسی طرح بھی اسٹیج پر نمودار رہتا۔

میرے خدمات رائیگاں گئے

لیکن نئی دہلی کے مکینوں کو ان حالات کا اندازہ کب ہو سکتا تھا، حیدر آباد میں کوئی حکومت موجود نہیں تھی۔ رضوی نے اپنے آدمیوں کو وافر تعداد میں اسلحہ مہیا کر دیا تھا کہ جیسے ہی فوج داخل ہو، وہ ہندوؤں کا، قتل عام شروع کر دیں، کسی کو نہیں معلوم تھا کہ فوج کب داخل بلدہ ہو رہی ہے، کیونکہ کئی کئی میل تک شہر کے ارد گرد سرنگیں بچھی ہوئی تھیں۔ فوج کا داخلہ اگر خالص فوجی طور پر ہوتا تو حیدر آباد میں خون کی ندی بہنے لگتی۔

صیانتی کونسل میں حیدر آباد کے مسئلہ پر بحث ہوا ہی چاہتی تھی، کہ اگر میں نے نظام کو بر وقت مشورہ دے کر ان سے اپنے شرائط نہ منوا لئے ہوتے تو حکومت ہند کے ہاتھ سے یہ زریں موقع نکل جاتا کہ نظام نے رضا کارانہ طور پر ہتھیار ڈالے ہیں، باشندگان حیدر آباد کو مصیبت سے نجات دلانے والا ہمارا یہ اقدام خالص فوجی نوعیت کے فتحمندانہ اقدام میں تبدیل ہو جاتا، اور وہ تاجِ شہادت جس سے بہادر شاہ ظفر محروم رہا تھا نظام کے سر پر رکھ دیا جاتا۔

ان حالات میں میرا یہ فرض تھا کہ میں دنیا کو یہ باور کراؤں کہ حالات کی ابتری کے باعث خود نظام نے ہندوستانی فوج کو دعوت دی تھی۔

رضوی کے گھر پر پہرہ

نام نہاد حیدر آبادی وفد نے صیانتی کونسل میں یہ رویہ اختیار کیا تھا کہ نظام ہندوستانی فوج کے ہاتھ میں قید ہیں، اور ان کا نشریہ ایک قیدی کا نشریہ تھا، میری ہی وجہ سے یہ دعویٰ بعید از حقیقت ثابت ہوا، کیونکہ نظام کی تقریر کے وقت میجر جنرل چوہدری حیدر آباد سے چوالیس میل دور تھے، اور میں انڈیا کا ایجنٹ جنرل نظام کے ہاتھ میں قید اور رضوی کے رحم و کرم پر تھا، میرے اس اقدام نے صیانتی کونسل کی نظر میں انڈیا کی پوزیشن مستحکم کر دی

جنرل عیدروس نے رضوی کے گھر پر پہرہ بٹھا دیا، رضوی نے کوئی مزاحمت نہیں کی!۔

پولیس ایکشن کے بعد!

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ان واقعات پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، جو لیک ویو میں میری نظر بندی کے دوران پیش آئے۔

حیدر آباد کی غلط فہمی

ان تیاریوں سے قطع نظر جو حکومت حیدر آباد، اور مجلس اتحاد المسلمین نے حکومت ہند کے اقدام و عمل کی مزاحمت کے سلسلے میں کی تھیں۔ انھیں اپنی جگہ یہ یقین بھی تھا کہ نئی دہلی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ کوئی قدم اٹھا سکے، اور اگر اس نے یہ حماقت کی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ خود تباہ ہو کر رہ جائے گی۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے حکومت حیدر آباد اور مجلس کا خیال تھا کہ برطانوی حکام کی علیحدگی، اور ساز و سامانِ جنگ کی کمی کے باعث، ہندوستانی حکومت کوئی بڑی فوجی مہم شروع کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی، خاص طور پر اس صورت میں کہ کشمیر نے اسے الجھا رکھا ہے۔ اس یقین کا اظہار ریڈیو پاکستان سے بھی ہوتا رہتا تھا، بھارتی فوج کے سابق برطانوی افسران جنھیں حیدر آباد نے ملازم رکھ لیا تھا، اور حیدر آباد

آرمی کے سینیر افسران اس بات کا یقین کامل رکھتے تھے کہ اگر موقع پیش آیا تو وہ ہندوستانی فوج کے پرخچے اڑا کر رکھ دیں گے۔

حیدرآباد کی مسلمانانِ ہند سے غلط امیدیں

اتحادی لیڈروں اور لائق علی کا خیال تھا کہ ایک مرتبہ اگر حیدرآباد کے خلاف کوئی اقدام کیا گیا تو ملک میں بڑے اور وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، یہ ایسا خطرہ ہے جسے صوبائی حکومتیں جھیلنے کو تیار نہیں ہو سکتیں۔ انھیں یہ اعتماد بھی تھا کہ اگر حیدرآباد کے خلاف کچھ کیا گیا تو ہندوستان کے مسلمان تنِ واحد بن کر حکومتِ ہند کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔

پاکستان سے آس

اتحادی لیڈروں کا یہ ایمان بھی تھا کہ پاکستان کے قائدین اور عوام حیدرآباد کے ساتھ ہیں اور وقت آنے پر دل سے اس کی سعیٔ آزادی کا ساتھ دیں گے۔ اگرچہ مسٹر جناح ان سے کہہ چکے تھے کہ پاکستان کو وہ کسی خطرہ میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہیں، انھیں یہ توقع بھی تھی کہ اگر حکومتِ ہند نے حیدرآباد کے خلاف کوئی اقدام کیا تو رائے عامہ پاکستان کو مجبور کر دے گی کہ وہ مداخلت کرے، انھیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اگر پاکستان نے مداخلت کی تو انڈیا کو بڑی آسانی سے مغلوب کر لیا جائے گا۔

سردار اور پنڈت جی کے اختلافات

یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کے سرکاری حلقوں میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ پنڈت جی اور سردار کے مابین شدید اختلافات رونما ہو گئے ہیں ان اختلافات کی یہ آواز بازگشت حیدرآباد میں دل کے کانوں سے سنی جاتی تھی۔ نظام گورنمنٹ کے ایجنٹ نئی دہلی میں گورنمنٹ سکریٹریٹ کے چکر کاٹتے رہتے تھے، اور جب پنڈت جی اور سردار کے اختلافات بیان کرتے تھے تو اپنی طرف سے بھی کچھ بڑھا دیتے تھے، یہ خوش فہمی بھی عام تھی کہ اگر سردار نے پولیس ایکشن کی تجویز پیش کی تو پنڈت جی انھیں مستعفی ہونے پر مجبور کر دیں گے، کیونکہ اس طرح ان کی بین الاقوامی شہرت اور وقار کو صدمہ پہنچے گا۔

سردار نے کمان ہاتھ میں لے لی

اس ساری مدت میں بھارت کو خطرہ کے احساس نے مبہوت اور ششدر کر رکھا تھا، اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ دہلی کے بعض حلقوں میں تذبذب اور تامل کا عالم طاری تھا، لیکن اب سردار تندرست ہو چکے تھے اور حالات کی باگ انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی — اب ان کی کوششیں دو امور پر مرکوز ہو رہی تھیں، ایک یہ کہ اتنی فوج جلد از جلد فراہم کر لی جائے، جو پیش نظر مہم کے لئے کافی ہو دوسری یہ کہ ملک میں پولیس ایکشن کے زمانہ میں مکمل نظم و امن قائم رہے۔

حسب ضرورت فوج کا مہیا کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا، ہندوستان کی مغربی سرحدات اور کشمیر کا دفاع نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ حیدر آبادی مہم سے فائدہ اٹھا کر پاکستان کے ہر متوقع اقدام کی پیش بندی کر لی جائے۔ پولیس ایکشن کے سلسلہ میں جن دستوں سے کام لینا تھا ان کی نقل و حرکت کا آغاز مئی سے ہو گیا، اور جولائی تک یہ مرحلہ طے کر لیا گیا، ستمبر میں اس مہماتی فوج کی تعداد بیس ہزار تک پہنچ گئی، یہ فوج ہر اعتبار سے منظم اور بہترین ساز و سامان سے مسلح تھی۔

انگریز کمانڈر انچیف کا تامل و تذبذب

اکثر ہندوستانی افسران پولیس ایکشن کی منصوبہ بندی میں لگے ہوئے تھے، ان میں سے اکثر نے حیدر آباد جا کر وہاں کے فوجی حلقوں کا بچشم خود مشاہدہ اور اندازہ کیا تھا، اور کامل اعتماد کے ساتھ یہ رائے قائم کی تھی کہ منصوبہ پر تیز رفتاری کے ساتھ بغیر کسی اندیشہ کے عمل کیا جا سکتا ہے، صرف جنرل بوچر (Buchet) کمانڈر انچیف ایسے شخص تھے جو آخر وقت تک متامل رہے، انھوں نے حیدر آباد آرمی کی قوت اور اہلیت کا زیادہ سے زیادہ اور اپنی ہندوستانی فوج کی قوت اور اہلیت کا کم سے کم اندازہ لگایا، دراصل وہ سردار اور صوبائی حکومتوں کی اس خوبی کا اندازہ نہیں کر سکے کہ اندرونی امن اس ساری مدت میں ضرور اور ہر قیمت پر قائم رکھنے میں وہ کامیاب ہو سکیں گے۔ بہت سے انگریزوں کی طرح وہ اس کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے تھے کہ رضاکار جماعت کو کچلنے کے لئے

جو قیمت بھی ادا کی جائے وہ کم ہے، کیونکہ یہ خطرہ سارے ہندوستان کی سلامتی کیلئے
پیام قضا بن گیا تھا۔

اتحادی لیڈروں نے ڈیڑھ سال کی مدت میں ہندوستانی مسلمانوں کو جو حیدرآباد
سے باہر رہتے تھے متحد کار کرنے کی جو کوششیں کی تھیں وہ بہت کم بارآور ہوئیں،
تقریباً یک آواز ہو کر ہندوستان کے سارے مسلم پریس نے اعلان کیا کہ یہ مصیبت خود
نظام کی لائی ہوئی ہے، صحیح الخیال مسلمان خواہ حیدرآباد کے ہوں، یا حیدرآباد سے
باہر کے مجلس اتحاد سے ذرا بھی ہمدردی نہیں رکھتے تھے، بلکہ متنفر تھے کہ مجلس اتحادالمسلمین
نے اپنی تفرقہ پسندی کے باعث سارے ہندوستان کی فضا مکدر کر رکھی ہے، اوران خوشگوار
تعلقات کی راہ میں حائل ہے جو مسلمان تقسیم ہند کے بعد سے ہندوؤں کے ساتھ قائم
رکھنا چاہتے تھے۔

صوبائی حکومتیں ہر طرح تیار تھیں

سردار بہرحال ہر طرح چوکس تھے، ان کی ہدایت کے مطابق صوبائی حکومتوں نے ہر مقامی طوفان
کا مقابلہ کرنے کی پوری تیاریاں کر لی تھیں، ہر امکانی فرقہ وارانہ فساد کا سدباب کرنے
کے لئے نہایت احتیاط سے منصوبہ بندی کر لی گئی تھی، کوئی شبہ نہیں چند سربرآوردہ مسلم لیگی
حضرات حیدرآباد سے علانیہ اظہار ہمدردی کر رہے تھے، ان کی خبر لینا ضروری تھا، متعدد
شہروں میں احتیاطی اقدامات کرلئے گئے تھے، جلسوں اور جلوسوں پر بھی پابندی عائد
کر دی گئی تھی۔

دہلی میں پاکستانی پناہ گزینوں کے ریلے نے عام مسلمانوں کے خلاف نہایت خوفناک
فضا پیدا کر دی تھی، مسلح پولیس اور فوجی دستے بالکل چوکس اور چوکنے کھڑے تھے کہ اگر
مسلمان غنڈے ذرا بھی سر اٹھائیں تو کچل دیئے جائیں۔

یوپی کے مسلمان حیدرآباد کے ساتھ تھے

اترپردیش (یوپی) میں کچھ مسلم عناصر ایسے تھے جو حیدرآباد کے دل وجان سے بہی خواہ
تھے، یہ لوگ تقسیم ہند کے دن ہی سے مخالف ہندوستیت کے علمبردار نظر آرہے تھے، ان

عناصر کو پنڈت گوبند بلبھ پنت وزیر اعلیٰ یو پی نے واضح طور پر متنبہ کر دیا تھا، اور ایک پبلک جلسہ میں اعلان کر دیا تھا کہ جو مسلمان انڈین یونین کے غدار ہیں۔ ان کی سرکوبی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جائے گا۔

ان احتیاطی پیش بندیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس ایکشن کے دوران میں سارے ملک کے اندر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ اور کامل امن وامان قائم رہا، ۱۶ ستمبر کو سردار نے بھارت کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو اس بات پر مبارک باد دی کہ انھوں نے متفقہ طور پر پولیس ایکشن کے زمانہ میں حکومت کا ساتھ دیا۔

سردار کا اضطراب

اگرچہ سردار حیدرآباد کے خلاف اقدام وعمل کا فیصلہ کر چکے تھے پھر بھی وہ سخت پریشان تھے انھیں ایک فکر تو یہ تھی کہ بین الاقوامی رائے عامہ ہندوستان کے خلاف ہو جائے گی، ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ یقین بھی تھا کہ کہ اگر ملک میں امن قائم رہے اور پولیس ایکشن تیز رفتاری اور سبک دستی کے ساتھ انجام پائے تو یہ مخالف رائے عامہ ہموار بھی ہو سکتی تھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نئی دہلی کے سرکاری حلقوں میں پولیس ایکشن کے وقت اور انداز کے بارے میں سخت اختلافات موجود تھے کابینہ کے طوفانی اجلاس ہو رہے تھے۔ لیکن رنڈرایڈورڈس (Edwards)کے رضا کاروں کی ستم رانیوں سے متعلق جو چھٹی لکھوا کر میں نے انگلینڈ کے مختلف کلیساؤں کو بھجوائی تھی، اور جس کی ایک نقل حکومتِ ہند کو بھی بھیج دی تھی، اس موقع پر بڑی ساز گار ثابت ہوئی، اور اطمینان ہو گیا کہ اب بین الاقوامی رائے عامہ انڈیا کے خلاف نہیں جائے گی۔

۱۲ ستمبر کو مسٹر جناح کی خبر وفات موصول ہوئی، بعض لوگوں کا خیال تھا کہ جناح کی موت اور پولیس ایکشن کے مابین ایک خاص رابطہ تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۳ ستمبر کے پولیس ایکشن کا فیصلہ ۹ ستمبر ہی کو کر لیا گیا تھا۔

جنرل بوچر کی سردار سے گفتگو

مجھے بتایا گیا ہے کہ ۱۲ ستمبر کو آدھی رات کے وقت جنرل بوچر (Bucher)نے سردار سے فون پر گفتگو کی،

اتنی رات گئے انھیں بستر سے اٹھانا بڑی غیر معمولی بات تھی، بہرحال سردار فون پر آئے، جنرل بوچر نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ان کی بات غور سے سنیں، اور زیادہ نہیں تو چند روز کیلئے حیدر آباد کے خلاف فوجی مہم ملتوی کر دیں۔ انھوں نے احمد آباد اور بمبئی پر امکانی فضائی حملہ کا ذکر بھی کیا، ایک کمانڈر انچیف کے لئے ایسی خبروں پر اعتماد کر لینا واقعی بے حد تعجب انگیز تھا۔ سردار نے جنرل بوچر کو یاد دلایا کہ جنگ عظیم میں لندن کو کہیں زیادہ فضائی تباہ کاریوں سے سابقہ پڑا تھا، اور بوچر کو یقین دلایا کہ اگر حیدر آباد اور بمبئی پر فضائی حملہ ہوا تو یہ دونوں شہر پامردی سے بھگت لیں گے۔

۱۳ ستمبر کو چار بجے سہ پہر کے وقت ہندوستانی فوجیں شولاپور کے راستہ سے حیدر آباد میں داخل ہوئیں، رات ہوتے ہوتے احمد نگر، سی پی، مدراس اور میسور کی طرف سے انڈین افواج نے سرحد پار کر لی۔

یورپین صحافی ہمارے خلاف تھے

جب دنیا کے سامنے پولیس ایکشن کی خبر کا اعلان ہوا تو گرین لینڈس کے یورپین صحافی مہمان، جن کی پذیرائی اور ضیافت بڑے ٹھاٹھ سے اب تک ہو رہی تھی، ہندوستان کے خلاف بڑے تلخ انداز میں مورچہ سنبھال کر بیٹھ گئے، ان کے خیال میں ہندوستان نے ایک آزاد ہمسایہ ملک کی آزادی، اور خود مختاری پر حملہ کیا۔

۱۵ ستمبر کو برطانوی دارالعوام میں ایک مباحثہ ہوا۔ سر انتھونی ایڈن اور اینورن بیون (Aneurin Bevan) دونوں نے ہندوستان کو اس اقدام پر ملامت کی، سر انتھونی ایڈن نے اس اقدام کو "جارحانہ حملہ" سے تعبیر کیا، لارڈ سالسبری کا دل برطانیہ کے پرانے یار وفادار نظام کے حال زار پر خون کے آنسو بہا رہا تھا۔

۱۶ ستمبر کو صیانتی کونسل نے حیدر آباد کا مسئلہ باقاعدہ اپنے ایجنڈے میں شامل کر لیا، پولیس ایکشن کی خبر کے بعد یہ خبر پھیلی کہ حیدر آباد سے سلسلہ مواصلات بالکل منقطع ہو چکا ہے، اور میں بالکل "پردۂ غیب" میں نہاں ہو چکا ہوں، تو میرے دوستوں کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ مجھے زندہ دیکھنے کی آس کھو بیٹھے۔

کامیاب یلغار نلدرگ کے استحکام پر حیدرآباد کو بڑا بھروسہ تھا، اور دعویٰ یہ تھا کہ یہاں میجر جنرل چوہدری کی فوجوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا، لیکن چند گھنٹوں میں یہ قلعہ سر ہوگیا، بات یہ ہے کہ حیدرآباد کی افواج باقاعدہ اور بے قاعدہ نے ابتک کوئی حقیقی جنگ دیکھی ہی نہ تھی، نلدرگ کے معرکہ میں حیدرآباد کی طرف کے بہت سے لوگ ہلاک اور مجروح ہوئے۔

ہندوستانی فوج کی یورش ۱۵ ستمبر کو انڈین سپاہیوں نے اورنگ آباد پر قبضہ کر لیا، یہاں مزاحمت ہوئی، لیکن بہت کمزور، اورنگ آباد کالج کا ایک لیکچرار ابراہیم اتحادی ذہنیت کا سراپا جوش شخص تھا، اس نے چند طالب علموں کو ساتھ لیا، اور انڈین ٹینکوں کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا، ہمارے افسر نے لڑکوں کو سمجھایا کہ وہ ہٹ جائیں، بعض نے یہ نصیحت مان لی بعض نے نہ مانی، وہ نعرے لگاتے راستہ پر کھڑے رہے، آخر جان سے گئے، ابراہیم بھاگ کھڑا ہوا، بعد میں گرفتار بھی کر لیا گیا، لیکن آئندہ وفادار رہنے کے وعدہ پر رہا کر دیا گیا، بعد میں وہ لاپتہ ہو کر غالباً اس سرزمین پر پہنچ گیا، تاکہ اپنی ان جنونی حرکتوں کو یاد کر کے خون کے آنسو روتا رہے جن کے باعث کئی معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔

برق رفتار کامیابی میجر جنرل چوہدری کی برق رفتار کامیابی نے ساری دنیا میں فوجی نقطۂ نظر سے بھارت کا پلہ بھاری کر دیا۔

۲۶ ستمبر کو گورنر جنرل راجہ جی نے اس کامیابی سے مسرور ہو کر قومی طور پر "یوم دعا و تشکرانہ" منانے کا اعلان کیا۔

سقوطِ حیدرآباد کا ردعمل پاکستان پر پاکستان میں ابتک حیدرآباد کی ظفرمندیوں کی خبریں نشر ہو رہی تھیں، دفعتاً نظام نے غیر مشروط سپردگی کا اعلان کر دیا، ایک بہت بڑا مجمع بپھرا ہوا، ہندوستانی ہائی کمشنر متعینہ پاکستان سری پرکاش کی قیام گاہ پر مظاہرہ کرتا ہوا پہنچا پھر لیاقت علی خاں کی قیام گاہ پر جا کر مطالبہ کرنے لگا، کہ پاکستان فوراً بھارت پر حملہ کر دے مسٹر لیاقت علی خاں کیلئے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ وہ بڑی مشکل سے مجمع کو اس کا قائل کر سکے کہ نہ وہ ایسا کریں گے نہ ایسا کرنا چاہتے ہیں۔

ایک مرحلہ کا اختتام!

۱۰ ستمبر کو میں ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے آرام کی ضرورت تھی مگر وہ میسر نہ تھا۔ دین یار جنگ، ذوالقدر جنگ اور ابوالحسن سید علی نظام کی طرف سے یہ درخواست لے کر آئے کہ میں فوراً ان سے مل لوں۔

نظام سے میری ملاقات جب میں کنگ کوٹھی پہنچا تو میں نے دیکھا کہ نظام اپنی دولت کے بارے میں سخت پریشان ہیں، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ افواج ہند کے داخلہ کے وقت بھی ان کے خاص محافظ کنگ کوٹھی کا پہرہ دیتے رہیں۔ میں نے کہا جہاں تک میں سمجھتا ہوں قصر شاہی میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی جائیگی، ہماری فوج اس کا لحاظ رکھے گی کہ آپ کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچے، پھر میں سردار کو فون کرکے ان سے ہدایات لے لوں گا۔

دکھشا سدن واپس آنے کے بعد میں نے سردار کو فون کیا، ان کی بھی وہی رائے تھی جو میری تھی، یہ بات میں نے نظام کو بتادی۔

حیدرآباد کے ہندو مظاہرین کا جوش مجھے معلوم ہوا کہ حیدرآباد اور سکندرآباد کی

سڑکوں پر ہندو مظاہرین اس جگہ کے قریب جہاں مسلم پناہ گزین مقیم تھے گھوم رہے ہیں جس سے ہندو مسلم فساد کا اندیشہ پیدا ہوگیا ہے، میں نے فوراً راما چار، پنالال اور سوامی رامانند سے استدعا کی کہ وہ جوش سے بھرے ہوئے ہندو مجمع کو منتشر کر دیں، تاکہ کوئی حادثہ رونما نہ ہونے پائے۔

دلکشا سدن پہنچنے کے بعد ایک نہایت دلچسپ لطیفہ سننے میں آیا، یہ کہ آج سب سے زیادہ مصروف حجاموں کا طبقہ تھا، ہر رضا کار داڑھی منڈانے پر تلا ہوا تھا۔ رضا کاروں نے داڑھی سمیت اپنی وردی، ہتھیار، اسلحہ، ہر چیز قریب ترین کنوؤں میں پھینک دی۔

سردار سر مرزا کو بھی نہیں چاہتے تھے

سر مرزا اسماعیل نے فون کر کے مجھ سے حیدرآباد آنے کے لئے پوچھا، میں نے کہا سردار سے پوچھ لیجئے، بعد میں سردار سے میں نے سر مرزا کے بارے میں استصواب کیا تو انھوں نے فرمایا، ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ حیدرآباد نہ جائیں، بنگلور میں آرام کریں۔

پرنس آف برار مجھ سے ملنے آئے، بہت خوش تھے، جب سے میں حیدرآباد آیا ہوں اس وقت سے ابتک ان کا طرز عمل میرے ساتھ حد درجہ دوستانہ رہا تھا۔ پولیس ایکشن کے نتیجہ پر سارے حیدرآباد میں ان سے زیادہ مسرور اور خوش و خرم کوئی شخص نہ تھا۔

بھارتی فوج کا داخلہ حیدرآباد میں

سہ پہر کو بھارتی فوج حیدرآباد میں داخل ہوئی۔ باشندگان شہر سڑکوں پر صف بستہ قومی پرچم ہاتھ میں تھامے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔

میجر جنرل چودھری نے لائق علی اور ان کی کابینہ، رضوی اور اس کے رفقاء کی گرفتاری کا فوری حکم صادر کیا، افواج نظام کا بڑا حصہ ہتھیار رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

میرا استعفا

ساڑھے چار بجے میجر جنرل چودھری دلکشا سدن آئے اور میرے ساتھ چائے پی، اسی دن میری بیوی بچے بھی آگئے، شام کو میں نے سردار کے نام خط لکھا۔

"حیدرآباد نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے، ہماری فوج شہر میں داخل ہوگئی،

ہٰذا اب میرا کام ختم ہوگیا، آپ نے جب یہ ذمہ داری مجھے سونپی تھی اور باپو نے اسے دھرم کا کام قرار دیا تھا تو میں نے یہ بارِ گراں اپنے دوشِ ناتواں پر اٹھالیا تھا، آپ کے اعتماد اور خدا کے فضل نے مجھے ناکامی کے داغ سے بچالیا، ہٰذا اگر آپ اجازت دیں تو میں اس ذمہ داری سے اپنے آپ کو آزاد تصور کروں

اس کے معنی نہیں ہیں کہ میں آپ کی خدمت سے جی چراتا ہوں، جب اور جہاں کہیں آپ مجھے طلب کریں گے، موجود پائیں گے، لیکن اب ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے میرا کام ختم ہو چکا ہے۔"

ہندوستانی فوج کے ہاتھوں میری تذلیل ۱۹ ستمبر کو جنرل راجندر سنگھ جی بذریعہ طیارہ تشریف لائے تھے، بخار کے باوجود مجھے استقبال کیلئے جانا پڑا، میجر جنرل چوہدری نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"مسٹر منشی آپ ادھر کہاں؟"

چوہدری ایک نوجوان آدمی تھے، اور فتحمندی کے نشہ سے مخمور، ہٰذا ان کے بالادستانہ لب ولہجہ اور ناروا طرزِ عمل کو میں برداشت کر گیا۔

۲۰ ستمبر کو میرا ٹمپریچر ایک سو پانچ تک پہنچ گیا۔ اور میرا فیملی ڈاکٹر بمبئی سے بلایا گیا۔

۲۱ ستمبر کو وی۔ پی مینن، ایچ ایم پٹیل، این ایم بچ اور کرشنا پرشاد ڈائرکٹر جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف حیدرآباد آئے۔

مجھے پنڈت جی کا ایک تار ملا کہ فوراً دہلی پہنچوں اور متعلقہ کانفرنس میں شرکت کروں لیکن میرے لئے بستر سے جنبش کرنا بھی ممکن نہ تھا، ۲۲ ستمبر کو میری بیوی اور ڈاکٹر مجھے لیکر بمبئی روانہ ہوگئے۔

مسلم اقوام کے نام نظام کا نشریہ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ سر راما سوامی مدلیار نے نظام کے نشریہ سے صیانتی کونسل (Security Council) میں کافی فائدہ اٹھایا۔

"نظام نے صیانتی کونسل سے اپنی شکایت" سر مدلیار نے کہا "اسی وقت واپس لے لی تھی جب ابھی ہماری فوجیں حیدرآباد پہنچی بھی نہیں تھی حقیقت یہ ہے کہ ہماری فوجیں حیدرآباد میں نظام کی درخواست پر داخل ہوئیں۔"

۲۲ ستمبر کو وزارت امور خارجہ کی درخواست پر میں نے اس پیام کا مسودہ تحریر کیا جسے نظام نے ۲۳ ستمبر کو مسلم عوام کے نام براڈکاسٹ کیا۔ سر راما سوامی مدلیار نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے صیانتی کونسل میں اس کے اقتباسات بھی پیش کئے۔

حکومتِ ہند کے ہاتھوں میری دُرگت

پولیس ایکشن کے ستم زدگان میں ایک حکومت ہند کا ایجنٹ جنرل متعینہ حیدرآباد اور اس کا اسٹاف بھی تھا۔

مجھ جیسے عمر رسیدہ شخص کا ٹائیفائڈ میں مبتلا ہونا خاصا سنگین واقعہ تھا، ۸ر اکتوبر تک ڈاکٹروں نے مجھے باہر کی دنیا سے بالکل منقطع رکھا، پھر بحالی صحت میں ایک مہینہ لگ گیا، میرے بائیں کان کی قوت سماعت میں بھی فرق آگیا۔

حیدرآباد کانگرس کے صدر نے میری نہ سنی

۸ر اکتوبر کے بعد جس شخص سے سب سے پہلے میں ملا، سوامی رامانند تیرتھ تھے، وہ دہلی سے حیدرآباد کانگرس کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں واپس جارہے تھے انھوں نے مجھ سے مشورہ لیا، میں نے ان سے استدعا کی کہ پچھلی باتیں بھول جائیں اور معاف کردیں، اور متحد ہوکر کام کریں، راما چار، راما کرشنا راؤ کے کانگرس گروپ سے رابطہ استوار کرلیں، تاکہ حیدرآباد کا بھلا ہو، وہ حیدرآباد گئے، اور راما چار اور راما کرشنا راؤ گروپ کے پانچسو کانگرسیوں کو کانگرس سے نکال دیا۔

فوجی افسران کا میرے ساتھ معاندانہ رویہ

بعض فوجی افسران کا رویہ میرے ساتھ حد درجہ معاندانہ تھا، یہ اس امید میں آئے تھے کہ حیدرآباد میں داخل ہوتے ہی حیدرآباد کو کچل دیں گے، نظام کو برطرف کر دیں گے، اور ساری حکومت کا صفایا کر دیں گے، میرا یہ جرم ان کی نظر میں قطعاً ناقابلِ معافی تھا کہ میرے مشورہ سے نظام نے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کرکے اپنی جان بچالی، اور ان حضرات کے سوچے سمجھے پروگرام کو پورا نہ ہونے دیا۔

میں اور میرا اسٹاف مدائذ بن گیا

جیسے ہی فوجی درو بست قائم ہوا، ان لوگوں کی نظر میں حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل اور اس کا اسٹاف مدائذ بن گیا، بلکہ یہ اسے ایک رقیب اور مخالف ادارہ تصور کرنے لگے، جیسے ہی میں بمبئی گیا، میری کار پر قبضہ کر لیا، بڑی اچھی لائبریری، قیمتی فرنیچر اور سامان خانہ داری، نیز وہ تاریخی اور ثقافتی مقالات و مضامین جو دکھشنا سدن کے ایجنٹ جنرل کے دفتر میں موجود تھے، مختصر سے نوٹس پر چند کوٹھریوں میں انھیں کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیا۔

مجھے خوشی ہے کہ پولیس ایکشن سے پہلے میں نے بعض ضروری کاغذات و مقالات یہاں سے منتقل کر دیئے تھے، ورنہ ان کا بھی نہ جانے کیا حشر ہوتا۔

میرا اسٹاف حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا

میرے اسٹاف نے جنوری سے ستمبر تک عالمِ نزع میں زندگی بسر کی تھی، لیکن ان کارناموں کو موجودہ برسرِ اقتدار لوگ حقارت کی نظر سے دیکھ رہے تھے، میں نے سردار کو کئی مرتبہ لکھا کہ میرے اسٹاف نے قابلِ قدر کام کیا ہے، اور وہ سزاوارِ اعتراف بھی ہے، لیکن میری یہ تحریریں وزارتِ امورِ ریاست کی ردی کی ٹوکری کی زینت بنی رہیں، کسی کام نہ آسکیں۔

میرا فون ٹیپ کیا جاتا تھا

دکھشنا سدن (سکندرآباد) سے میرا سکرٹری میری خیریت بمبئی میرے گھر پر فون کرکے دریافت کرتا

رہتا تھا، اِسے ٹیپ (Tappe) کر لیا جاتا ـــــ ہم نے جو گناہ کئے تھے، یہ سزا ملنی ہی چاہیئے تھی۔

میرا اسٹاف معتوب قرار دیا گیا میرا اسٹاف اب معتوب قرار دید یا گیا تھا، اسے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ان بیچاروں کو توقع تھی کہ جب حکومتِ ہند حیدرآباد کا چارج لے گی، اس اعتبار سے کہ ایک خطرناک ترین موقع پر اپنے فرائض سے چمٹے رہے تھے، صلۂ خدمت پائیں گے، لیکن صحت یابی کے بعد جب میں ممبران اسٹاف سے ملا، تو میرا دل یہ معلوم کرکے دکھا کہ حیدرآباد کے نئے اربابِ اختیار میرے اسٹاف سے وہی سلوک کر رہے تھے جو دشمن کے ساتھ کیا جاتا ہے، اسٹاف کے جو لوگ حیدرآباد رہ گئے تھے ان سے کہہ دیا گیا جہاں سینگ سما سکیں، چلے جائیں۔

میرے اسٹاف پر اعتماد نہیں کیا گیا امر واقعہ یہ ہے کہ میرے اسٹاف کو شروع ہی سے اعتماد کا نااہل سمجھا گیا، نہ اسے حکومت کے اس نظام کا حصہ سمجھا گیا جو حیدرآباد پر حکومت کرنے آیا تھا، ایجنٹ جنرل کا دفتر بند کرنے کا کوئی حکم اب تک صادر نہیں کیا گیا تھا، لہٰذا میرے اسٹاف کے لوگ دفتر بھی نہیں چھوڑ سکے تھے، عرصہ تک یہ بیچارے عالم نزع میں زندگی بسر کرتے رہے۔

میجر نندا اور میجر سنگھ نے خطرات دہالک میں گھر کر جو خدمات انجام دیئے تھے، ان کے پیشِ نظر میں نے کئی مرتبہ سردار، وزارتِ امور ریاست اور محکمہ دفاع سے کہا کہ ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، لیکن کسی نے نہ سنا۔

میرے اسٹاف کے ممبران جن مکانات میں رہتے تھے، فوجی حکام نے ان کا الاٹمنٹ منسوخ کر دیا۔ ۱۰ نومبر کو ان لوگوں نے ایک درد بھرا تار مجھے بمبئی بھیجا، میں نے کئی مرتبہ وزارت امور ریاست کو لکھا کہ یہ لوگ وہ ہیں جنھوں نے خطرہ کے موقع پر دیانت اور استقامت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے ہیں، اس سلسلہ میں متعلقہ حکام کو ذاتی خطوط بھی تحریر کئے تھے مگر ـــــ

سردار بھی کچھ نہ کر سکے ماتھران سے صحت یاب ہو کر واپس آنے کے بعد میں سردار سے ملا، میں نے انھیں بتایا کہ میرے اسٹاف کے ساتھ جو بدسلوکی روا رکھی گئی ہے، اس سے میں بے انتہا تلخی محسوس کر رہا ہوں۔

میرے خلاف ہندوستانی اخبارات کی مہم اس اثنا میں بعض ہندوستانی اخبارات نے میرے خلاف سخت و شدید الفاظ میں نکتہ چینی شروع کر دی، میری بیوی ان حملوں سے سخت متوحش ہوئیں، انھوں نے سردار کو ایک خط بھی لکھا جس کا جواب سردار نے یہ دیا۔

"تمہارا خط مورخہ ۵ ماہ حال ملا، مجھے تمہارے بھیجے ہوئے اخبارات کے تراشے بھی مل گئے، یہ وہ اخبارات ہیں جو مجھ پر بھی حملے کرتے رہے ہیں، ایسے رکیک حملوں پر ہمیں توجہ نہیں کرنی چاہیئے، جو شخص بھی پبلک کام کرتا ہے اسے دوسروں سے گالیاں کھانے کے لئے تیار رہنا چاہیئے، ان باتوں سے ہمیں بددل نہ ہونا چاہیئے، جب تک دیانت کے ساتھ ہم کام کرتے رہیں، اس طرح کی نکتہ چینیاں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں، لہٰذا تمھیں ذرا بھی پریشان نہ ہونا چاہیئے۔"

حکومت نے میرا استعفا منظور کر لیا ۱۱ر نومبر کو میں نے ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے باقاعدہ اپنا استعفا بھیج دیا۔

میرے استعفا کے جواب میں سردار نے لکھا:۔

"حکومتِ ہند خوشی سے آپ کا استعفا منظور کرتی ہے، آپ نے یہ منصب اس وقت سنبھالا تھا جب حیدرآباد اور انڈیا کے تعلقات حد درجہ کشیدہ ہو رہے تھے، حکومتِ ہند کی طرف سے میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہم عمیق جذبات کے ساتھ آپ کے اس احساس ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں، جس سے متاثر ہو کر آپ نے یہ گراں بار منصب قبول کیا، اور جو فرائض آپ کو تفویض کئے گئے تھے انھیں خوش اسلوبی سے انجام دیا!"

میرے زخم دل پر سردار کا پھاہا ۱۹ر نومبر کو میں دہلی پہنچا، دوستوں نے گرم جوشی

سے میرا استقبال کیا، اور میرے خدمات نیز جو تکلیفیں اور اذیتیں میں نے برداشت کی تھیں انھیں سراہا، لیکن بعض سرکاری حلقوں میں ایک طرح کے معاندانہ رویہ سے مجھے دوچار ہونا پڑا، ان کا خیال تھا کہ ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے میں نے بڑی بڑی غلطیاں کیں، میں نے سردار سے پوچھا۔

"آخر میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے کہ یہ حضرات میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے ہیں، جیسے میں نے اتحادالمسلمین کو ختم کرنے کے سلسلہ میں جو کچھ کیا، وہ بہت بڑا گناہ تھا!"

سردار نے ایک قہقہہ لگایا۔

"ان میں سے بعض لوگ اس لئے خفا ہیں کہ تم نے مجلس اتحادالمسلمین کو ختم کرنے میں نمایاں پارٹ ادا کیا، بعض اس لئے برہم ہیں کہ تم نے مجلس اتحاد کو یہ موقع کیوں نہ دیا کہ وہ نظام کو تخت سے اتار دیتی؟ کچھ میرے دشمن ہیں کہ میں نے تمھیں اس منصب پر کیوں مامور کیا؟ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، تم سے اس کی کسر نکالتے ہیں۔

میری ذہنی صعوبتیں حیدرآباد کے دورانِ قیام میں کافی ذہنی صعوبتیں مجھے برداشت کرنا پڑیں، بعض دفعہ جی چاہتا اس منصب سے الگ ہو جاؤں، کبھی محسوس ہوتا مجھے (سرکاری حلقوں میں) پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا جاتا، سردار جنھوں نے اس منصب پر مجھے مامور کیا تھا، وہ مجھے واپس کیوں نہیں بلا لیتے؟ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو میں وہی کروں گا جو مجھے مناسب نظر آئے گا، اور جو کچھ میں کرتا تھا ہر روز اس کی اطلاع بھی ——— کبھی کبھی دن میں دو دفعہ ——— انھیں دے دیا کرتا تھا۔

حیدرآباد میں میرے تمام اقدامات وحدتِ ہند برقرار رکھنے کے اصول پر مبنی تھے، اور میں نے اس فرض کو اچھی طرح انجام دیا، جسے خدا نے مجھے سونپا تھا۔

سردار کا اعتماد مجھے حاصل تھا میرے لئے سب سے بڑھ کر فخر و ناز کی بات یہ ہے کہ اس تمام مدت میں سردار کا اعتماد مجھے حاصل رہا۔

ایک دور کا خاتمہ

پولیس ایکشن کا خوشگوار نتیجہ پولیس ایکشن کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جنوبی ہند کی حالت بدل گئی، حیدرآباد میں حالات معمول پر آ گئے۔ ہمسایہ ریاستوں میں بھی امن و امان بحال ہوگیا۔ کاروبار پھر سے حسب معمول شروع ہوگیا، نظام گورنمنٹ نے جو پابندیاں عائد کر دی تھیں وہ ہٹا دی گئیں، سرکاری ملازمتیں صرف قابلیت اور اہلیت کے پیشِ نظر دی جانے لگیں۔

باہر کے مسلمانوں کو سبز باغ دکھا کر حیدرآباد میں بسانے کی پالیسی نتائج کے اعتبار سے بڑی سنگین ثابت ہوئی، رضاکاروں اور کمیونسٹوں کی سرگرمیوں نے ریاست کے متعدد علاقوں کے ہندوؤں کو ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ اس صورت حال سے بڑی احتیاط سے عہدہ برآ ہوتا تھا، دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو واپس کیا گیا، اور بھاگے ہوئے ہندوؤں کو واپس بلایا گیا، لیکن مصیبت زدہ مسلمانوں کی مدد سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔

نیا حیدرآباد جدید اسلوب پر، زرعی اصلاحات پر فوراً عمل شروع کیا گیا۔ نظام کے

ہولناک اقتدار کا سرچشمہ صرف خاص چھین لیا گیا۔ ۱۵۰۰ جاگیریں جو ۶۵۰۰ دیہاتوں پر اور ریاست کے ایک تہائی رقبہ پر مشتمل تھیں ختم کر دی گئیں۔

نظام راج پرمکھ بن گئے

۲۶ر جنوری ۱۹۵۱ء کو حیدرآباد کو درجہ "بی" کی ریاستوں میں شامل کر لیا گیا، اور نظام کو راج پرمکھ مقرر کر دیا گیا، جو دستوری سربراہ مملکت تھے، ۱۹۵۲ء میں نئے انتخابات، عام حق رائے دہی بالغان کے اصول پر ہوئے، اور ایک مجلس قانون ساز قائم ہو گئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا انجام

ہندی اور مقامی زبانوں کو اردو کی سطح پر لے آیا گیا، عثمانیہ یونیورسٹی جو اب تک مجاہدین ملت کو تخلیق کرتی رہی تھی، اب ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ایک معمولی یونیورسٹی بن گئی، جو ہر طرح کے فرقہ وارانہ امتیاز سے بالا تھی۔

ریاست حیدرآباد ختم

یکم نومبر ۱۹۵۶ء کو حیدرآباد کی قدیم ریاست جو عہد مغلیہ کی یادگار تھی ختم کر دی گئی۔ ریاست کے تلگو، مرہٹی اور کنڑی بولنے والے باشندے اپنے ہم زبان اور ہم ثقافت علاقوں سے وابستہ کر دیئے گئے۔

پولیس ایکشن ہی کی یہ ساری برکت ہے، ورنہ کچھ بھی نہ ہو سکتا۔

ہندو مسلم اختلافات

انگریزوں کے تسلط سے پہلے کے دور میں شہری مسلمان زیادہ تر مقامی نومسلموں کی اولاد تھے۔ یہ رفتہ رفتہ ہندوؤں کے ساتھ وہ برتاؤ کرنے لگے، جو فاتح کا مفتوح سے ہوتا ہے، ہندو جو اپنی نسل، مذہب اور معاشرت کی برتری کا جارحانہ احساس رکھتے تھے کڑھتے اور سلگتے رہے، کیونکہ مسلمان انھیں کمزور اور بزدل سمجھتے تھے، ہندو مظلوم اور مقہور تھے۔ ان کے جذبات بھڑکتے رہے۔

انگریزوں کے عہد میں ہندوؤں کو فروغ حاصل ہوا۔ اس عہد میں انھوں نے دولت بھی کمائی، پوزیشن بھی حاصل کی، اور وقار بھی حاصل کیا، انھیں مساوات اور اخوت کی حکومت ملی، قانون مساوات نے ان کی ذہنی صلاحیتوں اور تنظیمی

اہلیتوں کو ابھارا، اور اب وہ اس قابل ہو گئے کہ انہی کے سے جارحانہ انداز میں مسلمانوں کو ترکی بترکی جواب دے سکیں۔

ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کو ترکی بترکی جواب دیا

اگر مسلمانوں نے یہ کوشش کی کہ اپنے آپ کو منظم کریں اور تبلیغ کرکے ہندوؤں کو مسلمان بنائیں تو ہندوؤں نے بھی سنگھٹن اور شدھی کی تحریک شروع کردی، اگر مسلمانوں نے اردو کو زیادہ سے زیادہ عربی آمیز بنا دیا تو ہندوؤں نے بھی ہندی کو زیادہ سے زیادہ سنسکرت آمیز بنا دیا، مسلمان اگر اس پر فخر کا اظہار کرتے تھے کہ ان کے اجداد نے ہندوستان کو فتح کیا تو ہندوؤں کو اس دور پر ناز تھا جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھا، یا ان سورماؤں پر فخر تھا، جنھوں نے بہادری سے مسلمان حملہ آوروں کا مقابلہ کیا اور آخر وقت تک ہتھیار نہیں ڈالے۔

مذہب کے نام پر مسلمانوں کو اس پر اصرار تھا کہ وہ شاہراہ عام پر گائے کی قربانی کا حق رکھتے ہیں، لیکن ہندوؤں کے اس حق کو بھی کبھی تسلیم کرنے پر رضامند نہیں ہوئے کہ انھیں مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کا حق حاصل ہے۔

تحریک آزادیٔ ہند میں چند مسلمان بھی شریک تھے

لیکن بہت جلد ہندوستان کی نیشنلزم کی تحریک ایک پرزور قوت بن گئی، یہ ایک مشترک جذبہ تھا جس میں مغربی قومیت کا تصور، اور ہندوستان کے لئے مادرِ وطن ہونے کا تصور بھی شامل تھا، اس تصور نے ہندوؤں کی عظیم اکثریت اور چند مسلمانوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر لیا، مسلمانوں کا بڑا طبقہ اس جذبہ سے نفور تھا، بلکہ فرقہ وارانہ بنیاد پر تفرقہ پسندی کا قائل تھا۔

انگریزوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں جب انتقال اختیارات کا وقت آیا، تو تفرقہ پسند مسلمانوں کی بن آئی، پہلے تو ان لوگوں نے جداگانہ انتخاب، فرقہ وارانہ پاسنگ کا مطالبہ کیا، پھر وفاقی حکومت میں ہندو مسلم صوبوں کے توازن کا مطالبہ پیش کر دیا، اس کے بعد مرکزی مجلس آئین ساز میں ہندو مسلم مساوات کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس طرح کئی برس تک انھوں نے ہندوستان کی آزادی کا راستہ روکے رکھا، تفرقہ پسندی کے اس رجحان نے بالآخر یہ صورت اختیار کی کہ یہ ایک ملک میں رہنے پر تیار نہ ہوئے، اور اپنے لئے جداگانہ وطن کا مطالبہ کرنے لگے۔

ہندوستان کی تحریک انقلاب اخلاقی اقدار پر قائم تھی، لہٰذا قدرتاً اس نے مسلم اکثریت کے علاقوں کو اپنے ساتھ شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا۔

جب پاکستان قائم ہوگیا، اور کانگرس کے ہاتھ میں ہندوستان کی حکومت آگئی تو ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ فرقہ پرستی کے مرض سے آزاد ہوگیا، جو مسلمان ہندوستان میں رہ گئے وہ بھی کم از کم ظاہری طور پر فرقہ پرستی سے الگ ہوگئے۔

لیکن ان تبدیلیوں نے شمالی ہند کے ان مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں کیا، جو حیدرآباد ——— ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ——— میں برسر اقتدار تھے، مجلس اتحادالمسلمین کا تخیل اور وجود ہندوستانی مسلمانوں کا رہین منت تھا جنکی حقاقی طالع آزما مسلمان مدد کرتے تھے، انجمن کا مقصد یہ تھا کہ جدید طرز پر ایک فاسطی فرقہ پرستانہ اور جارحانہ مرکز ہندوستان میں ریاست حیدرآباد کی ہستی ناتواں پر قائم کیا جائے، اپنا مقصد ان لوگوں نے کبھی نہیں چھپایا، ان کا واضح مقصد یہ تھا کہ پاکستان سے یا پاکستان کی مدد کے بغیر ایک اسلامی مرکز پہلے حیدرآباد پھر جنوبی ہند کو بعد ازاں سارے ہندوستان کو بنادیا جائے، مجلس اتحاد کو ختم کردینا اس خطرناک اور ہولناک تصور کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کردینا تھا۔

نظام کچھ نہیں رہ گیا برسہا برس تک انگریزوں نے نظام کو اس خواب گراں میں مبتلا رکھا کہ ہندوستان میں وہ ایک مخصوص حیثیت کا مالک ہے، اپنی اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کی وہ ہمیشہ جد وجہد کرتا رہا، اگر نظام میں ذرا بھی حقیقت پسندی ہوتی یا اس نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا، تو وہ ہرگز یہ محسوس نہ کرتا کہ حیدرآباد کا وجود ہندوستان میں اٹھارویں صدی کے سیاسی زیر و بم کا نتیجہ تھا حقیقت واقعہ یہ ہے اُس کا وجود صرف غیر ملکی طاقت کا رہین منت تھا، جب اُس نے دیکھا کہ انگریز

جارہے ہیں، اس نے سوچا نہایت آسانی سے فرقہ دارانہ فاسطیت کا سہارا لے کر وہ اُس خلا کو پورا کرسکتا ہے جو انگریزوں کے جانے سے پیدا ہوگا۔

کوئی شبہ نہیں قاسم رضوی، لائق علی، معین نواز جنگ اور بعض دوسرے اصحاب ناقابل فراموش حیثیت اختیار کرچکے ہیں، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ حصول اقتدار کی اس جنگ میں عہد وسطیٰ کا آصف جاہی خاندان لگاتار اس جد وجہد میں مصروف رہا کہ ہندوستان کی انقلابی تبدیلیوں سے دامن کشاں نکل جائے۔ فرقہ وارانہ اور مذہبی عناصر صرف اس لئے بروئے کار لائے گئے کہ نظام اپنی جد وجہد آسانی کے ساتھ جاری رکھ سکے۔

اگر حیدرآباد ہندوستان سے غیر ملحق رہ جاتا تو سارے ملک میں طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا مجلس اتحاد المسلمین کی فرقہ وارانہ فاسطیت نے ہندوستان میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کردی تھی، ہندوستان کے مسلمان جو جمہوری ہندوستان کا ایک حصہ تسلیم کرلئے گئے تھے دشمن اور غدار سمجھے جانے لگتے اگر پولیس ایکشن میں ذرا بھی تاخیر کی جاتی تو رضوی کی بے پناہ طاقت ناقابل تسخیر بن جاتی، ہندو کمیونسٹوں کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوجاتے، امن اور سلامتی خطرہ میں پڑجاتی، اور کمیونسٹوں کا تسلط بہت زیادہ بڑھ جاتا۔

ایک دور ختم ہوگیا

ستمبر ۱۹۴۸ء میں جب حیدرآباد کا سقوط ہوا تو اس کے ساتھ ہی ساتھ فرقہ پرستی کا پرچم بھی ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہوگیا۔ حیدرآباد کا جس روز خاتمہ ہوا اُس طرح اسی دن ایک دور کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

خالدہ ادیب خانم کا سفر حیدر آباد

•

مشاہدات و تاثرات

•

مساجد میں وہی شورِ اذاں ہے

وہی اللہ اکبر بر زباں ہے،

وہی جوشِ دلِ اسلامیاں ہے

وہی رت ہے وہی اب تک سماں ہے

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشاں است

خم و خمخانہ با مہر و نشاں است!

•

حیدر آباد، اس کے نظم مملکت، اس کے فرمانروا، وہاں کی تہذیب و ثقافت، تمدن اور معاشرت، انداز تعلیم اور جنون مذہب سے متعلق مسٹر منشی نے جو کچھ، جس رنگ اور جیسے لب و لہجہ میں تحریر فرمایا، اس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں مسٹر منشی نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ حیدر آباد سے بڑھ کر پسماندہ، رجعت پسند، متعصب، ناروادار اور بدنظم ریاست ہندوستان کے سارے طول و عرض میں کہیں نہ تھی، صفحۂ ہستی سے اس کے وجود کا مٹا دینا بہت بڑی ملکی اور ملّی خدمت تھی، جسے مسٹر منشی کی سازش سے سردار پٹیل نے انجام تک پہنچایا، ع

وہ کام ہوا ہم سے جو رستم سے نہ ہوگا،

مسٹر بی پی مینن نے نسبتاً سنجیدہ اور سلجھا ہوا انداز بیان اختیار کیا ہے، لیکن ان کے اور مسٹر منشی کے افکار و خیالات میں حیرت انگیز حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے،

۱۹۲۵ء میں خالدہ ادیب خانم ہندوستان تشریف لائی تھیں،

خالدہ ادیب خانم ترکیہ کی تحریک انقلاب کے علمبرداروں میں تھیں، آزادی ہند کے سلسلہ میں ہندوستان کے بڑے سے بڑے لیڈر نے ان طوفانوں کا مقابلہ نہ کیا ہوگا، جن سے کھیلتی اور لڑتی یہ خاتون عہدہ برآ ہوئی، اپنے افکار و خیالات کے لحاظ سے خالدہ ادیب خانم بہت بڑی تجدد پسند خاتون تھیں، جس انقلابی تحریک کی وہ روح رواں تھیں، اس نے منصب خلافت کو ختم کیا اور خلیفۃ المسلمین کو

جلاوطن کردیا، عربی حروف ترک کردیے، لاطینی حروف اختیار کرلیے، برقعہ اور نقاب کو قانوناً جرم قرار کردیا، خانقاہوں پر تالے لگ گئے، مذہبی مدرسے بند کردیے گئے، علماء اور صوفیا کی کوئی وقعت نہ رہ گئی، پان اسلام ازم یعنی تحریک اتحاد عالم اسلامی سے یکسر بے تعلقی اور بیگانگی کا اظہار کردیا، پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ موصوفہ ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائی تھیں، جو مسلمانان ہند میں قومیت متحدہ کے عظیم المرتبت رہنما تسلیم کرلیے جاتے تھے۔ غرض خالدہ ادیب خانم کسی اعتبار سے بھی فرقہ پرست نہ تھیں،

ہندوستان سے واپس جاکر انھوں نے ڈاکٹر انصاری کی فرمائش کے مطابق ایک بڑی معرکۃ الآرا کتاب "اندرونِ ہند" (Inside India) کے نام سے لکھی، جو ہندوستان سے متعلق ان کے تاثرات و مشاہدات پر مشتمل تھی، موصوفہ حیدرآباد بھی تشریف لے گئی تھیں، مسٹر منشی اور مسٹر مینن کے حیدرآباد پر ایک نظر ڈال چکنے کے بعد اگر خالدہ ادیب خانم کے حیدرآباد پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تو کیا مضائقہ ہے، "

میں نے حیدرآباد میں کیا دیکھا

حیدرآباد کے راستہ میں مجھے سروجنی نائیڈو یاد آئیں، یہ ریاست ان کا وطن ہے، اور وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ وہ وہاں ہاتھی پر چڑھ کر مدرسے جایا کرتی تھیں، یہ چالیس سال اور کچھ پہلے کا حیدرآباد تھا، اب وہ بالکل یورپی نمونہ کا شہر ہے، کھلی اور بند عمدہ عمدہ موٹروں نے ہاتھیوں کی جگہ لے لی ہے۔ ڈامر کی نفیس سڑکوں پر وردی پہنے کوتوالی کے جوان آمد و رفت کا انتظام کرتے نظر آتے ہیں،

مجھے سر اکبر حیدری کے ہاں ٹھہرنا تھا، ان سے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی، کہا جاتا تھا کہ وہ ہندوستان میں سب سے ہوشیار ماہر مالیات ہیں، نہ صرف حیدرآباد کے موازنے میں آمد و خرچ ٹھیک ٹھیک تل رہتی ہے، بلکہ اس میں فاضلات کی مد بھی قحط کی اتفاقی ضرورتوں کے لیے مختص ہوتی ہے، جب مجھ سے اس نادر تدبیر کا ذکر کیا گیا تو میں نے کہا یہ عہد جدید کے یوسف[ع] ہوں گے، لیکن میں سر اکبر سے دارالسلام میں ملی تو خیال بھی نہ کر سکی کہ انھیں اعداد و شمار، مالیات اور حسابی علوم سے کوئی خاص نسبت ہوگی، مجھے وہ زیادہ تر علمی آدمی معلوم ہوئے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے انھیں تعلیمات کا وزیر خیال کیا،

سر اکبر ساٹھ سال سے متجاوز ذرا بھاری بدن کے آدمی ہیں اور اکثر یورپی لباس پہنتے ہیں، ان کے اخلاق میں مشرق کی دلی تواضع کے ساتھ عملی اور اثباتی مغرب کی آمیزش ہے، آنکھوں میں

نرمی اور مہربانی، خشخشی گول داڑھی، مجموعی طور پر آدمی کو ان کے مشرقی پہلو کا زیادہ احساس ہوتا ہے اگرچہ وہ انگریزی ادبیات میں حیرت انگیز معلومات رکھتے ہیں، جو لوگ ان سے واقف ہیں وہ بھی ان معلومات پر شاید حیران رہ جاتے ہیں کیونکہ حیدر آباد کے انگریز ریذیڈنٹ نے کسی قدر تعجب کے ساتھ مجھ سے کہا کہ سر اکبر حیدری کسی تعلیم یافتہ انگریز کی طرح نہ صرف شیکسپیر کے اقوال نقل کر سکتے ہیں بلکہ اسی قدر وثوق کے ساتھ ثانوی درجہ کے شعرائے اشعار بھی، اور مالیات پر ان کی ماہرانہ قابلیت پر یہ مستزاد انگریزوں کو ایک بے مثل مرکب نظر آتا ہے -

میری نظر میں سر اکبر کی بے مثالی دوسری قسم کی تھی، میں بہت سے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے ملی جن کی انگریزی ادب میں فاضلانہ دستگاہ اور ہندوستان کی مشرقی تہذیب کے ہندو اور اسلامی دونوں پہلوؤں پر قدرت کاملہ دیکھ کر ہو سکتا ہے کہ آدمی دنگ رہ جائے، لیکن ان لوگوں کی طبیعتوں میں یہ دو پہلو الگ الگ ہی پائے گئے، بعض کا میلان زیادہ تر ہندو مذہب کی طرف تھا اور بعض کا اسلامی تہذیب کی طرف اور عموماً وہ ان میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فوقیت جتانے کی کوشش کرتے تھے، بعض ان دونوں قوموں کو ملا دینے کے قائل تھے، یا سیاسی وجوہ سے کسی ایک تہذیب کی، جسے وہ درحقیقت ادنیٰ سمجھتے تھے، فقط زبانی ستائش کرتے تھے، لیکن سر اکبر بغیر ارادی کوشش کے ایسے کلّی امتزاج تک پہنچ گئے تھے اور ہندوستان کی تہذیب کا ایک نادر مرکب ان کے ذہن میں آگیا تھا، ان کی تعلیمی آرا بھی عاقلانہ اور قابل عمل تھیں، ہندوستان میں جس قسم کی بھی یونانی، بدھی، ہندوانی یا اسلامی تہذیب تھی وہ ان کے دماغ میں مجموعی طور پر سمائی ہوئی تھی، حیدر آباد میں غارہائے ایلورہ و اجنتا کے بدھی آثار کی بے نظیر خوبصورتی ان کی نظر میں ایسی ہی عزیز اور قابل فخر تھی، جیسے کسی اسلامی عمارت یا صوفی تصانیف کی خوبیاں، اگرچہ عمر کے لحاظ سے سر اکبر گذشتہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن وہ طبیعت کے لحاظ سے مستقبل کے آدمی ہیں، اس واسطے کہ اگر ہندوستان کو ایک قوم کی صورت میں آمیز ہونا ہے تو لازم ہے کہ وہ اپنی کثیر الاوضاع تہذیب و افکار کے اس غیر شعوری امتزاج تک رسائی پائے -

جامعہ عثمانیہ وہ ادارہ تھا جس سے سر اکبر کو سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور مجھے بھی اس کے متعلق اتنا کچھ سننے کا اتفاق ہوا تھا کہ اس کی نہایت مشتاق ہوگئی تھی، سر اکبر کی دعوت پر عثمانیہ

ہی کے طلبہ کے سامنے تقریر کرنے کے لئے میں حیدر آباد گئی، اور ان کے گھر مہمان ہونے والی تھی،

اس مکان میں آتے ہی آدمی کو وہاں کے حسن مذاق، خوبصورتی اور حسن انتظام کا احساس ہو جاتا ہے، اور یہ چیزیں صرف نمائشی حد تک نہ تھیں، خواہ نعمت خانہ ہو، یا کپڑے دھونے کا کمرہ، یا کوئی چھپا ہوا گنجینہ، گھر کے کونے کونے سے گھر والی کی قابلیت کی شہادت ملتی تھی، اور یہاں کی گھر والی لیڈی آمنہ تھیں، وہ طیب جی کے خاندان سے تھیں جو بجائے خود ہندوستان میں ایک خصوصیت کی بات ہے، ایک زمانہ سے اس خاندان کا ہر فرد کسی نہ کسی شہرت کا مالک رہا ہے، اس کی عورتیں مسلمانوں میں سب سے پہلے آزاد ہونے والیوں میں تھیں، اور اس کے مرد ہمیشہ ترقی کے حامی رہے، آجکل لیڈی آمنہ کی ایک عم زاد بہن بیگم شریف علی دنیائے نسواں میں بین الاقوامی شخصیت کی مالک ہیں، اسی طرح ایک اور عم زاد خاتون موسیقی میں نام پیدا کر چکی ہیں،

لیڈی آمنہ خود کسی جماعت و فرقے سے تعلق نہیں رکھتیں، مزاجاً ان کے لئے یہ ناممکن ہے، ان کے سامنے آتے ہی آدمی کو جسم و دماغ کے ایک کامل توازن کا احساس ہوتا ہے، وہ ایک بلند قامت، خوب صورت بیوی تھیں، لباس نک سک سے درست اور گفتار، رفتار یا محض دیکھن سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں وہ کامل متناسب قوی رکھتی ہیں، ان میں قریب قریب شاہانہ شان کی بھی کوئی اعلیٰ کہ آدمی کو کسی عالی رتبہ انگریز لیڈی کا جو اپنے تاریخی قلعہ میں رہتی ہو، خیال آتا تھا، لیکن انگریز لیڈی کے سامنے اس کے خانساماں، داروغہ اور نقل ہوتے جو اس کے قصر کا انتظام کرتے، بخلاف اس کے یہاں کی تمام جزئیات خود لیڈی آمنہ کے ہاتھ میں تھیں، وہ اپنے نوکروں کے جوق کو خود تن تنہا ہدایتیں دیتیں، نگرانی کرتیں، اور ہر مجلسی تقریب کا خود انتظام کرتیں، ان میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ یہ بات تصور میں نہ آتی تھی کہ وہ اپنے اقتدار اور فرض کے کسی حصہ کو دوسرے کے تفویض کر دیں گے، باورچی خانے سے دیوان خانے تک اور سادہ ترین رسم سے پیچیدہ ترین تقریب تک ہر چیز ان کی عقابی آنکھ کے اشارے پر چلتی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے مکان میں کامل وحدت و ہم آہنگی ہو گئی تھی، تعجب ہوتا تھا کہ ان سب کاموں کے لئے انھیں وقت کہاں سے ملتا ہے؟ کیونکہ چائے، دن کے کھانے یا رات کے کھانے پر ہمیشہ مہمان

رہتے تھے، اور ان سب باتوں کے ساتھ وہ پابندی سے نماز کے پانچوں وقت بھی ملحوظ رکھتی تھیں، اور ان میں جتنا وقت صرف ہوتا ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اسلامی نماز کے آداب سے واقف ہوں، ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ دوپہر کے بعد میں انھیں اپنے کمرہ میں بیٹھا سیتے یا مطالعہ کرتے دیکھتی تھی، پھر یہ کہ ان کے کسی کام میں عجلت نہیں پائی جاتی تھی، جس قدر مصروف عورتوں سے میری واقفیت ہے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان سب میں زیادہ فرصت رکھتی ہیں، اور اس کا لطف اٹھانا بھی خوب جانتی ہیں،

میں نے چند مرتبہ یہ ذکر کیا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے خال و خط زیادہ واضح ہوتے ہیں، لیڈی آمنہ اس کی اعلیٰ مثال تھیں، جس طرح ایک بت تراش بت کو ہمیشہ کے لئے تراش دیتا ہے، انھوں نے اپنی روح کو اسی طرح تراش کر بنایا تھا، اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ایسی خصائل کی جامع تھیں جو اس وقت تک کم سے کم ہندوستان میں، مجھے متضاد معلوم ہوتی تھیں، یعنی وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھیں اور پھر بھی ان میں فرقہ پرستی کا کوئی شائبہ نہ تھا، وہ ہندوستان سے محبت کرتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے مذہبی اختلاف سے بالکل بے خبر ہیں، اپنے ہم وطنوں کے متعلق ان کی یہ روش دیکھ کر مجھے ایک ترکی سلطان محمود ثانی کا قول یاد آیا "میں اپنی رعایا میں کسی فرق سے آگاہ نہیں، اگرچہ مجھے علم ہے کہ ان میں سے بعض مسجدیں، بعض گرجا میں اور بعض کسی صومعے میں عبادت کرتے ہیں" وہ غیر اسلامی فنون کی مثل اپنے شوہر کی دلدادہ تھیں، لیکن اس سے ان کی طبیعت میں کوئی احساس کمتری پیدا نہیں، ہوا تھا جو بعض اوقات ہندوستان میں مسلمانوں کی طبیعت کو تلخ کام اور مسخ کر دیتا ہے، وہ کسی بات پر بھی کبھی جوش میں نہیں آتی تھیں، ان کے معیار بالکل معین تھے، وہ ہندومت کے کسی مداح کی تقریر یا اسلام کی مذمت مساوی سکوت کے ساتھ سن سکتی تھیں، اور اسی درمیان میں وقت آجاتا تو اٹھ کر نماز کے لیے چلی جاتیں،

یہ بات کہ ان کے جذبات میں شدت آسکتی تھی میں نے دو موقعوں پر مشاہدہ کی، ایک تو ہر قسم کے تصوف اور مفرط رہبانیت خصوصاً اس کی وہ صورت جس میں آدمی بنی نوع انسان سے قطع تعلق کر لیتا ہے اس سے انھیں کمال تنفر تھا، اول اول میں نے خیال کیا اس کا سبب یہ ہوگا کہ ہر

راسخ العقیدہ مسلمان اس قسم کی رہبانیت سے طبعی کراہت رکھتا ہے، لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ اس شخص کا تعلق خود خاندان میں ایک رنج دہ واقعہ سے تھا، یعنی ایک قریبی اور عزیز رشتہ دار تصوف کے اثرات سے فقیر بن گیا، اور تھوڑے دن شدید ریاضت کی زندگی بسر کر کے فوت ہو گیا تھا، ان کے جذبہ میں آنے والی دوسری مثال میں نے ان کی دوست پرستی کے سلسلہ میں دیکھی۔ ان کی پختہ وفاداری کا یہ مشاہدہ مجھے اتفاقی طور پر ہوا اور میں اس کی وجہ سے مدت العمر کے لئے ان کی مداح ہو گئی، اگرچہ وہ ایسی عورت ہیں جو گویا اقتدار کے لیے پیدا ہوئی ہے اور اقتدار انھیں اس طرح من مانا حاصل ہوا جیسے اپنی ناپ کے مطابق دستانہ، لیکن کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے وہ اپنی دوستی اور محبت کی خاطر خوشی سے قربان نہ کر دیں، شاید یہی بات تھی جس نے انھیں اپنے ذاتی دوستوں میں اتنا محبوب بنا دیا تھا، اور جس نے ان لوگوں کو، جو ان سے واقف نہیں ہیں دشمن کر رکھا تھا، ان کے دوستوں میں میں نے دیکھا کہ نوعمر خاص طور پر ان کے گرویدہ تھے، گو وہ کبھی اپنی تمکنت کی وضع نہ چھوڑتی تھیں لیکن یہ نوعمر دوست ان کے ساتھ کمال بے تکلف ہو جاتے تھے،

وہ عورتوں کے تعلیمی اداروں کی سرپرستی کرتی تھیں، اور مجھے بھی زنانہ مدارس میں لے گئیں، ان مدرسوں کا انتظام اچھا ہے، ان کی صدر انگریز عورتیں ہیں، جو اپنے تعلیمی خیالات میں کسی قدر قدامت پسند معلوم ہوتی ہیں، یہاں ہندو مسلمان عورتیں بغیر کسی نسلی یا مذہبی تعصب کے مل جل کر رہتی ہیں، ان اداروں میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ایک یتیم خانہ کو دیکھ کر ہوا جو میرے نزدیک تمام ہندوستان کے لیے صحیح قسم کا ابتدائی مدرسہ ہے کہ اگر ہندوستان کسی یکساں پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا انتظام کرے اور اسے اپنے مفلوک الحال عوام کی ضرورتوں کے مطابق بنائے تو اس کا نمونہ یہی ہوگا، اس یتیم خانہ کے طلبہ لاوارث اور بے گھر بچے تھے، ان میں لڑکے، لڑکیاں دونوں تھیں، اور ان کی تعلیم و تربیت علیحدہ علیحدہ کی جاتی تھی،

پہلے ہم نے لڑکوں کا معائنہ کیا، یہ پانچ سے چودہ سال کی عمر تک کے تھے، اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے اور سیے ہوئے کپڑے اور اپنے ہاتھ کے رنگے چمڑے کے جوتے پہنے تھے، پارچہ بافی قالین بافی، جلد سازی، دباغت اور بہت سے پیشے اور دستکاریاں جو ضرورت زندگی میں داخل ہیں عمدہ طریق پر سکھائی جاتی تھیں، ہر طالب علم ان میں سے کئی کئی کام سیکھتا تھا تاکہ آسانی

سے کمائی کر سکے، اس مدرسے میں فرش و فروش، ظروف، کپڑے لتے، غرض کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو خود طلبہ نے تیار نہ کی ہو، بلکہ ممکن تھا کہ لڑکوں کو اس بعد سے کسی جنگل میں چھوڑ دیا جائے تو وہاں بھی وہ اپنی عملی واقفیت سے اچھے خاصے معیار کی ایک معاشرت پیدا کرلیں گے، ہرچند ان میں بڑی تعداد لاوارث یتامیٰ کی تھی، لیکن وہ اوسط درجہ کے تندرست بچے تھے، اور انھیں بہت سادہ لیکن احتیاط سے سوچ سمجھ کر غذا دی جاتی تھی،

تعلیمی شعبہ بھی ایسا ہی عمل اور اس کا نصاب بہت اچھا مرتب کیا ہوا تھا، مگر اس کی تعلیم چار مختلف زبانوں میں دی جاتی تھی، میں نے دریافت کیا کہ کسی مجہول الاحوال یتیم کی اصلیت اور اس کے والدین کی زبان کس طرح معلوم کی جاتی ہے؟ مجھے بتایا گیا جس بچے کو ماں باپ چھوڑ دیتے ہیں ان میں بھی ہمیشہ کوئی علامت ایسی ہوتی ہے جس سے اس کے ماں باپ کے مذہب اور ذات کا پتہ چل جاتا ہے،

زنانہ شعبہ بھی ایسا ہی قابل تعریف تھا، انھیں کھانا پکانے، نوکری کرنے، خانہ داری اور سلائی کی تعلیم دی جاتی تھی، امور خانہ داری بہت اہتمام سے سکھائے جاتے تھے، مجھ سے کہا گیا کہ یہاں کی سدھی ہوئی لڑکیوں کی خانگی ملازمت، نیز شادی کے لیے بڑی مانگ ہے، لیکن جو شخص یتیم خانہ کی لڑکی بیاہنا چاہتا ہے، اسے نیک چلنی اور اچھی حیثیت کے صداقت نامے پیش کرنے ہوتے تھے، دلہن کو پہننے کے کپڑے اور خانگی ظروف کا معقول جہیز دیا جاتا تھا، اور چند سال تک یتیم خانہ اس کی خبر گیری رکھتا تھا تاآنکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ لڑکی کے ساتھ شوہر کا سلوک شریفانہ ہے،

لڑکوں کا کھانا لڑکیاں پکاتی تھیں اور کپڑے بھی دھوتی تھیں، مجھے دو باورچی خانے دکھائے گئے، ایک ہندوؤں کے لیے، دوسرا مسلمانوں کے لیے تھا، یہ تفریق سبزی خوری کی وجہ سے نہیں تھی، کیونکہ تمام ہندو طلبہ گوشت خور فرقوں کے تھے، لیکن یہ ذات پات کا سوال تھا، ہندو مسلمانوں کا تیار کیا ہوا کھانا، یا ان کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھا سکتے تھے،

پورا مکان کامل طور پر صاف اور انتہا درجے سادہ رکھا گیا تھا، ضرورت سے زیادہ تن آسانی یا بلند خیال پیدا کرنے کا کوئی سامان نہیں کیا گیا تھا کہ مبادا یہاں کے رہنے والوں کو وہ سادہ

معاشرت جو اُنھیں آئندہ بسر کرنی تھی، ناگوار گزرنے لگے، میرے خیال میں یہ ایسا خردمندانہ اور مناسب خیال ہے جس کے لئے اعلیٰ حضرت نظام، جو اس ادارہ کے صدر مربّی ہیں، قابل مبارکباد ہیں، کیونکہ رؤسا اور امرا جو غریبوں کے لئے ایسے ادارے قائم کرتے ہیں، انھیں عام طور پر جدید آرائش اور نمود و نمائش کے سامان سے آراستہ کر دیا جاتا ہے تاکہ نوواردوں پر رعب پڑے، لیکن ایسے سامان خود ان اداروں کے رہنے والوں کو اس معاشرت کے ناقابل بنا دیتے ہیں جو آئندہ بسر کرنا ان کے نصیب میں لکھا ہے،

یتیم خانہ ایک یوریشین میاں بیوی کے زیر انتظام ہے جو تعلیم و تنظیم کے کام میں نہایت لائق اور اس ادارہ کیلئے نہایت موزوں ہیں، جنہم کی بیوی میں کام کی صلاحیت کے علاوہ مادرانہ شفقت دیکھ کر مجھے خاص طور پر خوشی ہوئی، کیونکہ اس قسم کے بچوں کو سدھانے کے لئے دماغی قابلیت کے علاوہ بڑے باجہر دل کی ضرورت ہے،

اس رات کے کھانے پر میں نے اس یتیم خانہ کے متعلق چند بحثیں چھیڑیں: نصاب چار بولیوں میں کیوں پڑھایا جاتا ہے ؟، اگرچہ یہ قدرتی اور مناسب بات ہے کہ ہر بچہ اپنے فرقہ کی زبان کی تعلیم حاصل کرے، لیکن حیدرآباد میں ایک زبان کا ہونا جو سرکاری تسلیم کی جاتی ہے لازم ہے تاکہ جملہ فرقے باہمی کاروبار یا دوسرے تعلقات کے لئے، اور سب سے بڑھ کر تعلیمی اغراض کے لئے اسے استعمال کریں،

جس صورت میں کہ ہندو اور مسلمان دونوں گوشت خور ہیں، تو وہ الگ الگ کھانا کیوں کھائیں؟ اگر ہندو مسلمانوں کی پکائی ہوئی غذا نہیں کھاتے تو مسلمان ہندوؤں کا تیار کیا ہوا کھانا کھائیں، کیونکہ جو مدرسہ اپنے طلبہ کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب نہ لا سکے کہ مل کر کھانا بھی نہ کھائیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اس ملک میں سچے شہری پیدا کرنے میں ناکام رہا،

یہ سن کر مسٹر اکبر نے سر ہلایا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کے حالات سے میری ناواقفیت پر وہ متحیر ہو گئے، انھوں نے کہا ہم مسلمان یہاں حکمران ہیں، اور اگر ہم یہ کام کریں تو گویا اپنے اقتدار اور ان بچوں کی بے کسی کا جنہیں پالنا اور تعلیم دینا چاہتے ہیں، بےجا فائدہ اٹھائیں گے۔

قدرتی طور پر سر اکبر کے شریفانہ خیالات کا میں احترام کرتی ہوں، لیکن یہ میری ناواقفیت نہ تھی کہ میں نے اس قسم کے سوال چھیڑے، اگر دور گذشتہ کی طرح آج بھی ہندوستان اس پر قانع ہوتا کہ وہ ایسی ہی سخت جداگانہ فرقہ بندیوں میں بٹا رہے تو میں ایسی کوئی بات نہ کہتی، لیکن جب سے میں ہندوستان کی سیاحت کر رہی ہوں، اور یہاں کے لوگوں سے باتیں کرتی رہی ہوں، میں نے دیکھا کہ ہر شخص، اتحاد قومیت اور اہل ہند میں اشتراک عمل اور مستقبل میں آزادی کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ بچے ہندوستان کے لئے ایک دوسرے سے ملکر کیا کام کر سکیں گے، اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کیونکر شریک ہو سکیں گے، اگر وہ مدرسہ میں یکجا کھانا بھی نہ کھا سکتے رہتے؟ لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انگریزی علاقہ سے دیسی ریاستوں کا حال مختلف ہے، یہ بات کہ مسلم اقلیت کسی ہندو اکثریت پر حکمران ہے، اور کہیں کوئی ہندو اقلیت مسلم اکثریت پر، بالکل نئی اور دشوار صورتیں پیدا کرتی ہے، تاہم اگر میں کسی ہندو فرمانروا کی ریاست میں ہوتی تو بھی یہی رائے ظاہر کرتی، مذہبی محسوسات کا پورا خیال رکھنے کے باوجود یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کے لئے ایک مشترک قومی میدان پیدا کیا جائے، جہاں وہ ایک مشترک اور آزاد مملکت کی جس پر انھیں آئندہ حکومت کرنی ہے، نیو ڈال سکیں۔

لیڈی آمنہ کے گھر میں حیدرآباد کی جن بی بیوں سے میں ملی، ان میں سے اکثر کے مرقعے پیش کر سکتی ہوں، لیکن یہاں صرف تین تمثیلوں پر قناعت کروں گی، یہ تینوں سب سے نوجوان نسل کی خواتین ہیں، مگر لیڈی آمنہ کی گہری دوستوں میں ہیں۔

(۱) ولی عہد بہادر کی بیگم شاہزادی درشاہوار ہیں نسباً عثمانی شہزادی ہیں، لیکن اب بجز ایک ہندوستانی کے کچھ نہیں رہی ہیں، اس لئے کہ اب نئے ماحول کے سانچے میں نہایت خوبی سے اپنے آپ کو ڈھال لیا ہے، اور بحیثیت بیوی، ماں اور نیز غیر معمولی تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے اپنے رتبۂ بلند کے فرائض کو دل سے انجام دیتی ہیں، ان کی عمر صرف تیئیس ۲۳ سال کی ہے، لہذا خاصی طرح لیڈی آمنہ کی بیٹی کے برابر ہیں، لیکن دونوں ایک جا ہوں تو خوردتر خاتون کی خلاف معمول پختگی دیکھ کر تعجب ہوگا، ان کی یہی متانت ہے جس نے انھیں اپنے سے زیادہ سن رسیدہ خاتون کا ایسا دوست بنا دیا ہے کہ ایسی دوستی صرف دو ہم عمروں ہی میں ہو سکتی ہے۔

میں نے اس شہزادی کو اپنے وطن میں جبکہ وہ چودہ سال کی تھی، دیکھا تھا، اب جو انھیں
لیڈی آمنہ کے ساتھ کھڑے دیکھا تو یہ یقین کرنا مشکل ہوا کہ یہ وہی بی بی ہیں، میں سمجھتی
ہوں وہ تقریباً چھ فٹ لمبی ہیں، اور سب سے بلند قامت خواتین سے بھی نکلی ہوئی معلوم
ہوتی ہیں، اپنی شاہانہ اور متین صورت کے باوجود ان میں ایک شرمیلا پن اور کسی
قدر جھجک پائی جاتی ہے، چہرہ جو کسی وقت نہایت چھوٹے بچے کا چہرہ تھا، اب
اس قدر بدل گیا ہے کہ اس سے زیادہ متین انسانی نقاب میں نے نہ دیکھی تھی،
جس وقت میں ان سے ملی تو وہ ہر قسم کے زیورات اور بناؤ سنگار سے بے نیاز سیدھی
سادی ساڑھی پہنے تھیں، ان کا سر باریک اوڑھنی کے چو کھٹے میں طاقتور شانوں پر
بالکل سیدھا اٹھا ہوا تھا، چہرہ کسی قدر لمبوترا، پیشانی چوڑی، بھورے بال پشت کی
طرف جمے ہوئے، نازک لیکن گول ٹھوڑی، بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں، ایک دوسرے
سے فاصلہ پر، یک سطح بالوں کی محرابی بھنویں اپنی جگہ پر قائم، دہانہ تنگ نہایت
سرخ اور کمال نزاکت سے تراشہ ہوا، اس کے اندر موتی سے دانت کہ ان سے زیادہ
سفید قیاس میں نہیں آتے، ناک شروع میں ستواں اور قدیم نقشے کی لیکن لمبی اور
دہانے پر ذرا کی ذرا خمیدہ،
میں حیران تھی کہ یہ چہرہ کہاں دیکھا تھا؟ اور پھر فوراً یاد آگیا، یہ محمد فاتح استنبول کی
بلینی کی بنائی ہوئی تصویر کا چہرہ تھا، حیرت کی بات ہے کہ اس زبوں احوال خاندان کے
افراد میں سے شہزادی کو ورثہ ملا تو ایسے شخص کا جو اس خاندان سلاطین کا سب سے طاقتور
اور لائق فرد گزرا ہے، اور یہ تقدیر کی مہربانی تھی کہ وہ اس جگہ لائی گئیں جہاں ان کو ہونا
چاہیے تھا، کیونکہ ابتدائی زمانہ کی عثمانی ذہنیت بھی ہر قسم کے نسلی و مذہبی تعصب سے ماورا
تھی، پھر یہ کہ سلطان فاتح کی مثل انہیں نظم نگاری میں ملکہ اور تعلیم کا نہایت شوق ہے،
وہ نہایت روانی سے اردو بولتی تھیں، اور انگریزی مادری زبان والے کی طرح، یہ
بات کہ وہ کسی وقت ترک تھیں مجھے اس وقت یاد آئی کہ جب انھوں نے اپنے پیاری
صورت والے بچے کو ترکی میں "میری بورا" کہہ کے پکارا، چونکہ وہ کبھی پردے میں نہیں

رہیں، اس لئے بے تکلف پھرتی ہیں، اور مجھ سے کہا گیا کہ گھوڑے کی بہت عمدہ سوار ہیں،
ان کی ایک تقریر کے پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیدر آباد کی عورتوں کی ضروریات
اور ان کی تعلیم کے بیے ریاست نے جو کچھ کیا ہے اس سے نہایت عمدہ واقفیت رکھتی ہیں، یہ
پر مغز تقریر انھوں نے ریاست حیدر آباد کی زنانہ کانفرنس کے دسویں اجلاس میں کی تھی، اس
سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں تعلیم سے کس قدر دلچسپی ہے اور وہ اپنے نامور جد کی کس قدر
متبع ہیں، ذیل میں اس کے چند اقتباس درج ہیں، تقریر اردو میں تھی، یہ اس کا انگریزی ترجمہ
ہے،

"حیدر آباد اب میرا وطن ہے اور میں آپ کی امیدوں، دلچسپیوں، آرزوؤں، تمناؤں اور
بچوں کی فلاح و بہبود میں کلیتہً آپ کے ساتھ ہوں، میں مشتاق تھی کہ کب آپ مجھ کو بھی اپنے میں
شامل سمجھیں گی، اور یقین کریں گی کہ میں ہر طرح آپ کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوں،
ہندوستان کی عورتوں کا مجھے انتہا درجہ خیال ہے، اور میرے دل میں کمال قدر و منزلت
ہے، یہ قدر و منزلت ان کے بے پایاں صبر، کمال دلیری اور حال و مستقبل کو بہتر بنانے کا شوق
دیکھ کر ہوتی ہے، آج دنیا میں ہر طرح عورتیں بیدار ہو رہی ہیں کہ اپنی ذمہ داری اور آئندہ
نسلوں کو ڈھالنے میں اپنے خاص حصے کا کام سرانجام دیں، ہندوستان کی عورتوں نے وفاداری
خدمت گزاری اور دلنوازی کی اعلیٰ صفات ورثے میں پائی ہیں، اور وہ بہت کچھ سکھا سکتی ہیں،
لہذا نوع انسان کی خدمت میں انھیں پیش پیش ہونا چاہیے، دنیا کے مہذب ممالک میں اب
عورتیں محض مفت خور اور دست نگر نہیں بلکہ جس ملک میں پرورش پائی اس کی شہری ہیں اور انھیں
زندہ رہنے اور اہل معاملہ بننے کا حق حاصل ہو گیا ہے، اور اب وہ بھی اپنی قوم کی عزت اور اپنے
ہم وطنوں کے فضائل میں اضافہ کر سکتی ہیں،"

زنانہ کالج اور حیدر آباد کے چار ابتدائی مدارس کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے ابتدائی تعلیم
کی ضرورت پر نہایت خوبی سے زور دیا،

"اضلاع میں ہزاروں متنفس اس زندگی بخش روشنی کی حدود سے باہر ہیں مگر لازم ہے کہ
یہ روشنی پھیلے اور سب کو میسر آئے، خواہ وہ غریب ہوں یا امیر ہوں،"

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ قول بیان کر کے کہ علم عبادت سے افضل ہے، انھوں نے ہندو فلسفے کی ستائش کی جس میں علم و دانش کی اسی طرح قدر و منزلت بلند کرنے والے نصائح ہیں اور پھر کہا: بایں ہمہ محض کتابی تعلیم کافی نہیں یہ اس بے قیاس تعلیم کا محض ایک جز ہے، جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ تنگدلی

اوہام، تعصب اور خوف کو دور کرے، اور انسانوں میں ہمدردی اور مفاہمت پیدا کرے،

پوری تقریر سے ایسی پختگی اور سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے جیسے ان کی عمر کے آدمی سے منسوب کرنا مشکل ہے، حضور نظام سے وہ واقعی مثل بیٹی کے شیفتگی رکھتی ہیں تقریر میں بھی حضور ممدوح کی دل ستائش کے بعد وہ عورتوں کی اقتصادی خود مختاری کے مسئلے پر بحث کرتی ہیں، اگرچہ وہ شہزادی ہیں، مگر ان کا اذعان ہے کہ "عورتوں کو محنت کا احترام جاننا چاہیئے، کہ اگر ضرورت ہو تو عزت کے ساتھ روٹی کما کر اپنا پیٹ پال سکے، کنبے کی قلیل آمدنی میں اپنی کوشش سے اضافہ کرنا سبکی کی بات نہیں ہے بلکہ قابل فخر چیز ہے۔"

اسی طرح دوسرے تعلیمی مسائل اور ترقی کی ضرورت پر بحث کی۔ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحب فکر و رائے خاتون ہیں،

لیڈی آمنہ کی دو اور کمسن ملنے والیاں سروجنی نائڈو کی بیٹیاں ہیں، دونوں میں دلکشی ہے، اور مختلف پہلوؤں سے اپنی ماں کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ پدمجا ایک حسین چیز ہے، نرم، باہنر، محفلی، مطالعہ کی شوقین، لیلامنی بالکل بیٹریا ہے، جس کا چہرہ، صورت، آتشی آنکھیں اور غصہ کی دیکھنے کے قابل ہے، ان دونوں میں اس چھوٹی کو اپنی ماں کی وہ غیر معمولی خصوصیت کہ اس کے مزاج کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا زیادہ ملی ہے اور اپنی قابلیت اور تعلیم کی وجہ سے وہ کسی تحریک میں بہت کار آمد ہو سکتی ہے، معلوم ہوتا ہے ابھی اس نے یہ فیصلہ نہیں کیا کہ کس خاص میدان میں کام کرنا چاہتی ہے؟"

حیدرآباد میں میرے لئے ایک سامان حیرت یہ ہوا کہ کملا دیوی مل گئیں، وہ مجھ سے ملنے کے لئے جنوب سے دور دراز سفر کی تکلیف اٹھا کے یہاں آئی تھیں، اور جب انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ بھی ان دنوں وردھا میں ہوں گی جس میں خود میں مہاتما گاندھی کے مستقر پر جانے والی تھی تو میں نہایت مسرور ہوئی کیونکہ اس سے مجھے یہ موقع ملا کہ جدید ہندوستان کی ایک زوردار

کارکن کو ایسے میدان میں بغور دیکھوں جس تک کسی اجنبی کی پہنچ مشکل تھی،

ہندوستان میں جامعہ ملیہ کا پیہم تذکرہ رہتا ہے، جامعہ عثمانیہ سے پہلے یہی وہ نادر ادارہ تھا جہاں اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جاتی تھی، اس میں جو دشواریاں ہیں وہ ظاہر میں نظر نہیں آتیں، کیونکہ اردو میں اصطلاحی الفاظ اور جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مناسب طریق بیان موجود نہیں ہے اور ان کو من مانے وضع کرنا بھی ممکن نہیں، علمی اصطلاحات مغرب سے لی جاتی ہیں، لیکن جب تک خیالات پہلے سے موجود نہ ہوں ادائے مطالب کے لئے اچھے اسلوب نہیں مل سکتے، صرف وہ فاضل اور عالم جو اردو کی مصطلحات میں سوچنے کے عادی ہیں علمی اور فلسفیانہ خیالات کو ایک غیر زبان سے اردو میں منتقل کر سکتے ہیں، اس غرض کے لئے حیدرآباد کے طلبہ پے در پے مغربی جامعات کو بھیجے گئے، یہ صرف نوجوان طلبہ نہ تھے کہ امتحانوں کی سند حاصل کریں، بلکہ پختہ عمر کے لوگ بھی بھیجے گئے جو سند لینے کے بعد خصوصی تعلیم پاتے اور تحقیقاتی کام کرتے رہے، مغرب کی علمی اور فلسفی تصانیف کو اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے اب ایک وسیع تنظیم موجود ہے، اور یہ کتابیں نصاب تعلیم نیز استناد دونوں کے لئے ترجمہ کی جاتی ہیں، یہ تنظیم صدر جامعہ ڈاکٹر میکنزی کے ماتحت ہے، موصوف ایک لائق اسکاچ ہیں جو تنظیم کی قابلیت اور یورپی جامعات کے مثل جامعہ تیار کر دینے کی ضروری معلومات رکھتے ہیں، یہ کام جس طرح ہو رہا ہے، اسے ان کی زبان سے سن کر لطف آتا ہے، کس طرح خاص خاص مضامین پہ اہل علم کی جماعتیں کام کرتی ہیں، اور ان مختلف جماعتوں میں کس طرح اتصال پیدا کیا گیا ہے، حقیقت میں یہ سب سے ضروری اور نہایت وسیع کام ہے اور اس کی انجام دہی میں سلیقہ مندی، تدبر دونوں ہی شامل ہیں، حیدرآباد میں دیسی، نیز یورپی علوم کے فاضل اور اہل تحقیق موجود ہیں، کیونکہ جامعہ السادار العلوم ہے جو دور ماضی کے راسخ علمی روایات رکھتا ہے، خاص ترجمہ، تعداد میں وہ ممتاز لوگ مجھے بتائے گئے جو تاریخ، فلسفہ اور مغربی علوم کے خاص خاص شعبوں میں کام کر رہے ہیں، ان میں سے ڈاکٹر حمید اللہ کو پہلے سے پیرس میں جانتی تھی، وہ سوربون کے تعلیم یافتہ ہیں اور پیرس کے جامعی حلقوں میں اپنی تاریخی تحقیقات کی بدولت امتیاز حاصل کر چکے ہیں،

سن رسیدہ علماء میں جو ادبی تحقیقات اور زبان اردو پہ جدید موضعی اصول کے مطابق ناقدانہ

تصنیفات کرنے میں غیر معمولی جامعیت رکھتے ہیں، مولانا عبدالحق ہیں، نہ صرف عالم بلکہ اس
یادگار کام (جامعہ) کو جن دماغوں نے بنایا ہے، ان میں شامل ہونے کے باعث بھی ان کا اہم
ذکر آتا ہے، سفید گول ڈاڑھی رکھتے ہیں اور ہمیشہ شیروانی پہنتے ہیں، خاموش زندگی بسر کرتے
ہیں اور مطالعۂ کتب، تحقیقات و تصنیفات کے لیے وقف، اور کم گو آدمی ہیں،

جامعہ عثمانیہ کے اس شاندار کارنامے کا وجود اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن کی سرپرستی اور
اعانت کا رہین منت ہے، معلوم ہوتا ہے حیدرآباد کو علم کا مرکز بنانے میں ممدوح نے پوری
توجہ صرف فرمائی اور بڑی فیاضی سے کام لیا ہے، سر اکبر بھی اس کے پرجوش حامی ہیں اور کوشش
کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے کہ یہ جامعہ اس درجۂ اول سے بھی جو وہ حاصل کر چکا ہے، بلند تر
مراتب پر پہنچ جائے، مولانا عبدالحق کا علمی تبحر اس میں تصنیفی مادہ پیدا کر رہا ہے،

اگر ایک طرف سے تعلیمی مرتبے اور تصنیفی قابلیت بڑھانے کی یہ کچھ کوششیں کی جا رہی ہیں، تو
دوسری طرف اس جدید جامعہ کی عمارات بھی ایسے شاندار پیمانے پر بنانے کا ارادہ ہے کہ ایسی
ہندوستان نے اب تک نہیں دیکھی ہیں، ان پر کم و بیش دو کروڑ روپیہ خرچ ہونے والا ہے۔
عمارتوں کا نقشہ ملکی انجنئروں نے مختلف یورپی مرکزوں میں دو سال تک مطالعہ کرنے کے بعد تیار
کیا ہے، مقام کا انتظام کیا جا چکا ہے، سڑکیں اور بدرروئیں بنائی گئی ہیں، اور بعض عمارات بھی
بنی شروع ہو گئی ہیں، چند سال کے عرصہ میں اردو زبان کی یہ جامعہ تیار ہو جائے گی، اور عمارات
اور درسیات دونوں اعتبار سے ایک ممتاز ترین دارالعلوم ہوگی، سر دست اس کی تعلیم عارضی عمارتوں
میں دی جاتی ہے،

رخصت ہوتے ہوئے رات کو میں نے حیدرآباد کا ایک عجیب اور نہایت دلکش سماں دیکھا، جامعہ
کی طرف سے وسیع شامیانے کے نیچے دعوت کی گئی تھی، پرلطف اور مختصر تقریریں اور اس کے بعد
مشاعرہ ہوا، اس نام نے مجھے بہت پرانی اپنے زمانے سے پہلے کی ترکی یاد دلا دی، یعنی اس وقت
کی جب قہوہ خانوں میں عام جلسے ہوتے اور مطرب اپنے ساز کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابلہ
میں گیت گاتے تھے، اس موقع پر فی البدیہہ شعر کہے جاتے تھے، اور بہترین کہنے والوں کو ریشم
کے تھانوں کا انعام ملتا تھا، یہ تھان قہوہ خانے میں تمام چھت پر لٹکے ہوتے تھے، اس کا نام

مشاعرہ، یعنی شعر کا مقابلہ تھا، یہ طریق ہندوستان میں آج تک چلا آرہا ہے، اگرچہ یہاں جو شعرا مقابلہ میں آتے ہیں وہ ساز پر اشعار نہیں سناتے، نہ فی البدیہہ تصنیف کرتے ہیں، بلکہ اپنی نظم لکھ کر اور تیار ہو کر آتے ہیں، مشاعرہ بھی بڑے شامیانے میں ہوا جس میں اتنے آدمی بھرے تھے کہ بہت سے لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ نہ ملی، اور وہ مجبوراً کھڑے رہے، دروازہ کے قریب ایک کوچ بچھی تھی، کارچوبی کام کا سرخ ریشمی کپڑا اس پر پڑا تھا، سامنے حقہ دھرا تھا، مشاعرہ کی صدارت وزیر اعظم کرنے والے تھے جو ہندو مگر اردو کے خود شاعر ہیں، وہ اپنے دیسی لباس میں تھے یہ ایک خوش خلق سن رسیدہ صاحب ہیں، جو شاندار کوچ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، حقہ پیتے رہے اور شعرا کا کلام بہت لطف کے ساتھ سنتے رہے، ان کے کوچ کے سامنے شاعر بیٹھے تھے، انھوں نے باری باری شعر پڑھے، اول پرانے طرز کا اردو کلام سنایا گیا، اشعار نیم ترنم کی آواز میں پڑھے جاتے تھے اور سامعین جس شعر کو پسند کرتے اس پر واہ وا کا شور مچ جاتا تھا، اور شاعر سلام کرتا اور دوبارہ شعر پڑھتا تھا، بعض اوقات شاعر عمداً رک جاتا اور چاروں طرف نظر ڈالتا، میں خیال کرتی ہوں کہ یہ وہ موقع ہوتا تھا جبکہ وہ اپنے کسی شعر پر پہنچتا اور اسے داد کے قابل سمجھتا تھا، سامعین بھی بہت خوش مزاجی سے داد دیتے تھے، وہ سلام کرتا اور آگے سنانے لگتا، یہ پرانی طرز کا کلام صریحاً فارسی کے فرسودہ الفاظ سے معمور تھا، انھیں سن کر مجھے ترکی ادبیات کے پرانے دیوان یاد آئے، نسیم سحر، آفتاب جہاں سوز، بلبل و گل، شراب و ساقی، سب یہاں موجود تھے،

جب نئی وضع کے شعرا نے پڑھنا شروع کیا تو میں کچھ بھی نہ سمجھی، صاف معلوم ہوتا تھا کہ فارسی کے مقررہ الفاظ ترک کر دیے گئے ہیں، اور پڑھنے میں بھی وہ نیم ترنم باقی نہیں رہا، ہرچند میں اس کو بہت کم سمجھ سکی لیکن وہ مانوس معلوم ہوا، یہ جدید بد مشرق تھا، بایں ہمہ تحسین و آفرین اسی زور شور سے ہوتی رہی، جب ہم شامیانے سے نکلے تو قریب قریب آدھی رات ہو چکی تھی، لیکن شعرا اور سامعین کے شوق میں کچھ کمی نہ آئی تھی، اور ان پر نیند کا کوئی اثر معلوم ہوتا تھا، اس طرح میں نے حیدرآباد کی چلتے وقت وہ جھلک دیکھی جو اس عہد گزشتہ کی جس میں ہم سب حصہ دار ہیں جھلک تھی، ●

ملاحظات وایضاحات

(۱)

"چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا!"

"کانگرس کی قوم پرستی کا امتحان" "ایک عہد کا خاتمہ"! "The End of an Era" کے مصنف مسٹر منشی ہیں"!

کتاب کے ساتھ، صاحب کتاب کا تعارف بھی ضروری اور ناگزیر ہے"!

مسٹر منشی گجرات کے رہنے والے ہیں، بمبئی کے کامیاب وکیلوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ کانگرس کی تجدید و احیاء سے پہلے، یہ ایک عرصۂ دراز تک مسٹر جناح کی قیادت میں "ہوم رول لیگ" کے سرگرم اور فعال کارکن رہے، پھر کانگرس میں شریک ہو گئے، کانگرس میں آکر انھیں اپنی ذہنی تعمیر و تشکیل کے مواقع میسر آئے۔ قومیت متحدہ کے علمبردار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی کانگرسی زندگی کا آغاز کیا، رفتہ رفتہ بلکہ شاید غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر کانگرس پر تنگ نظری، اور مسلم بیزاری غالب آتی گئی، گاندھی جی کی زندگی کا نصب العین خود بقول ان کے ہندو مسلم اتحاد تھا، کانگرس کو جب انھوں نے اپنے سایۂ عاطفت میں لیا، تو اس کے مقاصد حیات میں ایک یہ مقصد بھی شامل ہو گیا، لیکن وہ گاندھی جی ہی تھے، جنھوں نے کوہاٹ کے فسادات (۱۹۲۴ء) کے بعد صرف ہندوؤں کے بیانات سنکر، اور مسلمانوں کا "جواب مضمون" نہ سنکر علی الاعلان فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ "مسلمان دنگئی (Bully) ہیں اور ہندو بزدل (Coward) مولانا شوکت علی کی جیب کا مکیں ہونے پر گاندھی

جی فخر کیا کرتے تھے، لیکن یہی واقعہ دونوں میں آغاز اختلاف کا سبب بنا، پھر جب سوامی شردھانند نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریک شروع کی، اور ہندو مسلم منافرت کا کاروبار شروع کیا تو گو گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈر اس تحریک میں نہیں شریک ہوئے، لیکن رفتہ رفتہ اس ذہنیت سے وہ متاثر ہونے لگے، اس تحریک کی مخالفت نہ کرنا، اس تحریک کے رہنماؤں کی تقدیس کا کلمہ پڑھنا، اس تحریک کے ثمرات و نتائج کو قبول کر لینا ہمارے اس دعوے کا بہترین ثبوت ہے نہرو رپورٹ کے زمانہ میں اختلاف زیادہ واضح ہو گیا اور جن مسلمان رہنماؤں کو مسلم مفاد ہر حال میں عزیز تھا وہ کانگرس کے معمار اور گاندھی جی کے محسن ہونے کے باوجود، دل برداشتہ ہو کر دونوں سے الگ ہو گئے،

نہرو رپورٹ کو جب حکومت برطانیہ نے منظور نہیں کیا، اور ہندوستان کا مطالبۂ درجہ نو آبادیات (Dominion Status) تسلیم نہیں کیا، تو گاندھی جی نے انگریز حکومت کے خلاف ستیہ گرہ شروع کی، اس ستیہ گرہ کا مقصد یہ تھا کہ حکومت برطانیہ، نہرو رپورٹ کی بنیاد پر ہندوستان کو آزاد کر دے، مسلمان اگر اس تحریک میں شریک ہوتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ نہرو رپورٹ کو قبول کر رہے ہیں اور خود اپنے حقوق کی نفی کر رہے ہیں چنانچہ مجموعی حیثیت سے مسلمان اس تحریک میں شریک نہیں ہوئے، یہ پہلی تحریک تھی جسے مسلمانوں کو اعتماد میں لئے بغیر گاندھی جی نے شروع کیا تھا۔

یہ تحریک ناکام ہوئی، لیکن ہندوستان کے سیاسی اصلاحات کا سلسلہ حکومت برطانیہ کے پروگرام کے مطابق جاری رہا، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں انڈیا ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ ہندوستان ایک وفاقی مملکت بنے گا، پہلی قسط کے طور پر، صوبوں کو اندرونی خود مختاری دے دی گئی، ۱۹۳۶ء میں نئے انتخابات کے بعد صوبائی آزادی (Provincial Autonomy) کا دور شروع ہوا، جس صوبے میں جس قوم کی اکثریت تھی، اس نے وزارت بنالی

لیکن۔ جو معاملہ دوسری قوموں اور ملتوں کے لئے نہایت آسان تھا، وہی کانگرس کے لئے ایک سنگین مسئلہ (Problem) بن گیا۔ گاندھی جی اور کانگرس

بانگ دہل اعلان کرتے رہے تھے کہ، کانگرس ہندو جماعت نہیں ہے، وہ قومیت متحدہ کی علمبردار ہے، اس کے پلیٹ فارم پر ہر قوم ہر ملت کو یکساں طور پر بڑھنے، فروغ پانے اور پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل ہیں، وہ کسی معاملہ پر" ہندو" نقطۂ نظر سے غور کر ہی نہیں سکتی، ہر حالت میں، اس کا نقطۂ نگاہ قومی اور صرف قومی ہوتا ہے، مسلم لیگ یا مجلس خلافت یا مجلس احرار، یا جماعت خاکسار، یا جمعیۃ علماء یا جماعت اسلامی، یا جماعت نیلی پوش کا صدر لازمی طور پر صرف مسلمان ہی ہو سکتا ہے، مہاسبھا کی صدارت صرف ہندو کا حصہ ہے، پارسی پنچایت کی سربراہی پارسی کے علاوہ کسی کے حصہ میں نہیں آسکتی، سکھ لیگ کی مسند قیادت پر کوئی سکھ ہی فائز ہو سکتا ہے، اچھوت کانفرنس کا زعیم کبیر کوئی اچھوت ہی ہوگا، لیکن کانگرس کا صدر ہر شخص ہو سکتا ہے، اور ہوتا رہا ہے، ہندو بھی، مسلمان بھی، پارسی بھی، سکھ بھی، یہ کیفیت صرف آل انڈیا کانگرس تک محدود نہیں ہے، صوبائی کانگرس میں بھی یہی ہوتا رہا ہے، اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کانگرس بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے، وہ قومی حیثیت کی حامل ہے، کوئی ایک قوم اس کی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتی، وہ سب کی ہے، سب اس کے ہیں۔

صوبائی آزادی کے بعد وقت آیا کہ کانگرس اپنے قول کو عمل سے ثابت کرے، یعنی وہ غیر ہندو، جو مختلف صوبوں میں اپنے ایثار، قربانی، جوش عمل، دیانت اور کارگزاری کی بنا پر ممتاز ترین حیثیت رکھتے تھے۔ انھیں ہندو نہ ہونے کے باوجود وزارت عظمیٰ کا منصب عطا کیا جائے، جو اب تک غیر ہندو ہونے کے باوجود ہندو صوبوں میں اپنی قابلیت، ایثار، قربانی، اور جوش کردار کے باعث کانگرس کی صدارت اور قیادت کرتے چلے آئے تھے، اب انھیں پیچھے نہ دھکیلا جائے، آگے بڑھایا جائے"!

کیا کانگرس اس کے لئے تیار تھی؟ کیا کانگرس امتحان میں پوری اتری؟ ———

واقعات کا جواب نفی میں ہے"!

یوپی میں، رفیع احمد قدوائی، ایسے کوہ پیکر کانگرسی زعیم تھے کہ گوبند ولبھ پنت، سمپورنا نند ٹنڈن وغیرہ ان کے سامنے بونے نظر آتے تھے،

رفیع موتی لال کا پیارا، گاندھی جی کا راج دلارا، جواہر لال کا یارِ غار، نڈر، دلیر، جری، بیباک، ایثار پیشہ، قربانی اور فداکاری کے مرحلہ میں پیش پیش، نہ جیل سے خائف نہ پھانسی سے گریزاں، حق تھا کہ وہ صوبہ جات متحدہ (یوپی) کا پہلا وزیر اعظم بنتا، !

بہار میں ڈاکٹر سید محمود کا طوطی بولتا تھا، ڈاکٹر صاحب، محمد علی شوکت علی کے فدائیوں میں تھے۔ لیکن کانگرس اور خلافت میں جب ٹکر ہوئی، انھوں نے علی برادران کو چھوڑ دیا گاندھی اور موتی لال کو اختیار کر لیا۔ اب تک آل انڈیا مجلس خلافت کے سکریٹری تھے، اب وہ آل انڈیا کانگرس کے سکریٹری بن گئے، کانگرس نے جو تحریک شروع کی، اس میں شریک رہے۔ ہر مرتبہ جب کانگرس نے جیل پر یورش کی، ڈاکٹر صاحب آگے آگے نظر آئے، بیرسٹری چھوڑی، تکلیفیں اٹھائیں، قوم سے کٹے، لیکن کانگرس سے منہ نہ موڑا، پورے صوبۂ بہار میں ان سے سینیر کانگرسی لیڈر کوئی نہ تھا، ——————

کیا انھیں حق نہ تھا کہ بہار کے پہلے وزیر اعظم یہ ہوتے؟

بمبئی میں، کے ایف نریمان، اور عابد علی جعفر بھائی کا دور دورہ تھا، پارسی ہونے کے باوجود نریمان برسہا برس سے صوبہ کانگرس کا صدر چلا آرہا تھا، اور مسلمان ہونے کے باوجود سالہا سال سے عابد علی جعفر بھائی سکریٹری کے منصب پر فائز تھا، سب سمجھ رہے تھے کہ بمبئی میں وزارت عظمیٰ کا منصب صرف نریمان ہی کو ملے گا، انگریز گورنر نے تو اسی ایقان کی بناء پر نریمان کو بلا کر تشکیل وزارت کی دعوت بھی دے دی!!

لیکن ہوا کیا؟

یوپی میں رفیع احمد نظر انداز کرائے گئے، پنت صاحب کے سر پر تاج وزارت عظمیٰ رکھ دیا گیا۔ بہار میں ڈاکٹر محمود دودھ کی مکھی کی طرح پھینک دیے گئے، اور ایک نو آموز شخص سنہا کو وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں، اور بمبئی میں عین وقت پر سردار پٹیل کی مداخلت سے گورنر کو اپنا دعوت نامہ واپس لینا پڑا، اور مسٹر منشی کا نام پارٹی لیڈر کی حیثیت سے پیش کر دیا گیا جو منظور نہ ہو سکا، تو ایک اور شخص مسٹر کھیر کو نامزد کر دیا گیا، اور وہی وزیر اعظم بنے!!

مسٹر منشی کا تعارف

مسٹر منشی بمبئی کے وزیر اعظم نہ بن سکے لیکن وزیر داخلہ بن گئے، عملی طور پر سارا صوبہ انہی کے ہاتھ میں تھا!
وزارت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد مسٹر منشی نے بہت جلد ثابت کردیا کہ وہ کانگرس کے ان ہندو کارکنوں میں ہیں جنھیں اپنی قوم پرستی پر نہیں، اکثریت پر ناز ہے۔

مسلم لیگ اپوزیشن میں تھی، مسٹر منشی نے اپنے دور وزارت میں، ہندوؤں کو جتنا خوش کیا، مسلمانوں کو اتنا ہی بددل اور بیزار کرلیا، انھیں اپنی قوت اور اکثریت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ وہ اصول، حق، صداقت، استحقاق، معقولیت کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتے تھے،

بمبئی کرانیکل کا ایک رپورٹر، مسٹر منشی کی نظر میں چڑھا ہوا تھا، انھوں نے بے تامل محکمۂ اطلاعات میں ایک اونچی ملازمت دیدی، حزب مخالف نے اعتراض کیا کہ اتنی اونچی اسامی پبلک سروس کمیشن کی منظوری کے بغیر کس طرح دے دی گئی، ؟ اس جگہ کا اشتہار کیوں نہیں دیا گیا ؟ منتخب امیدواروں سے انٹرویو کیوں نہیں لیا گیا ؟ مسٹر منشی اپنے موقف پر قائم رہے

بمبئی کی کانگرس وزارت نے امتناع شراب کی تجویز منظور کی، اور اسے نافذ بھی کر دیا گیا،

ظاہر ہے مسلمان اس تجویز سے اختلاف نہیں کرسکتے تھے، انھوں نے تائید کی، لیکن اس کے بعد جو مرحلہ پیش آیا وہ بڑا دلچسپ تھا، امتناع شراب کی اسکیم نافذ کرنے کے بعد، حکومت کو دو دشواریوں سے سابقہ پڑا، ایک تو وہ بہت بڑی رقم ہاتھ سے گئی جو محصول کی صورت میں وصول ہوتی تھی، دوسرے بہت سے پارسی بیکار ہو گئے، جو پشتہا پشت سے یہ کاروبار کرتے چلے آئے تھے، حکومت کو خسارہ کی رقم بھی پوری کرنی تھی، اور پارسیوں کے لئے متبادل روزگار فراہم کرنے میں بھی ہر امکانی مدد دینی تھی، اس کے لئے روپیہ چاہئے تھا!

روپیہ پیدا کرنے کی تجویز، مسٹر منشی کے زرخیز دماغ نے یہ سوچی کہ بمبئی کی شہری جائداد یعنی مکانات پر بھاری ٹیکس عائد کردیا جائے، گویا عملی طور پر اس ٹیکس کا بڑا حصہ مسلمانوں کی جیب سے وصول کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا، کیونکہ اقلیت میں ہونے کے باوجود، بمبئی میں مسلمانوں

کی شہری جائداد تقریباً ستر فیصد تھی،

مسلمان اس زیادتی کو برداشت نہیں کر سکے، سر کریم بھائی ابراہیم (بیرنٹ) کی قیادت میں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان اجتماعی جلوس نکالا، جلوس بالکل پر امن تھا، لیکن چھوٹے قبرستان کے قریب پہلے تو پولیس نے لاٹھی چارج کر کے اسے منتشر ہو جانے کا حکم دیا۔ جب اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی، تو فائرنگ کر دی،

یہ گویا حسن انتظام کا شاہکار تھا!

میں نے روزنامۂ خلافت میں اس حادثہ پر ایک مقالۂ افتتاحیہ لکھا کہ، کتنی عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ عدم تشدد کے پرستار مسلح دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے نہیں، بلکہ مخالفوں کو خاموش کرنے اور نظم و ضبط قائم کرنے کے لئے تشدد کا سہارا لیتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ صرف لاٹھی چارج پر اکتفا نہیں کرتے فائرنگ بھی کر دیتے ہیں،

کیونکہ اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا

اس لیڈنگ آرٹیکل پر حکومت نے روزنامۂ خلافت اور خلافت پریس کی سابقہ ضمانت ضبط کر لی، اور نئی ضمانت طلب کر لی، حالانکہ کانگرس اصولی طور پر اعلان کر چکی تھی کہ ضمانت طلبی کا سلسلہ اب بند، البتہ کھلی عدالت میں کسی اخبار کے خلاف مقدمہ چلایا جا سکتا ہے

مسٹر منشی ہی کے دور میں ریاست حیدرآباد میں مہاسبھائیوں نے "ستیہ گرہ" کی تحریک شروع کی، جو درحقیقت کانگرس کی شہ پر شروع کی گئی تھی،

انگریزوں کے دور حکومت میں مہاسبھا یا کسی دوسری جماعت کو ستیہ گرہ شروع کرنے کی جراءت نہیں ہوئی لیکن اب پراونشل آٹانومی، کے بعد صورت احوال یہ تھی کہ ریاست جن تین صوبوں —— مدراس، بمبئی، سی پی —— سے گھری ہوئی تھی، وہاں ہندو اکثریت تھی، اور کانگرسی وزارت قائم تھی، جس سے ہر طرح کی مدد مل سکتی تھی لہٰذا اس زعم میں یہ تخریبی تحریک شروع کر دی گئی،

حیدرآباد میں اس تحریک کو دبانے کی قوت تھی، اور اس نے کامیابی کے ساتھ اسے ختم بھی کر دیا، لیکن پڑوسی اور ہم وطن ہونے کی حیثیت سے سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدرآباد

نے بار بار مسٹر منشی سے استدعا کی کہ وہ شولا پور وغیرہ سے مہابھائی رضاکاروں کو حیدرآباد میں داخل ہونے کی سہولت نہ دیں، لیکن نہایت تحقّر اور تکبّر کے ساتھ مسٹر منشی نے جواب دیا۔

"اگر یہ لوگ ہمارے صوبہ میں کوئی خلاف قانون حرکت کریں گے تو ضرور سزا پائیں گے"!!

یا ٹیکلہ مسجد کے بالکل پہلو میں بغیر کسی حق اور جواز کے مسٹر منشی نے ایک مندر کی تعمیر کی اجازت دیدی، مسلمانوں نے احتجاج کیا، —— لیکن کون سنتا ہے فغان درویش"!

آخر نوبت ہندو مسلم فساد تک پہنچی، کافی کشت و خون ہوا، لیکن مندر بنا، اور نزاع و کشمکش کا ایک مستقل مرکز بن گیا۔

غرض چند سالہ دورِ حکومت میں مسٹر منشی نے اپنے اقتدار و اختیار سے کام لے کر مسلمانوں کی دل شکنی اور دل آزاری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اردو زبان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، مسلمان ملازمان سرکار جس پریشانی سے دوچار ہوئے، مسلم اوقاف کے سلسلہ میں جو رویہ اختیار کیا گیا، وہ ایک مستقل داستان ہے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

کانگرس سے مسٹر منشی کا قطع تعلق

۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی، اسی سال مسلم لیگ نے لاہور سشن میں قرارداد پاکستان منظور کی، اس تجویز نے سارے ہندوستان میں ایک تہلکہ برپا کر دیا، مہاسبھا تو مہاسبھا کانگرس نے بھی اس کے خلاف مورچہ قائم کر لیا، گاندھی جی، سردار پٹیل، جواہر لال نہرو سب ہی نے ہندوستان کے ٹکڑے کرنے سے انکار کر دیا۔

مساعی جنگ میں، کانگرس نے حصہ لینے سے انکار کر دیا، پھر وہ وزارتوں سے مستعفی ہو گئی، محدود اور مختصر پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی، بہت سے کانگرسی لیڈر جیل چلے گئے۔

مسٹر منشی بھی مستعفی وزرا میں تھے، لیکن سول نافرمانی کی تحریک میں انھوں نے کوئی حصہ نہیں لیا، جیل بھی نہیں گئے، پھر گاندھی جی کی اجازت سے انھوں نے کانگرس سے قطع تعلق

کرلیا، اور اکھنڈ بھارت یعنی متحدہ ہندوستان کے لئے اپنی سرگرمیاں وقف کردیں، غالبًا اسی نام سے ایک جماعت کی بھی تشکیل کرڈالی، کانگرس سے علیحدگی کی وجہ یہ تھی کہ جس رفتار سے یہ کانگرس کو تجویز پاکستان کے خلاف مصروف عمل دیکھنا چاہتے تھے، اس رفتار سے وہ کام نہیں کر رہی تھی، اس کے بعد ۴۲ء میں جب گاندھی جی نے "ہندوستان خالی کردو" کا نعرہ لگایا اور تمام رہنمایان کانگرس گرفتار ہوگئے تو بھی مسٹر منشی اس گروہ میں نظر نہیں آئے،

منشی اور جواہر لال

رفتہ رفتہ مسٹر منشی کانگرس سے بہت دور ہوگئے، رہنمایاں کانگرس کی نظر سے اتر گئے، جواہر لال تو خاص طور پر انھیں چشم اغماض سے دیکھا کرتے تھے، البتہ سردار پٹیل کے وہ ہمیشہ مقرب بارگاہ رہے، لیکن سردار کی نگاہ التفات بھی انھیں کانگرس میں پھر کوئی رتبہ نہیں دلا سکی، چنانچہ ۴۷ء تک یعنی تقسیم ہند تک مسٹر منشی چند دن کے لئے بھی وزیر نہ بن سکے، نہ بمبئی کے، نہ مرکز کے، تقسیم کے بعد جو وزارت قائم ہوئی، اس میں بھی سردار پٹیل کوشش کے باوجود انھیں شامل نہ کرا سکے، آخر سردار نے جو وزیر محکمہ امور ریاست بھی تھے، اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر، انھیں ہندوستان کا ایجنٹ جنرل بنا کر حیدر آباد بھیج دیا، جواہر لال اس انتخاب سے خوش نہ تھے، لیکن سردار سے لڑنا بھی نہ چاہتے تھے، ناگواری مگر خاموشی کے ساتھ اس تقرر کو برداشت کرلیا، لیکن جب تک منشی اس منصب پر فائز رہے، جواہر لال نے انہیں منہ نہیں لگایا، اشارۃً جس کی شکایت اپنی کتاب میں کئی موقعوں پر انھوں نے کی ہے۔

مسٹر منشی حیدر آباد میں

حیدر آباد کے دوران قیام میں مسٹر منشی نے بڑے بڑے گل کھلائے، ان کی کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سردار پٹیل نے ان کا انتخاب کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا تھا، حیدر آباد میں مسٹر منشی نے جس طرح زندگی بسر کی، جو کارنامے انجام دیے، اور ان کا جس طرح خود ذکر کیا وہ بڑی دلچسپ داستان ہے، اس داستان سے جہاں مسٹر منشی اور سردار

پٹیں برافگندہ نقاب ہو جاتے ہیں، وہاں حیدر آباد کے ایسے عبرت انگیز سبق آموز
اور حسرت آمیز واقعات بھی منظر عام پر آجاتے ہیں جن کے کیف و تاثر کا اندازہ صرف
پڑھنے والا ہی کر سکتا ہے، مسٹر منشی حیدر آباد اس لئے بھیجے گئے کہ جس طرح بھی ممکن
ہو، اس مسلم ریاست کا وجود ختم کر دیں، آدمی خوش قسمت تھے، فضا سازگار ملی، غداروں
نے پورے خلوص سے استقبال کیا، پرنس آف برار، فیلڈ مارشل، عیدروس شہزادہ
معظم جاہ نواب علی یاور جنگ اور دوسرے بہت سے لوگ تخریب حیدر آباد کا کارنامہ
انجام دینے میں مسٹر منشی کے دست و بازو ثابت ہوئے، اور اپنے ان نیاز مندوں
کے خدمات جلیل سے انھوں نے پورا فائدہ بھی اٹھایا بظاہر وہ اس لیے گئے تھے
کہ حیدر آباد اور ہندوستان کے تعلقات خوشگوار اور استوار کرائیں، لیکن درحقیقت
اس لیے گئے یعنے کہ حیدر آباد کو قصۂ ماضی بنا دیں، اور کوئی شبہ نہیں اپنے فرض
کو انھوں نے نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ انجام دیا، ان کی جگہ کوئی اور جاتا
تو شاید اس خوبی سے یہ کام نہ انجام دے سکتا،

مسٹر منشی کی خود گزشت

دوران قیام حیدر آباد کے جو تاثرات مسٹر منشی
نے قلمبند کئے ہیں وہ بڑے دلچسپ ہیں، اور
ان سے ہمیں بہت سی باتیں پہلی بار معلوم ہوئی ہیں،

مسٹر منشی نے بہت کچھ کہا ہے، لیکن بہت کچھ نہیں بھی کہا ہے، انھوں نے حق
و صداقت کا لبادہ اوڑھ کر خامہ فرسائی کی ہے، لیکن حق و صداقت کو اپنے ساتھ لے
کر چند قدم بھی نہ چل سکے، ان کی تحریروں میں روانی ہے، شگفتگی ہے طنز ہے، تسلسل ہے
ترتیب ہے، ذہانت ہے، لیکن یہ روانی ہے وہ آب مصفا کی نہیں سیل جہانگیر کی
ہے، جو شگفتگی ہے وہ خندۂ استہزاء، اور زہر خندے عبارت ہے، جو طنز ہے، وہ
طنز لطیف نہیں، جس سے وہ بھی لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتا جس پر طنز کیا
جائے، بلکہ ایسا طنز ہے جس میں کپٹ ہے، استحقار ہے، نفرت ہے، غرور ہے، اور
اس طنز کو سننے والے بھی کراہت کے کانوں سے سنتے ہیں، تسلسل ضرور ہے،

لیکن وہ تسلسل جو ایک ہوشیار وکیل کی مسلوں میں نظر آتا ہے، ترتیب بھی ہے، اور وہ ترتیب، جو واقعات و حقائق کو الٹ پلٹ کر کچھ کا کچھ بنا دیتی ہے، اور جو ذہانت نظر آتی ہے اس کا مصرف صرف اتنا ہے کہ گل کو خار، اور خار کو گل ثابت کر دے، جس کی ایک طباع وکیل کے پاس فراوانی ہوتی ہے، اور جھوٹے مقدمے لے کر بھی ہر اپنی ذہانت کے جھنڈے گاڑتا ہے،

زبان و بیان کے اعتبار سے کتاب دلچسپ ہے، لیکن بھونڈے قسم کا انا اتنا زیادہ بھرا ہوا ہے، حریفوں پر اتنے چھچھورے انداز میں ذاتی اور صفاتی حملے کئے گئے ہیں اپنی رفعت اور برتری کا ایسا سماں باندھا گیا ہے۔ اور دوسروں کی پستی اور نگوں ساری کا ایسا ڈھنڈورا پیٹا گیا ہے کہ زبان و بیان کے لطف پر پانی پھر جاتا ہے، اور طبیعت میں انشراح کے بجائے انقباض پیدا ہو جاتا ہے۔

غیر معتبر حکایات

بڑی ڈھٹائی سے مسٹر منشی نے اس کتاب میں نظام اور بعض دوسرے ذی مرتبہ اشخاص کے بارے میں ایسی حکایتیں بیان کی ہیں، جو حد درجہ پست اور مبتذل ہیں، اور لطف یہ کہ حکایت بیان کرتے کرتے بڑی معصومیت اور سادگی سے اشارہ کر جاتے ہیں کہ اس کی صداقت پر خود انہیں بھی اعتماد نہیں، یوں ہی سنی سنائی بات زبان پر آ گئی بیان کر دی، یہ انداز نگارش نہ کسی مؤرخ کا ہو سکتا ہے، نہ صحافی کا، نہ ذمہ دار اہل قلم کا، لیکن مسٹر منشی کو اس پر ناز ہے بغیر کسی جھجک اور تامل کے ان خرافات کو وہ بیان کرتے چلے جاتے ہیں،

بیگمات کی توہین

سب سے زیادہ افسوس ناک یہ ہے کہ روانی کلام میں آداب شرافت تک کو ملحوظ نہیں رکھا ہے، انھوں نے صاف الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ بمبئی میں ایک "جاسوس خاتون" اس لئے "فلاں" میں مقیم تھی کہ حسن و ادا، اور عشوہ و غمزہ کا کاروبار کر کے، بمبئی کے اعلیٰ سرکاری اور نیم سرکاری طبقہ سے کچھ راز حاصل کر لے، اسی طرح پولیس ایکشن سے پہلے چند روز کے لئے جب وہ بنگلور گئے ہیں تو وہاں بھی انھیں اونچے خاندانوں کی کئی ایسی لڑکیاں نظر آئیں

جو بھارت کے فوجی افسروں کو اپنے رقص و نغمہ کے جال میں پھنسا کر راز اگلوانے کے درپے تھیں۔

مسٹر منشی نے حیدر آباد اور وہاں کے برسرِ اقتدار اور حریت خواہ اصحاب کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی زیادہ اور اس سے بھی سخت لکھ سکتے تھے، لیکن مسلم خواتین کے بارے میں اس طرح تہمت تراشیاں کم از کم ایک شریف آدمی کو تو زیب نہیں دیتیں، کوئی عقیل و فہیم شخص ان باتوں پر اعتبار نہیں کر سکتا، لیکن ایسی باتیں لکھ کر مسٹر منشی نے خود اپنے آپ کو بے نقاب کر دیا، اور ستم ظریفی یہ کہ یہ جرأت شبستان محل میں بیٹھ کر کی ہے ——

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفل رنداں خبرے نیست کہ نیست

زیادہ تعجب اس لئے ہوتا ہے کہ گاندھی جی سے حیدر آباد کی مہم سر کرنے کے بارے میں مسٹر منشی نے مشورہ کیا، تو انھوں نے وہاں جانا، اور کام کرنا "دھرم" قرار دیا تھا، اور جہاں تک گیتا پڑھنے کا تعلق ہے روزانہ مسٹر منشی "دھرم" کا فریضہ انجام دیتے رہے، لیکن گاندھی جی سے عہد اور گیتا کی روزانہ تلاوت کے باوجود، ایک قوم کی خواتین پر تہمت تراشی کرنا، نہ جانے کس طرح انھوں نے "دھرم" میں شامل کر لیا، ورنہ دنیا تو یہی سمجھتی ہے کہ جھوٹ بولنا، اور شریف خواتین پر تہمت لگانا، دھرم کے خلاف کام ہے، مسٹر منشی کا دھرم اگر یہی ہے تو —— مذہب معلوم و اہلِ مذہب معلوم ! ،

جاسوس ساز ایجنٹ جنرل

حیدر آباد کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مسٹر منشی نے پہلا کام یہ کیا کہ جاسوسوں کی تخلیق، اپنے وسیع وسائل اور ذرائع سے کام لے کر شروع کر دی، بڑے فخر کے ساتھ اعتراف فرمایا ہے کہ نظام، لائق علی، اور رضوی کی ساری باتیں مجھے فوراً معلوم ہو جاتی تھیں، اور جو لوگ یہ اطلاعات لے کر آتے تھے "وہ میری آنکھ، اور میرے

کان تھے، ۱۱ (They were my eyes and ears)

حیدر آباد کے سربر آوردہ اصحاب (Leading Men) کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ مجھے تمام اہم باتیں آآکر بتایا کرتے تھے،" ۱۱ ص ۹۵

شاید یہی وجہ تھی کہ اہل نظر نے بھانپ لیا تھا کہ مسٹر منشی حیدر آباد کیوں تشریف لے جا رہے ہیں، خود انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ بعض غیر ملکی اخبارات نے انھیں " ہندوستانی فوج کا ہراول " (Advance Guard of Indian Army) قرار دیا تھا، اور ایک برطانوی اخبار نویس نے تو انھیں گی لپٹی رکھے بغیر "ٹروجن ہارس" (اس محاورہ کی تفصیل اندرون کتاب میں ملاحظہ ہو) سے تشبیہ دیدی تھی

Munshi has been chosen to be the Trojan Horse in the seige of Hyderabad

مسٹر منشی کا غصہ

شاید انہی چبھتے ہوئے فقروں کے باعث مسٹر منشی، انگریز اور امریکن صحافیوں کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے ہیں اور انھیں چٹورا، ندیدا اور لالچی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، اور برہمی یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ گو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو کئی مواقع پر انھوں نے خراج عقیدت پیش کیا ہے اور واقعی وہ تھے بھی ان کے اور ان کی قوم کے محسن اعظم لیکن کبھی کبھی ان پر بھی چھینٹے مار جاتے ہیں، ہندوستانی فوج کے وہ افسر، جو حیدر آباد میں آکر ملازم ہو گئے تھے، اور ہندوستانی فوج کے وہ افسر، جو حیدر آباد پر بوجوہ فوجی حملہ کے مخالف تھے، مسٹر منشی کے خاص طور پر معتوب ہیں، انھیں اتنی کھری کھری سناتے ہیں کہ لب و لہجہ عامیانہ اور سوقیانہ ہو جاتا ہے، لیکن دل کی بات زبان پر آ ہی جاتی ہے۔

سیکولر حکومت کا فرقہ پرست ایجنٹ

مسٹر منشی ایک سیکولر حکومت کے ایجنٹ جنرل بنکر حیدر آباد گئے تھے، ان کا نقطۂ نظر وسیع ہونا چاہئے تھا، ان کا دل فراخ ہونا چاہئے تھا، ان کے استدلال میں جامعیت

ہونی چاہئے تھی، لیکن ایسا نہیں ہے وہ اوّل و آخر ہندو نظر آتے ہیں، ہندو مفاد کے تحفظ و بقا کے لئے ماہی بے آب دکھائی دیتے ہیں، ہندو اکثریت پر مسلم اکثریت کی بالادستی کے خلاف غم و غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے —— کیا سیکولر حکومت کے نمائندے کو یہ باتیں زیب دیتی تھیں؟ لیکن صرف مسٹر منشی کو الزام دینا زیادتی ہے، یہاں تو آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے، کیا منشی، کیا سردار، کیا دوسرے حضرات سب کی زبان پر یہی نوحہ ہے، ——!!

مسٹر منشی کو شکایت ہے کہ حیدر آباد کی ۹۵ فیصد آبادی (بیلن نے ۸۵ فیصد لکھا ہے) ایک حقیر اقلیت —— مسلمان قوم —— کی غلامی کس طرح کر سکتی ہے؟

اپنی جگہ پر یہ اعتراض بجا اور درست ہے،! —— لیکن یہ بات زبان پر لاتے وقت وہ کشمیر کو کیوں بھول گئے، وہاں ہندو مسلم تناسب تقریباً وہی ہے، جو حیدر آباد میں ہے

حیدر آباد اور کشمیر کا فرق

بلکہ حیدر آباد اور کشمیر میں یہ فرق ہے کہ حیدر آباد کا فرماں روا دل کھول کر ہندو اداروں اور معبدوں کی مالی مدد کرتا تھا، مگر کشمیر کے مہاراجہ نے کبھی ایسا نہیں کیا، حیدر آباد میں سر کشن پرشاد، مدتوں وزیر اعظم رہے، لیکن کشمیر میں کبھی کوئی مسلمان اس منصب پر (الحاق کشمیر سے پہلے) فائز نہیں ہوا، حیدر آباد میں صنعت، حرفت، تجارت، اور سارے کاروبار پر ہندوؤں کا قبضہ تھا، لیکن کشمیر میں ملازمت سے لے کر تجارت تک، ہر چیز کے دروازے مسلمانوں پر بند تھے، حیدر آباد میں کوئی مندر، کوئی گوردوارہ مسجد میں نہیں تبدیل کیا گیا، نہ اس پر تالا لگایا گیا، نہ اس کے حدود میں داخلہ ممنوع قرار پایا، لیکن کشمیر میں نہ جانے کتنی مسجدیں اور خانقاہیں ایسی تھیں، جن پر ہندوؤں کا یا ریاست کا قبضہ تھا، اور مسلمان اف بھی نہیں کر سکتے تھے، گلانسی کمیشن کی سفارشات کے بعد بھی کوئی تدارک نہیں کیا گیا، کشمیر میں مسلمانوں کے شعائر کی بجا آوری پر طرح طرح

کی پابندیاں تھیں، مگر حیدر آباد میں سکھوں یا ہندوؤوں پر کوئی پابندی نہیں تھی، پھر بھی کشمیر کے مسلمانوں کی تائید و حمایت میں منشی صاحب اور ان کے سرپرستوں نے کبھی کچھ نہیں لکھا، اور حیدر آباد کے لئے مرغ نیم بسمل بن گئے، کشمیر پر قبضہ کر لینے کے بعد بھی مسلمانوں کی قسمت وہی رہی جو مہاراجہ کے زمانہ میں تھی، اور حیدر آباد پر قبضہ کے فوراً بعد ہندوؤں کی قسمت بدل گئی، ——— کیا اسی کا نام انصاف ہے؟

اور یہ ۹۵ یا ۸۵ فیصد کا طلسم حقیقت بھی کیا رکھتا ہے اگر اچھوتوں کو ہندوؤں کے زمرہ سے نکال لیا جائے،!

حیدر آباد میں اچھوتوں کی بہت بڑی تعداد تھی، اور یہ اچھوت ہندوؤں کے ظلم سے تنگ آئے ہوئے تھے، انھیں ایک طرف تو ہندو کہا جاتا تھا، دوسری طرف یہ ان تمام حقوق سے محروم تھے جو ہندو کی حیثیت سے انھیں حاصل ہونا چاہئے تھے، یہ مندر میں عبادت نہیں کر سکتے تھے، یہ مورتی کو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے، یہ مذہبی تعلیم نہیں حاصل کر سکتے تھے، یہ مذہبی کتابیں نہیں پڑھ سکتے تھے، یہ ایک ہندو کے ساتھ ایک دسترخوان پر کھانا نہیں کھا سکتے، آخر یہ کیوں ہندو تھے، کس اصول اور استحقاق کی بنا پر انھیں ہندو قرار دیا جا رہا تھا؟ یہ نہ ہندو تھے، نہ ہندوؤں کے ساتھ تھے،!

مسٹر منشی نے حیدر آباد کے اچھوت دھرکین) وزیر اور وہاں کے اچھوتوں کا ذکر بڑی حقارت اور طنز کے ساتھ کیا ہے، لیکن اس طرح حقائق تو نہیں بدل سکتے، واقعات کو تو نہیں چھپایا جا سکتا حقیقت یہ ہے کہ تاریخ عالم میں اس دھاندلی کی مثال نہیں مل سکتی جس دھاندلی اور سینہ زوری کے ساتھ اچھوتوں کو ہندو ثابت کرنے اور انھیں ہندوؤں کے ساتھ سیاسی طور پر وابستہ رہنے پر مجبور کیا گیا؟،

جب تک حیدر آباد کا سقوط عمل میں نہیں آگیا، اچھوت نہ اپنے آپ کو ہندو سمجھتے تھے نہ ہندوؤں کے ساتھ سیاسی الحاق پر آمادہ تھے، انھیں اپنی انفرادیت پر اصرار تھا، اور

حیدرآباد کی حق پسند حکومت سے اپنا یہ مطالبہ انھوں نے منوا بھی لیا تھا، لیکن سقوط حیدرآباد کے بعد ان بیچاروں کو بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے، اور جس طرح حیدرآباد کا ہندوستان کے ساتھ جبری الحاق ہو گیا، اسی طرح وہاں کے اچھوتوں کا ہندوؤں کے ساتھ جبری الحاق ہو گیا، تلوار کی منطق کے سامنے کمزور کب ٹھہر سکتا ہے''؟

ہندوؤں کی مذہبی بے بسی کے بارے میں منشی صاحب نے جو داستان بیان کی ہے وہ بھی سراسر غلط ہے، انھوں نے جس میمورنڈم کا ذکر کیا ہے (جو وائسرائے کے سامنے پیش کیا گیا تھا) اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس محضر میں شکایت کی گئی تھی، کہ حیدرآباد کے ہندوؤں کو اپنے شعائر مذہبی پر عمل کرنے کی آزادی نہیں، لیکن اس محضر پر حیدرآباد کے ایک ہندو کے بھی دستخط نہیں تھے، جتنے دستخط تھے، سب غیر حیدرآبادی ہندوؤں کے، ان دستخط کنندگان میں مسٹر اینے بھی تھے، جو اوّل درجہ کے مہاسبھائی تھے مسٹر چنتامنی بھی تھے، جو گو مدراس کے رہنے والے تھے، لیکن جن کی ساری عمر یوپی میں "لیڈر" کی ایڈیٹری کرتے گزری تھی، جو کچھ عرصہ تک یوپی میں وزیر بھی رہے تھے، اور مستقل طور پر یوپی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر تھے، جو کانگریس کے بدترین دشمن تھے، اور مہاسبھا سے جن کا ربط اتنا ہی گہرا تھا، جتنا مسٹر منشی کا سردار پٹیل سے تھا!!

مسٹر منشی کا تعصب!!

حیدرآباد پہنچنے کے بعد مسٹر منشی نے شاید پہلے ہی دن اتنے پست قسم کے تعصب کا اظہار کیا، جس سے ریاست کے عوام و خواص میں اندیشہ ہائے دور و دراز کا پیدا ہونا ایک قدرتی اور طبعی اثر تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ الحاق کے بعد حیدرآباد میں کس طرح کی حکومت ہوگی، موصوف بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے اپنی سرکاری قیام گاہ کا سرکاری نام "دکن ہاؤس" بدل دیا، اور اسے "وکشتا سدن" کر دیا، یہ بولتی ہوئی ذہنیت کسی تشریح کی محتاج نہیں انگریزی سے تو موصوف کو چڑ نہیں ہے، ان کی ساری عمر انگریزی بولتے اور لکھتے گزری ہے، خود یہ معرکہ آرا کتاب بھی انھوں نے انگریزی ہی میں لکھی ہے، چڑ لفظ "دکن" سے ہوگی، اس لئے کہ اس سے بوئے اسلام و مسلمین آتی تھی، اور اسے برداشت کرنے

کے لئے وہ تیار نہیں تھے،

لیکن عربی فارسی الفاظ ہندوؤں کی دوسری زبانوں گجراتی، مرہٹی وغیرہ میں بھی کچھ اس طرح رچ گئے گئے ہیں کہ نکالے نہیں نکل سکتے نہ ان کا کوئی بدل تلاش کرنے کی موصوف جراءت کر سکتے ہیں، خود "منشی" کا لفظ عربی ہے، کیا مسٹر منشی اپنا خاندانی اسم گرامی بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، جس "سردار" کی نیاز مندی پر انھیں فخر ہے، وہ ولبھ بھائی پٹیل کے نام سے اتنا موصوف نہیں جتنا "سردار" کے نام سے، مسلمانوں سے انتہائی بیزاری اور وحشت کے باوجود سردار نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ اپنا نام بدل دیں، ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت نہرو ہیں، اور اپنے ملک میں اتنے محبوب ہیں کہ بارہ تیرہ سال سے اس منصب پر فائز چلے آ رہے ہیں ان کا نام "جواہر" ہے، کیا مسٹر منشی نے کبھی یہ تجویز پیش کی یہ نام بدل دیا جائے؟ اچاریہ کرپلانی بھی تعصب اور تنگ نظری میں مسٹر منشی سے کم نہیں ہیں، لیکن ان سے زیادہ حقیقت پسند ہیں، چنانچہ آزادی ہند کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اب "انڈیا" کا بدل کیا ہو، "بھارت یا کچھ اور" تو کرپلانی جی نے بے تامل فرما دیا، "ہندوا"!

تاریخی "شاہکار"

ہندوستان کے مسلمان کشور کشاؤں میں علاؤ الدین خلجی "جیسا" شاپ کا فاتح گزرا ہے، عین عالم شباب میں کڑہ مانک پور (الہ آباد) سے اس عالم میں کہ صرف شہزادہ تھا، اپنی مختصر سی فوج لے کر اٹھا، اور طوفان باد و باراں کی طرح، میدانوں، پہاڑوں، دریاؤں کو ناگھتا، پھلانگتا، عبور کرتا، گجرات پہنچ گیا، اور اس قدیم و عظیم الشان سلطنت کو آن کی آن میں، دشمن کی ہر طرح کی تیاریوں، اور غیر محدود وسائل و ذرائع کے باوجود فتح کر لیا، فتح کرنے کے بعد، اس نے رعایا پر کسی طرح کی زیادتی نہیں کی، امراء و شرفا کے اعزاز و اکرام کو ملحوظ رکھا، پھر اس نے مجبور سے راجہ کی بیوی کملا دیوی سے اپنی، اور اس کی چند سے آفتاب چندے ماہتاب بیٹی دیول دیوی سے اپنے بیٹے خضر خاں کی شادی کر دی، زندگی کی آخری سانس تک یہ دونوں اپنی بیویوں کے، اور یہ بیویاں اپنے شوہروں کی وفادار ہیں، بلکہ دیول دیوی نے تو حق وفا کملا دیوی سے زیادہ ادا کیا، اس نے اپنے شوہر کا ساتھ اس وقت بھی نہیں چھوڑا جب باپ نے بدظن ہو کر

بیٹے کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا تھا۔ امیر خسرو علاؤ الدین خلجی کے دربار میں بلند مرتبت حیثیت کے مالک تھے۔ علاؤ الدین ان کا حد درجہ خیال کرتا تھا، وہ صاحب دل بھی تھے صاحب زبان بھی، اس حسن وفا سے وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے ایک مثنوی "خضر خاں اور دیول دیوی" پر لکھ دی، جو تاریخ ادبیات میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے، یہ ایسے تاریخی حقائق ہیں کہ کسی مسلمان، ہندو، یا انگریز مورخ نے ان سے انکار نہیں کیا ہے، لیکن مسٹر منشی نے ایک ڈرامہ لکھ کر، اس تاریخ کو افسانہ بنا دینے کی سعی "دکشنا سدن" میں شروع کر دی، اور ڈرامہ کے لکھنے سے پہلے تاریخ کا افسانہ یوں بنایا کہ "میں تاریخی نقطۂ نظر سے (From a Historical point of view) ...... اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں کے واقعات امیر خسرو کے شاعرانہ تصور کی تخلیقات ہیں The figment of the Poet Amir Khusru's imagination

پھر ملک کافور وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ داستان گو مورخ لکھتا ہے "اور یہ ہندو تھے جو غلام بنا کر گجرات سے دہلی لے جائے گئے، جہاں انھیں طرح طرح کے رسوا کن (Ignominious) وحشیانہ اور شرمناک (Brutality and Shame) مظالم کا نشانہ بننا پڑا،

ان انکشافات سے جہاں مسٹر منشی کی تاریخ دانی بے نقاب ہوتی ہے۔ وہاں ان الفاظ سے ان کی پاکیزگی طبع، شرافت نفس اور دیانت فکر و نظر کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

رضوی کی تقریروں پر احتجاج و اضطراب

کتاب میں جگہ جگہ مسٹر منشی نے سید قاسم رضوی کی شعلہ انگیز لیکن پر جوش، اور ولولہ آفریں تقریروں پر سخت و ترش الفاظ میں احتجاج و اضطراب کا اظہار کیا ہے۔

یقیناً سید قاسم رضوی نے پرزور، اور پرخروش تقریریں کیں، لیکن کیا انھیں ان تقریروں کا حق نہ تھا؟ کیا انگریزوں کے عہد استبداد و استعمار میں کانگرس کے ہندو

لیڈروں نے ایسی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ مبالغانہ تقریریں نہیں کی تھیں؟ کیا جس ملک یا قوم کو غلام بنانے کی کوشش کی جائے، اسے صرف سر جھکا دینا چاہیئے، نطق و کلام سے یکسر قطع تعلق کر لینا چاہیئے۔ قاسم رضوی نے اگر اشتعال انگیز تقریریں کی تھیں، تو ان تقریروں کا سبب کون بنا تھا؟ حکومت ہند نے، اگر زور اور جبر کے بل بوتے پر حیدر آباد کو زیر نگیں کرنے کی سعی نامحمودنہ کی ہوتی تو قاسم رضوی کو کیا ضرورت تھی ایسی تقریریں کرنے کی؟ وہ بہر حال غلامی پر راضی نہیں تھے، وہ چاہتے تھے ان کا ملک آزاد رہے، اور آزادی کی ہر قیمت دینے کو تیار تھے، اور یہ قیمت جتنی انھیں چکانی تھی اتنی ہی ان کی قوم اور باشندگان ملک کو بھی چکانی تھی، قوم کو آمادۂ عمل کرنے کے لئے اگر انھوں نے آتش نوائی سے کام لیا، تو یہ انھیں کرنا ہی چاہیئے تھا اور بلاشبہ انھوں نے یہ کیا،

باقی ریاست کے ہندوؤں سے اور خاص طور پر وہاں کے اچھوتوں سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، اور اس کا سب سے بڑا ثبوت خود منشی نے اپنی کتاب میں فراہم کیا ہے۔ اگر اچھوتوں کو ان سے شکایت ہوتی، تو لائق علی کابینہ میں وہ اپنا نمائندہ نہ بھیجتے، اگر ہندوؤں کو کوئی جائز شکایت ہوتی تو پوری آزادی اور سلامتی کے ساتھ وہ اپنا کاروبار جاری نہ رکھتے اور لاکھوں روپے کے وارے نیارے نہ کرتے رہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کو شکایت اسی وقت پیدا ہوئی جب منشی صاحب حیدر آباد تشریف لے گئے، اور انھوں نے خفیہ و اعلانیہ انھیں اکسانا اور اشتعال دلانا شروع کیا۔

رضاکاروں کے خلاف احتجاج و اضطراب

رضاکاروں کے خلاف بھی جب جب [illegible] وہ احتجاج و اضطراب کا ثبوت دیا ہے، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ خالص وطنی تحریک تھی، ویسی جیسی خود کانگرس کے رضاکاروں کی تھی، حیدر آباد کی خونیں داستان کے مصنف نے سچ لکھا ہے، :

• حیدرآباد کی رضاکارانہ تنظیم جس پر انسانیت ہمیشہ فخر کرے گی، جذبۂ خدمت گزاری ایثار و جاں نثاری کا بیش بہا نمونہ تھی۔ جس تیزی کے ساتھ وطن کی آزادی کی یہ تحریک آگے بڑھی، اور جس اعلیٰ کردار کا مظاہرہ ہوا، اس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کا ہر حصہ واقف ہے، جو امیدیں اس تنظیم سے وابستہ کی گئی تھیں، اس کے ہر فرد نے حتی الامکان عملی طور پر ان کو پورا کر دکھایا، اعلانِ جنگ سے قبل بلا لحاظ مذہب و ملت عوام کے جان و مال کی حفاظت اور ملک کا وقار قائم رکھنے میں رضاکاروں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مظلوم کی حفاظت ان کا اولین فرض اور آخری نصب العین تھا، انڈین یونین رضاکاروں کو خطرہ سے تعبیر کرتی تھی اور ان پر صدہا الزامات عائد کرتی تھی، چنانچہ اپنے سرکاری بیانات میں یونین یہ دروغ بیانی کرتی تھی کہ ڈکیتی اور قتل وغیرہ کے ایسے واقعات جو حیدرآباد کے مرہٹواڑی کے علاقوں میں آپس کی خصومتوں کی وجہ سے ہمیشہ ہوا کرتے تھے، اور جن سے ان علاقوں کی عدالتوں کے ریکارڈ بھرے ہوئے تھے، ان کا ذمہ دار رضاکاروں کو ٹھہرانے لگی، اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور سفید جھوٹ کیا ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی تنظیموں کے بہانہ سے چند غنڈے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مجلس اور حکومت وقت نے ایسے عناصر کی بیخ کنی کا نہایت موثر طریقہ رائج کر رکھا تھا، اور جب کبھی رضاکاروں کے تعلق سے کسی ایسے واقعہ کی اطلاع ملتی تھی تو فوراً کونسل کے ہندو اور مسلم اراکین موقع واردات پر پہنچ کر حالات کی تحقیق کرتے اور خاطیوں کو سزا دیتے تھے،

شعیب اللہ کو رضاکاروں نے نہیں قتل کیا تھا

مسٹر شعیب اللہ ایڈیٹر امروز کے قتل کے واقعہ کو جو بالکلیہ ایک ذاتی مخاصمت کا واقعہ تھا، رضاکاروں سے متعلق کر کے انڈین یونین نے اس کو رضاکاروں کی تباہ کاریوں کی بنیاد بتایا ہے، مقتول ایک معمولی اخبار کا ملازم اور غیر معروف شخص تھا، اگر مجلس کے رضاکاروں کو مخالف تنظیم عناصر کی بیخ کنی ہی مقصود ہوتی تو شعیب اللہ کی بجائے بڑے بڑے خطرناک افراد کا بہت پہلے بہ آسانی خاتمہ

کیا جا سکتا تھا لیکن کبھی کسی رضاکار نے ان باتوں کا وہم وگمان تک نہیں کیا، کیونکہ مجلس یہ بتلانا چاہتی تھی کہ ہر قسم کا اقتدار رکھتے ہوئے اور دشمن اور مخالف جماعتوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ کامیاب ہونے کا یقین واثق رکھتی تھی۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ چند مخصوص غنڈوں نے رضاکاروں کے بھیس میں کہیں کوئی زیادتی بھی کی ہوگی تو ایسے واقعات گنتی کے چند واقعات سے زیادہ نہ ہوں گے،

خود ہندوؤں نے کیا کیا؟

لیکن جن واقعات کا انڈین یونین نے ذکر کر کے رضاکاروں کو مورد الزام ٹھہرایا ہے وہ دراصل ہندوؤں ہی کے تھے اسٹیٹ کانگرس کی مجلس عمل کے صدر مسٹر بندھو نے اپنے حالیہ اخباری بیانات میں انکشاف کیا ہے اور اعداد و شمار کے ساتھ ان کی وضاحت کی ہے ''اس کے علاوہ گاندھی جی کے قتل کے مقدمہ کے ایک ملزم آپٹے نے تحریری طور پر عدالت میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس نے حیدرآباد کے ہندوؤں کو ہتھیار فراہم کئے ۔ نیز اسٹیٹ کانگرس کی سوشلسٹ پارٹی کے ایک ذمہ دار رکن مہادیو پی رام چندر راؤ نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ تخریبی اعمال ہندوؤں کی طرف سے ہوئے تاکہ حیدرآباد کو آزاد کر دیا جائے، اسی طرح سوشلسٹ پارٹی کے ذمہ دار اراکین ایک کتاب ''مسئلہ حیدرآباد'' (Hyderabad problem) ——— شائع کی ہے، جس میں ان واقعات کا اعتراف کیا گیا ہے''!

اور پھر مسٹر منشی جن سنگھ کے رضاکاؤں کو کیوں بھول گئے، کیا انھوں نے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی؟ کیا وہ جن سنگھ رضاکار نہیں تھے جنہوں نے بے دریغ مسلمانوں کو قتل کیا، لوٹا، خانماں برباد کیا، !؟

بمبئی مسٹر منشی کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے، پونہ وہاں سے بہت قریب ہے۔ کیا مسٹر منشی پونہ کی ''پتری سرکار'' کے وہ دہشت انگیز مظالم بھول گئے جو مسلمانوں کے دست و پا قطع کرنے کی حد تک پہنچ گئے تھے؟ ان واقعات و حقائق کو مسٹر

منشی کس طرح جھٹلا سکیں گے ؟

کیا حیدر آباد کے ہندو مظلوم تھے ؟

مسٹر منشی نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ حیدر آباد کے ہندو مظلوم تھے، انھیں مساویانہ شہری حقوق نہیں حاصل تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سے بڑی کوئی غلط بیانی نہیں ہو سکتی، امر واقعہ یہ ہے کہ حیدر آباد کے ہندو، مسلمانوں سے زیادہ سکھ اور چین۔ راحت اور آسائش کی زندگی بسر کر رہے تھے، حیدر آباد کی خونیں داستان کے مصنف نے کتنی سچی بات کہی ہے :

”حیدر آباد کے بادشاہوں کے تعلقات اپنی رعایا کے ساتھ بلا لحاظ مذہب ہمیشہ یکساں رہے، بلکہ ہندوؤں کو اکثر صورتوں میں برتری حاصل رہی، چنانچہ زندگی کے جس پہلو پر غور کیجئے، ہندو مسلمانوں پر حاوی نظر آئیں گے، مثلاً جاگیرداری نظام میں ۷۵ فیصدی ہندو ہیں تو صرف ۲۵ فیصد مسلمان ہیں، عطیات و اوقاف سے بھی ہندو ہی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے، ہندوؤں کی عبادت گاہوں اور تعلیمی اداروں کو بکثرت رقمی امدادیں ملتی تھیں، جن میں بنارس یونیورسٹی وغیرہ شامل ہیں، کاروبار اور تجارت پر بھی ہندو بالکلیہ حاوی تھے، بنک کاری اور لین دین میں مسلمان بالکلیہ طور پر ہندوؤں کے دست نگر تھے، مکانوں اور جائدادوں کے بھی ہندو مالک تھے، اگر مسلمانوں کو کوئی برتری حاصل تھی تو وہ صرف سرکاری ملازمتوں میں تھی، جن کو محدود آمدنی کی وجہ سے ہندو باوجود مواقع حاصل ہونے کے قبول کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے، اعلیٰ خدمات حاصل کرنے اور سول سروس وغیرہ میں ہندوؤں کو وہی مراعات حاصل تھیں جو مسلمانوں کو، اور جس میں ہندو برابر شریک تھے “

حیدر آباد کے امتیاز خاص سے انکار

مسٹر منشی نے بار بار جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ حیدر آباد میں اور برطانوی ہند کی دوسری ریاستوں میں رتبہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں تھا، حالانکہ یہ غلط ہے، شروع ہی سے حیدر آباد کو ہر اعتبار سے دوسری ریاستوں پر تفوق حاصل

رہا ہے، خونیں داستان کا حیدر آبادی مصنف رقمطراز ہے:

"پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے:

حیدر آباد کا سیاسی پہلو تقسیم ہند سے قبل برطانوی دور میں بالکل وہی تھا جو من حیثیت الکل خود برِ اعظم ہند کا، انگریز کی سلطنت تمام ہندوستان پر حاوی تھی، ہندو مسلمان کسی کو اعتراض کی گنجائش نہ تھی، جس طرح ابتداء سے انگریز نے قبضہ جمائے رکھا، اسی طرح والیان ریاست کو بھی انگریز کے تحت رہنا ناگزیر تھا، بلکہ ہندو مسلمانوں کی سیاسی مجبوریوں نے والیان ریاست کے ارادوں کو بھی بعض مواقع پر پورا نہ ہونے دیا، لہٰذا حیدر آباد پر انگریز کی بالادستی بھی اسی پہلو کا ایک جز تھی، لیکن باوجود اس کے حیدر آباد کی سیاسی برتری اور اس کے اعلیٰ مقام کا یہ بین ثبوت تھا کہ حیدر آباد کا اپنا سکہ، اپنی ڈاک، اپنی ریل، اپنی فوج، اپنی جامعہ، اپنا نظم و نسق جو ابتداء سے رائج تھا، انگریز کے اعلیٰ اقتدار کے تصور کے باوجود ہمیشہ باقی رہا، ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی اگر انڈین یونین نظام کو یہ الزام دے کہ نظام کبھی آزاد نہیں رہے تو یہ تاریخی حقائق سے انکار، ہٹ دھرمی، اور اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے استعماری چال کے سوا اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔"

اس سے بھی مسٹر منشی انکار نہیں کر سکتے:

"ملک معظم نے ۱۹۳۶ء میں اس معاہدہ کا اعلان کیا جس میں برار پر حیدر آباد کی اقتدار اعلیٰ حیثیت کو تسلیم کیا گیا اور جس کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے حسب ذیل امور طے کئے گئے:

۱۔ ولیعہد سلطنت کو پرنس آف برار کا لقب حاصل ہوگا،

۲۔ سی پی و برار کے گورنر کا تقرر نظام کے مشورے سے ہوا کرے گا

۳۔ حیدر آباد کا ایجنٹ جنرل برار میں رہا کرے گا۔

۴۔ حکومت برطانیہ نظام کو سالانہ ۲۵ لاکھ روپیہ دیا کرے گی۔

۵۔ حکومت حیدر آباد کا پرچم سرکاری طور پر برار میں لہرایا جائے گا۔

حیدر آباد کے کھوئے ہوئے علاقوں میں علاوہ برار کے علاقہ جات، شمالی سرکار، بندرگاہ مچھلی پٹم، کڑپا، کرنول اور بلاری بھی شامل تھے جن کی واپسی کا بحیثیت خود مختار

حکمران کے نظام شدت سے مطالبہ کرتے رہے، حیدرآباد کی حیثیت سلطنت برطانیہ کے ساتھ خود شاہ انگلستان کی زبان میں ایک حلیف (Ally) کی تھی، نہ کہ ایک تابع کی، یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے'' :

چونکہ نظام کی حیثیت دیگر تمام ریاستوں سے بالا تھی، اسی لئے حکومت حیدرآباد نے کبھی کسی ریاستی ادارے میں بشمول ایوان والیان ریاست (Princes Chamber) شرکت نہیں کی، اور نہ اس کے لئے سلطنت برطانیہ نے اس کو مجبور کیا۔

حیدرآباد کو آزادی پر اصرار کیوں تھا

یہی وہ حقائق تھے، جن کی بنا پر حیدرآباد کو اپنی آزادی اور خود مختاری پر اصرار تھا۔ ہندوستان کی کسی ریاست نے آزاد رہنے کے لئے اتنے ہاتھ پاؤں نہیں مارے جتنے حیدرآباد نے۔ کیوں ؟ اس لئے کہ اسے آزادی کا استحقاق تھا، وہ ہر اعتبار سے اپنی آزادی قائم رکھ سکتی تھی، ہندوستان کی ساری ریاستوں میں وہی ایک ایسی ریاست تھی کہ لوٹ کھسوٹ اور شاہ خرچ ہونے کے باوجود، جس کا میزانیہ توفیر کا رہتا تھا، جس کے اقتصادی اور معاشی وسائل اتنے تھے کہ اپنے باشندوں کو جنگ کے ہولناک زمانہ میں بھی اس نے کوئی تکلیف نہیں ہونے دی، اس کے پاس ایسے قدرتی ذخائر تھے جن سے جنگ کے زمانہ میں اس نے فارن ایکسچینج کمایا، اور جنگ کے بعد اور زیادہ کما سکتی تھی۔ قدرت نے اسے بہت کچھ دیا تھا، بعض ایسی چیزیں دی تھیں کہ خود ہندوستان اس کا دست نگر رہنے پر مجبور تھا،

حیدرآباد کے باشندے ان حقائق پر غور کرتے تھے، تو ان کا جذبۂ آزادی اور زیادہ ابھرتا تھا، وہ ہر قیمت پہ آزاد رہنا چاہتے تھے، کوئی چیز بھی ان کے اس جذبہ میں سنگ راہ نہیں ہو سکتی تھی، حد یہ ہے کہ جب جوش انتقام سے مجبور ہو کر حکومت ہند نے حیدرآباد کے خلاف تعزیری اقدامات کئے، اور بڑی سختی سے اس کی اقتصادی ناکہ بندی کر لی جب بھی اس کے عزم اور حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ یہ جذبہ اور زیادہ سنگین ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ : ——————

"حیدر آباد کی حکومت اور حیدر آبادی قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے ان تمام واقعات و مشکلات کا نہایت صبر اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا، جنگی حالات پیدا ہو جانے کے باوجود حیدر آباد نے اپنے کامل نظم وضبط کو برقرار رکھتے ہوئے ہر آنیوالی اور آئی ہوئی مشکل کا نہایت آسان حل معلوم کر لیا، چنانچہ پٹرول کی جگہ پاور الکحل استعمال کر کے موٹریں چلائی گئیں، ڈیزل آئل کے بجائے ارنڈی اور مونگ پھلی کے تیل کا مکسچر بنا کر بسوں کو چلایا گیا، کلورین تیار ہونے لگی، ادویہ کے نئے کارخانے جاری ہو گئے، انگریزی ادویہ کی جگہ یونانی اور ایورویدک ادویہ استعمال کی جانے لگیں، البتہ انجکشن اور پنسلین وغیرہ کی نایاب ادویہ کے نہ ملنے کی وجہ سے کچھ جانی نقصان ضرور برداشت کرنا پڑا، مرض ہیضہ کا بڑے کامیاب طریقہ سے مقابلہ کیا گیا، تخریبی اعمال کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا جاتا رہا، ریلوں کی کمی کی وجہ سے سفر کم کر دیے گئے، ذرائع آمد و رفت کی کمی کی وجہ سے پیدل چلنا شروع کیا گیا، اور وزراء تک سائیکل پر پھرنے لگے، جان ومال کے نقصانات کو اہل ملک آزادی کے لئے قربانی تصور کرنے لگے"!!

یہ جذبہ، یہ جوش، یہ ولولہ، یہ حوصلہ، یہ عزم صرف اسی قوم میں پیدا ہو سکتا ہے جو آزادی کی قدر شناس ہو، جو آزادی کی لذت آشنا ہو، جو آزادی کو ہر چیز پر ترجیح دیتی ہو! بلا شبہ حیدر آبادی باشندوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا جذبۂ آزادی قابل رشک تھا!!

بی بی نگر ڈکیتی کیس

مسٹر منشی نے اپنی کتاب میں بی بی نگر کو بڑے زور شور سے پیش کیا ہے، حالانکہ واقعات و حقائق کی رو سے یہ کیس اتنا سنگین نہیں جتنا مسٹر منشی نے بنانے کی کوشش فرمائی ہے۔

جب کوئی عوامی تحریک اٹھتی ہے، تو وہ جوش و خروش سے مملو ہوتی ہے، اور جو لوگ اس تحریک کے راستے میں آڑے آتے ہیں، ان کے ساتھ اس کا رویہ تشدد آمیز بھی ہو جاتا ہے ——————— جو نہیں ہونا چاہئے ——————— لیکن عوامی تحریک کو لاکھ کنٹرول کیا جائے، اس طرح کے حوادث رونما ہو ہی جاتے ہیں، گاندھی جی کی ابتدائی دور قیادت میں چوری چورا کا حادثہ پیش آیا تھا، جس میں ایک پورا

تھا، مع عملہ کے نذر آتش کر دیا گیا تھا، اور ۴۲ءکی تحریک میں مخالفوں کے ساتھ، اور خاص طور پر سرکار کے حامیوں کے ساتھ جو سلوک مرعی رکھا گیا، اس کی تفصیلات درکار ہوں، تو مسٹر ٹاٹنہم ایڈیشنل سکریٹری محکمۂ داخلہ حکومت ہند کی وہ دلچسپ اور طویل کتاب پڑھی جائے، جو انھوں نے اس تحریک یعنی عدم تشدد کے پرستاروں کی تشدد پسندی کے ثبوت میں بقید ماہ و تاریخ، نہایت تفصیل اور پورے حوالوں کے ساتھ مرتب کر کے شائع کی تھی، غرض یہ کوئی ایسی ان ہونی بات نہیں ہے، ایسی باتیں ہو ہی جاتی ہیں،

مسٹر منشی نے اس بات کو اس لئے اور زیادہ زوردار بنا دیا ہے کہ اس واقعہ کی آڑ لے کر، لائق علی کابینہ کے کانگرسی وزیر راما چارنے استعفا دے دیا تھا، کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ یہ زیادتی نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ برداشت کر سکتے ہیں،

راما چاری کے استعفے کے بعد بھی بات وہیں رہتی ہے جہاں تھی، البتہ اس سے ایک سبق ہم مسلمانوں کو ضرور ملتا ہے۔

وہ سبق یہ ہے کہ راما چار نے وزارت سے اس لئے استعفیٰ دے دیا کہ ہندوؤں پر ظلم ہو رہا تھا اگر مسلمانوں نے بھی ایسا کیا ہوتا تو آج حالات کچھ دوسرے ہوتے، گڑھ مکتیشر میں جب بے گناہ مسلمان بھیڑ بکری کی طرح ذبح کیے گئے، تو نہ حافظ ابراہیم نے استعفیٰ دیا، نہ رفیع احمد قدوائی نے، بہار میں جب مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو نہ سید محمود مستعفی ہوئے، نہ مسٹر عزیز، دہلی میں جب بقول جواہر لال مسلمان کتے بلی کی طرح کاٹے جا رہے تھے، تو نہ مولانا ابوالکلام نے استعفا دیا، نہ ان کے کسی اور رفیق طریق نے، لیکن صرف ایک بی بی نگر کے واقعہ سے متاثر ہو کر ایک کانگریسی وزیر نے وزارت ٹھکرا دی،

مسٹر منشی کا اعتراف شکست

مسٹر منشی نے خودنمائی، خودبینی اور خود پسندی کی پوری شان کے ساتھ یہ کتاب قلمبند فرمائی ہے، لیکن کہیں حسرت و افسوس کے ساتھ، کہیں غم و غصہ کے ساتھ، کہیں اشتعال اور

برہمی کے ساتھ انھوں نے حریف مقابل کی برتری بھی تسلیم کی ہے، :

۱۔ مسٹر منشی نے صاف اور واضح الفاظ میں نظام جاسوسی کو خراج تحسین پیش کیا ہے، اور کئی مواقع پر اس کی کارگزاری اور برتری کا اعتراف کیا ہے، سب سے بڑا اعتراف یہ ہے کہ انھیں اپنے دو ہندو ملازموں کو بدرجۂ مجبوری نکالنا پڑا، کیونکہ یہ "دشمن" کے آلۂ کار بن چکے تھے کن سوئیاں لیتے رہتے تھے، اور پل پل کی خبریں حریف کیمپ میں پہنچایا کرتے تھے۔

۲۔ معین نواز جنگ سے مسٹر منشی بے حد خفا ہیں، سارے فتنہ کی جڑ انہی کو قرار دیتے ہیں، کبھی انھیں، مجلس اتحاد المسلمین کا دماغ قرار دیتے ہیں، کبھی انھیں قاسم رضوی کا مرشد قرار دیتے ہیں، کبھی انھیں لائق علی کا تربیت دہندہ تسلیم کرتے ہیں، اور یہ ساری باتیں جل جل کر، اور غصہ میں بھر بھر کر کہتے ہیں، لیکن اس اعتراف پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ، یہ شخص نہایت نفیس قسم کا آدمی ہے، آداب سفارت کا ماہر، فن گفتگو کا امام، سیاسی سوجھ بوجھ اور جوڑ توڑ میں بے مثل و بے نظیر، یہ بہت بڑا اعتراف ہے، جو کوئی حریف کسی حریف کے بارے میں کر سکتا ہے، اس اعتراف پر معین نواز جنگ کو فخر کرنا چاہیے۔ اس اعتراف کو پڑھنے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ ایسا جوہر قابل موجود ہے، مگر ہماری حکومت شروع سے اب تک اس کی ذہانت فراست و قابلیت سے فائدہ نہ اٹھا سکی، کم از کم کسی بڑے ملک میں اسے مرتبۂ سفارت پر پاکستان کی طرف سے فائز ہونا چاہیے تھا!!

۳۔ مسٹر منشی، سب سے زیادہ جس چیز سے نالاں، پریشاں، دل گرفتہ، مغموم و مایوس اور سراسیمہ نظر آتے ہیں، وہ حیدر آباد کا ملکۂ تشہیر ہے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ حیدر آباد نے اپنے ملک میں، ہندوستان میں، برطانیہ میں، امریکہ میں، فرانس میں، مشرق وسطی میں، اسلامی ممالک میں جس وسیع تنظیم اور کامیاب طریقہ پر اپنے کیس کی پبلسٹی کی ہے، اس نے حیدر آباد کے کیس کو بہت زیادہ مضبوط اور ہندوستان کے کیس کو بے انتہا کمزور کر دیا ہے، کبھی کبھی تو وہ حیدر آباد کے اس فضل و کمال

پر رشک کرتے، اور اشک حسرت بہاتے نظر آتے ہیں، بڑے درد بھرے الفاظ میں اپنی حکومت کے اس کمزور پہلو پر نکتہ چینی کرتے ہیں، گویا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ مسٹر منشی نے اعتراف کر لیا کہ بیلسٹی کے میدان میں حیدرآباد اپنے محدود وسائل اور بے زری کے باوجود، ہندوستان سے اس کے لامحدود وسائل اور خزانۂ قارون کے باوجود گوئے سبقت لے گیا، ــــــــ یہ اعتراف حکومت ہند اور سردار پٹیل کے لئے کتنا ہی موجب شرم و ندامت ہو، لیکن حیدرآباد اگر اس پر فخر کرے تو کیا بیجا ہے ''؟

(۴) مسٹر منشی کو سب سے زیادہ جس شخص نے زچ کیا، وہ مرد درویش لائق علی ہیں مسٹر منشی کا خیال تھا یہ ایک صنعت کار قاسم رضوی کی عنایت سے وزارت عظمیٰ کی مسند پر پہنچ گیا ہے، یہ کیا جانے سیاست کسے کہتے ہیں، اور سیاسی جنگ کس چیز کا نام ہے، لیکن جب سامنا ہوا، باتیں ہوئیں، داؤں پیچ ہوئے، جنگ ذہانت اور فراست شروع ہوئی، تو مسٹر منشی اسی طرح خلاف توقع اور یک بیک شکست کھا گئے جس طرح گاما سے زبیکو نے کھائی تھی، جب وہ بدن جھاڑتا ہوا اٹھا تھا، تو بے ساختہ کہہ اٹھا، سمجھ میں نہیں آتا میں کس طرح ہار گیا؟

لائق علی کا جہاں کہیں بھی ذکر آتا ہے، مسٹر منشی بہت پیچ و تاب کھاتے نظر آتے ہیں، اس لئے کہ انھوں نے سارے فنون جنگ استعمال کر ڈالے مگر اس تسبیح خواں کو زیر نہ کر سکے، کہیں جھنجھلاتے ہیں کہیں بگڑتے ہیں، کہیں سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اس کے کردار اور سیرت کا کمزور پہلو ایک بھی نہیں تلاش کر پاتے، وہ ایک چٹان کی طرح اپنے موقف پر جما ہوا نظر آتا ہے ــــــــ نہ بہ زوری نہ بہ زاری نہ بہ زری آید ــــــــ واقعہ یہ ہے کہ ساری زندگی میں مسٹر منشی کو ایسے حریف پنجہ فگن سے سابقہ نہ پڑا ہوگا، جب بھی وہ لائق علی کا ذکر کرتے ہیں ان کا یہ اعتراف گونجتا ہوا نظر آتا ہے، ــــــــ

ما را ازیں گیاہ ضعیف ایں گماں نہ بود،

غداران مملکتِ آصفیہ

مینن نے کم، اور منشی نے بہت زیادہ بے تکلفی کے ساتھ اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ حیدرآباد کے طبقۂ امراء و خواص ہیں، عام اس سے کہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو، بلکہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان زیادہ مسٹر منشی، اور حکومت ہند کے مددگار بنے ہوئے تھے، اور آئندہ کی منفعت ہیں، اپنے بادشاہ، اپنے وطن اور اپنی ملت سے غداری کر رہے تھے۔

ہر زوال پذیر قوم میں اس طرح کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہی اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اب اس کی زندگی کے دن پورے ہو گئے، حیدرآباد کے ساتھ بھی یہی ہوا، جب حیدرآباد کی مملکت کو ختم کرنے اور اس کی آزادی چھین لینے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو وہ حیدرآباد کے چند مسلمان ہی تھے، جو حکومت ہند اور اس کے ایجنٹ کے آلہ کار بنے ہوئے تھے، اور یہ معمولی مسلمان نہیں تھے، ان میں نظام دکن کے فرزند دلبند، ولی عہد مملکت، کمانڈر اعلیٰ، پرنس آف برار، اور چھوٹے بیٹے معظم جاہ بھی شامل تھے،

عزیز روز سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را

پھر دوسرے امرائے ذی وقار، اور حکام والا تبار کا کیا گلہ! مسٹر منشی نے اپنی کتاب میں اس طرح کے چند ہیروؤں کا ذکر کیا ہے، کیا جرم ہے اگر منشی صاحب ہی کے فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ایک مرتبہ ان کا نام نامی پھر سامنے آجائے، ویسے کتاب کے ترجمہ میں تفصیل تو آپ ملاحظہ ہی کر چکے ہوں گے،

پرنس آف برار

مسٹر منشی نے جب اپنی اہلیہ کے ساتھ پرنس آف برار اور ان کی بیگم شہزادی درشہوار سے ملنے کی تمنا کی، جو تمام تر ایک سوشل ملاقات تھی، تو پرنس نے از راہ سعادت مندی اس میں بھی سیاسی پہلو، اپنی وفاداری جتانے کے لئے پیدا کر لیا، ملاقات سے معذرت کر دی، کیونکہ ملاقات

کے لیے نظام کی اجازت درکار تھی، اور اجازت صرف اس صورت میں مل سکتی
تھی کہ ان کا جاسوس موقع واردات پر موجود رہے''!

..."And permission will be given only if his spy
is allowed to be present at our interview

اس انکشاف و اعتراف سے مسٹر منشی نے کیا کیا فائدے نہ اٹھائے؟

پرنس معظم جاہ | یہ نظام کے دوسرے صاحبزادے ہیں، انھیں نظام بہت عزیز اور محبوب رکھتے تھے، بر بھی پسر نوح ہونے میں پرنس آف برار سے کم نہیں ثابت ہوئے، اس فرزند سعادت اطوار نے ایک خط لکھ کر جس کی نقل پہلے سے مسٹر منشی کو بھیج دی گئی تھی، اور جو بعد میں شائع بھی ہو گیا، باپ پر الزام لگایا تھا کہ وہ حیدر آباد کو تباہی کے راستے پر لیے جا رہے ہیں (Leading Hyderabad to destruction)

یہ خط پڑھ کر غریب باپ پر کیا گزری ہوگی، اور حریفوں کے ہاں کیا چراغاں ہوا ہوگا!

العیدروس | جنرل العیدروس، افواج حیدر آباد کے سپہ سالار تھے، کہا جاتا ہے کہ جنگ کا تجربہ بھی رکھتے تھے، ان پر ملک کو بادشاہ ذی جاہ کو، لائق علی کو، قاسم رضوی کو غیر معمولی اعتماد تھا، لیکن، اس اعتماد کا صلہ یہ دیا کہ نہ ملک کا وجود باقی رہنے دیا، نہ بادشاہ کو کہیں کا رکھا، نہ لائق علی کو نہ رضوی کو ——— اور نہ خود اپنے آپ کو،

منشی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے یہ انڈین یونین سے راہ و رسم رکھے ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ ایک گھنٹہ بھی کسی مورچہ پر جم کر مقابلہ نہیں کیا،

عیدروس کے چند منظر:

۱۔ شروع شروع میں العیدروس صاحب، سامان جنگ چیکو سلوا کیہ (Czechoslovakia) . . . . سے خریدتے نظر آتے ہیں۔

(۲) دوسرے موقع پر عیدروس صاحب کے لئے بعض وزرا جو اتحادی نقطۂ نظر رکھتے تھے نواب چھتاری سے سفارش کرتے ہیں کہ انھیں یورپ سامان جنگ خریدنے بھیجا جائے۔

(۳) کنگ کوٹھی پر اکزیکیٹو کونسل کی جو میٹنگ نظام کی زیر صدارت ہوتی ہے جس میں مظالم حیدرآباد کے مسائل زیر بحث آتے ہیں، عیدروس بطور خاص مدعو کئے جاتے ہیں،

(۴) عیدروس اسلحہ خریدنے فرانس جاتے ہیں (ص ۵)

(۵) عیدروس افسران فوج سے خطاب کر کے انھیں جنگ کے لئے تیار رہنے کی ہدایت کرتے ہیں، (ص ۱۴۹)

(۶) عیدروس اپنی بیگم کے ساتھ دکشنا سدن میں آنا جانا شروع کر دیتے ہیں، اور وقتاً فوقتاً مسٹر منشی سے ملاقاتیں کرتے رہتے ہیں، ساتھ ہی عیدروس کی اس رائے کا بہت چرچا ہے کہ انڈین آرمی، بنیا فوج ہے، اور حیدرآباد کم از کم چھ مہینہ تک تو بڑی آسانی سے اس کی مزاحمت کر سکے گا۔

(۷) نانج کے حادثہ کے بعد رضوی اور عیدروس میں ان بن ہو جاتی ہے

۸۔ پرنس آف برار جو سپریم کمانڈر انچیف ہیں اور عیدروس ہیں جو کمانڈر انچیف ہیں، اختلافات پیدا ہونے لگتے ہیں،

۹۔ ہندوستان کے یوم آزادی کے موقع پر دکشنا سدن میں عیدروس بھی حاضر ہوتے ہیں،

(۱۰) پولیس ایکشن سے مہینہ بھر پہلے، عیدروس کے لئے انڈین آرمی کے جنرل راجندر سنگھ منشی سے فون پر کہتے ہیں کہ بیگم عیدروس پونہ جا رہی ہیں، انھیں جملہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں،

(۱۱) ۳ ستمبر کو، یعنی پولیس ایکشن سے دس دن پہلے منشی، مرارجی ڈیسائی وزیر اعلیٰ بمبئی (اب وزیر مالیات حکومت ہند) کو فون کرتے ہیں کہ شائستگی کا تقاضا یہ ہے کہ بیگم عیدروس سے بہت اچھا برتاؤ کیا جائے ۔ (Courtesy required that Mrs. Edroos)

should be very well treated

(۱۲) ۱۶- ستمبر کو یعنی پولیس ایکشن شروع ہونے کے بعد معین یار جنگ آکر منشی کو بتاتے ہیں کہ عیدروس نے نظام سے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وہ ہندوستانی افواج کا مقابلہ نہیں کر سکتے، He told the Nizam in unequivocal terms that he could not resist the Indian Army

(۱۳) سقوط حیدرآباد کے وقت حیدرآباد کی فوجی حالت بہ قول مسٹر منشی یہ تھی،

افواج باقاعدہ ، ۲۲ ہزار

افواج بے قاعدہ ۱۰ "

مسلح پولیس ۱۰ "

مسلح لیکن غیر تربیت یافتہ عرب فوجی ۱۰ "

مسلح رضاکار ۱ لاکھ

ان کے پاس بہترین سامان جنگ تھا، مگر عیدروس کی قیادت میں یہ دو دن بھی نہ ٹھہر سکے، حالانکہ وہ کہا کرتے تھے کہ کم ازکم چھ ماہ تک وہ "بنیا فوج" کا مقابلہ تو کر ہی لیں گے،

(۱۴) سقوط حیدرآباد کے بعد بڑے شوق سے عیدروس نے چودہری کے سامنے ہتھیار ڈالے، اور اس طرح ختم فسانہ ہو گیا، !

ہوش یار جنگ | ہمیشہ منشی سے ملتے چھپ چھپ کر رہے، نظام کو، لائق علی کے لئے اکساتے رہے، سر مرزا کے لئے فضا ہموار کرتے رہے، بھیس بدل کر، رات کے دو دو بجے دِکشنا سدن پہنچکر، منشی کو سوتے سے جگا کر باتیں کرتے رہے،

منظور یار جنگ | منشی کے یار غار بن گئے، اپنے ہم خیال دوستوں کا بھی ان سے تعارف کرایا، بروقت بڑے صائب مشورے دیتے

رہے، اور نظام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔

علی یاور جنگ حیدر آباد کے پشتینی نمک خوار، نظام اور لائق علی کے معتمد آزادی حیدر آباد کے علمبردار، پھر یک بیک ہوا پلٹی، اور حیدر آباد کے خلاف سازباز میں لگ گئے، مسٹر منشی کے مخصوص معتمدین میں تھے۔

ذوالقدر جنگ حیدر آباد کے دیرینہ نمک خوار تھے، لیکن منشی سے ہدایت لے کر نظام کو راہ راست پر لانے کی جد و جہد میں مصروف رہتے تھے، لائق علی کی نظام سے شکایت کی گئی کہ یہ نظام کے آلۂ کار ہیں۔

مہدی یار جنگ نظام کے معتمد خصوصی، لیکن ہر ملاقات میں یہ نقش بٹھا کر اٹھتے تھے کہ نظام خودکشی کر رہے ہیں، کاش انڈیا انہیں بچالے،

سر سلطان احمد یہ وہی بزرگ ہیں جو قائد اعظم کے ہدایات نظر انداز کر کے وائسرے کی کونسل کے ممبر بن گئے تھے، پھر مسلم لیگ سے نکالے گئے تھے، پھر حیدر آباد نے ان کا استقبال کیا، وہاں ایک منصب بلند پر فائز ہو گئے، مگر ساتھ حکومت ہند کا دیتے رہے، سقوط حیدر آباد کی کہانی لکھنے وقت جب کوئی مشکل پیش آئی سر سلطان نے مدد کی،

سالار جنگ تعارف میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ مسٹر منشی سے پہلی ہی ملاقات میں فرماتے ہیں، اگر معاملہ رو براہ کرنا ہے تو سکندر آباد سے آپ فوجیں نہ ہٹایئے گا،

If you want to solve the problem do not remove the Army from Secunderabad

راجہ بہادر دھرم سنگھ مسٹر منشی نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے کہ شہر کے تمام واقعات وحالات کی کہانی اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر سناتے تھے اور یہاں کو جانتے تھے۔

مسٹر شاستری یہ حیدر آباد کے ایک ہندو صحافی تھے، وینکٹ راؤ بریگیڈیئر وزیر ان پر بہت اعتماد کرتے تھے، قاسم رضوی کو بھی ان پر بہت بھروسہ تھا، ان

دونوں کے راز منشی کو بتایا کرتے تھے،

حیدرآباد فوج کا وہ افسر اعلیٰ

مسٹر منشی نے حیدرآبادی فوج کے اس افسر اعلیٰ کا ذکر بڑی محبت اور ممنونیت کے ساتھ کیا ہے (نام لئے بغیر) جس نے حکومت ہند کو حیدرآباد کی فوجی قوت کے صحیح اعداد و شمار کا مکمل نقشہ پیش کر دیا تھا، جس سے ہندوستانی فوج نے بہت فائدہ اٹھایا،

ایک اور بلند پایہ افسر

مسٹر منشی نے ایک اور بلند پایہ حیدرآبادی افسر کا بھی ذکر (بغیر نام لئے) کیا ہے، اور اسے خراج تحسین پیش کیا ہے کہ وہ باوجود احکام امتناعی Interdict ہمت و حوصلہ سے کام لے کر دلکشا سدن آتا تھا، اور راز کی باتیں بتا جاتا تھا،

لکشمی نواس

مسٹر منشی نے لکشمی نواس کے خدمات جلیلہ سے متاثر ہو کر یہانتک اعتراف کر لیا ہے کہ وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اگر یہ خضر طریقت ہر نازک موقع پر دستگیری نہ کرتا رہتا اور اطلاعات نہ فراہم کیا کرتا،

آخری اور ناقابل فراموش غدار

اب ہم ایک آخری غدار کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، اس غدار ہستی نے حیدرآباد سے نہیں ہندوستان سے غداری کی تھی، ! یہ کوئی معمولی ہستی نہ تھی، اس نے کانگرس کی کرسی صدارت کو شرف بخشا تھا، اس نے ایک بڑے صوبہ کی گورنری کی تھی، اس نے سول نافرمانی کی تحریکوں میں حصہ لیکر جیل کی سختیاں سہی تھیں، اسکی نشست اسی صف میں تھی جو گاندھی جی اور جواہر لال کیلئے مخصوص تھی۔ یہ وہ ہستی تھی جس نے اپنی زندگی کا آغاز، نظام کی شان میں قصیدہ مدحیہ لکھ کر کیا تھا، اور زندگی کا آخری کارنامہ یہ تھا کہ عین اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی کے طلبہ کے سامنے یہ ہستی گورنر کی حیثیت سے تقریر کر رہی تھی، سقوط حیدرآباد کی خبر آئی۔ سارے مجمع پر جوش مسرت سے دیوانگی کی کیفیت طاری ہو گئی، لیکن اس کی چشم خوں فشاں سے آنسو بہنے لگے، یہ سروجنی نائیڈو تھیں !!

یوپی کی گورنر، کانگرس کی صدر، اور اپنے وطن ——— حیدرآباد

—— کی نوحہ گر،!

اور آخرکار مسٹر منشی نے اپنی کتاب میں سقوط حیدر آباد کا سارا کریڈٹ خود لیا ہے، لیکن جس طرح ان کی توہین بھارت کے فوجی حکام نے کی، جس طرح وہاں سے بے پاپد تے دگرے دست بدتے دگرے نکالے گئے وہ داستان درد خود انہی نے رورو کر بیان کی ہے،

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

مسٹر منشی حیدر آباد میں اپنے آپ کو انگریز ریزیڈنٹ کی طرح با اقتدار و با اختیار دیکھنا چاہتے تھے لیکن خود ان کی حکومت نے جیسا کہ مینن نے لکھا ہے انھیں کوئی مرتبہ عطا نہیں کیا، حتیٰ کہ ریزیڈنٹ یا سفیر کے تبادلہ کے موقع پر جو تقاریب ہوا کرتی تھیں حکومت ہند نے احساس کمتری کے باعث ان تک کو روا نہ رکھا، پھر وہ اختیارات انھیں کیسے مل جاتے،!

پھر بھی پٹیل کی شہ پر انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا،!

بہرحال اب نہ حیدر آباد ہے، نہ مسٹر منشی کا وہ دم خم، لیکن اگر وہ گوش حق نیوش رکھتے ہوں تو جب وہ رخصت ہو رہے تھے، حیدر آباد کے ویرانہ سے آواز آ رہی تھی،

یہ میں نے مانا کہ آج خنجر مرا گلو بھی نہیں رہے گا
مگر میں قاتل کی تو بھی ظالم ہمیشہ یونہی نہیں رہے گا

مسلمانوں کے لئے درس ایثار ایک زمانہ تھا کہ مسلمان، قومی اور ملی معاملات میں ایثار بے غرضی اور خدائیت کی حیرت انگیز مثالیں قائم کر دیتے تھے، لیکن اب وہ دور ختم ہو گیا، البتہ دوسری قوموں میں ضرور موجود ہے،

دوسری جنگ عظیم میں مسٹر چرچل نے جب سر اسٹیفرڈ کرپس کو روس میں برطانیہ کا سفیر

بنا کر بھیجا تو وہ اس شرط پر گئے کہ تنخواہ نہیں لیں گے، لارڈ ہالی فیکس (جو پہلے لارڈ اروِن تھے) امریکہ میں برطانیہ کے سفیر کبیر بنا کر بھیجے گئے، انھوں نے بھی تنخواہ لینے سے معذرت کر دی، ان دونوں کی ذاتی مالی حالت ایسی تھی کہ انھوں نے حکومت کے خزانہ پر بوجھ بننا مناسب نہ سمجھا،

ہندوؤں میں بھی قومیت کا جذبہ بہت ترقی کر گیا ہے، اور وہ قومی خدمت بے غرضی اور ایثار کے ساتھ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، سردار پٹیل نے مسٹر منشی کو ہندوستان کا ایجنٹ جنرل بنا کر جب حیدر آباد بھیجنا چاہا تو انھوں نے بھی "باپو" اور "سردار" سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اس خدمت کو تو وہ بجا لائیں گے، لیکن خزانۂ سرکار سے کسی قسم کی تنخواہ نہیں قبول کریں گے۔

کرپس، ہالی فیکس، اور منشی کی یہ مثالیں، ہر طرح کے سیاسی اور فکری اختلاف کے باوجود ہر آئینہ قابل تحسین و ستائش ہیں، بلکہ قابل تقلید بھی ہیں، خدا کے فضل سے ہمارے دیس میں نواب بھی ہیں، دولت مند اور زردار بھی، اور اس طبقہ کے بعض افراد کو بڑے بڑے مناصب پر فائز ہونے کا بارہا موقع ملتا رہا ہے، لیکن اب تک ہمارے سننے میں یہ نہیں آیا کہ کسی دولت مند شخص نے کوئی منصب، ملّی اور ملکی خدمت سمجھ کر بے معاوضہ قبول کیا ہو!

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے!

جب تک ہم میں ایثار اور بے غرضی کا یہ جذبہ اور ولولہ نہیں پیدا ہوگا، ہم صحیح معنی میں ترقی نہیں کر سکتے!!

۱۷۳

HYDERABAD

مسئلۂ حیدرآباد

●

وی پی مینن سکریٹری محکمۂ امورِ ریاست حکومتِ ہند

●

•

آج ہوتا نہیں اس کا ضرر ان کو محسوس

ہو رہے ہیں ابھی کچھ لالۂ و سوسن پیدا،

بالیقین آئے گا اس باغ پہ ایسا اک وقت

کہ چلیں گی روشیں نشتر و سوزن پیدا

صورت برگ خزاں دیدہ پھریں گے اڑتے

نہ بہار آئے گی پھر، ہو گا نہ گلشن پیدا

•

حیدرآباد (۱)

....بالآخر معاہدۂ قائمہ کس طرح عمل میں آیا؟

ریاست حیدرآباد کو میر قمرالدین چین قلیچ خاں نے قائم کیا، یہ اورنگ زیب کے جنرل غازی الدین خاں فیروز جنگ کے صاحبزادے تھے، ان کا سلسلۂ نسب ابوبکر مسلمانوں کے پہلے خلیفہ سے ملتا ہے۔

خاندان آصفیہ

۱۷۱۳ء میں، اورنگ زیب کی وفات کے ساٹھ سال بعد فرخ سیر نے قمرالدین کو دکن کا وائسرائے مقرر کیا، اور نظام الملک فیروز جنگ خطاب دیا، بعد ازاں شہنشاہ محمد شاہ نے آصف جاہ کا خطاب مرحمت کیا، یہ خاندان اب اسی خطاب سے مخاطب کیا جاتا ہے۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی کشمکش

۱۷۲۴ء میں میر قمرالدین نے عملی طور پر اپنے آپ کو دہلی کے تسلط سے آزاد کر لیا، اگرچہ ۱۸۵۷ء تک یہ خاندان رسمی طور پر مغلیہ تاج سے وابستہ رہا۔ ۱۷۴۸ء میں میر قمرالدین کا انتقال ہو گیا، اور

فوراً ہی جنگ جانشینی شروع ہوگئی جس میں انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اپنے اپنے موقع پر حصہ لیا، اور حریف امید داروں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی، ۱۷۵۱ء میں صلابت جنگ ــــــ نظام الملک کا تیسرا بیٹا ــــــ فرانسیسیوں کی مدد سے کامیاب ہوا۔ اس نئے نظام نے اپنے آپ کو پورے طور پر فرانسیسیوں کے ہاتھ میں دیدیا، شرط یہ تھی کہ مرہٹوں کی یورش اور تاخت سے وہ اسے بچائے رکھیں، اس صلہ میں اس نے شمالی سرکار کے چار ضلعے فرنچ کو دیدیئے ــــــ جو اب صوبۂ اندھرا میں شامل ہیں ــــــ ۱۷۵۹ء میں انگریزوں نے فرانسیسیوں سے یہ علاقہ چھین لیا۔

۱۷۶۱ء میں صلابت جنگ کو اسکے چھوٹے بھائی نظام علی خاں نے نکال باہر کیا، اور کرناٹک کے محاصرہ کا حکم صادر کر دیا، لیکن انگریز فوجوں نے حیدرآبادی افواج کے حملوں کو پسپا کر دیا، ۱۷۶۶ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے نظام انگریزوں کی حمایت اور حفاظت میں آگئے۔

نظام کا جذبۂ آزادی

۱۷۶۷ء میں نظام نے جذبۂ آزادی سے سرشار ہوکر گزشتہ سال کا معاہدہ منسوخ کر دیا، اور حیدر علی فرماں روائے میسور سے ربط و تعلق قائم کر لیا، نظام اور حیدر علی کی مشترکہ فوجوں کو بھی شکست ہوئی، اور ۱۷۶۸ء کے معاہدہ کی رو سے ایک مرتبہ پھر نظام انگریزوں کے فوجی تحفظ میں آگئے، ۱۷۷۸ء سے حیدرآباد میں انگریزوں کا ایک ریزیڈنٹ رہنے لگا، اور ایک امدادی فوج بھی تعینات کر دی گئی۔

ٹیپو کے مقابلہ میں انگریزوں کا ساتھ

۱۷۹۹ء میں، ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ میں نظام نے انگریزوں کی مدد کی، ٹیپو کی شکست اور شہادت کے بعد اس کا صلہ انگریزوں نے یہ دیا کہ اسکا کچھ علاقہ نظام کو عطا کر دیا۔ اسی سال نظام نے اس علاقہ کا کچھ حصہ واپس کر دیا تاکہ امدادی فوج کے مصارف انگریزوں کو بہم پہنچ سکیں۔

۷ راگست ۱۸۰۳ء کو نظام علی خاں کی وفات اور ان کے بیٹے سکندر جاہ کی جانشینی

عمل میں آئی، یہ واقعہ انگریزوں اور مرہٹوں کی جنگ شروع ہونے کے تین دن بعد کا ہے۔ اس جنگ میں نظام نے انگریزوں کی دل سے مدد کی۔ مرہٹوں کو شکست ہوئی، اور نظام نے سارا برار، واردھا کا مغربی علاقہ، اور اجنتا کے تمام جنوبی اضلاع پر قبضہ کر لیا۔ جس پر اب تک سندھیا کا قبضہ چلا آرہا تھا۔

۱۸۲۹ء میں سکندر جاہ کا انتقال ہو گیا، اور ان کے بڑے بیٹے نصیر الدولہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے زمانہ میں امدادی فوج کے مصارف برابر بڑھتے گئے۔ آخر ۱۸۵۳ء کے معاہدے کے مطابق، صوبہ برار، اضلاع رائچور، اور حیدرآباد کی مغربی سرحد کے کچھ علاقے انگریزوں کی تحویل میں دیدیئے گئے۔ ان علاقوں کا نظم و انصرام انگریز حکام کے ہاتھ میں آگیا جس کی نگرانی ریزیڈنٹ کے ذمہ تھی۔

غدر کے ہنگامہ میں نظام کا انگریزوں پر احسان

۱۱ مارچ ۱۸۵۷ء کو نصیر الدولہ کا انتقال ہو گیا، ان کے بڑے بیٹے افضل الدولہ مسندِ حکومت پر فائز ہوئے۔ ان پر وزیر اعظم سالار جنگ کا اتنا اثر تھا کہ ۱۸۵۷ء کے غدر میں یہ انگریزوں کے لئے خطرہ ثابت ہونے کے بجائے مددگار ثابت ہوئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ میں نظام کے حسب دلخواہ ترمیم کی گئی، چنانچہ ۱۸۶۰ء کے معاہدے کی رو سے برار کے علاوہ سارا علاقہ نظام کو واپس کر دیا گیا، باغی راجہ شوراپور کا ضبط شدہ علاقہ بھی نظام کو دے دیا گیا، اور حکومت ہند پر پچاس لاکھ کا جو قرضہ تھا وہ معاف کر دیا گیا۔

۲۶ فروری ۱۸۶۹ء کو جب افضل الدولہ کا انتقال ہوا تو محبوب علی خاں بہت کم سن تھے، پندرہ سال بعد انھیں اختیاراتِ حکومت تفویض کئے گئے۔ ان کا عہدِ حکومت گو طویل تھا، لیکن قابلِ ذکر اور اہم واقعات و حوادث سے خالی تھا۔

برار پر نظام کا حق فرماں روائی

۵ نومبر ۱۹۰۲ء کو ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رو سے برار پر نظام کا حق فرماں روائی تسلیم کر لیا گیا، لیکن یہ علاقہ حکومتِ ہند کو پچیس لاکھ روپیہ سالانہ ٹھیکہ پر دے دیا گیا، جسے

انتظامی مصلحت سے حکومت نے صوبۂ متوسط سے ملحق کردیا، یہ معاہدہ لارڈ کرزن (Curzon) کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

میر عثمان علی خاں کا دور

موجودہ نظام میر عثمان علی خاں ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو تخت نشین ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں انھیں ہز اگزالٹڈ ہائی نس His Exalted Highness) کا خطاب مرحمت ہوا، کچھ ہی عرصہ بعد بادشاہ نے اپنے دستخطی مکتوب کے ذریعہ انھیں ایک اور خطاب "یار وفادار حکومت برطانیہ" Faithful Ally of the British Government) دیا۔

جغرافی اعتبار سے حیدرآباد ہندوستان کا قلب ہے۔ یہ ریاست شمال میں صوبجات متوسط سے، مغرب میں صوبہ بمبئی سے، اور مشرق میں صوبہ مدراس سے گھری ہوئی ہے آبادی، آمدنی اور سیاسی اہمیت کے لحاظ سے ہندوستان کی جملہ ریاستوں میں ممتاز ہے۔ اس کی آبادی تقریباً سولہ ملین ہے، سالانہ آمدنی چھبیس کروڑ سے زائد، رقبہ بیاسی ہزار مربع میل سے متجاوز، اس کا سکہ، نوٹ، ٹکٹ وغیرہ سب اس کے اپنے تھے۔ اس کے باوجود برطانوی حکومت کی بالادستی اس پر قائم تھی۔ جیسا کہ ۱۹۱۱ء میں لارڈ ہارڈنگ (Hardinge)، ۱۹۱۹ء میں لارڈ چیمسفورڈ (Chelmsford) اور ۱۹۲۵ء میں لارڈ ریڈنگ (Reading) نے تحریری و زبانی طور پر ظاہر کیا۔

حیدرآباد کے بدقسمت ہندو

حیدرآباد کی آبادی بچاسی فیصد سے زیادہ ہندو ہے، لیکن سول سروس پولیس، اور فوج کی ساری ملازمتیں مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں، حتیٰ کہ ۱۹۴۶ء میں نظام نے جو مجلس قانون ساز قائم کی تھی، اس میں بھی مسلمانوں کی دس نشستیں ہندوؤں سے زیادہ تھیں، ایوان صرف ایک سو تیس ممبروں پر مشتمل تھا۔

آزادی ہند کے موقع پر نظام کی امنگیں

۳ جون ۱۹۴۷ء کو جیسے ہی برطانوی حکومت کا پلان شائع ہوا، نظام نے ایک فرمان شائع کیا، اور اعلان کیا کہ وہ اپنے نمائندے نہ ہندوستان کی دستور یہ میں بھیجیں گے نہ پاکستان کی،

اور یہ کہ ۱۵ اگست کو۔ جب ہندوستان و پاکستان کو اختیارات حکومت منتقل ہوں گے تو وہ بھی آزاد اور خود مختار فرماں روا کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیں گے، اور یہ کہ حیدرآباد کی حیثیت ایک آزاد اور جداگانہ مملکت کی ہوگی، اور کامن ویلتھ کے ایک ممبر کی حیثیت سے وہ بھی شریک ہوگا، پھر جب انھوں نے پارلیمنٹ کے آزادیٔ ہند کے مسودۂ قانون کی دفعہ سات پر نظر ڈالی، جس کی رو سے ہندوستان کی کسی ریاست کو ڈومینین اسٹیٹس (درجہ نوآبادیات) نہیں دیا گیا تھا، تو انھوں نے سخت احتجاج کیا، اور کہا کہ میری حکومت کو برطانیہ جیسے دیرینہ یار وفادار نے کس مپرسی کے عالم میں چھوڑ دیا۔

۱۱ رجولائی کو نظام نے نواب چھتاری کی سرکردگی میں ایک وفد دہلی بھیجا، جو نظام کی اگزیکٹو کونسل کے صدر، یعنی وزیر اعظم تھے، دوسرے ممبران وفد نواب علی یاور جنگ سر والٹر مانکٹن، عبدالرحیم، اور رینگل وکمٹ رانا ریڈی تھے، اس کانفرنس میں پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ کی نمائندگی سر کونارڈ کارن فیلڈ (Sir Conrad Cornfield) اور ایل، سی، ایل، گریفن (Griffin) کر رہے تھے، محکمہ امور ریاست کی نمائندگی میرے ذمہ تھی، بحث جن عنوانات پر ہوئی وہ تین تھے۔

(۱) برار نظام کو واپس دیا جائے۔

(۲) حیدرآباد کو ڈومینین اسٹیٹس عطا کیا جائے۔

(۳) انڈین یونین سے حیدرآباد کا الحاق،

ماونٹ بیٹن کا کورا جواب

لارڈ ماونٹ بیٹن نے پہلے موضوع بحث کے متعلق کہا کہ آزادیٔ ہند کے مسودہ قانون میں نظام کی حکومت برار پر تسلیم کرلی گئی ہے، لیکن برار صوبہ جات متوسط کا ایسا مستحکم حصہ بن چکا ہے کہ اب یا تو وہ جنگ کے ذریعہ واپس لیا جا سکتا ہے، یا باہمی رضامندی سے ——— جس کا کوئی امکان نہیں! ——— علاوہ ازیں ۱۹۳۶ء میں ملک معظم کی حکومت اپنے آپ کو اس کا پابند بنا چکی ہے کہ موجودہ انتظامات میں اس وقت تک کسی طرح کا ردّوبدل نہیں کیا جائے گا، جب تک وہاں کے باشندوں سے رائے نہ لی جائے۔ اور اگر استصواب رائے کیا گیا تو کوئی شبہ نہیں

برار کے لوگ موجودہ صورت برقرار رکھنے کی تائید کریں گے۔

سرکونارڈ کارفیلڈ نے کہا کہ برار کے بارے میں تین سال کے لئے ایک معاہدہ قائم کر لیا جائے، یہ مدت گزرنے کے بعد استصواب کئے بغیر برار نظام کو واپس کر دیا جائے۔

میں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تجویز پیش کی کہ ایک معاہدۂ قائمہ برار کے متعلق غیر معین مدت کیلئے کر لیا جائے۔ اور طرفین میں سے ہر ایک کو اختیار ہو کہ بارہ مہینے کا نوٹس دے کر جب چاہے اس معاہدے کو منسوخ کر دے۔

وفد نے کہا کہ یہ تجویز وہ نظام کے سامنے رکھدے گا۔

حیدرآباد کے درجۂ نوآبادیات کے متعلق لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ملک معظم کی حکومت حیدرآباد کو برطانوی خاندان مشترکہ کا ممبر صرف ہندوستان یا پاکستان کے ذریعہ ہی سے بنا سکتی ہے— براہ راست نہیں۔

اس کے بعد حیدرآباد کے انڈین یونین سے الحاق کا مسئلہ زیر بحث آیا۔

پاکستان سے الحاق کی دھمکی

میں نے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وفد کو یہ باور کرانے کی سعی کی کہ الحاق میں حیدرآباد اور بھارت دونوں کا بھلا ہے، لیکن وفد کا تاثر یہ تھا کہ اس طرح نظام کی خودمختاری پر حرف آئے گا، وفد نے یہ بھی کہا کہ اس باب میں اگر حیدرآباد پر زیادہ زور دیا گیا تو نظام پاکستان سے الحاق کر لیں گے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ بلاشبہ قانونی طور پر نظام کو پاکستان سے ملحق ہونے کا حق ہے، لیکن اس سلسلہ میں جغرافی رکاوٹوں کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، نظام کو اس وقت جو موقع مل رہا ہے وہ آخری ہے، اور اگر اس سے فوراً فائدہ نہ اٹھایا گیا تو ہمیشہ کے لئے یہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بغیر کسی دھمکی کے میری آنکھیں وہ تباہ کن انجام ریاست کا دیکھ رہی ہیں جو آیندہ چند سالوں میں رونما ہو کر رہے گا۔

نظام کا خط ماؤنٹ بیٹن کے نام

۸ر اگست کو نظام نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط میں لکھا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان کسی کا بھی ایک

غیر منفک حصہ بننا نہیں چاہتے، البتہ ہندوستان سے ایک معاہدہ کرنے پر تیار ہیں، اس معاہدہ کے ماتحت حیدر آباد:

۱۔ مواصلات اور ریلوے کو ہندوستان کے معیار پر قائم رکھے گا۔
۲۔ دفاع ہند کے لئے حیدر آباد اپنی فوج بھی دے گا۔
۳۔ خارجہ پالیسی میں ہندوستان سے ہم آہنگ رہے گا۔

لیکن:۔

۱۔ اگر ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہوئی تو حیدر آباد غیر جانبدار رہے گا۔
۲۔ حیدر آباد کو ہر ملک میں اپنے ایجنٹ جنرل متعین کرنے کا حق ہوگا۔
۳۔ اگر ہندوستان نے برطانوی کامن ویلتھ سے کبھی علیحدگی اختیار کی تو حیدر آباد کو صورت احوال پر از سر نو غور کر کے کوئی راستہ معین کرنے کی آزادی ہوگی۔

۱۵ اگست کو دستور یہ ہند میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے امید ظاہر کی کہ حیدر آباد سے بہت جلد ایک تصفیہ جو فریقین کے لئے تسلی بخش ہو، عمل میں آجائے گا۔

حیدر آباد کے ہندو لیکن سارے ملک میں عام طور پر اور حیدر آباد کے ہندوؤں میں خاص طور پر ایک بے چینی اور خلش سی حیدر آباد کے بارے میں پائی جا رہی تھی۔ ہندوستانی پریس سختی سے نکتہ چینی کر رہا تھا کہ حیدر آباد قلب ہندوستان میں واقع ہے۔ اسے باقی رکھنا قومیت متحدہ کے لئے ایک عظیم خطرے کو دعوت دینا ہے۔

۱۷ اگست کو سر والٹر مانکٹن دہلی آئے، انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا، وہ نظام کو راہ پر لگا لائے ہیں، وہ ایسا معاہدہ کرنے کو تیار ہیں جس کی رو سے دفاع، امور خارجہ، اور مواصلات پر حکومت ہند کی بالادستی تسلیم کریں گے، سر والٹر نے یہ بھی کہا کہ وہ نظام کو الحاق کے قریب قریب لے آئیں گے بشرطیکہ "دستاویز الحاق" (Instrument of Accession) پر شکر چڑھا دی جائے یعنی اسے معاہدۂ اشتراک (Article of Association) کا نام دیا جائے۔

سردار کا سخت رویہ لیکن اس اصطلاحی تبدیلی کو ماننے کے لئے سردار کسی طرح تیار

نہیں تھے، انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ میں سوا اس کے کسی بات پر اصرار نہیں کرتا کہ نظام کو ہندوستان سے بہر حال ملحق ہو جانا چاہیئے کیونکہ دستاویز الحاق میں ذرا سی تبدیلی بھی ان والیانِ ریاست کی اعتماد شکنی ہو گی جو ہندوستان سے الحاق کر چکے ہیں، علاوہ ازیں اس سے یہ تاثر بھی پیدا ہو گا کہ ہندوستان کے دائرہ الحاق سے باہر رہنے میں بہ نسبت داخل ہونے کے زیادہ فائدہ ہے، سردار اس پر تیار تھے کہ حیدرآباد میں استصواب رائے عامہ کرا لیا جائے جس کا فیصلہ مان لیں گے، بلکہ برار تک دے دیں گے۔

چھتاری وفد دہلی میں

۸ رستمبر کو نواب چھتاری پھر ایک وفد لے کر دہلی آئے، بے نتیجہ بحث مباحثہ کے بعد وفد حیدرآباد واپس چلا گیا، ۸ رستمبر کو نظام نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک مکتوب لکھا کہ وہ الحاق پر نہیں، البتہ ہندوستان سے ایسا معاہدہ کرنے پر تیار ہیں جو باہمی اشتراک پر مبنی ہو، اس معاہدہ سے نہ صرف دونوں مملکتوں کے دوستانہ تعلقات و روابط زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے بلکہ دونوں میں زیادہ سے زیادہ تعاون اور ہم آہنگی کے عوامل بھی کارفرما ہو جائیں گے۔

نظام نے اپنے خط میں یہ بھی لکھا کہ اگر انھوں نے ہندوستان سے الحاق کر لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ فتنہ و فساد اور خوں ریزی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

جناح سے نظام کا رابطہ

اور عین اس وقت جب نظام نے ہمیں یہ خط لکھا اسی وقت انھوں نے جناح سے بھی رابطہ قائم کیا، اور استدعا کی کہ سر ظفر اللہ خاں کے خدمات مستعار دیئے جائیں تاکہ انہیں وہ اپنی ایگزیکٹو کونسل کا صدر بنا سکیں لیکن نظام کی یہ تمنا بر نہ آئی کیونکہ سر ظفر اللہ خاں مجلس اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی رہنمائی کر رہے تھے۔

سر والٹر مانکٹن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو بتایا کہ نظام کا رویہ الحاق کے بارے میں اتنا سخت اس لئے ہے کہ پاکستان انہیں اکسا رہا ہے، چنانچہ نظام نے ان سے استدعا کی ہے کہ وہ یکم اکتوبر کو کراچی جا کر جناح سے ملیں۔

الحاق کے بجائے اشتراک

گزشتہ تین ماہ سے جو گفت و شنید ہو رہی تھی اسے

رائیگاں جاتا دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر ہم حیدر آباد سے معاہدہ کرکے الحاق کا جوہر حاصل کرلیں تو کوئی مضائقہ نہیں، بے شک اس طرح ہماری کچھ سبکی ہوگی، دوسری ریاستوں کے سامنے ہمیں خفیف ہونا پڑے گا لیکن اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی تو ہوگا کہ حیدر آباد پاکستان سے الحاق نہ کرنے کا پابند ہوجائے گا!

یہی خیال لے کر میں سردار کے پاس پہنچا، ان سے میں نے کہا حیدر آباد سے ہم اس طرح کا معاہدہ کرکے اطمینان کا سانس لے سکیں گے، اور ہمیں کچھ وقت مل جائے گا۔ جنوبی ہند کا امن وامان اس طرح ہم خرید لیں گے، سردار نے اس بات سے اتفاق کیا کہ سیاست کی دنیا میں دوسرے درجہ کی چیز بھی کبھی قبول کرنا پڑتی ہے، لیکن یہ بھی کہا کہ وہ اپنی آخری رائے اس وقت تک نہیں دے سکتے جب تک اصل مسودہ نہ دیکھ لیں۔

چنانچہ میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سر والٹر سے کہا کہ میں سردار اور نہرو کو اس پر رضامند کرلوں گا کہ وہ معاہدۂ قائمہ پر تیار ہوجائیں بشرطیکہ یہ معاہدۂ الحاق کی روح اپنے اندر پنہاں رکھتا ہو، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی استدعا پر میں نے ہی ایک مسودہ تیار کیا۔ سر والٹر نے کچھ معمولی سی ترمیمیں کیں جنھیں میں نے قبول کرلیا، پھر یہ مسودہ باقاعدہ طور پر حیدر آبادی وفد نے حکومت نظام کی تجویز کی حیثیت سے میرے پاس بھیج دیا میں نے سب سے پہلے یہ مسودہ سردار کی خدمت میں پیش کیا، پھر نہرو کو دکھایا، اس مسودہ کو سردار، نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نے منظور کرلیا، حیدر آبادی وفد یہ مسودہ لے کر ۲۲ اکتوبر حیدر آباد روانہ ہوگیا اس وعدے کے ساتھ کہ ۲۶ اکتوبر کو نظام کے دستخط لے کر واپس آئے گا۔

قاسم رضوی کی مداخلت

۲۳، ۲۴، ۲۵ اکتوبر کو اس مسودے پر نظام کی ایگزکٹو کونسل نے غور کیا، اور تین کے مقابلہ میں چھ آرا سے فیصلہ کیا کہ نظام اس پر دستخط کردیں۔

لیکن مجلس اتحاد المسلمین اور قاسم رضوی کی مداخلت کے باعث، نظام نے حکومت ہند سے گفت وشنید کے لئے ایک دوسرا وفد مرتب کیا، جو نواب معین نواز جنگ، عبدالرحیم،

اور پنگل ونکٹ رام ریڈی پر مشتمل تھا، معین نواز جنگ ہی کی وہ شخصیت تھی جس نے حیدرآباد اور بھارت کے مابین ایک باعزت تصفیہ ناممکن بنا دیا، عبدالرحیم ایک فرقہ پرست اور نالائق شخص تھا، ریڈی کسی جماعت کا لیڈر نہ تھا۔

ماؤنٹ بیٹن اور سردار کی پریشانی

لارڈ ماؤنٹ بیٹن حیدرآباد کے ان نئے تغیرات سے سخت پریشان تھے، خاص طور پر قدیم وفد کی جگہ نئے وفد کے انتخاب سے، سردار سب سے زیادہ آشفتہ خاطر تھے، انھوں نے مجھ سے کہا، اب معقول چارہ کار ہمارے لئے صرف یہ ہے کہ جس طیارے پر یہ نیا وفد آئے اسی طیارہ سے اسے واپس کر دیں۔

نیا وفد ۳۱ اکتوبر کو دہلی پہنچا، ۲ نومبر کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے باقاعدہ ملاقات ہوئی، میں بھی اس موقع پر موجود تھا، معین نواز جنگ کچھ تبدیلیوں پر مصر تھے، لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن ماننے پر تیار نہ تھے، میں نے وفد کو بتایا کہ اگر ہندوؤں کے ساتھ بدسلوکی جاری رہی تو حکومت ہند خاموش نہیں بیٹھ سکتی۔ حیدرآباد اگر انڈین یونین سے باہر رہنا ہے تو ریاست کے ہندوؤں کو بجا طور پر یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ ان کی قسمت مسلم اقلیت کے ہاتھ میں ہے، حیدرآباد کی بھلائی اسی میں ہے کہ بھارت کے ساتھ شامل ہو جائے۔

ماؤنٹ بیٹن کی دھمکیاں

دوسرے روز وفد لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملا، انھوں نے کہا معاہدہ قائمہ کے مسودہ پر دستخط نہ کرکے نظام حکومت ہند کو تھوڑی سی زحمت میں ضرور مبتلا کر دیں گے، لیکن خود بہت بڑی تباہی سے دوچار ہوں گے۔ انھوں نے یہ غلط فہمی بھی رفع کر دی کہ ہندوستان کمزور ہے، اور دوسرے معاملات میں اتنا الجھا ہوا ہے کہ حیدرآباد پر پوری توجہ نہیں کر سکتا، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ریاست کے ہندوؤں کا اعتماد حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا چاہئے۔

لائق علی: نئے صدر اعظم

اس اثناء میں نواب چھتاری مستعفی ہو گئے، نظام پر مجلس کی طرف سے زور دیا گیا کہ وہ لائق علی کو جو مجلس اقوام متحدہ میں پاکستان کے نمائندے، اور حیدرآباد کے بڑے تاجر تھے یا زاہد حسین کو وزیر اعظم بنائیں۔

جو اس وقت ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے، نظام نے جناح سے مشورہ کیا انھوں نے رائے دی کہ ہر دو میں سے کسی کو بھی یہ منصب سونپنا مناسب نہیں۔ نظام نے اس گفت و شنید کے بارے میں بھی جناح سے رائے طلب کی، جو حکومت ہند سے ہو رہی تھی، لیکن ان معاملات پر جناح نے اظہار رائے کرنے سے انکار کر دیا، نظام نے جناح کے مشورہ کو نظر انداز کر کے لائق علی کو اپنی اگزکٹو کونسل کا صدر (وزیر اعظم) بنا دیا یہ سب کچھ قاسم رضوی کے اشارے پر ہوا، اگزکٹو کونسل کے دوسرے ممبر بھی قاسم رضوی کے نامزد کئے ہوئے تھے، اس طرح حکومت حیدرآباد عملی طور پر قاسم رضوی کے دست تصرف میں آگئی۔

قاسم رضوی دہلی میں

اس زمانہ میں قاسم رضوی دہلی آئے، وہ اس زعم میں تھے کہ حیدرآباد کی قسمت ان کے ہاتھ میں ہے، انھوں نے سردار سے ملاقات کی، اور میرے دفتر میں آ کر مجھ سے بھی ملے، انھوں نے گفتگو کے دوران میں اعلان فرمایا کہ حیدرآباد اپنی آزادی سے کبھی اور کسی حال میں دست بردار نہیں ہو سکتا۔ حیدرآباد کے ہندو نظام کے ماتحت خوشی اور مسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

میں نے جواب میں کہا، حیدرآباد، قلب ہندوستان میں واقع ہے، اور وہاں کے امن و امان سے حکومتِ ہند کو غیر معمولی دلچسپی ہے، یا تو دوسرے والیان ریاست کی طرح خود نظام کو الحاق کر لینا چاہیئے۔ ورنہ پھر یہ معاملہ وہاں کی رائے عامہ پر چھوڑ دینا چاہیئے!۔

رضوی نے جواب دیا اگر حکومت ہند نے استصواب رائے پر اصرار کیا تو آخری فیصلہ تلوار کے ذریعہ ہوگا۔

میں نے کہا یہ اندازِ کلام ان کے اور نظام کے لئے تباہ کن ہوگا، یہ سن کر رضوی نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

معاہدۂ قائمہ پر دستخط ہو گئے

بہر حال ۲۹ رنومبر ۱۹۴۷ء کو نظام نے الحاق کے بغیر معاہدۂ قائمہ پر دستخط کر دیئے۔

یہ معاہدہ پانچ دفعات پر مشتمل تھا۔

معاہدۂ قائمہ کے دفعات (۱) معاملات عامہ سے متعلق تمام معاہدے اور انتظامات، بہ شمول دفاع، امور خارجہ، اور مواصلات جو حکومتِ نظام اور نمائندۂ تاج (Crown representative) ــــ کے درمیان تھے بدستور حکومتِ نظام اور حکومتِ ہند کے مابین قائم رہیں گے، البتہ حکومتِ ہند نظام کو داخلی بدامنی کی صورت میں، فوجی مدد دینے کی پابند نہ ہوگی، نہ جنگ میں گرفتار ہونے کے سوا کسی اور حالت میں، اپنی فوجیں حیدرآباد میں تعینات کرے گی۔

۲۔ حکومتِ ہند اور حکومتِ نظام اپنے اپنے ایجنٹ جنرل، علی الترتیب حیدرآباد، اور دہلی میں رکھنے پر تیار ہیں، اور انھیں فرائض مفوضہ سرانجام دینے میں پوری پوری مدد دینگے۔

(۳) اس معاہدے کے ماتحت حکومتِ ہند حیدرآباد پر اپنی بالادستی کا کسی طور پر بھی مظاہرہ نہیں کرے گی، اور اس معاہدے کے ختم ہونے پر فریقین میں سے کسی کو بھی کوئی خاص حق حاصل نہیں ہوگا جس کا وہ دعویٰ کر سکے، نہ فریقین میں سے کوئی کسی ایسے حق سے محروم ہوگا جس سے وہ اب تک بہرہ ور ہوتا چلا آیا ہے۔

(۴) اس معاہدے سے متعلق اگر کوئی اختلاف فریقین میں رونما ہوا، تو اس کا فیصلہ ثالثی سے بایں طور ہوگا کہ ایک ثالث نظام نامزد کریں گے، دوسرا حکومت ہند، اور یہ دونوں نامزد شدہ ثالث مل کر امپائر (umpire) منتخب کریں گے۔

۵۔ یہ معاہدہ ایک سال تک قائم رہے گا، اور دستخط ہوتے ہی نافذ ہو جائے گا۔

نظام کا خفیہ خط معاہدے کے ساتھ نظام نے جو خط لکھا، اس میں انھوں نے تحریر کیا کہ گو وہ اپنے شاہانہ اختیارات اور حقوق سے مستقل طور پر دست بردار نہیں ہوئے ہیں لیکن وقتی طور پر اپنے بعض اختیارات شاہی کو اس معاہدہ کی مدت تک ازخود انھوں نے معطل کر دیا ہے۔

نظام نے ماؤنٹ بیٹن کے نام ایک خفیہ خط بھی لکھا جس میں اس بات کا عہد تھا کہ پاکستان سے حیدرآباد کا الحاق نہیں کیا جائے گا، نیز یہ کہ اگر بھارت نے برطانوی کامن ویلتھ سے علیحدگی اختیار کی تو حیدرآباد کو اپنی پوزیشن پر نظر ثانی کرنے کی پوری آزادی ہوگی۔

معاہدۂ قائمہ پر دستخط

وی پی مینن - لارڈ ماؤنٹ بیٹن - معین نواز جنگ، وغیرہ

نیز یہ کہ اگر بھارت اور پاکستان کے مابین جنگ ہوئی تو حیدرآباد غیر جانبدار رہے گا، حکومتِ ہند نے یہ دونوں شرطیں نوٹ کرلیں۔

سردار نے دوسرے دن یہ معاہدہ دستوریہ کے سامنے رکھدیا، سیکرٹریٹ کی گیلری میں میری ملاقات نہرو سے ہوئی۔ اس معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"گویا ایک سال کے لئے ہم نے امن حاصل کرلیا۔"
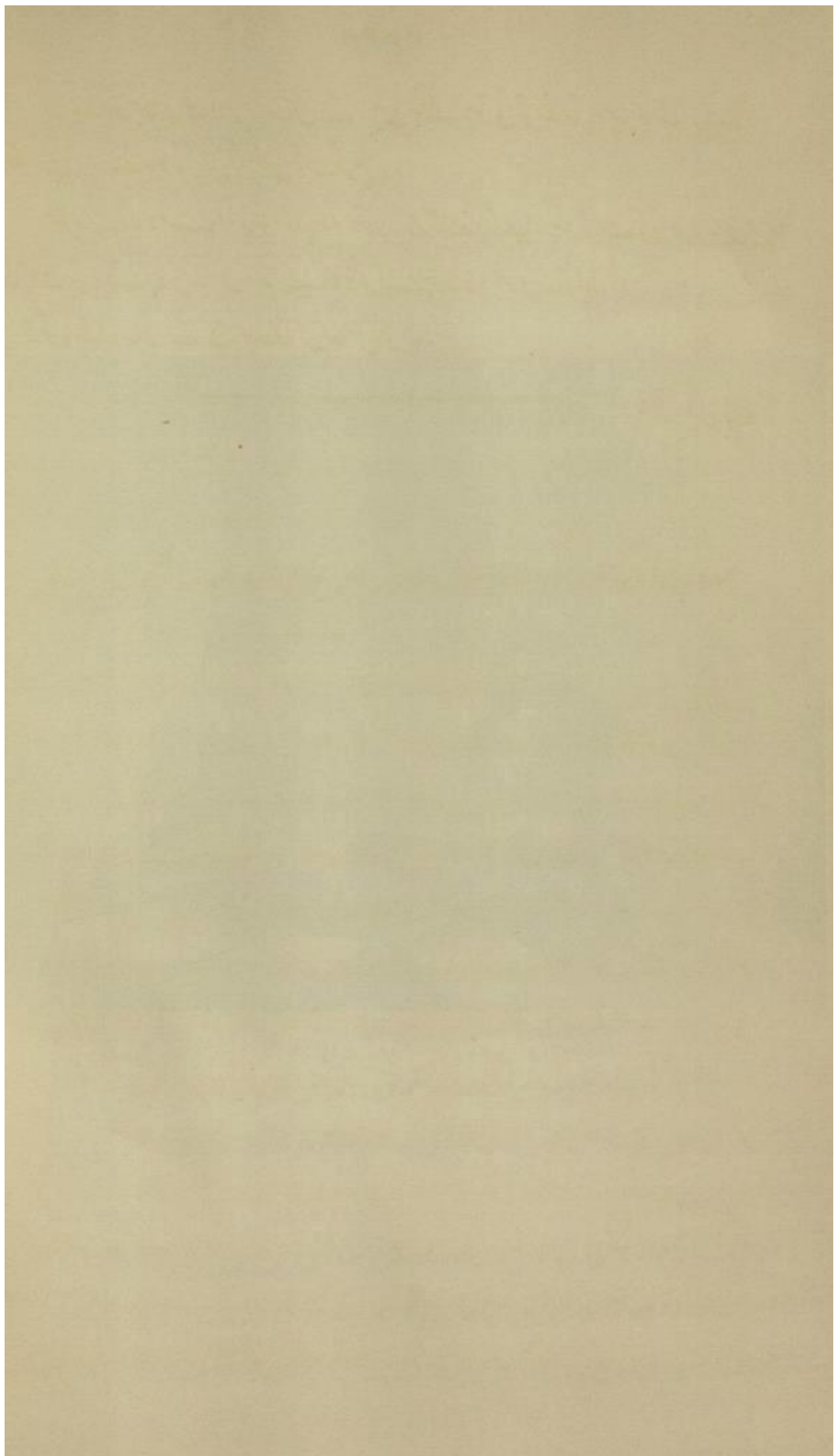
حیدرآباد (۲)

معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزیاں اور جارحانہ کارروائیاں

خودفریبی حیدرآباد سے جو معاہدۂ قائمہ ہوا تھا، اس نے متعلقہ افراد میں سے ہر ایک کو ایک جداگانہ طور پر خودفریبی میں مبتلا کر رکھا تھا، نہرو کا خیال تھا کہ جنوبی ہند کا امن کم از کم ایک سال کے لئے خرید لیا گیا، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو امید تھی کہ اس عرصہ میں ٹھنڈے دماغ اور ٹھنڈے دل کے ساتھ حالات کو اس طرح نپٹایا جائے گا کہ نظام دوسرے والیان ریاست کی طرح بالآخر ہندوستان سے الحاق قبول کر لیں گے، نظام اور ان کے مشیر یہ سمجھتے تھے کہ مہلت سے فائدہ اٹھا کر آزادیٔ حیدرآباد کے لئے ضروری سروسامان بہم پہنچائیں گے، سردار کو حکومت حیدرآباد کی نیت پر ذرا بھی بھروسہ نہ تھا، میں نے انھیں یقین دلایا کہ اس ایک سال کی مدت میں یا تو نظام الحاق پر راضی ہو جائیں گے ورنہ ذمہ دار حکومت قائم کرنے پر انھیں مجبور ہونا پڑے گا، نتیجۃً دونوں صورتیں یکساں ہیں،

کے ایم منشی معاہدۂ قائمہ کی دفعہ (۲) کے مطابق حکومت ہند نے کے ایم منشی کو اپنا ایجنٹ جنرل بنا کر حیدرآباد بھیجا، اب تک منشی سے مجھے براہ راست کوئی واقفیت نہ تھی، لیکن انھوں نے بمبئی کے وزیر داخلہ کی حیثیت سے سنہ ۴۷ء سے سنہ ۴۸ء تک فرقہ وارانہ الجھنوں کو جس طرح نپٹایا اس سے میں بہت متاثر تھا، ہم نے حکومت حیدرآباد کو منشی

کے تقرر کی جب اطلاع دی تو نظام نے کئی شرطیں پیش کر دیں، پہلی شرط یہ تھی کہ منشی کی حیثیت وکیل تجارت Trade Agent سے زیادہ نہ ہوگی، میں نے لائق علی کو جواب دیا کہ از روئے معاہدہ ہمارا ایجنٹ جنرل صرف تجارتی معاملات تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھے گا،

ایجنٹ جنرل بے حیثیت تھا

نظام گورنمنٹ نے ایک سوال یہ بھی اٹھایا کہ حیدر آباد اور دہلی کے ایجنٹ جنرل جب اپنے منصب کا چارج لیں، تو سرکاری تقاریب کا اہتمام کیا جائے، اس طرح حیدر آباد کی حکومت گورنمنٹ آف انڈیا کو گویا اپنی سطح پر لانا چاہتی تھی اور ایجنٹ جنرل کا باہمی تبادلہ گویا اسی طرح ہو رہا تھا جیسے دوسری حکومتوں کے سفیر ایک دوسرے کے ملک میں متعین ہوتے ہیں، وزارت امور ریاست اس بات کی حمایت نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ کسی تقریب کا اس موقع پر اہتمام نہیں کیا گیا، اور نہ حیدر آباد اور دہلی کے ایجنٹ جنرل نے اپنے منصب کا چارج لیتے وقت کاغذات نمائندگی پیش کئے۔

جب تک منشی حیدر آباد نہیں گئے تھے، نہ ہمیں بتایا گیا تھا، نہ معلوم ہوا تھا کہ حیدر آباد میں فوجی ساز و سامان کے بڑے بڑے ذخیرے پڑے ہوئے ہیں، ان ذخیروں کی حفاظت صرف چوکیدار کرتے تھے، حکومت ہند نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانی افواج کا انخلا اور فوجی ساز و سامان کی ہندوستان میں منتقلی ساتھ ساتھ عمل میں آئے،

نظام کے دو آرڈی ننس

معاہدۂ قائمہ کی سیاہی بھی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ حکومت نظام نے دو آرڈی ننس تابڑ توڑ نافذ کئے، ایک آرڈی ننس کی رو سے تمام قیمتی دھاتوں کی بر آمد ممنوع قرار دے دی گئی، دوسرے آرڈی ننس نے حیدر آباد میں ہندوستانی سکے کا چلن بند کر دیا،

۲۵ دسمبر ۱۹۴۷ء کو میں نے حکومت حیدر آباد پر یہ بات واضح کی کہ یہ دونوں آرڈی ننس معاہدۂ قائمہ کے خلاف ہیں،

پاکستان کو بیس کروڑ کا قرض

پھر فوراً ہی حکومت ہند کو اطلاع ملی کہ حیدر آباد گورنمنٹ نے پاکستان کو بیس کروڑ روپے کا قرضہ ہندوستانی

تمسکات کی صورت میں دیا ہے، یہ کارنامہ معین نواز جنگ کا تھا، جنہوں نے معاہدہ قائمہ سے متعلق گفت و شنید میں سرگرم حصّہ لیا تھا،

معاملہ یہیں پہ ختم نہیں ہوا، حکومت حیدر آباد نے سرکاری طور پر ہمیں مطلع کیا کہ بعض غیرممالک میں وہ اپنے ایجنٹ متعین کر رہی ہے اور حکومت ہند سے مشورہ لئے بغیر کراچی میں پبلک ریلیشن افیسر کا تقرر کر بھی لیا ہے،

معین نواز جنگ کی طلاقت لسانی

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو معین نواز جنگ کی سربراہی میں ایک وفد دہلی آیا اور مجھ سے ملا، نواب معین نواز جنگ نے ارشاد فرمایا کہ آزادیٔ حیدر آباد کا مطالبہ ہندوستان کے مطالبۂ الحاق کا ردّعمل ہے کرنسی آرڈی ننس کے متعلق انھوں نے کہا، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ حیدر آباد کے سکّہ کو زیادہ مقبول بنایا جائے اس آرڈی ننس سے نہ ہندوستان کی اقتصادیات پہ کوئی اثر پڑتا ہے نہ کوئی دستوری خلاف ورزی ہوتی ہے، دھاتوں کی برآمد پہ پابندی سے متعلق ان کا بیان یہ تھا کہ صرف اجازت نامہ ضروری قرار دیا گیا ہے، اجازت لے کر برآمد کی جاسکتی ہیں۔ پاکستان کو جو رقم قرض دی گئی تھی، اس کے بارے میں نواب صاحب نے فرمایا کہ یہ واقعہ معاہدۂ قائمہ سے پہلے کا ہے، علاوہ ازیں یہ صرف ایک اقتصادی معاملہ ہے، نہ کہ سیاسی، حیدر آباد کی حکومت نے ایک نفع بخش کام میں اپنا سرمایہ لگایا ہے جو کوئی قابل اعتراض بات نہیں۔ کراچی میں پبلسٹی افیسر کے تقرر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا، یہ فیصلہ دو سال پہلے ہی ہو چکا تھا، کہ حیدرآباد کی پبلسٹی کا کام زور شور سے شروع کیا جائے، مقصد صرف یہ ہے کہ اس طرح دوسرے ممالک میں حیدر آباد کو زیادہ بہتر طور پہ سمجھا جاسکے، اس کے بعد نواب معین جنگ نے حکومت ہند کے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست پیش کر دی،

ہم دونوں میں کافی بحث و گفتگو ہوئی، میں نے زور دیا کہ حکومت حیدر آباد اپنے دونو آرڈی ننس فوراً واپس لے لے، اور پاکستان کو بیس کروڑ روپے کا جو قرض دیا ہے وہ بھی واپس لے لے،

حیدر آباد کے وزیر اعظم لائق علی بھی اسی اثنا میں دہلی آگئے اور سردار سے ملے، لیکن

ابھی ان سے گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ گاندھی جی کا حادثہ قتل پیش آگیا، جس کے باعث لائق علی حیدرآباد واپس آگئے اور وفد بھی چلا گیا،

رضاکاروں کی خوفناک سرگرمیاں

اس اثنا میں رضاکاروں کی سرگرمیاں خوفناک حد تک بڑھ گئیں، رضوی کی قابل اعتراض تقریروں کا سلسلہ جاری ہو گیا، جس کے باعث حیدرآباد میں، اور حیدرآبا[د کے] باہر فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھے، ایک تقریر میں رضوی نے الزام لگایا کہ حکومت ہند حیدرآباد کے ہندوؤں کو بغاوت کے لئے ہتھیار فراہم کر رہی ہے، ایک تقریر میں اس نے کہا، رضاکار مسلمانان ہند کے نجات دہندہ ہیں،

اسی زمانہ میں حکومت مدراس نے سرحدی علاقوں پر رضاکاروں اور حیدرآباد کے فوجی دستوں کی تاخت وتاراج کے بارے میں حکومت ہند سے فوجی مدد طلب کی، مسئلہ متعلقہ پر غور وفکر کے لیے وزارت امور ریاست کے دفتر میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں مدراس بمبئی اور سی پی کے وزرائے اعلیٰ، وزرائے داخلہ اور کے ایم منشی شریک تھے، صدارت کے فرائض سردار نے انجام دیے،

سردار کی معنی خیز تقریر

سردار نے اپنی صدارتی تقریر میں صورت احوال کا اجمالی جائزہ لیا، انھوں نے کہا، معاہدہ قائمہ کی رو سے حیدرآباد کے ساتھ جو جداگانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے وہ اس لیے کہ یہ ریاست نہایت اہم پوزیشن کی مالک ہے، اس کا مقصد جہاں یہ ہے کہ نظام از سر نو اپنی روش پہ غور کر لیں وہاں یہ بھی ہے کہ ہم ذرا اطمینان سے اپنے آپ کو یکسو کر لیں، ویسے حکومت ہند ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار ہے،

سردار نے اپنی تقریر میں رضاکاروں کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی کہ وہ کس طرح ریاست کی ہندو آبادی کو دہشت زدہ کرتے رہتے ہیں، انھوں نے حکومت حیدرآباد کے کرنسی آرڈی نس نس اور پاکستان کو دیے ہوئے قرضہ کا ذکر بھی کیا، اور فرمایا یہ تمام باتیں صاف طور پر معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزی ہیں، اور لائق علی سے جو آخری گفتگو ہوئی تھی، اس میں بہ حقیقت ان پر

واضح کی جاچکی ہے کہ یہ خلاف ورزیاں حکومت ہند زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی، آخر میں سردار نے کہا الحاق حیدرآباد کے مسئلہ کو وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے، البتہ جس چیز پر قطعاً سمجھوتہ نہیں کر سکتے وہ حیدرآباد میں ذمہ دار اور جمہوری حکومت کا قیام ہے اس مسئلہ کا التوا یا صرف نظر برداشت کرنا ہمارے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں،

وزیر اعلیٰ مدراس کی فریاد

پھر عام مباحثہ شروع ہوا، مدراس کے وزیر اعظم نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ ہمارے راستے میں سب سے بڑی دشواری کمیونسٹوں نے پیدا کر دی ہے، جو اندھرا اور حیدرآباد کے اضلاع میں اپنی تمام تخریبی سرگرمیوں کے ساتھ مصروف عمل ہیں اور کھل کر میدان میں نہیں آتے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں، ان علاقوں کے باشندے اب صاف طور پر کہنے لگے ہیں،،

"رضاکاروں کی ستم رانیاں تو صرف روز روشن تک محدود ہیں، لیکن کمیونسٹوں کی حکومت رات ہوتے ہی قائم ہو جاتی ہے،

پاکستان کو قرض کیوں دیا گیا؟

اس زمانہ میں نظام نے سر والٹر مانکٹن کو لندن سے پھر بلا لیا، وہ ۲ مارچ کو، لائق علی اور معین نواز جنگ کے ساتھ دہلی آئے، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملے، اس موقعہ پر میں بھی موجود تھا، لائق علی نے کہا کہ کل وہ کراچی جا رہے ہیں، اور کوشش کریں گے کہ انڈیا اور پاکستان کے مابین بہتر روابط قائم ہو جائیں، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس بیس کروڑ روپے کے قرض کا ذکر کیا جو نظام نے پاکستان کو دیا تھا، اور کہا کہ جب معاہدۂ قائمہ آخری مرحلہ پر تھا تو پاکستان سے اس قرض کی گفتگو ہو رہی تھی، مگر کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ حکومت ہند کو اس سے بے خبر رکھا گیا، معین نواز جنگ نے جواب دیا، حیدرآباد کا خیال ہے کہ وہ اپنے روپے اور کفالتوں کو کامن ویلتھ کے اندر جہاں چاہے کاروبار میں لگا سکتا ہے، اس میں پوچھ گچھ کی ضرورت ہی کیا ہے؛ اور چونکہ اس کاروبار کا کوئی تعلق معاہدہ قائمہ سے نہیں تھا، لہذا اس کی اطلاع بھی نہیں دی گئی،

میں نے معین نواز جنگ کے خیالات کی تردید کی اور کہا کہ معاہدہ قائمہ کی رو سے حکومت حیدرآباد

کو کسی غیر ملک سے براہ راست رابطہ پیدا کرنے کا اختیار نہیں ہے، کامن ویلتھ میں شریک ممالک سے بھی نہیں، ہاں اگر کوئی رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے تو حکومت ہند کی وساطت سے اور حکومت ہند ہرگز اس قرض کی اجازت نہیں دے سکتی تھی،

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ حیدر آباد سے آئندہ جو گفت و شنید ہوگی اس میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اب کوئی ایسی بات نہ ہو جو معاہدۂ قائمہ کو کمزور یا مجروح کرنے والی ہو موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ کراچی جاکر لائق علی بہت بڑی خدمت جو انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ حکومت پاکستان کو اس پر راضی کرلیں کہ معاہدۂ قائمہ جب تک قائم ہے وہ حکومت کی کفالتوں کو استعمال نہیں کرے گی،

میں نے کہا، حکومت پاکستان معاہدہ قائمہ کی مدت ختم ہونے کے بعد بھی ان کفالتوں کو استعمال نہیں کر سکتی، اور اگر ایسا کیا گیا تو یہ بات تو اتنی ہی قابل اعتراض اور ناقابل برداشت جب ہوگی، جتنی اب ہے،

سر والٹر مانکٹن نے کہا کہ معاہدۂ قائمہ کی مدت گزر جانے کے بعد بھی، پاکستان کو ان کفالتوں کے استعمال نہ کرنے پر راضی کرنا مشکل ہے۔ کم از کم اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی،

حیدر آباد میں نئے فضائی اڈے

میں نے لائق علی سے پوچھا،
"ہمیں اطلاع ملی ہے کہ حیدر آباد میں نئے فضائی اڈے تعمیر ہو رہے ہیں کیا یہ سچ ہے"

لائق علی نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا،

"صرف ایک فضائی اڈے میں توسیع کی جا رہی ہے تاکہ ڈکوٹا قسم کے طیارے آسانی سے اُتر سکیں،!!"

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس امر پر زور دیا کہ اگر واقعی حکومت حیدر آباد، حکومت ہند سے اپنے اختلافات رفع کرنا چاہتی ہے تو اسے ہر ایسے اقدام پر اقدام سے پہلے بار بار غور کر لینا چاہیے جو باہمی تعلقات میں تلخی کا موجب ہو سکتا ہو، حیدر آباد اور ہندوستان ہر دو مقامات پر ایسے

لوگ ہیں جو ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ معاہدہ قائمہ کامیابی کے ساتھ اختتام تک پہنچے، لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک نہرو، سردار پٹیل اور کابینۂ ہند کا تعلق ہے یہ سب اس کی کامیابی کے متمنی ہیں، یہ سب خلوص کے ساتھ چاہتے ہیں کہ یہ معاہدہ جاری رہے اور کامیاب رہے، حالانکہ حکومت حیدرآباد کی طرف سے جو خلاف ورزیاں اس معاہدے کی اب تک ہو چکی ہیں ان کے پیش نظر حکومت ہند اس معاہدے کو منسوخ کرکے اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کر سکتی تھی، میری تمنا ہے کہ حیدرآباد بھی اسی جذبے سے اس موقعہ پر کام لے،

لائق علی نے جواب میں کہا،

میں، اور میرے رفقاء بھی دل وجان سے یہ چاہتے ہیں کہ معاہدۂ قائمہ پہ سچائی اور دیانت کے ساتھ عمل کیا جائے۔

اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے رضاکاروں کا ذکر چھیڑا، اور ان کی سرگرمیوں کے پیش نظر خواہش ظاہر کی کہ اس جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا جائے۔

رضاکار اور لائق علی

لائق علی نے رضاکاروں کے وجود پر ایک بہت ہی عجیب دلیل دی، انھوں نے کہا،

یہ جماعت اس لئے نمودار ہوئی ہے کہ مسلمانان حیدرآباد اپنے آپ کو خطرہ میں سمجھتے ہیں، انھیں اپنی جان اور مال کی طرف سے خطرہ ہے،!

لائق علی نے معاہدۂ قائمہ کو زیادہ استوار اور مستحکم بنانے کے لئے چند تجاویز پیش کرنی چاہیں اس موقع پر میں نے کہا،

ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں، ہم کوئی باضمنی معاہدہ اس وقت تک نہیں کر سکتے، جب تک حیدرآباد اور انڈیا میں خوشگوار اور دوستانہ ماحول نہ پیدا ہو جائے، اور یہ خوشگوار، اور دوستانہ ماحول صرف الحاق ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، جب تک حیدرآباد دائرۂ الحاق سے باہر ہے اس وقت تک کوئی بات طے نہیں ہو سکتی، حیدرآباد ایک پاکستانی جزیرے کی طرح ہندوستان کے بیچ میں موجود ہے، اور اسے ہم کس طرح گوارا کر سکتے ہیں؟

میں نے یہ بھی کہا کہ کئی ریاستیں جہاں قابل لحاظ مسلم اقلیت موجود تھی، ہندوستان سے ملحق ہو

چکی ہیں، اور وہاں کے مسلمان بالکل محفوظ ہیں، واقعہ یہ ہے کہ جب تک حیدر آباد اور انڈیا میں بے اعتباری اور شک و شبہ موجود ہے اس وقت تک کوئی مستقل حل دریافت نہیں ہو سکتا، حکومت ہند اپنے اس مقصد سے ذرا بھی منحرف نہیں ہو سکتی کہ حیدر آباد کو ہندوستان سے ملحق ہو جانا چاہیئے البتہ اگر وہاں ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے تو ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ الحاق کا فیصلہ وہی حکومت کرے اور ہم اسے منظور بھی کریں گے۔

تعاون کی فضا کیونکر پیدا ہو؟

سردار نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا، "جب تک شک و شبہ اور بے اعتباری کی فضا موجود ہے اس وقت تک الحاق کی بات کرنا بیکار ہے"!

دوسرے روز لائق علی کراچی چلے گئے، ۴ مارچ کو واپس آئے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور میں نے حیدر آبادی وفد سے پھر ملاقات کی، لائق علی نے کہا حکومت پاکستان اس امر پر تیار ہو گئی ہے کہ معاہدۂ قائمہ کی مدت تک وہ ہندوستانی کفالتوں کو استعمال نہیں کرے گی، لائق علی نے یہ وعدہ بھی کیا کہ اس سلسلہ میں وہ ایک بیان جلد شائع کریں گے۔

حیدر آباد میں جمہوریت کا مطالبہ

پھر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا سردار پٹیل نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں حیدر آبادی وفد کو مطلع کر دوں کہ حکومت ہند ریاست حیدر آباد میں مکمل ذمہ دار حکومت کے سوال پر سختی سے قائم ہے، سردار کا خیال ہے کہ اگر یہ بات مان لی جائے تو ساری مشکلیں اور رکاوٹیں خود بخود دور ہو جائیں گی، اور یہ بات بالکل ناممکن ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف حیدر آباد ہی ایک ایسی ریاست رہ جائے جہاں کا نظام حکومت مطلق العنانی ہو، اور جہاں عوام کے نمائندے حکومت نہ کرتے ہوں،

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مزید کہا کہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر یہ مطالبہ مان لیا جائے اور حیدر آباد میں مکمل ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے تو اس سے دنیا کی نظر میں حیدر آباد کا وقار بڑھ جائے گا، اور اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ نظام اور ان کا خاندان موروثی اور پشتینی طور پر حیدر آباد کے آئینی حکمران کی حیثیت سے باقی رہیں گے، لیکن اگر نظام نے یہ بہترین موقعہ کھو دیا یا اگر وقت ہاتھ سے نکل گیا تو بہت ممکن ہے کہ حالات کی تلخ کامی، نظام کو تخت حکومت

سے محروم کر دے۔

لائق علی نے کہا، اگر مکمل ذمہ دار حکومت فوراً قائم کر دی جائے تو یہ اقدام خطرناک ہوگا البتہ کابینہ وزارت کو از سرِ نو مرتب کیا جا سکتا ہے اور اس میں نمائندہ عناصر شامل کئے جا سکتے ہیں، اس سلسلہ میں جو اعلان شائع کیا جانے والا ہے، وہ ملاحظہ کے لئے بھیج دیا جائے گا۔ تاکہ حیدرآباد اور دہلی سے بیک وقت وہ اشاعت پذیر ہو سکے،

پھر وہی الحاق کا مسئلہ

اس کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے الحاق کا مسئلہ اٹھایا اور لائق علی کو جتایا کہ الحاق سے خود حیدرآباد کو غیر معمولی فائدہ پہنچے گا،

جواب میں لائق علی نے اس امید کا اظہار کیا کہ تسلی بخش مفاہمت لفظ الحاق کو بیچ میں لائے بغیر ہی ہو سکتی ہے،

لائق علی نے یہ اعلان بھی کیا کہ حیدرآباد نہ پاکستان کا حصہ بننا چاہتا ہے نہ انڈین یونین کا، لیکن وہ اپنا مستقبل خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے،

میں نے نہایت سختی کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوستان الحاق سے کم کسی چیز پہ رضامند اور مطمئن نہیں ہو سکتا —!

سردار پٹیل ہی سب کچھ تھے

اس ملاقات کے اختتام کے بعد ایک اور طوفان اٹھ کھڑا ہوا یعنی یہ کہ ملاقات کے مشترکہ کمیونکے کی عبارت کیا ہو، سر والٹر مانکٹن نے ایک مسودہ تیار کیا، لیکن سردار نے اسے یک لخت نامنظور کر دیا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سلسلہ میں ۵ مارچ کو سہ پہر کا وقت سردار سے ملنے کا مقرر کیا لیکن دوپہر کے کھانے کے دوران میں سردار پر ایک نہایت سخت قلبی دورہ پڑا، جس نے انھیں بستر علالت پر دراز کر دیا، ڈاکٹروں نے سختی سے ممانعت کر دی کہ چند روز تک وہ قطعاً کوئی کام نہ کریں، کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو سردار کے فیصلہ کو بدلنے کی ذمہ داری اپنے سر لے سکتا، اور کمیونکے کا مسودہ بطور خود منظور کر سکتا، نتیجہ یہ ہوا کہ سرے سے کوئی کمیونکے ہی نہیں شائع ہوا،

گول میز کانفرنس کا اعلان حیدرآباد واپس جانے کے بعد لائق علی نے اعلان کیا کہ وہ پارٹی لیڈرس کی ایک گول میز کانفرنس بلانا چاہتے ہیں،

قاسم رضوی نے فوراً اعلان کر دیا کہ وہ اس گول میز کانفرنس میں کوئی حصّہ نہیں لیں گے،

لائق علی نے ریاستی کانگرس کے چند لیڈروں کو مدعو کیا، لیکن انھوں نے کہا جب تک سوامی رامانند ترتھ جیل سے رہا نہ کر دیے جائیں، وہ کسی قسم کی گفت و شنید میں حصّہ نہیں لیں گے،

ایک بیان میں کانگرسی لیڈروں نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ جب تک بغیر کسی تحفظ کے مکمل نیابتی اور ذمہ دار حکومت نہیں دی جاتی، ہم حزب مخالف میں شریک رہیں گے،

سوامی رامانند ترتھ کو رہا نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا،

ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ لائق علی جو وعدے کر کے دہلی سے حیدرآباد گئے تھے ان میں سے ایک کا ایفا بھی نہیں کیا،

پاکستان کو بیس کروڑ روپے کی کفالتیں دینے کے سلسلہ میں کوئی اعلان انھوں نے نہیں کیا،

کرنسی آرڈی ننس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی،

کابینہ وزارت کی از سر نو ترتیب سے متعلق لائق علی نے جو وعدہ کیا تھا، وہ بھی پورا نہیں کیا،

رضاکاروں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی اور وہ روز بروز خطرناک سے خطرناک تر صورت اختیار کرتے گئے۔

سرحدی علاقوں پر حیدرآبادی دستوں اور رضاکاروں کی تاخت و تاراج کے سلسلہ میں کوئی کمی نہیں ہوئی،

اب تک معاہدہ قائمہ کی خلاف ورزیوں پر ہم یونہی بات چیت کر لیا کرتے تھے؛ اب میں نے فیصلہ کیا کہ ہر ہر خلاف ورزی پر، حکومت ہند کی طرف سے باقاعدہ نوٹس جانا چاہیے۔

حکومت ہند کا الٹی میٹم چنانچہ میں نے ۲۵۔ مارچ کو اس سلسلہ میں ایک خط وزیر اعظم حیدرآباد کے نام لکھا، جو منشی نے بدست خود لائق علی کو جا کر دیا، اس مکتوب

ہیں معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزیوں پر میں نے وضاحت سے روشنی ڈالی تھی،

۱۔ حیدرآباد نے ایک غیر ملکی حکومت ــــــ پاکستان ــــــ کو بیس کروڑ روپے دے کر معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزی کی نیز:

۲۔ ایک غیر ملک ــــــ پاکستان ــــــ میں اپنا پبلک ریلیشنز دفتر مقرر کیا۔

۳۔ انڈین فورسز اسکیم ۱۹۳۹ء پر حیدرآباد نے عمل کر کے اپنی افواج میں تخفیف نہیں کی،

۴۔ حکومت ہند کی اجازت کے بغیر ان کی تعداد میں اضافہ کر لیا،

۵۔ پولیس فورسز کے سلسلہ میں سالانہ رٹرن (Return) بھی حکومت ہند کے پاس نہیں بھیجا،

۶۔ رضاکار جماعت کو مدد دیتے اور اس سے ملا پینے کا سلسلہ جاری رکھا،

۷۔ حکومت ہند کی اجازت کے بغیر حکومت حیدرآباد نے یونائیٹڈ پریس آف امریکہ سے ایک معاہدہ کر کے اسے ٹرانسمیشن نصب کرنے، اور اس سے کام لینے کی اجازت دے دی، یہ بھی معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزی ہے نیز:

۸۔ ہندوستانی کرنسی کو غیر قانونی سکہ قرار دے دیا،

۹۔ سونا اور بعض دوسری چیزوں کی درآمد ممنوع قرار دے دی،

معاہدۂ قائمہ کو استوار اور محکم بنانے کے لئے ضروری ہے کہ:

۱۔ حکومت پاکستان کو بیس کروڑ روپیہ کا جو قرضہ دیا گیا ہے وہ فوراً واپس لے لیا جائے۔

۲۔ ایک مشترکہ کمیشن کا تقرر منظور کر لیا جائے جو معاملات دفاع سے متعلق ضروری امور کا فیصلہ کرے،

۳۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے جس طرح حکومت ہند کو پولیس فورسز کے بارے میں ہر سال ایک رٹرن بھیجا جایا کرتا تھا، اس کا سلسلہ پھر شروع کر دیا جائے،

۴۔ سونے وغیرہ کی برآمد پر جو پابندی عائد کر دی گئی ہے وہ واپس لے لی جائے۔

۵۔ ہندوستانی کرنسی کو غیر قانونی سکہ قرار دینے کا جو فرمان صادر کیا گیا ہے اسے واپس لے لیا جائے

۶۔ غیر ملکی خبریں وصول کرنے، اور پہنچانے کے لئے ٹرانسمیشن نصب کرنے کا جو معاہدہ یونائیٹڈ پریس آف امریکہ سے کیا گیا ہے، وہ منسوخ کر دیا جائے۔

۷۔ مجلس اتحاد المسلمین کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا، تو نہایت خطرناک صورت حال، نہ صرف حیدر آباد کے امن و سلامتی کے لیے، بلکہ بمبئی، مدراس اور سی پی کے امن و سلامتی کے لئے بھی پیدا ہو جائے گی۔

لائق علی کا جوشِ جہاد

منشی کا بیان ہے کہ لائق علی یہ خط پڑھ کر پہلے تو ہکا بکا رہ گئے پھر کیفیت بدلی تو نشۂ شہادت میں سرشار نظر آنے لگے، انھوں نے کہا، نظام نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آزادیٔ حیدر آباد کے لئے لاکھوں مسلمانوں کے ساتھ جام شہادت نوش کریں گے۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ نظام کے مشیروں نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ اگر حکومت ہند نے حیدر آباد کی ناکہ بندی کر بھی لی تو کیا ہوگا، چند ماہ تک تو حیدر آباد آسانی سے اپنے وسائل و ذرائع کام میں لاکر گزارہ کر سکے گا، اس اثناء میں دنیا کی رائے عامہ اسے یہ قدم واپس لینے پر مجبور کر دے گی، نظام کو یہ یقین بھی دلایا گیا کہ انڈیا فوجی اعتبار سے بہت کمزور ہے اور وہ اب، آئندہ کوئی فوجی اقدام کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، دنیا کے تمام مسلم ممالک حیدر آباد کے دوست ہیں اور وہ ہندوستان کے فوجی اقدام کو ہرگز گوارا نہیں کریں گے، حیدر آباد ریڈیو کی طرف سے لگاتار اعلان ہونے لگا کہ اگر حیدر آباد کے خلاف جنگ چھیڑی گئی، تو ہزار ہا ہزار پٹھان ہندوستانی علاقوں میں گھس پڑیں گے۔

رضاکاروں کے خصوصی جلسے شب و روز ہونے لگے، ان اجتماعات میں نہایت اشتعال انگیز اور جذباتی تقریریں کی جاتیں،

عیدروس کی اپیل

حیدر آبادی افواج کے کمانڈر انچیف العیدروس نے حیدر آباد ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے باشندگان حیدر آباد سے ہر ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی زوردار اپیل کی۔

لائق علی کے جوابی الزامات

۵- اپریل کو، لائق علی نے ، ۱۷ صفحہ کا ایک طویل مراسلہ نہرو کے نام بھیجا، جس میں معاہدۂ قائمہ کی ان تمام خلاف ورزیوں سے صاف انکار کر دیا جو میرے مراسلہ میں درج تھیں، اور جواب میں خود الزامات کی ایک طویل فہرست حکومت ہند کے خلاف پیش کر دی، انھوں نے لکھا تھا کہ حکومت حیدر آباد تو ہر طرح سے معاہدۂ قائمہ پر عمل کر رہی ہے، بجز ان چند صورتوں کے جہاں بعض دفعات کی تعیین مفہوم میں، ہمارے اور حکومت ہند کے درمیان اختلاف ہے، لیکن اس کے برعکس وہ حکومت ہند ہے جو :

۱- حیدر آباد کے خلاف ہندوستان کی اقتصادی ناکہ بندی روز بروز شدید سے شدید صورت اختیار کرتی جا رہی ہے -

۲- حیدر آباد کے خلاف اعصابی جنگ پوری شدت سے جاری ہے اور اس کے خلاف جارحانہ پروپیگنڈا بڑی شدومد سے مسلسل اور متواتر کیا جا رہا ہے -

۳- ہماری تازہ ترین اطلاعات مظہر ہیں کہ حیدر آباد کے آس پاس تقریباً ہر مقام پر ہندوستانی فوجیں کیل کانٹے سے لیس حملہ کرنے کے لئے کھڑی ہیں،

۴- اس بات کا ثبوت موجود ہے کہ انڈین یونین کے فوجی افراد موقع پا کر ہمارے علاقوں میں گھس آتے ہیں،

۵- میں اپنی طرف سے معاہدۂ قائمہ کی بجا آوری کی پوری کوشش کر رہا ہوں، لیکن اگر بدقسمتی سے بعض نزاعی اور اختلافی دفعات پر میں آپ کو قائل نہیں کر سکا ہوں تو اسی معاہدہ کی رو سے کیوں نہ ہم اختلافی امور ثالث کے سامنے پیش کر کے اس کا فیصلہ حاصل کر کے بات ختم کر دیں، آخر دونوں حکومتیں از روے معاہدہ اختلاف و نزاع کی صورت میں ثالثی کا اصول تسلیم کر چکی ہیں،

ثالثی کا مطالبہ: نظام کا مکتوب

اسی طرح نظام کا بھی ایک مکتوب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام آیا، جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت ہند کا

مراسلہ درحقیقت ایک الٹی میٹم کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ دوستانہ تعلقات کی کھلی ہوئی خلاف ورزی ہے۔

نظام نے بھی لائق علی کی بات اپنے مکتوب میں دہرائی تھی۔ بعض اختلافی معاملات کا فیصلہ ثالثی سے کرالیا جائے۔

نظام نے اپنے مکتوب میں یہ بھی لکھا تھا کہ حیدرآباد کے خلاف اقتصادی دباؤ برابر بڑھتا جارہا ہے، اور اگر اس کا تدارک نہ کیا گیا تو حکومت ہند کی خلاف ورزیوں کا دستاویزی ثبوت وہ شائع کردیں گے۔

نظام نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اپیل کی تھی کہ اس اقتصادی ناکہ بندی میں وہ حصہ دار نہ بنیں، اور اگر اس پالیسی پر عمل درآمد جاری رہا۔ تو نہ صرف حیدرآباد کا بلکہ سارے جنوبی ہند کا امن وامان غارت ہوکر رہ جائے گا۔

نظام کا یہ خط سر والٹر مانکٹن بہ نفس نفیس لے کر تشریف لائے تھے، ۲۰ اپریل کو انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مجھ سے ملاقات کی، میں نے محسوس کیا کہ سر والٹر میرے اس مراسلہ کے لب ولہجہ سے بہت برافروختہ تھے، جو میں نے لائق علی کے نام لکھا تھا، اور مجھ سے دو دو ہاتھ کرنے پر بالکل تیار نظر آرہے تھے،

میں نے انھیں یقین دلایا کہ میرا مراسلہ ہرگز کوئی دھمکی نہیں تھا، میں نے جو کچھ اس میں لکھا تھا اس کے ایک ایک لفظ پر اب بھی قائم ہوں، فریقین کی طرف سے قانون اور دفعات کا نام لے کر کچھ بھی کہا جائے مگر یہ حقیقت ہے کہ اب حیدرآباد سے ہمارے تعلقات انتہائی نازک مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں،

اس گفتگو کے دوران میں یہ بات بھی میں نے واضح کردی کہ حیدرآباد اور انڈیا کے تعلقات کی تلخی سے رضاکار اور کمیونسٹ پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جارہے ہیں جب تک انڈیا اور حیدرآباد میں مکمل تعاون نہ ہو اس وقت تک یہ صورت حال قائم رہے گی، مجھے ہر روز اطلاعات ملتی رہتی ہیں، اور میں ان سے سخت پریشان ہوں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت مجھے الحاق یا ذمہ دار حکومت کے معاملہ سے اتنی دلچسپی نہیں ہے

جعلی کمیونسٹوں اور رضاکاروں کے استیصال سے،

وزارت امور ریاست کا مراسلہ جب حیدرآباد بھیجا گیا اس وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن دہلی میں نہیں تھے، میرا خیال ہے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا یہ تاثر تھا کہ زیر بحث مراسلہ، نہرو کے علم اور رضامندی کے بغیر لکھا گیا اور بھیج دیا گیا، ورنہ وہ ہرگز نہ اسے منظور کرتے نہ بھیجے جانے کی اجازت دیتے۔ لیکن میں نے یقین دلایا کہ یہ مراسلہ سردار اور نہرو کے ایما سے لکھا اور بھیجا گیا ہے۔

قاسم رضوی کی شعلہ بار تقریر

اگر میرے مراسلہ نے نظام اور سر والٹر مانکٹن کو بدحواس کردیا تھا، تو حکومت ہند بھی قاسم رضوی کی اس تقریر سے کم پریشان نہیں تھی جو انھوں نے ۳۱۔مارچ کو حیدرآباد میں "ہفتۂ اسلحہ" منانے کے موقع پر کی تھی، یہ تقریر، ۷۔ اپریل کو ہندوستان کے اکثر اخبارات میں شائع ہوئی۔

اس تقریر میں قاسم رضوی نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اس وقت تک تلوار میان میں نہ رکھیں جب تک اسلامی بالادستی کا منصوبہ اور مقصد پورا نہ ہو جائے،

رضوی نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو اکسایا تھا کہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر وہ دشمن کو کچلنے کے لئے بڑھیں،

اس تقریر کا سب سے زیادہ مجرمانہ اور خطرناک حصہ وہ تھا جس میں اس شخص نے اعلان کیا تھا کہ اگر جنگ ہوئی تو ہندوستان کے ۴۵ ملین مسلمان ہمارے ففتھ کالم ثابت ہوں گے،

نہرو سے مانکٹن کی ملاقات

۷۔اپریل کی سہ پہر کو سر والٹر نہرو سے ملے، لیکن یہ ملاقات نامکمل رہی، پھر ایک دوسری ملاقات ہوئی اس موقعہ پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن بھی موجود تھے، نہرو نے قاسم رضوی کی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے معلوم کرنا چاہا کہ حکومت حیدرآباد کس کے ہاتھ میں ہے؟ نظام کے اور کابینہ وزارت کے ہاتھ میں یا قاسم رضوی کے ہاتھ میں؟

سر والٹر نے وعدہ کیا کہ اس آتشیں تقریر کے سلسلہ میں وہ نظام سے گفتگو کریں گے، اور انھیں مشورہ دیں گے کہ رضوی کے خلاف جلد از جلد تعزیری اقدام کرے اس تقریر کے

اثرات محو کر دیے جائیں۔

اس کے بعد سر والٹر نے ناکہ بندی کا سوال اٹھایا،

نہرو نے کہا مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے کہ حیدر آباد کی اقتصادی ناکہ بندی کے خلاف حکومت ہند نے کوئی فرمان صادر کیا ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تاجروں نے از خود وہاں کے غیر یقینی سیاسی حالات دیکھ کر چیزوں کا بھیجنا بند کر دیا ہو،

نہرو نے مزید کہا،!

موجودہ حالات میں یہ بات ناقابل برداشت ہے کہ حیدر آباد کو جنگی ساز و سامان دوسرے ممالک سے درآمد کرنے کی اجازت دی جائے،

ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ

دوسرا مسئلہ جس پر بحث ہوئی، وہ حیدر آباد میں مکمل ذمہ دار حکومت کا قیام تھا،

نہرو نے بتایا کہ تمام ملحقہ ریاستوں میں یہ ہوتا رہا ہے کہ حکمرانوں نے یا تو فوراً ذمہ دار حکومت قائم کر دی، یا مستقبل قریب میں اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کا اعلان کر دیا، صرف حیدر آباد اب تک اپنے استثنائی موقف پر قائم ہے۔

اس مرحلہ پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ نظام ذمہ دار حکومت قائم کرتے ہوئے اس لئے ہچکچاتے ہیں کہ اس کا لازمی نتیجہ الحاق کی صورت میں برآمد ہوگا،

نظام کو رشوت کی پیشکش

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو سے یہ سوال بھی کیا کہ آیا وہ سر والٹر مانکٹن کی اس رائے کے مطابق نظام کو نجی طور پر یقین دلانے کو تیار ہیں کہ الحاق کی صورت میں ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا اور انہی مفادات کی گارنٹی دی جائے گی جس سے دوسرے والیان ریاست بہرہ ور ہیں؟

نہرو نے جواب دیا،

"بغیر کسی تامل کے اس امر کا یقین دلانے پر میں تیار ہوں،!!"

حکومت ہند حیدر آباد پر حملہ نہیں کرے گی

آخر میں نہرو نے سر والٹر مانکٹن کو یقین دلایا کہ حکومت ہند حیدر آباد پر حملہ کرنا نہیں چاہتی،

نہ اس کی اقتصادی ناکہ بندی اس کا مقصد ہے۔

اس یقین دہانی کا سر والٹر نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ حیدرآباد جا کر نظام کو رپورٹ دیں گے، اور سفارش کریں گے کہ:

۱۔ رضوی کے خلاف سخت اور شدید اقدام کیا جائے۔

۲۔ جس قدر جلد ممکن ہو، ذمہ دار حکومت کے قیام و تشکیل کی طرف قدم بڑھایا جائے۔

۸۔ اپریل کو ماؤنٹ بیٹن نے نظام کے مکتوب مورخہ ۵۔ اپریل کا جواب دیا جس میں ان شبہات کے رفع کرنے کی سعی کی، اور اس امر پر زور دیا کہ حیدرآباد میں جلد از جلد ایک ذمہ دار حکومت، نیابتی بنیادوں پر حیدرآبادی عوام کے رجحان و میلان کے مطابق قائم کردی جائے۔

حیدرآباد پہنچنے کے بعد، ۱۱۔ اپریل کو سر والٹر مانکٹن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک تار دیا کہ حکومت حیدرآباد پوری طرح تحقیق کر چکی ہے رضوی کی جہادی تقریر کا افسانہ تمام تر دروغ ہے، انھوں نے اس طرح کی کوئی تقریر نہیں کی، اور یہ افسانہ محض اس لئے تراشا گیا ہے کہ حیدرآباد اور انڈیا کے خوشگوار تعلقات میں تلخی کی جائے،

رضوی کی شعلہ بار تقریریں

لیکن ہندوستانی اخباروں میں نہایت صحت کے ساتھ رضوی کے جہادی کلمات شائع ہو رہے تھے، ۱۲۔ اپریل کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا نے بقید تاریخ رضوی کی ایک شعلہ بار تقریر کی رپورٹ شائع کرائی، اس تقریر میں رضوی نے کہا تھا:

"وہ دن دور نہیں ہے جب خلیج بنگال کی لہریں ہمارے سلطان کے قدم چوم رہی ہوں گی۔"

اس تقریر میں رضوی نے یہ اعلان بھی کیا کہ:

"آصف جاہی پرچم، دہلی کے لال قلعہ پر میں نصب کر کے رہوں گا۔"

۱۴۔ اپریل کو سر والٹر مانکٹن پھر دہلی آئے۔ دوسرے دن لائق علی بھی پہنچ گئے۔ نہرو بھی ملاقات کے وقت میں موجود تھا، یہ ملاقات ۱۵۔ اپریل کو ہوئی تھی،

اس ملاقات کے موقع پر لائق علی نے کہنا شروع کیا کہ قاسم رضوی کی جہادی تقریر کا افسانہ محض دروغ ہے ———

نہرو نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، میں اچھی طرح تحقیق کر چکا ہوں، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رضاکاروں کا ریلے ہوا تھا، زیر گفتگو تقریر رضوی نے کی یا نہیں یہ کوئی اہم بات نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض تقریریں کر چکے ہیں اور کرتے رہتے ہیں،

لائق علی نے کہا میں نے آئندہ کے لئے رضوی کو متنبہ کر دیا ہے،

پھر لائق علی نے مزید کہا کہ متعدد کانگریسی لیڈروں کے بیانات نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ حیدرآباد پر ہندوستان کا حملہ ہوا ہی چاہتا ہے،

نہرو کی یقین دہانی

نہرو نے جواب دیا، حملہ اور جنگ کی باتیں مہمل ہیں ہاں یہ واقعہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں حیدرآباد کے خلاف جو تند و تیز تقریریں ہوتی ہیں وہ حیدرآباد کے خلاف ہمارے عوام کی برہمی کا ثبوت ہیں، آپ کو یہ حقیقت محسوس کر لینی چاہیے کہ کسی آزاد مملکت کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے عین قلب میں ایک غیر ملکی علاقہ برداشت کر سکے، حیدرآباد کو انڈین یونین سے بہر حال اور قطعاً ملحق ہو جانا چاہیے لیکن قوت اور دباؤ سے نہیں، صلح اور صفائی کے ساتھ ہمارا پہلا جھگڑا یہ ہے کہ ہندوستانی سرحد کے اندر آزاد حیدرآباد کا وجود نہیں برداشت کیا جا سکتا اور دوسرا قضیہ یہ ہے کہ حیدرآباد کا مطلق العنانی نظم حکومت جو جمہوری اصول اور حیدرآباد کے عوام کے مطالبات و خواہشات کے خلاف ہے گوارا نہیں کیا جا سکتا،

منشی کے خلاف لائق علی کی شکایت

لائق علی نے شکایت کی منشی اپنے آپ کو فاتح حیدرآباد سمجھنے لگے ہیں،

نہرو نے جواب دیا منشی کچھ بھی کہتے اور کرتے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے ان باتوں کو رضاکاروں کی سرگرمیاں بڑھا دیتی ہیں،

اس موقع پر میں نے کہا کہ منشی سے قطع نظر بمبئی، سی پی اور مدراس کی صوبائی حکومتیں

بھی رضاکاروں کی سرگرمیوں سے سخت نالاں ہیں، حکومت ہند اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی کہ حیدر آباد کے ہندو حد درجہ دہشت زدہ اور سراسیمہ ہو چکے ہیں، چنانچہ انھوں نے وہاں سے انخلا بھی شروع کر دیا ہے۔

طویل المیعاد تعلقات رفاقت کا ذکر چھیڑتے ہوئے لائق علی نے کہا کہ میں اس مسئلہ پر الحاق کے نقطۂ نظر سے غور نہیں کرتا، بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ نہایت مضبوط بنیادوں پر سیاسی تعلقات قائم ہو جائیں،

نہرو نے سوال کیا،

حیدر آباد کے مسائل کا فیصلہ عوام ہی کر سکتے ہیں

حیدر آباد کے مستقبل کا فیصلہ کس کے ہاتھ میں ہے؟ نظام کے یا عوام کے!

لائق علی نے کہا عوام ہمارے ساتھ ہیں، ہندو بھی ہمارے ساتھ ہیں، وہ میرے پاس آتے رہتے ہیں، میں ان کے دماغ اور مزاج کو پہچانتا ہوں،

نہرو نے جواب دیا، ممکن ہے کچھ طالع آزما ہندو آپ کے پاس آتے ہوں، اور اظہار وفاداری کرتے ہوں، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حیدر آبادی باشندوں کی بہت بڑی تعداد سخت افلاس اور فلاکت سے دوچار ہے، اور صرف جمہوری بنیادوں اور ذمہ دار حکومت ہی ان مسائل کو حل کر سکتی ہے۔

لائق علی کی سردار سے ملاقات

۱۶- اپریل کو لائق علی نے سردار سے ملاقات کی، اس موقعہ پر میں بھی موجود تھا، سردار نے رضوی کی تقریر کا حوالہ دیا، ——— جس سے اب رضوی اور لائق علی دونوں منکر تھے ———

سردار نے کہا حکومت ہند کے پاس ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ یہ تقریر کی گئی، اور وہ کسی قیمت پر اس انکار کو جو اب کیا جا رہا ہے تسلیم نہیں کر سکتی؛ !!

پھر سردار نے حکومت ہند کا نقطۂ نگاہ واضح کرتے ہوئے کہا،

حیدر آباد کسی امتیاز کا سزاوار نہیں

میں حیدر آباد کے ساتھ کوئی ایسا امتیازی اور جداگانہ رویہ اختیار کرنے کو تیار نہیں ہوں جو دوسری

ریاستہائے ہند سے روانہ رکھا گیا ہو، اگر حیدر آباد کا مسئلہ طے نہ ہوا، اور معاملات اسی طرح بد سے بدتر صورت اختیار کرتے رہے، تو موجودہ حکومت ہند کا وجود اور قیام بیکار ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی موجودہ صورت احوال برداشت نہیں کی جا سکتی تھی، اگر انگریزی عہد کا پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ اب موجود ہوتا۔

سردار کی دو ٹوک باتیں

آخر میں سردار نے نہایت صفائی کے ساتھ کہہ دیا: "آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتا ہوں کہ اصل طاقت کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اور کس کے ساتھ حیدر آبادی گفت و شنید کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے؟ وہ ذات شریف (قاسم رضوی) جو اس وقت حیدر آباد پر عملاً حکومت کر رہے ہیں اپنا جواب دے چکے، وہ صاف الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ اگر حکومت ہند کی فوجیں حیدر آباد کی طرف بڑھیں تو وہاں انہیں ہندوؤں کی خاک اور جھلسی ہوئی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا، جن کی تعداد ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے، اگر واقعی پوزیشن یہی ہے تو پھر یہ چیز نظام اور ان کے خاندان کو تباہ کر کے رہے گی، میں آپ سے صفائی کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کسی غلط فہمی میں رہیں —— کہ حیدر آباد کا مسئلہ اسی طرح طے ہوگا، جس طرح دوسری ریاستوں کا ہوا، کوئی دوسرا راستہ ہرگز ممکن نہیں، ہم کسی قیمت پر ایسے علاقہ کا وجود برداشت نہیں کریں گے جو یونین کے لئے تباہ کن ہو، جسے ہم نے اپنا خون پانی بہا کر تعمیر کیا ہے، ساتھ ہی ساتھ ہم دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتے ہیں، اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ مسائل پیش آمدہ کا دوستانہ حل نکل آئے، لیکن اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم حیدر آباد کے مطالبۂ آزادی کو منظور کر لیں گے، اگر وہ اپنے اس مطالبہ پر اڑا رہا، تو اس کی ناکامی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔!!"

لائق علی کو سردار کا حکم

آخر میں سردار نے لائق علی سے درخواست کی کہ وہ حیدر آباد جائیں اور نظام سے مشورہ کے بعد کوئی آخری فیصلہ کریں تاکہ ہم دونوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم کہاں ہیں؟

اس ساری گفتگو کے دوران میں لائق علی کا ایک رنگ آتا ایک جاتا رہا، میں نے محسوس کیا کہ سردار نے جس انداز میں گفتگو کی، اور جس دوٹوک طریقہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اس سے لائق علی ہکابکا رہ گئے۔

گفتگو کے ساتھ ساتھ سازش بھی جاری تھی

اسی اثنا میں کہ لائق علی سے گفتگو جاری تھی، تین دن تک مسلسل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہرو، سر والٹر مانکٹن اور میں آپس میں مل کر حیدرآباد کے مسائل پہ گفتگو کرتے رہے اور آخر کار ہم ایک پروگرام مرتب کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چار نکات پہ ہم نے اتفاق کر لیا کہ نظام کی طرف سے ان کی منظوری حاصل کر لی جائے، :

۱۔ رضاکاروں کے خلاف فوری اقدام ——— رضاکاروں کے جلسوں، جلوسوں اور تقریروں پہ پابندی کا نفاذ،

۲۔ جملہ اسیران کانگرس کی بالعموم اور کانگرسی لیڈروں کی فی الفور رہائی،

۳۔ وزارت کی از سرِ نو تشکیل ہو تمام فرقوں کی مکمل اور متناسب نیابت پہ مبنی ہو،

۴۔ سال رواں کے اختتام تک حیدرآباد کی مجلس دستور ساز کا قیام، اور اس کے ساتھ ہی مکمل ذمہ دار حکومت کا قیام،

گفتگو کے دوران میں سر والٹر مانکٹن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ وہ نظام کو مشورہ دیں گے کہ وہ ان نکات چارگانہ کو منظور کر لیں، اور موجودہ وزیر اعظم (لائق علی) کو برطرف کر دیں،

سردار اور لائق علی کے مابین گفتگو

۱۱۔ اپریل کو لائق علی نے پھر سردار سے ملاقات کی لائق علی نے سردار کو اپنی نہرو سے ملاقات کا حال بتایا اور کہا جہاں تک دستوری اصلاحات کا تعلق ہے معاملہ بہت ٹیڑھا ہے، کیونکہ اس سے پہلے یہ طے کرنا ہے کہ فرقہ وارانہ تناسب کی نوعیت کیا ہو، ؟

سردار نے جواب دیتے ہوئے کہا، اس وقت اصل مسئلہ اصول کو طے کرنے کا ہے تفصیلات

بعد میں طے پا سکتی ہیں اگر نظام یہ مان لیں کہ دوسری ریاستوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ اسے کرنے پر تیار ہیں، اور باشندگان ریاست کے جذبات و میلانات کے مطابق اقدام و عمل پر آمادہ ہیں تو نہ صرف اس طرح وہ حیدر آباد میں امن و امان پیدا کرنے کے موجب ہوں گے، بلکہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کے مستقبل کو بھی مستقل طور پر محفوظ کرلیں گے،

لائق علی نے کہا میں ہر قیمت پر خوں ریزی سے بچنا چاہتا ہوں، یہی میرا اصل اصول ہے اور اسی کو پیش نظر رکھ کر میں گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہوں،

سردار نے کہا، ذمہ داری بہرحال نظام اور ان کی حکومت پر عائد ہوتی ہے،

پھر سردار نے مجھ سے کہا کہ وہ رپورٹ پڑھوں جو حکومت مدراس نے رضا کاروں کی تخریبی سرگرمیوں کے بارے میں بھیجی ہے، اس رپورٹ کی رو سے رضا کار بیجاپور اور شولا پور نامی دیہاتوں میں داخل ہوئے، وہاں کے رہنے والوں کو ہلاک کیا، اور مال زر لوٹ لیا،

یہ رپوٹ پڑھوانے کے بعد سردار نے لائق علی سے کہا،

"آپ ہی بتایئے کون حکومت ہے جو ان حرکتوں کو در گذر کر سکتی ہے؟ حکومت بمبئی نے فوجی امداد طلب کی ہے، اور ہم اپنے دیہاتیوں کی مال و جان بچانے کے لئے یہ مدد دینے پر مجبور ہیں۔

میرے تجویز کردہ دو راستے

اسی شام کو لائق علی کی استدعا پر میں ان سے ملا، گفتگو کے دوران میں واضح طور پر میں نے بتایا کہ اب حکومت حیدر آباد کے لئے دو ہی چارہ کار ہیں یا تو وہ الحاق کرلے، ورنہ مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرے، اگر نظام نے الحاق کرلیا تو پھر ذمہ دار حکومت کا معاملہ، نظام جانیں اور ریاست کے باشندے، لیکن اگر کسی وجہ سے نظام الحاق منظور نہیں کرتے تو حکومت ہند، ریاست میں ذمہ دار حکومت قائم کرنے کے سلسلہ میں دباؤ ضرور ڈالے گی، بہتر یہی ہے کہ الحاق کو قبول کرلیا جائے ——،

لائق علی کا تیسرا راستہ

لیکن لائق علی دونوں راستوں میں سے کوئی راستہ

اختیار کرنے پر تیار نہیں تھے، انھوں نے ایک تیسرا چارہ کار تجویز کیا کہ، عارضی وقفہ کے لئے ہند و مسلم مساوات کی بنیاد پر دستوری قدم اٹھایا جائے، البتہ اس سال کے اندر ذمہ دار حکومت قائم کر دی جائے گی۔

میں نے لائق علی کو بتایا کہ یہ حل ناقابل قبول ہے، اگر آپ مسلم مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں تو اس کی ایک دوسری صورت ہو سکتی ہے، وہ یہ کہ نظام فوراً ذمہ دار حکومت قائم کر کے کانسٹی ٹیوشنٹ اسمبلی طلب کریں، جس کا انتخاب حق رائے دہی بالغاں کے اصول پر ہو، نظام نے یہ شرط عائد کر دی کہ مسلم اقلیت کے تمام جائز حقوق اور مفادات محفوظ رکھے جائیں گے اور اگر تحفظات واقعی جائز حقوق اور مفادات پر مبنی ہوئے، تو ان پر کوئی بھی معترض نہیں ہو سکتا۔

نظام کا مکتوب

وفد حیدر آباد واپس چلا گیا، توقع یہ تھی کہ نظام ہمارے پیش کردہ نکات کو فوراً منظور کر لیں گے، ۲۲- اپریل کو انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام ایک مکتوب لکھا کہ حکمران اور رعایا کے دستوری تعلقات کو ایک خاص داخلی مسئلہ تصور کیا جائے، ساتھ ہی نظام نے ایک فرمان بھی شائع کیا، جو حد درجہ مایوس کن تھا، اس فرمان میں اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ جن سیاسی جماعتوں کو اب تک کابینۂ وزارت میں نمائندگی نہیں حاصل ہے، وہ اب شریک وزارت ہو کر، ذمہ داری میں حصہ دار بن جائیں گی، اس تریاق کے ساتھ جو زہر ملا تھا وہ یہ تھا کہ:

"مجھے اندیشہ ہے کہ دوسری حکومتوں کی نقل کرتے ہوئے حیدر آباد میں حکومت کی تشکیل کرنا ہمارے ملک کی فضا کو مسموم کر دے گا، بالکل اسی طرح جیسا دوسری جگہوں پر نظر آ رہا ہے۔"

ماؤنٹ بیٹن کی ایک اور کوشش

اب لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کو الوداع کہکر رخصت ہونے والے تھے، وہ چاہتے تھے مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی اس مدت میں حیدر آباد کا مسئلہ جس طرح ہو حل کرتے جائیں، اب تک جس معاملہ کو انھوں نے ہاتھ میں لیا تھا کامیابی سے اتمام تک پہنچایا تھا، صرف

حیدر آباد کا مسئلہ اب تک ناقابل حل تھا، انھوں نے نظام کو دہلی آنے کی دعوت دی، نظام نے انہیں حیدر آباد میں مدعو کیا، آخر اپنے پریس اٹیچی ایلن کیمپل جانسن Alan Campbell Ihonson کو نظام سے ملنے اور وہاں کے حالات کا بچشم خود معائنہ کر کے رپورٹ دینے کے لئے حیدر آباد بھیجا،

کیمبل جانسن نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ اصل کار فرما شخصیت نظام ہی کی ہے، اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ نظام کی مرضی سے ہوا ہے، نظام نے اپنے آپ کو قصدا وقت کے حوالے کر دیا ہے،!

نتائج تباہ کن ہوں گے

۲۵-مئی کو لائق علی کی لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے پھر ملاقات ہوئی، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لائق علی کو متنبہ کیا کہ اگر حیدر آباد اور بھارت میں مفاہمت نہ ہوئی تو نتائج بہت سنگین ہوں گے،

لائق علی نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ نہ وہ الحاق پر رضامند ہو سکتے ہیں نہ ذمہ دار حکومت کی تشکیل پر تیار ہیں کیونکہ اس کا نتیجہ الحاق ہی ہوگا۔

۶ جون کو، لائق علی سر والٹر مانکٹن کے ساتھ دہلی آئے اور تصفیۂ معاملات کا ایک نیا مسودہ بھی ساتھ لائے، لیکن یہ تجاویز میرے نزدیک قطعاً قابل قبول نہ تھیں، میں نے سر والٹر مانکٹن سے بے جھجک کہہ دیا کہ حکومت ہند انھیں کس طرح منظور نہیں کر سکتی، میں نے لائق علی پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ جب تک حکومت حیدر آباد ذمہ دار حکومت اور الحاق کے سلسلہ میں حقیقت پسندانہ رویہ نہیں اختیار کرتی اس وقت تک کسی قسم کی مفاہمت اور سمجھوتہ کی توقع کرنا بیکار ہے۔

سردار کی برہمی

دوسرے دن سردار سے مشورہ کرنے میں وہرا دون گیا، جہاں بحالی صحت کے لئے وہ مقیم تھے، وہ اس بات پر بہت برہم تھے کہ حیدر آباد کی وفود سے اتنی طویل گفت و شنید کے بعد بھی ہم اب تک نئے نئے فارمولے برائے منظوری پیش کئے جا رہے ہیں، انھوں نے نہایت سختی کے ساتھ کہا کہ وقت آگیا ہے کہ صاف طور پر نظام کو بتا دیا جائے کہ غیر مشروط الحاق اور مکمل نیابتی اور ذمہ دارانہ حکومت سے کم پر کوئی چیز

حکومت ہند کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتی، انھوں نے تاکید کی کہ حیدر آبادی وفد کو ایک مختصر سا مراسلہ حوالہ کر دیا جائے جس میں انہی دونوں امور کا مطالبہ کیا گیا ہو، ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اقدام و عمل میں مزید تاخیر حکومت ہند کے لئے سیاسی نقطۂ نگاہ سے بھی اور فوجی اعتبار سے بھی حد درجہ مہلک ہوگی، سردار نے نہرو، اور ماؤنٹ بیٹن کے نام جو خط لکھا اس میں یہ تمام امور تفصیل سے واضح کر دیے۔

وفد حیدر آباد کے چار نکات

۸ اور ۹ جون کو حیدر آبادی وفد سے پھر گفتگو ہوئی اور ایک مسودہ متفقہ فریقین تیار کیا گیا، ۱۰ جون کو وفد نظام کی منظوری لینے حیدر آباد روانہ ہوگیا۔ ۱۲ جون کو سر والٹر دو نئی ترمیمیں لے کر دہلی آئے، میں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر یہ بات واضح کر دی کہ یہ ترمیمیں ناقابل قبول نہیں، لیکن موصوف ایک آخری کوشش کرنے پر تلے ہوئے تھے، چنانچہ ۱۳ جون کو وہ نہرو کو اور مجھے ساتھ لے کر دہرادون گئے، سردار نے فوراً یہ ترمیمیں نامنظور کر دیں، لیکن ماؤنٹ بیٹن کے اصرار سے بالآخر مان لیں، ۱۴ جون کو حیدر آبادی وفد پھر دہلی آیا، اور اس نے اصرار کیا کہ:

۱۔ حکومت ہند مواصلات کے سلسلہ میں کوئی قانون حیدر آباد میں صرف اس وقت نافذ کر سکے گی جب کہ وہ ہندوستان میں بھی نافذ کیا گیا ہو،

۲۔ حیدر آباد کو ۸ ہزار افواج بے قاعدہ رکھنے کی اجازت بھی دی جائے۔

۳۔ رضاکار جماعت کی تحلیل آہستہ آہستہ عمل میں آئے گی یک دم نہیں،

۴۔ ہندوستان اپنی فوجیں حیدر آباد میں صرف اس وقت داخل کر سکے گا۔ جب اس کی کسی ملک سے لڑائی ہو، یا ہندوستان میں داخلی طور پر امن و امان درہم برہم ہو رہا ہو۔

---

۱۴ جون کو کابینۂ وزارت کا ایک اجلاس ہوا، جس میں حیدر آبادی وفد کے ان نکات چہارگانہ پر غور ہوا، آخر تعدیل کے بعد انھیں منظور کر لیا گیا۔

۱۵- جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وفد سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ حکومت ہند نے اس کے نکات چہارگانہ منظور کر لئے ہیں اور اب حیدر آباد کی طرف سے کوئی مزید ترمیم یا تجویز نہیں آنی چاہیے، اس گفتگو کے بعد وفد حیدر آباد روانہ ہو گیا -

نظام نے پھر اڑنگا لگا دیا

شام کو نظام کا تار لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام آیا کہ:

«میں نے اپنی اگزیکیٹو کونسل سے مجوزہ مسودہ پر مشورہ کیا، اور اس نے مجھے اسے منظور نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے،!»

اس کے بعد نظام نے حسب ذیل چار شرائط پیش کئے :-

۱- سردست مجلس دستور ساز کے قیام پر اصرار نہ کیا جائے، اس پر میں پھر کسی وقت غور کروں گا،

۲- عارضی حکومت کے قیام کے لئے یہ شرط نہ عائد کی جائے کہ اس میں تمام ممتاز سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک کئے جائیں،

۳- تجارت اور اقتصادی معاملات میں حیدر آباد کی کامل آزادی تسلیم کی جائے -

۴- اختلافی امور کا فیصلہ ثالث کے ذریعہ سے کرایا جائے،

سر والٹن کا فون گورنر جنرل کو

سر والٹر نے بھی ان نئی ترمیموں کو مہمل اور نامعقول قرار دیا، پھر وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ایک مفصل خط لے کر حیدر آباد گئے تاکہ نظام کو راضی کر سکیں،

۱۶- جون کو سر والٹر کا فون لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام آیا،

«بازی ہر گئی،!»

اسی دن نظام کا ایک مکتوب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام آیا، جس میں انھوں نے کسی قیمت پر بھی، اور کسی حالت میں بھی ہندوستانی فوج کو حیدر آباد میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

نظام کا آخری خط گورنر جنرل کو

نظام کے مکتوب کا آخری حصہ یہ تھا،!

«اگرچہ موجودہ صورت میں مسودہ زیر بحث کرنا، بوجوہ معلومہ میرے لئے ممکن نہیں، لیکن مجھے قوی امید ہے کہ گفت و شنید

مصالحت کا سلسلہ بدستور جاری رہے گا، اور بہت جلد ہم کسی سمجھوتہ پر پہنچ جائیں گے!"

مزید یہ کہ میری ایگزیکٹیو کونسل یہ بات مان لینے کا مجھے کسی طرح مشورہ نہیں دے سکتی کہ ہندوستان جب چاہے اپنی فوجیں حدود حیدرآباد میں داخل کردے، اور اس اقدام کی اسے پوری آزادی حاصل ہو، البتہ اگر کوئی ایسا موقع آئے کہ ہندوستان میں ہنگامی حالات کا اعلان کرنے پر حکومت ہند مجبور ہو جائے تو ایسے موقع پر پوری صدق دلی کے ساتھ ہم اس سے تعاون کریں گے اور ریاست کے سرحدی علاقوں پر حکومت ہند اپنی فوج متعین کرنے کی مجاز ہوگی، اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا.

علاوہ ازیں ثالثی کا مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کر دیا جائے، جس پر اپنے پچھلے تاروں میں صراحت کے ساتھ میں زور دے چکا ہوں!!"

گفت و شنید: نہرو کا اعلان!

۱۸ جون کو نہرو نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی، جس میں انھوں نے اعلان کیا کہ حکومت ہند اب حیدرآباد سے مزید گفت و شنید کے لئے تیار نہیں ہے، مجوزہ مسودہ وہ آخری حد ہے جہاں تک حکومت ہند جا سکتی تھی، اب اس سے قدم آگے بڑھانا ممکن نہیں، البتہ ہمارا دروازہ کھلا ہوا ہے، جہاں تک مسودۂ مفاہمت کا تعلق ہے، نظام جب چاہیں اسے منظور کرلیں ہم خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں،"

حیدرآباد (۳)

پولیس ایکشن کی کہانی

بات چیت ختم

حیدرآباد سے گفت و شنید مصالحت کا سلسلہ منقطع ہونے کے تین دن بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان سے رخصت ہو گئے، ان کی جگہ سی۔ راج گوپال اچاری گورنر جنرل بنائے گئے۔ گفتگوئے مصالحت ٹوٹنے سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن بہت دل گرفتہ تھے۔

ریاست کا اقلیتی فرقہ چھایا ہوا تھا

یہ بات واضح تھی کہ لائق علی کابینہ نہ اتفاق پہ آمادہ ہو گا نہ ذمہ دار حکومت قائم کرنے پر۔ اقلیتی فرقہ (مسلمان) نے تمام سرکاری ملازمتوں کا ٹھیکہ لے رکھا تھا، اور یہی ذمہ دار حکومت کی راہ میں سب سے بڑا روڑا تھا، کیونکہ ذمہ دار حکومت کے معنی یہ تھے کہ اس کا ٹھیکہ ختم ہو جائے نظام اور ان کے مشیروں کا خیال تھا کہ حکومت ہند کشمیر اور بعض دوسرے معاملات میں ایسی الجھی ہوئی ہے کہ وہ حیدرآباد کا رخ نہیں کر سکتی، برطانوی اخبارات اور بعض برطانوی سیاستدانوں کے مخالف ہند رویہ نے بھی نظام کو بڑی تقویت پہنچائی، اور ان کا غیر مفاہمانہ رویہ اور زیادہ سخت ہو گیا۔

حالات سنگین سے سنگین تر ہوتے جا رہے تھے، سرحد پر یلغاروں، جھڑپوں اور ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ بڑھ رہا تھا، ٹرینوں پر روز روشن حملے ہو رہے تھے ان حالات نے معاہدۂ قائمہ کو

پس منظر میں ڈال دیا تھا، حکومت حیدرآباد نے ثالثی کا سوال اٹھایا کہ معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزیوں کا تدارک کیا جا سکے، لیکن اب معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزی غیر اہم چیز ہو کر رہ گئی تھی، اصل بات یہ تھی کہ ریاست میں امن و قانون کی حکمرانی رخصت ہو چکی تھی،

حیدرآباد کے لوگ ڈرتے تھے

حیدرآباد کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے؟ اس سوال پر حکومت ہند کے مشیروں میں اختلاف رائے تھا۔

جو لوگ حیدرآباد کے خلاف اقدام و عمل کے مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ سارے ہندوستان میں فرقہ وارانہ جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی اور حیدرآباد کے ہندو ذبح کر دیے جائیں گے، اور ہندوستان میں مسلمانوں کی گردنیں کاٹی جانے لگیں گی، پھر جنوبی ہند میں مالابار کے موپلہ مسلمانوں کا خطرہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اس میں کوئی شبہ نہیں ہر بات ممکن تھی، لہذا ہر متوقع حادثہ کی روک تھام کا پہلے سے بندوبست کر لینا ضروری تھا، میری رائے یہ تھی کہ وسیع پیمانہ پر ہندوستان میں فرقہ وارانہ فساد کا اندیشہ بے بنیاد نہیں تو مبالغہ آمیز ضرور تھا۔

ایک اندیشہ یہ بھی ظاہر کیا جا رہا تھا کہ اگر حیدرآباد کے خلاف قدم اٹھایا گیا تو پاکستان مداخلت کرے گا، میری پختہ رائے یہ تھی کہ پاکستان حیدرآباد کے لئے جنگ کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا،

ہندوستانی پریس کھلے بندوں حکومت ہند پر الزام لگا رہا تھا کہ حیدرآباد کے معاملہ میں بے عملی کی پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے۔

ہماری فوج فرقہ وارانہ فساد کچلنے پر تیار تھی

جب بھی حیدرآباد کے خلاف کسی اقدام پر غور کیا گیا فرقہ وارانہ سوال نے اسے معرض التوا میں ڈال دیا، ہمارے فوجی حکام کا خیال تھا کہ وہ فرقہ وارانہ بدنظمی کو بڑی پھرتی اور آسانی سے کچل دیں گے خواہ وہ کتنے ہی وسیع پیمانہ پر کیوں نہ شروع ہو

مسلمانوں کو کچلنے کے لئے گورکھوں کی بھرتی

پھر بھی ہم نے ہندوستانی خزانہ پر ایک بڑا بوجھ ڈال کر کئی گورکھا بٹالین بھرتی کیں، لیکن ان حد درجہ احتیاطی اقدامات کے باوجود کچھ دلوں میں اب تک وحشت سمائی ہوئی

تھی۔

لائق علی کے الزامات حکومت ہند پر

اس اثناء میں لائق علی مجلس اقوام متحدہ میں حیدرآباد کا کیس لے جانے پر مصر تھے، ۱۲ اگست کو انھوں نے نہرو کو اس امر پر متوجہ کیا کہ ہندوستان کی طرف سے معاہدۂ قائمہ کی مسلسل خلاف ورزی ہو رہی ہے، انھوں نے یہ شکایت بھی کی کہ حیدرآباد کی سخت ناکہ بندی کی جا رہی ہے اور یہ فریاد بھی کی کہ ہندوستانی فوجی دستے بار بار حدود ریاست میں داخل ہو رہے ہیں، آخر میں انھوں نے لکھا کہ ان حالات کے پیش نظر ہم مجلس اقوام متحدہ میں اپنی فریاد لے کر جا رہے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے پائدار اور پرامن مفاہمت بروئے کار آ سکے۔

۲۳- اگست کو حکومت ہند کی طرف سے جواب دیا گیا کہ حیدرآباد سے ہمارے اختلافات گھریلو قسم کے ہیں، ان میں کوئی غیر ملکی ادارہ مداخلت کرنے کا مجاز نہیں ہے، لہذا حیدرآباد کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ بین الاقوامی قانون سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے،

امریکہ نے مداخلت سے انکار کر دیا

امریکہ کے چارج ڈی افیئر نے ہمیں مطلع کیا کہ نظام نے صدر امریکہ سے ثالث بننے کی اپیل کی ہے، لیکن انھوں نے انکار کر دیا ہے۔

گورنر جنرل کا خط نظام کے نام

۲۸- اگست کو حیدرآباد کے ایجنٹ جنرل نے مجلس اقوام متحدہ میں اپنا کیس پیش کرنے کے لئے فضائی سفر کی سہولتیں طلب کیں، لیکن ہماری طرف سے جواب دیا گیا کہ چونکہ یہ گھریلو معاملہ ہے، لہذا اس معاملہ میں مجلس اقوام متحدہ کا دامن پکڑنے کی حیدرآباد کو اجازت نہیں دی جا سکتی پھر بھی کسی نہ کسی طرح معین نواز جنگ کی سرکردگی میں وفد حیدرآباد نیویارک پرواز کر گیا۔

اگست کے آخر میں ریاست کا امن و امان اور زیادہ ابتر ہو گیا۔ آخر نئے گورنر جنرل راجہ جی نے نظام کو کہا کہ وہ ہمت سے کام لیں، رضاکار جماعت کو خلاف قانون قرار دیں، اور حکومت ہند کو دعوت دیں کہ وہ اپنی فوج سکندرآباد میں متعین کر دے، اس طرح دوستی اور

خیر سگالی کی ایک خوشگوار فضا پیدا ہو جائے گی، اور لوگوں کو اپنی جان و مال کے تحفظ کا اعتماد پیدا ہو جائے گا۔

۵۔ ستمبر کو نظام نے جواب دیا کہ ریاست میں لوگوں کی جان و مال کے عدم تحفظ کے بارے میں بہت غلط اطلاعات آپ کو ملی ہیں، ہندوستانی افواج کو حیدر آباد میں داخل ہونے کی کسی طرح اجازت نہیں دی جا سکتی، حیدر آبادی افواج نظم و امن برقرار اور بحال رکھنے کا فریضہ بخوبی انجام دے سکتی ہیں،

حیدر آباد کو الٹی میٹم

۷۔ ستمبر کو میں نے لائق علی کے نام ایک مراسلہ بھیج کر مطالبہ کیا کہ رضا کار جماعت فوراً توڑ دی جائے، اور ہندوستان کی افواج کو جتنی تعداد میں ہم مناسب سمجھیں سکندر آباد میں داخلہ کی سہولت دی جائے، تاکہ ریاست کا نظم و امن بحال ہو سکے،

راجہ جی سے نظام کی استدعا

۹۔ ستمبر کو نظام نے راجہ جی سے استدعا کی کہ وہ مداخلت کر کے حیدر آباد کا نقطۂ نظر ہندوستانی حکومت کو سمجھائیں اور دونوں میں تعلقات خوشگوار بنیاد پر قائم کرنے کی سعی کریں، راجہ جی نے جواب دیا، سب سے مقدم مسئلہ امن و امان کا ہے، لہٰذا نظام کو چاہیے کہ وہ حکومت ہند کو دعوت دیں کہ وہ اپنی افواج سکندر آباد میں متعین کر دے، یہ اس بات کا ثبوت ہو گا کہ حیدر آباد واقعی باعزت مفاہمت کا طلب گار ہے۔

حکومت ہند کے لئے سخت مشکل سوال

حکومت ہند اس وقت بڑی سنگین صورت سے دوچار تھی، یا

کیا رضا کاروں اور کمیونسٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو اسے برداشت کر لینا چاہیے؟

کیا ہندوستانی علاقوں پر تاخت و تاراج اور ہندوستانی ٹرینوں پر مسلسل حملوں کا سلسلہ اسے گوارا کرتے رہنا چاہیے،؟

کیا ایک غیر جانبدار اور بے بس تماشائی کی حیثیت سے حیدر آباد کے ہندوؤں کا انخلاء دیکھتے رہنا چاہیے؟ یا جو بد قسمت ہندو اب تک، وہاں موجود ہیں ان کا عام

نظر انداز کر دینا چاہیے ؟

ان سوالات کا جواب اگر اثبات میں نہیں نفی میں تھا تو پھر جس قدر جلد اقدام کیا جائے اتنا ہی حیدر آباد اور انڈیا دونوں کے لئے بہتر ہے،

ہماری فوج کو یقین تھا کہ وہ حیدر آباد کی قوت مزاحمت کو بہت مختصر مدت میں توڑ دے گی۔

سب سے اہم مسئلہ ہماری نظر میں یہ تھا کہ حیدر آباد پر حملہ کرنے کی صورت میں جنگ کب تک جاری رکھنا پڑے گی ؟ کیونکہ ہر چیز کا انحصار صرف اس پر تھا کہ جنگ زیادہ سے زیادہ کم مدت مدت میں کامیابی کے ساتھ ختم کر دی جائے، صرف اسی طرح اندرونی خلفشار اور دنیا کی رائے عامہ سے ہم محفوظ رہ سکتے تھے،

ہمارے فوجی ماہرین کی رائے تھی کہ معاملہ تین ہفتے سے زیادہ کا نہیں ہے، لیکن عملاً ایک ہفتہ سے بھی کم مدت میں معاملہ اتمام اور اختتام کو پہنچ گیا۔

حیدر آباد پر حملہ کا فیصلہ

۹۔ ستمبر کو تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اور اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد کہ اب کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا ہے حکومت نے فیصلہ کر لیا کہ حیدر آباد پر حملہ کر دیا جائے، تاکہ اندرون ریاست میں نظم و امن اور بیرون ریاست میں اعتماد کی فضا پیدا ہو جائے، یہ فیصلہ جنوبی کمان کو پہنچا دیا گیا، جس نے افواج متعلقہ کے نام فرمان صادر کر دیا کہ ہندوستانی فوجیں دوشنبہ ۱۳۔ ستمبر کی صبح حیدر آباد کی طرح مارچ کر دیں، اس موقعہ پر یہ بات نظر انداز نہیں ہونی چاہیے کہ حیدر آباد پر حملہ کی تاریخ مقرر ہو چکنے کے بعد بھی، یہ کوششیں جاری رہیں کہ کم از کم ۱۵۔ ستمبر تک اسے ملتوی کر دیا جائے۔

پولو ایکشن نہ کہ پولیس ایکشن

ہمارے فوجیوں نے اس اقدام کا نام رکھا "ایکشن پولو (Action Polo)"

حیدر آباد کی طرف سے سخت مزاحمت

پہلے اور دوسرے دن، حیدر آباد کی طرف سے سخت مزاحمت ہوئی، اس کے بعد وہ کمزور

پٹتی گئی اور آخر دم توڑ گئی، ہماری طرف نقصان جان زیادہ نہیں ہوا حریف کے آدمی زیادہ کھیت رہے، کیونکہ افواج بے قاعدہ اور رضاکاروں میں نہ تنظیم تھی، نہ تجربہ، ہلاک شدگان کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ تھی، افسوس ہے کہ اتنے آدمی ہلاک ہوئے، لیکن یہ تعداد کچھ بھی نہیں رہتی ہے جب اس کا موازنہ ان واقعات سے کیا جائے، جو رضاکار ریاست کے ہندوؤں کی جان و مال اور آبرو پر ڈاکہ ڈال کر برپا کیا کرتے تھے۔

حیدرآباد ہار گیا

۱۷ ستمبر کی شام کو حیدرآبادی افواج نے ہتھیار ڈال دیے ۱۸ ستمبر کو میجر جنرل چودھری کی قیادت میں ہندوستانی فوجیں بلدۂ حیدرآباد میں داخل ہو گئیں،

یہ اقدام صرف ۱۰۸ گھنٹے کی قلیل مدت میں اتمام و اختتام تک پہنچ گیا۔

۱۷ ستمبر کو لائق علی کا بینہ نے استعفا دے دیا، ۱۹ ستمبر کو قاسم رضوی کی گرفتاری عمل میں آئی۔

۲۲ ستمبر کو نظام نے ایک بحری تار کے ذریعہ مجلس اقوام متحدہ سے اپنا کیس واپس لے لیا، متعدد غیر ممالک نے زور دیا کہ اس مسئلہ پر بحث کی جائے، لیکن بالآخر اسے ختم کر دیا گیا۔

کوئی فساد نہیں ہوا

حیدرآباد کے خلاف فوجی اقدام کے زمانہ میں سارے ملک کے طول و عرض میں کسی طرح کا فرقہ وارانہ خلفشار نہیں پیدا ہوا،

نظام کی معزولی کا مطالبہ

جون میں جب گفتگوئے مصالحت منقطع ہوئی تو نظام کے معزول کر دینے کا مطالبہ حکومت ہند سے کیا جانے لگا تھا پولیس ایکشن کی کامیابی کے بعد اس مطالبہ نے اور شدت اختیار کر لی، بعض اخبارات نے مطالبہ کیا کہ حیدرآباد کی ریاست کو مختلف قریبی صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور آصف جاہی خاندان ختم کر دیا جائے۔

پولیس ایکشن سے پہلے زین یار جنگ نے اس مسئلہ پر مجھ سے گفتگو کی تھی، میں

نے کہا تھا حیدر آباد جب دائرۂ الحاق میں آگیا، تو پھر موجودہ نظام ہی کو برقرار رکھنا مناسب ہوگا۔

نظام کے مستقبل کا فیصلہ

پولیس ایکشن کے فوراً بعد جب مجھے حیدر آباد جانے کی اجازت دی گئی تو سردار سے پہلا سوال میں نے یہی کیا کہ نظام کا مستقبل کیا ہوگا؟

میں نے سردار سے کہا کہ نظام، ۳۷ برس سے تخت حکومت پر فائز ہیں، نیز یہ کہ نظام کو نہ صرف ریاست میں نہ صرف مسلمانان ہند کی نظر میں بلکہ، ہندوستان سے باہر بھی ایک خاص مقام اور منزلت حاصل ہے، پولیس ایکشن کے فوراً ہی بعد خاندان نظام کا خاتمہ مسلمانوں پر بہت بری طرح اثر انداز ہوگا، ذاتی طور پر میری رائے یہی ہے کہ نظام کو اپنی جگہ رہنا چاہیے ایک مرتبہ حیدر آباد میں جمہوری حکومت قائم ہوگئی اور نظام اس کے دستوری سربراہ بن گئے، پھر ہماری راہ میں کوئی دشواری باقی نہیں رہ جائے گی، سردار نے میری رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ نہرو سے مشورہ کرکے فیصلہ کریں گے، اسی دن انھوں نے مجھے مطلع کیا کہ نہرو بھی ہم سے متفق ہیں،

حیدر آباد کے مایوس مسلمان

اب میں حیدر آباد پہنچا، یہاں میں نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے گفتگو کی، مسلمانوں نے مجھے بتایا کہ مسلمانوں پر اب پست حوصلگی اور مایوسی طاری ہے، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ۱۹۴۷ء ہی سے یہاں مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا چلا آرہا ہے، جو نظام اور ان کی حکومت کا مخالف تھا، انھوں نے تجویز پیش کی کہ رضاکاروں کو سختی سے سزا دی جائے، اور ریاست کی مالی حالت درست کی جائے، بہت سے سادہ لوح لوگ بھی لیڈروں کے اس جتھے میں شامل ہوگئے تھے، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے، میں نے انھیں بتایا کہ ملٹری گورنر کو ان سب باتوں کی خبر ہے اور ہم نے اسے ہدایت کردی ہے کہ اقلیتوں کو جائز اور مناسب تحفظات دئے۔

ہندو جوشِ مسرت سے بے قابو تھے

ہندو قدرتاً ہماری اس کامیابی سے باغ باغ ہوئے جا رہے تھے، میں نے انھیں متنبہ

کردیا کہ اگر کوئی ناگوار حادثہ رونما ہوا تو اس کا اثر حکومت ہند پر پڑے گا، اور وہ نہایت سختی سے اس کا تدارک کرے گی اور وہ وقت جلد آنے والا ہے جب حالات کے سازگار رہنے کی صورت میں حکومت ہند، ریاست کی عنان، عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں دے دے گی،

نظام کے نام پر کام کرنے کا فیصلہ

سب سے پہلا سوال جو زیر غور تھا یہ تھا کہ حیدر آباد کے نظم و انصرام کی بنیاد کیا ہو؟

ہمارے سامنے دو راستے تھے، یا تو مارشل لا نافذ کردیں، یا نظام کے نام پر کاروبار حکومت جاری رکھیں، یہی آخری صورت ہر نقطۂ نظر سے زیادہ مناسب نظر آئی، سہ پہر کو میں نظام سے ملا، وہ ہر طرح تعاون کرنے کو تیار تھے،

میجر جنرل چوہدری، ملیٹری گورنر اور دوسرے سول حکام سے بحث و گفتگو کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے پہلے رضاکاروں کا قصہ تمام کیا جائے تاکہ ریاست میں فرقہ وارانہ امن بحال ہو سکے، جو ہندو یہاں سے انخلا کر گئے ہیں وہ واپس آجائیں، اور جو مسلمان باہر کے شہروں سے یہاں آئے تھے وہ اپنے اپنے گھر واپس چلے جائیں، دوسرا مسئلہ کمیونسٹوں کا تھا جو کسی طرح پہلے سے کم اہم نہیں تھا، یہ معاملہ ملیٹری گورنر پر چھوڑ دیا گیا -

زخم پر نمک پاشی

میں پھر نظام سے ملا، وہ اس وقت بہت پریشان اور بدحال نظر آرہے تھے، اپنے مستقبل کے بارے میں بے حد فکرمند تھے، میں نے انھیں یاد دلایا کہ حکومت ہند نے باعزت سمجھوتہ کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ آزادی پر مصر رہے، حالانکہ یہ فیصلہ صرف تنگ نظری پر مبنی تھا، میں نے بتایا ۱۷۱۲ء میں جب آصف جاہی خاندان برسر اقتدار آیا، اس وقت سے اب تک یہ بدیسی سمجھا جاتا رہا ہے، ابتدائی زمانہ میں یہ خاندان بافرانسیسیوں کے رحم و کرم پر زندہ رہا یا انگریزوں کے، اور آخر میں وہ انگریز ہی تھے جنھوں نے اس خاندان کو باقی رکھا اور ختم نہیں ہونے دیا، انگریزوں کے چلے جانے کے بعد، نظام کو یا تو حکومت ہند سے پیمان رفاقت باندھنا چاہیے تھا یا باشندگان ریاست کا دل موہ لینا چاہیے تھا لیکن نہ یہ ہوا نہ وہ اس حقیقت کو بہرحال نظرانداز نہ کرنا چاہیے تھا کہ مسلمان اقلیت میں ہیں،

اور صرف ایک اقلیت کی تائید و حمایت کے بل پر یہ خاندان برسرِ حکومت نہیں رہ سکتا تھا، بہر حال حکومت ہند انتقام لینا نہیں چاہتی، نہ تخت حکومت چھیننا چاہتی ہے، ایک مرتبہ جب حیدرآباد دوسری ریاستوں کی صف میں آگیا، اور مرکز کا تابع بن گیا، اور بشرطیکہ عہد گزشتہ کی ذہنیت نے دوبارہ عود نہ کیا، انڈین یونین سے پیمانِ وفا استوار رہا، اور عوام کی بھلائی کا کام جاری رکھا گیا، تو حکومت ہند ہرگز یہ گدی نہیں چھینے گی،

نظام کا اقرارِ وفا

نظام میری باتیں گہری توجہ سے سنتے رہے اور مجھے یقین دلایا کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا اس سے قطع نظر وہ انڈین یونین کے جان و دل سے وفادار رہیں گے، حکومت ہند کے ہدایات کے مطابق کام کریں گے، انھوں نے مجھ سے استدعا کی کہ ان کا یہ فیصلہ سردار اور نہرو تک پہنچا دوں،

جیل میں قاسم رضوی سے میری ملاقات

نظام سے ملاقات کے بعد میں نے میجر جنرل چودھری سے کہا کہ میں قاسم رضوی سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں،

رضوی نے جب مجھے دیکھا، تو اپنی حیرت چھپا نہ سکے، جب میں نے خیریت پوچھی انھوں نے کہا وہ ہرگز اس کی توقع نہیں رکھتے تھے کہ میں ان سے ہاتھ ملانا پسند کروں گا،

میں نے رضوی سے کہا،

وہ جب آپ دہلی آئے تھے تو کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ اپنے آپ کو گرفتارِ بلا کر رہے ہیں؟ وہ آتش نوا شخص اس وقت پیکرِ یاس و حرماں نظر آ رہا تھا،

رضوی نے کہا جنوبی ہند میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے انھوں نے ایک وسیع اور جامع پروگرام بنایا تھا،

میں نے جواب دیا، اس کا نتیجہ میرے سامنے ہے۔

میں نے رضوی سے پوچھا، کیا آپ کی اچھی طرح دیکھ بھال ہو رہی ہے؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟

رضوی نے کہا، مجھے نہ کوئی تکلیف ہے، نہ شکایت،!

کچھ عرصہ بعد میں پھر حیدر آباد گیا، مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا پروگرام وضع کیا جائے کہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے عوامی لیڈروں کے ہاتھ میں ریاست کی باگ دی جا سکے،

حیدر آباد کے نظم و انصرام کا تدریجی دور

حیدر آباد کو ایک عجیب قسم کے انقلاب سے دوچار ہونا پڑا تھا بہت سی جمی ہوئی چیزیں اکھڑ گئی تھیں، ان حالات میں یکایک عوامی لیڈروں کے ہاتھ میں انتظام حکومت سونپ دینا سخت مشکلات کا موجب ہوتا، نظم و قانون کی حالت اب تک زبوں تھی، رضاکار ابھی تک پورے طور پر ختم نہیں ہوئے تھے، کمیونسٹوں کا وجود بھی باقی تھا، ریاست کی مالی حالت حد درجہ نازک تھی، جب تک حالات درست نہ ہو جاتے، عوامی لیڈروں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ دینا اور خرابی پیدا کرتا، سرکاری ملازمتیں سونی پڑی تھیں، پولیس میں ۹۵ فیصدی مسلمان تھے، اور ان کی اکثریت رضاکاروں کی حامی تھی، فوج تمام تر مسلمانوں پر مشتمل تھی، کم و بیش یہی حال دوسری سرکاری ملازمتوں کا تھا، اہم اور ممتاز عہدوں پر مسلمانوں کا باقی رکھنا ہندوؤں کے مزید اشتعال کا سبب ہوتا ان حالات میں تبدیلی رفتہ رفتہ عمل میں آنی چاہیے تھی،

تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد ایک فارمولا مرتب کیا گیا جسے کابینۂ ہند نے بھی منظور کر لیا،

میجر جنرل چوہدری کی سربراہی میں دسمبر ۱۹۴۹ء تک ریاست کا نظم و انتظام جاری رہا، پھر ایک وزارت بنائی گئی، جس کے وزیر اعظم ایم کے ویلودی آئی سی ایس، حکومت ہند کی طرف سے نامزد کئے گئے، ۱۹۵۰ء میں کانگرس کے چار نمائندے شریک وزارت کر لئے گئے، مارچ ۱۹۵۲ء میں عام انتخاب کے بعد راما کرشنا راؤ نے کانگرس وزارت قائم کی، اور اب ڈوری کی حیثیت بشری کی ہو گئی،

حیدر آباد کے مسلمانوں میں ہم نے اعتماد پیدا کر دیا

اس طرح تقریباً ۳ سال تک حیدر آباد کا نظم و نسق حکومت ہند کے ہاتھ میں رہا جو ہر اعتبار سے سول اور فوجی افسران کے تعاون کے باعث کامیاب رہا،

بالآخر حیدر آباد کے مسلمانوں میں ہم نے مکمل اعتماد پیدا کر دیا، رضاکار جماعت ختم ہو گئی، اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت بہت سے نذر زنداں کر دیے گئے، جن رضاکاروں پر سنگین الزامات تھے، انھیں بہ شمول رضوی کھلی عدالت کے حوالہ کر دیا گیا، رضوی مجرم ثابت ہوئے اور انھیں سزائے قید دی دیدی گئی۔ اب دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔

جاگیرداری نظام کی تنسیخ

کمیونسٹوں کی متشددانہ سرگرمیوں کو کچلنے کے ساتھ مثبت اقدام کی بھی ضرورت تھی، ہم نے اپنے عمل اور پروپیگنڈے سے لوگوں کو باور کرا دیا کہ حکومت ان کی اقتصادی بدحالی کا سب سے زیادہ لحاظ رکھتی ہے۔ چنانچہ پہلا قدم تنسیخ جاگیرداری کے سلسلہ میں اٹھایا گیا، جو حیدر آباد میں اپنی بدترین صورت میں موجود تھا۔

نظام کے صرف خاص پر قبضہ

سب سے پہلے جس جاگیر پر قبضہ کیا گیا وہ خود نظام کی جاگیر تھی، جو صرف خاص کے نام سے موسوم تھی جملہ مصارف وضع کرنے کے بعد نظام کو اس جاگیر سے سوا کروڑ سالانہ کی خالص بچت ہوتی تھی، نظام نے اپنے تمام حقوق سے دستبرداری اختیار کر لی، جس کے معاوضہ میں حکومت ہند نے ۲۵ لاکھ روپے سالانہ نظام کے لئے تاحیات مقرر کر دیے۔

نظام کے بعد دوسرے جاگیرداروں کی باری آئی، اور ان کی جاگیریں بھی لے لی گئیں، اس اقدام نے ان پانچ ملین لوگوں کو جوش مسرت سے معمور کر دیا، جو ان جاگیروں کے علاقہ میں بود و باش اختیار کئے ہوئے تھے،

معاوضہ کی ادائی

جاگیرداروں، ان کے حصہ داروں، اور متعلقین کے ساتھ انصاف اور معقولیت کا برتاؤ کیا گیا،

پہلے چھ مہینہ کی مدت کے لئے ایک عارضی الاؤنس انھیں پیش کیا گیا، جو ان کی اصل آمدنی کا ۴۰ فیصد سے لیکر ۵۰ فیصد تک پر مشتمل تھا، پھر جاگیرداروں کو ان کی جاگیر کے تناسب کے لحاظ سے معاوضہ بھی ادا کیا گیا، جس سے کم آمدنی والے جاگیرداروں نے زیادہ فائدہ اٹھایا،

معاوضہ کی شرح کیا ہو؟ اقساط کی تعداد کیا ہو؟ ادائی کی صورت کیا ہو؟ اب یہ ساری باتیں طے کرنی تھیں، چنانچہ اگست ۱۹۵۰ء میں ایک مرتبہ پھر مجھے حیدرآباد جانا پڑا، میں نے حکومت حیدرآباد، اور جاگیرداروں کے نمائندوں سے طویل گفتگو کی، اور آخر حسب ذیل بنیادوں پر ایک فارمولا طے پایا،

۱۔ معاوضہ کی رقم اتنی نہ ہو جو حکومت حیدرآباد کے مالی وسائل کے لئے ناقابل برداشت ہو،

۲۔ شرح اقساط اس طرح مقرر کی جائے کہ امکانی حد تک مختصر مدت میں ادا کی جاسکے،

۳۔ کسی حالت میں بھی معاوضہ ادا کرنے کے لئے حکومت قرض نہیں لے گی، نہ رقم معاوضہ پر کسی طرح کا سود جاگیرداروں کو ادا کیا جائے گا۔

۴۔ دس ہزار تک کی رقم معاوضہ، اس سال میں دس مساوی قسطوں کے ذریعہ ادا کی جائے گی،

۵۔ ۲۵ لاکھ تک کی رقم معاوضہ، بیس سال میں بیس مساوی قسطوں میں ادا کی جائے گی،

۶۔ ۲۴ اور ۵ لاکھ کی درمیانی رقم، پندرہ سال میں پندرہ مساوی قسطوں کی صورت میں ادا کی جائے گی۔

ریاستی جاگیروں کی آمدنی

ریاست حیدرآباد کی جاگیروں کی آمدنی ۵۔۳ کروڑ روپے کے قریب تھی،

حکومت حیدرآباد کو جو معاوضہ دینا تھا اس کی میزان ۱۸ کروڑ بنتی تھی، یہ رقم بالاقساط ادا کرنی تھی، اس کے معنی یہ تھے کہ حکومت کے خزانہ پر سالانہ ۵۔۴۰ لاکھ مزید بار پڑ رہا تھا،

یہ بھی طے ہوا کہ جاگیروں کے جو ملازم ریاستی حکومت کی ملازمت میں نہیں لئے جا سکتے انھیں پنشن دی جائے، یہ بار بھی حکومت کے خزانہ پر تھا،

ریاست میں جیسے ہی ملٹری گورنر کا راج قائم ہوا نظام نے ایک اعلان شائع کیا جس کی رو سے حیدرآباد بھی دوسری ریاستوں کی صف میں آگیا، الحاق اور دوسرے امور میں اس کی حیثیت وہی ہو گئی جو دوسری ریاستوں کی تھی،

ہندوستان کے خلاف نکتہ چینی

یہ باب ناتمام رہے گا اگر اس نکتہ چینی کا ذکر نہ کیا جائے جو حکومت ہند کے پولیس ایکشن کے خلاف مسلسل کچھ عرصہ تک کی گئی،

بہت سے برطانوی اخبارات نے نہایت درشت لہجہ میں اس اقدام پر حکومت ہند کی مذمت کی، برطانوی دارالعوام میں اس مسئلہ پر سوالات کی بوچھاڑ ہوئی، اور برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون (Ernest Bevin) تو یہاں تک بھٹکے کہ انھوں نے ” جنگی ذہنیت “ رکھنے کا طعنہ دیا، ان میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ حکومت ہند، اس مسئلہ کو امن و امان سے طے کرنے میں کس حد تک آگے جا چکی تھی،!

اس وقت سے جب ۱۷۹۸ء میں حیدرآباد نے انگریزوں کی ایک زبردست ریاست کی صورت اختیار کی، انگریزوں نے نظام سے وہی سلوک مرعی رکھا جو دوسری ریاستوں کے ساتھ ان کا تھا، — !

جغرافی، ثقافتی، اقتصادی، اور سیاسی طور پر حیدرآباد ہمیشہ ہندوستان کا غیر منفک حصّہ رہا، کوئی قدرتی حد بندی ہندوستان اور حیدرآباد کے مابین نہیں ہے، وہاں کے باشندے دوسرے پڑوسی صوبوں کے باشندوں سے مکمّل طور پر یکسانیت رکھتے ہیں، مواصلات، ڈاک، تار اور ٹیلیفون کے سلسلہ میں ریاست ہمیشہ ہندوستان کی محتاج رہی ہے، یہ ریاست کبھی بھی ایک آزاد علاقہ کی حیثیت سے قائم نہیں رہی، یہ صورت احوال گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے قائم چلی آرہی تھی،، اسے رات کے رات، برطانوی حکومت کے اس اعلان کے ماتحت بدلا نہیں جا سکتا تھا کہ وہ بالادستی کے اختیارات سے دستبردار ہوتی ہے،

لائق علی کا طعنہ

لائق علی نے شکایت کی تھی کہ جو لوگ آزادئ ہند کے لئے سرکیف رہا کرتے تھے وہی حیدرآباد کی آزادی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں، اور ایسے انگریزوں کی بھی کمی نہ تھی جو لائق علی کے اس موقف کی تائید میں رطب اللسان تھے، لیکن یہ لوگ جب حیدرآباد کی آزادی کا نعرہ لگاتے تھے تو ان کے پیش نظر صرف نظام اور ان کے حواری ہوتے تھے، یہ ریاست کے عام باشندوں کو خاطر

ہی نہیں لاتے تھے۔

نقشہ اٹھا کر دیکھئے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اگر نظام اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو جنوبی ہند شمالی ہند سے بالکل منقطع ہو جاتا،

ایک انگریز ریذیڈنٹ کے ہمیرانہ الفاظ

اس موقع پر اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہیں کہ حیدرآباد کے سلسلہ میں ہماری پالیسی وہی رہی جس کی تشکیل انڈین یونین سول سروس کے ایک ممتاز رکن نے ۱۹۲۶ء میں کی تھی، ہماری مراد حیدرآباد کے برطانوی ریذیڈنٹ، سر ولیم بارٹن (Sir William Barton) کے میمورنڈم سے ہے۔ انھوں نے لکھا تھا، !

"اس میں کوئی شبہ نہیں حیدرآباد کا وجود برطانیہ کا رہین منت ہے، حقیقت یہ ہے کہ آصفیہ خاندان ہمیشہ سے بدیسی سمجھا جاتا رہا ہے، اگر انگریز نہ ہوں تو صرف مٹھی بھر مسلمانوں پر، ریاست کو تکیہ کرنا پڑے گا،

موجودہ نظام چاہتے ہیں کہ ۱۷۹۸ء سے پہلے والی صورت قائم ہو جائے، اگر ایسا ہو تو ہندو ریاست کا صفایا کر دیں گے، بجز اس صورت کے کہ برطانوی حکومت ریاست حیدرآباد کو باہر سے سازو سامان جنگ منگانے کی اجازت دے، لیکن اس صورت میں کیا، ہندو رعایا کے ہم مذہب، بمبئی، مدراس، اور سی پی کے باشندے خاموشی سے بیٹھے ہندوؤں کا قتل عام دیکھتے رہیں گے ؟ ایسی صورت میں برطانوی حکومت کو لامحالہ دخل دینا پڑے گا، بہرحال یہ بات ناممکن ہے۔ خواہ کوئی معاہدہ ہو یا نہ ہو کہ برطانوی حکومت حیدرآباد میں ایک مطلق العنان حکومت کا وجود برداشت کرے ___ !"

سر ولیم بارٹن کے ہمیرانہ الفاظ اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اس ایجی ٹیشن کا سبب ثابت ہوئے، جو ریاست کو ختم کر دینے کے سلسلہ میں شروع ہو چکا ہے !!

تصویر کا دوسرا رخ

حیدر آباد کی خونی داستان

قریب ہے یار، روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آستیں کا!

حیدرآباد کی خونی داستان

مسٹر منشی کی داستان، اور مسٹر وی پی مینن کا بیان پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حکومت ہند کا پولیس ایکشن ایک سرتاپا مشفقانہ اقدام تھا، نہ حیدرآباد کے باشندوں پر کسی طرح کی زیادتی روا رکھی گئی، نہ وہاں کے مسلمانوں کو کشتۂ تیغ ستم بنایا گیا، نہ ان کی دولت لوٹی گئی، نہ آبرو پر ڈاکہ ڈالا گیا، نہ انھیں ذلیل کیا گیا، نہ ان کے ساتھ غیر شریفانہ برتاؤ کیا گیا، نہ انھیں ہدف انتقام بنایا گیا، نہ ان کی جائداد و املاک پر غارت گری کی گئی، نہ ان کی ملازمتیں چھینی گئیں۔ نہ ان کے کاروبار کو تالا لگایا گیا غرض پولیس ایکشن کیا تھا، نسیم صبح گاہی کا خرام روح پرور تھا، جس سے دل کی کلی کھل گئی، اور جس کی شمیم آرائیوں سے مشام جان معطر ہو گیا۔

لیکن حیدرآباد کے کشتگان ستم میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنے سپہ سالار کی غداریاں۔ اپنے ارباب حکومت کی خود غرضیاں، دشمن کی یورش اور یلغار کا دل خراش اور جاں سوز منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، کیا حرج ہے اگر، مینن اور منشی کی نغمہ سرائیوں اور زمزمہ سنجیوں کے ساتھ ان گرفتاران بلائے بکاو شیون، آہ جگر فگار اور نالہ بے اختیار کے لیے بھی سماعت کے دروازے کھول دیے جائیں،؟

اس کا فیصلہ مستقبل کا مورخ کرے گا کہ حق پر کون تھا، اور باطل کو کس نے اپنا شعار بنایا تھا،؟ ظالم کون تھا اور مظلوم کون تھا؟ لیکن قبل اس کے کہ فیصلہ صادر ہو، مقدمے کا غذات

تو مکمل ہو جائیں، جن دستاویزوں پر مقدمہ کا فیصلہ ہو سکتا ہے وہ تو مرتب کر لی جائیں، جو مسلیں واقعات وحقائق کا گنجینہ ہیں انھیں سمیٹ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

حیدر آباد کی خونیں داستان ایک حیدر آبادی نے پولیس ایکشن کی تباہ کاریوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد قلمبند کی تھی جسے اردو اکیڈمی سندھ (کراچی) نے شائع کیا تھا، اس کے بعض مندرجات ایسے ہیں، جنھیں اگر نظر انداز کر دیا جائے تو داستان نامکمل رہے گی،

فوجی یلغار سے پہلے

حیدر آباد پر، حکومت ہند نے فوجی یلغار سے پہلے، وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے جو ایک سامراجی حکومت، ایک کمزور ملک پر غاصبانہ قبضہ اور تسلط سے پہلے بروئے کار لایا کرتی ہے، اس نے انسانیت کا لحاظ کیے بغیر، اہنسا کی تعلیم فراموش کر کے، "دشمن" کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دینے کے سلسلہ میں ان جملہ وسائل و ذرائع سے کام لیا جو اس کے قبضہ میں تھے، چنانچہ سب سے پہلے اس نے عملی طور پر اس معاہدۂ قائمہ کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھیریں، جس پر صداقت، دیانت دوستی اور اصول پروری کا قلم ہاتھ میں لے کر دستخط کیے تھے، جس کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے التجائیں کی تھیں جس کے لیے نہرو نے آرزوئیں کی تھیں، جس کے لئے سردار پٹیل نے بے لچک ہونے کے باوجود لچک کا مظاہرہ کیا تھا، جس پر منشی اور مینن نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی تھی کہ آخر کار۔

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، !

معاہدۂ قائمہ کی خلاف ورزیوں کا ایک نمونہ:۔

انڈین یونین نے معاہدۂ انتظامات جاریہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حیدر آبادیوں پر ظلم و استبداد کے تمام وہ طریقے اختیار کیے جو اس سے ممکن ہو سکتے تھے۔ اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حیدر آباد کی سرحدوں پر انڈین یونین نے اپنی فوجیں جمع کرنی شروع کیں، جنھوں نے بالآخر حدود حیدر آباد میں داخل ہو کر حیدر آبادیوں پر مظالم کرنا شروع کر دیا۔

۲- معاہدہ کے مطابق اسلحہ کی فراہمی کی شرط پوری نہ کی۔

۳- پنڈت نہرو اور سردار پٹیل نے کھلم کھلا جنگ کی دھمکیاں دینی شروع کیں اور نظام اور رضوی کو چیلنج پر چیلنج دینے لگے کہ یا تو وہ یونین کی غلامی قبول کریں یا جنگ پر آمادہ ہوں۔

۴- حیدرآباد کے وقار کو گرانے کے لئے اور دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے بجائے جنگ کے پولس ایکشن کا نام لے کر جنگ شروع کر دی۔

۵- حیدرآباد کی سخت ترین معاشی ناکہ بندی شروع کر دی گئی۔ پنڈت نہرو نے اپنے بیانات سے گو اس میں شدت بھی پیدا کر دی جس کی وجہ سے :-

(الف) حمل و نقل کو مفلوج کرنے کی خاطر پٹرول اور کروڈ آئل کی فراہمی کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔

(ب) کلورین کی فراہمی بھی بند کر دی گئی۔ جس کی وجہ سے حیدرآباد کے مختلف شہروں میں مرض ہیضہ شدت سے پھوٹ پڑا اور ہزاروں بے گناہ افراد اس کے ظلم و ستم کا شکار ہو گئے۔

(ج) عام طور پر ادویہ کی سپلائی روک دی گئی، جس کی وجہ سے تمام امراض میں اضافہ ہوا اور اکثر جانیں ضائع ہو گئیں۔

(د) روزمرہ کی ضروریات زندگی کی شدید ناکہ بندی کی گئی، تاکہ حیدرآباد کے معاشی نظام کو درہم برہم کر دیا جائے۔ اور عوام میں ہراسانی پیدا ہو۔

(س) اشیائے خوردنی اور پارچہ کو بھی روک دیا گیا۔ جس کی وجہ سے عوام کو اور زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

تخریبی سرگرمیاں

پولیس ایکشن کو بروئے کار لانے سے پہلے، انڈین یونین نے اپنے آدمیوں، اور کارکنوں کا جال ساری ریاست میں بچھا دیا تھا کہ وہ عوام میں گھل مل کر، خواص سے رابطہ پیدا کر کے سبب حکومت کی نظر سے پوشیدہ رہ کر، دیہاتوں میں جا کر، شہروں میں رہ کر، ہندوؤں اور مسلمانوں میں، افتراق اور بیگانگی، بلکہ نفرت اور عداوت

کا جذبہ ابھار کر، کہیں دوست بنکر، کہیں دشمن کے روپ میں، جلتی تباہیاں اور بربادیاں پھیلا سکتے ہیں پھیلائیں تاکہ عوام کا حوصلہ پست ہو، حکومت کا عزم متزلزل ہو، نظم دامن تباہ ہو، حکومت کا استحکام اور وقار خطرے میں پڑ جائے، اور غیر ممالک کے لوگوں کی نظر میں اسے زیادہ سے زیادہ نااہل ثابت کیا جائے۔

چنانچہ:-

"ہر قسم کے تخریبی اعمال کو انڈین یونین نے اپنے کانگرسی مہاسبھائی اور سوشلسٹ ایجنٹوں کے ذریعہ روا رکھا، مثلاً:"

(الف) خفیہ طور پر مندرجہ بالا جماعتوں کو بالخصوص سوشلسٹ جماعت کے کارندوں کو انڈین یونین کی جانب سے جدید ترین اسلحہ فراہم کیے جاتے رہے۔ جن کا مقصد مسلمان کشی اور دہشت انگیزی تھا۔ تا این کہ خود نظام پر فوجی قسم کے بموں سے حملہ کیا گیا۔ جو انڈین یونین کے فراہمی اسلحہ کا بین ثبوت ہے۔

(ب) ان جماعتوں نے منظم طور پر ایک جانب مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا تو دوسری طرف ریل کی پٹریوں کو اکھیڑنا، ڈاک خانوں کو جلانا، پولس کے تھانوں کو برباد کرنا، چنگی کی چوکیوں کو جلانا، آبکاری کے دفاتر کو نقصان پہنچانا اور راہ گیروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ ان تمام امور کی توثیق خود اسٹیٹ کانگریس کے ایک ذمہ دار رکن مادھا پتی رام چندر راؤ کا وہ بیان ہے جو کہ حیدرآباد پر قبضہ کے بعد وہاں کے مقامی اخباروں میں نہایت دلیری کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس بیان میں بہ صراحت ہے کہ اتنی تعداد میں تھانے جلائے گئے۔ اتنی تعداد میں چونگی کی چوکیاں برباد کی گئیں۔ اور اتنی ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں وغیرہ۔

(ج) اسٹیٹ کانگریس نے انڈین یونین کی ایماء و ہمت افزائی سے حیدرآباد کی سرحدوں پر حیدرآباد کے شرپسند ہندوؤں کو اکسا اکسا کر اس قسم کی تباہ کاریوں پر آمادہ کیا، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اسٹیٹ کانگریس کے ان آلہ کار شر انگیز افراد کی تعداد کئی ہزار بتلائی گئی ہے۔ گویا مجلس کے رضاکار تعمیری مقاصد رکھتے تھے۔ تو کانگریس کے کارکن تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھے اور حکومت ہندستان کو مسلسل ہتھیار اور گولہ بارود فراہم کر رہی تھی، اسٹیٹ کانگریس کا ایک گروہ

ایسا بھی تھا جو کمیونسٹوں کے روپ میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کر رہا تھا۔

(ح) اسٹیٹ کانگریس کے ذریعہ انڈین یونین نے حیدرآباد کے بعض تعلیم یافتہ افراد سے بھی تخریبی اعمال کو جاری رکھنے کا کام لیا چنانچہ بعض سرکاری عہدہ داروں کا رخصت لے کر گھر بیٹھ جانا اور بعض کا حیدرآباد چھوڑ کر سرحدات اور انڈین یونین کے علاقہ میں پانچویں کالم کی حیثیت سے داخل ہو جانا، نیز ہندو وکیلوں کا عدالت سے بائیکاٹ کر کے اہل معاملہ کو پریشان کرنا۔ ڈاکٹروں کا دواخانے بند کر کے مریضوں کو سخت اذیت دینا۔ تجار کا کاروبار چھوڑ کر ملک کی تجارت پر اثر انداز ہونا، ہندو جاگیرداروں و معاش داروں کا گاؤں کو کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ کر رعایا کو پریشانی کے عالم میں چھوڑ دینا اس تخریبی سازش کا ثبوت ہے۔"

چھیڑ چھاڑ کا آغاز

شاید یہ دیکھنے کے لئے کہ کون کتنے پانی میں ہے، فوجی شورش سے پہلے حکومت ہند کے فوجی دستوں نے چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ شروع کر دیا، اگر حکومت حیدرآباد جنگ پر تلی ہوتی تو اس سے بہتر موقع جنگ شروع کر دینے کا اور کون میسر آسکتا تھا، لیکن نہ صرف یہ کہ وہ جنگ پر تلی ہوئی نہیں تھی، بلکہ جنگ کے لیے تیار بھی نہیں تھی، اور جنگ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی، "تلی ہوئی اس لئے نہیں تھی کہ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ کیا ؟ جنگ کرنے کے لئے تیار اس لئے نہیں تھی کہ اس کے پاس وہ وسائل و ذرائع نہیں تھے جو جنگ کے لئے ناگزیر ہیں ، اور جنگ کرنا اس لئے نہیں چاہتی تھی کہ اچھی طرح جنگ کی ہولناکیوں اور اس کے شدائد و مصائب اور نتائج سے واقف تھی، لہٰذا انھوں نے زیادہ سے زیادہ صلح پسندی اور آشتی کا مظاہرہ کیا، البتہ احتجاج ضرور کرتی رہی، "۔

لائق علی وزارت نے اس تمام عرصہ میں کسی نہ کسی قسم کے مستقل معاہدہ کی ہر کوشش کر ڈالی اور انڈین یونین کے دباؤ کا جواب دینے کے بجائے اس کو برداشت کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ برداشت کی یہ انتہا تھی کہ جب انڈین یونین نے سرحدات پر اپنی فوجوں کو حدود حیدرآباد میں داخل ہونے کے احکام دے دیے تو حیدرآباد نے بجائے جوابی کارروائی کے اپنی فوجوں کو حدود سے تین اور پانچ پانچ میل اندر ہٹ جانے کی ہدایت کی تاکہ مقابل جماعت حیدرآباد

کا کچھ تو پاس ولحاظ کرے اور حیدرآبادیوں پر انسانیت سوز مظالم توڑنے کے بجائے ان کے جذبۂ آزادی کا کچھ تو احترام کرے حکومت حیدرآباد نے نہ صرف اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹا لیا بلکہ جو ظلم و زیادتی انڈین یونین کی فوجوں اور تخریبی جماعتوں نے حیدرآباد کے دیہاتی مسلمانوں اور پست اقوام پر روا رکھی تھی، ان کو بھی برداشت کیا اور سوائے انڈین یونین سے احتجاج کے اور کوئی کارروائی نہیں کی۔

حیدرآباد کی فریاد

انڈین یونین کی دراز دستیاں جاری رہیں، ہندوستانی فوج کی چھیڑ چھاڑ اور جارحانہ سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا رہا، حیدرآباد میں انڈین یونین کے کارکن، پوشیدہ اور علانیہ طور پر تخریبی کارروائیوں میں منہمک رہے، حیدرآباد کی اقتصادی ناکہ بندی کا سلسلہ سنگین سے سنگین تر صورت اختیار کرتا رہا، نہرو اور پٹیل کی دھمکیاں زیادہ گھن گرج کے ساتھ گونجنے لگیں، منشی نے باقاعدہ الحاق کا مطالبہ شروع کر دیا۔ مینن تو الٹی میٹم تک پر اتر آئے۔

اب حیدرآباد کے لئے اس کے سوا کیا چارۂ کار تھا کہ وہ فریاد کناں مجلس اقوام متحدہ کے حضور میں حاضر ہو، اور اپنا کیس پیش کرے، چنانچہ اس نے یہی کیا، لیکن یہ کام کس طرح ہوا؟ اور انڈین یونین نے کیونکر اس راستے میں پتھر بچھائے یہ داستان بھی سن لیجئے!

"لائق علی وزارت نے مفاہمت کی ہر ممکن کوشش سے مایوس ہو کر بالآخر معاہدۂ انتظامات جاریہ کے مطابق جملہ نزاعی مسائل کو طے کرنے کیلئے ثالث مقرر کرنے کا بار بار مطالبہ کیا اور استصواب عامہ کے ذریعہ آخری فیصلہ کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔ لیکن انڈین یونین نے ہر بار ایسی تمام تجاویز کو بھی ٹھکرا دیا اور حیدرآباد کو مجبور کر دیا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی عدالت کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کیا انڈین یونین کو حیدرآباد کی آزادی سلب کرنے کا اختیار حاصل ہے و نیز یہ کہ کیا اس ظلم و زیادتی کو روا رکھا جا سکتا ہے۔ کہ ایک طاقتور حکومت دوسرے کمزور ملک کو اپنی قوت کے زور سے ہضم کرے اور دنیا میں اقوام متحدہ کی کونسل کے موجود ہوتے ہوئے بھی اس ظلم کو روا رکھا جائے۔ اگرچہ حیدرآباد کو اس امر کا اندازہ تھا کہ حیدرآباد کے اس باہمت قدم کے اٹھاتے ہی انڈین یونین چراغ پا ہو جائے گی اور حیدرآباد کی آزادی کو ختم کرنے کی تدابیر کو بہ عجلت ممکنہ اختیار کرنے لگے گی، مگر ہند یونین کے ظالمانہ طرز عمل نے حیدرآباد کو اقوام متحدہ سے رجوع ہونے پر مجبور کر دیا، چنانچہ باقاعدہ طور پر حیدرآباد کے مقدمہ کو تیار کیا گیا۔ اس فیصلہ کے بعد

بھی حیدرآباد نے مصالحت کی کوشش جاری رکھی اور گورنر جنرل ہندوستان سے نظام اور حکومت حیدرآباد کی مفاہمانہ گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن حکومت ہند کسی طرح بھی مفاہمت پر آمادہ نہ تھی۔ صیانتی کونسل میں حیدرآبادی وفد کے پیرس جانے کے لئے انڈین یونین سے سفر کی سہولتیں جن کو مسدود کر دیا گیا تھا طلب کی گئیں۔ لیکن اس کا جواب نفی میں ملا۔ اور کسی ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اس صورت میں اگر یہ وفد انڈین یونین کے علاقوں سے گزرتا تو یا تو اراکین وفد کو گرفتار کر لیا جاتا یا کم از کم ان سے ضروری کاغذات لے لئے جاتے جس کا مظاہرہ انڈین یونین نظام کے خط اور دیگر ضروری دستاویزات کے سلسلہ میں کر چکی تھی جو شہنشاہ انگلستان وغیرہ کو لکھے گئے تھے۔ مسٹر بوماؤنٹ جو سر والٹر مانکٹن اٹورنی جنرل کے سکریٹری کی حیثیت سے یہ خط اور ضروری کاغذات انگلستان لے جا رہے تھے ان کا بیان اس سلسلہ میں خود ان واقعات کا شاہد ہے۔ لہذا حیدرآباد کا یہ وفد دیگر ریاستوں سے یکے بعد دیگرے چھپ چھپا کر پیرس پہنچنے لگا۔ ہر متنفس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی آزاد زندگی کے ہر سہارے ہر آسرے کو ڈھونڈے اور اپنی بقا کی حتی الامکان کوشش کرے۔ چنانچہ یہی صورتِ حال حیدرآباد کی بھی تھی۔ جس کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے حکومت حیدرآباد نے اب ہر جائز کوشش شروع کی اور اسی اصول کے پیش نظر حکومت حیدرآباد نے اپنے نمائندوں کو مختلف ذرائع سے دنیا کے مختلف حصوں میں آزاد حکومتوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے بھیجنا شروع کیا تاکہ اقوام عالم کو بھی صحیح واقعات کا علم ہو اور انڈین یونین نے جو جابرانہ طرزِ عمل حیدرآباد کے ساتھ روا رکھا ہے اور جس ناجائز طریقے سے وہ حیدرآباد کی آزادی کو چھین لینے پر تلی ہوئی ہے۔ اس کا وہ بخوبی اندازہ کر سکیں۔ انڈین یونین کے یہ اعتراضات کہ یہ تمام امور معاہدۂ انتظامات جاریہ کے خلاف تھے۔ بالکل مہمل ہو کر رہ جاتے ہیں جب کہ خود انڈین یونین نے اس معاہدہ کی تکمیل نہیں کی۔ حیدرآباد کے جذبہ آزادی کا اعتراف نہیں کیا۔ اور عملی طور پر خود معاہدہ کی خلاف ورزیاں کیں۔ حتیٰ ایں کہ معاہدہ کے اختتام سے پہلے ہی حیدرآباد پر فوجی حملہ بھی کر دیا۔“

جنگ بغیر اعلان جنگ کے

اور ایک روز دفعتہً یہ معلوم ہوا کہ حکومت ہند کی فوج ظفر موج حیدرآباد کی طرف بڑھ رہی ہے، اس کے طیارے

فضائے حیدر آباد پر منڈلانے لگے، اس کے ٹینک زمین کا سینہ چیرتے ہوئے حدود حیدر
آباد میں داخل ہونے لگے، اس کی بکتر بند گاڑیاں ہر اصول، ہر ضابطہ ہر قانون کی خلاف ورزی
کرتی ہوئی سرزمین حیدر آباد کو پامال کرتی، روندتی یلغار کرنے لگیں، اس کے سپاہی، تمام جدید
اسلحہ سے مسلح ہو کر مہتوں، کمزوروں، حریت خواہوں کا گلا گھونٹنے، ان کی عورتوں کو بے آبرو
کرنے اور انھیں غلام بنانے کے لئے، سیل رواں کی طرح بڑھنے لگے، !

یہ وہ لوگ تھے جو ابھی ابھی آزاد ہوئے تھے،

اور ان لوگوں نے جو ابھی ابھی آزاد ہوئے تھے، اور دوسروں کو غلام بنانے کے لئے دست و بازو
کی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہر طرح آمادہ اور مستعد نظر آرہے تھے، ان عام
اصولوں کی پرواہ بھی نہیں کی، جو ہر دشمن، ہر دشمن کے ساتھ روا رکھنا ہے قاعدہ ہے کہ جب
کسی ملک یا قوم پر حملہ کیا جاتا ہے تو پہلے اسے ایک مختصر سی مہلت دی جاتی ہے کہ اس
اثناء میں اگر سر تسلیم خم کردو تو بہتر ہے، پھر اعلان جنگ کیا جاتا ہے پھر حملہ کیا جاتا ہے، لیکن
ان ابتدائی اور معمولی اصولوں کا بھی خیال نہیں رکھا گیا، دشمن کمزور تھا، اس کا کوئی حامی اور ساتھی
معین و ناصر، یار و مددگار موجود نہ تھا، پھر کیا ضرورت تھی ان رسمیات پر عمل کرنے کی، ؟ :—

* ۱۳- ستمبر ۱۹۴۸ء کی وہ غم انگیز اور المناک صبح تھی جب کہ حیدر آباد کے عام و خاص
برِعظم ہند کی عظیم المرتبت شخصیت، بانی پاکستان اور مسلمانوں کے محبوب ترین قائد مسٹر محمد علی جناح
مرحوم و مغفور کا سوگ منانے کے لئے کثیر تعداد میں جمع ہوئے تھے، ابھی اس سوگ کی کارروائی
بھی مکمل نہ ہونے پائی تھی اور مسلمانوں کے آنسو بھی خشک نہ ہونے پائے تھے کہ اسی اجتماع میں
مجاہد ملت مولوی سید محمد قاسم رضوی صاحب نے عوام کو یہ خبر دہشت اثر سنائی کہ اسی صبح
کو ۴ ½ بجے انڈین یونین نے حیدر آباد پر اپنی پوری قوت کے ساتھ باقاعدہ طور پر فوجی حملہ
کر دیا ہے۔ اور ورنگل، بیدر اور عادل آباد کے ہوائی اڈوں پر دشمن نے تباہ کن بمباری کی ہے۔
حیدر آباد کے لئے یہ خبر اس لئے اور بھی زیادہ حیرت ناک تھی کہ انڈین یونین نے بین الاقوامی
اصولوں کے خلاف حکومت حیدر آباد کو پہلے سے کوئی اطلاع دیئے بغیر حملہ کر دیا۔ انڈین یونین
کے ایجنٹ جنرل مسٹر منشی نے بھی اس فوج کشی کی اطلاع حکومت حیدر آباد کو پورے سات

گھنٹے کی تباہ کاریوں کے بعد دی۔

غلامی کی زندگی یا آزادی کی موت

بلا شبہ یہ بڑی کٹھن گھڑی تھی، بڑا نازک وقت تھا، حریف نے اچانک اور بھرپور وار کیا تھا، اور اس وار نے دہشت اور سراسیمگی بھی پیدا کردی تھی،

لیکن انہی دہشت زدہ اور سراسیمہ لوگوں میں وہ اصحاب عزیمت بھی تھے، جو ہر قیمت پر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے، جو غلامی کی زندگی پر آزادی کی موت کو ترجیح دیتے تھے، لیکن جن کے دل جوش جہاد سے معمور تھے، اب تک جن کی ساری سرگرمیاں صرف ایک ہی مقصد کے لئے وقف رہی تھیں، یعنی حریت و استقلال، انھوں نے عہد کیا تھا کہ خون بہا کر، جان دے کر، گردن کٹا کر یہ مقصد حاصل کیا جائے، :—

* مجاہد ملت سید محمد قاسم رضوی صاحب نے مجاہدین حیدرآباد کو اس موقع پر نہایت درد ناک لہجہ میں مخاطب فرمایا اور رو رو کر کہا کہ مجاہدو! آج دشمن تمہارے ملک میں گھس آیا ہے۔ تمہارے ملک و قوم کی عزت و ناموس خطرے میں پڑ چکی ہے۔ جس کے تم امین ہو اس امانت کی حفاظت تمہارا اولین فرض ہے، بہادرو! آج سارے ملک کی نظریں تم پر لگی ہوئی ہیں۔ بہادر بنو، شجاعت دکھاؤ، آگے بڑھو، ہمت سے کام لو اور ملک کی حفاظت اور اپنی آزادی کے لئے تن من، دھن کی بازی لگادو۔ رضاکارو! تم دلبر بنو، درندے نہ بنو، بہادر بنو، خونخوار نہ بنو، محافظ بنو۔ غاصب نہ بنو اور ظلم و تشدد کی سرکوبی کرو۔ مظلوم کی حفاظت و اعانت کرنا اپنا فرض سمجھ لو۔ اپنی تمام تر قوتوں اور صلاحیتوں کو ملک و قوم کی حفاظت کے لئے صرف کردو۔ مسلمان اور ہندو کا علیٰحدہ علیحدہ تصور تمہارے ذہنوں میں نہ آئے۔ ہر حالت میں ہر شخص کی امداد و حفاظت تمہارا فرض ہونا چاہیے۔

مجاہدو! مجھے معلوم ہے کہ تم بے بس و بے کس ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس اسلحہ نہیں ہے۔ میں اس سے بھی واقف ہوں کہ محاذ جنگ پر تمہاری آسائش و آرام کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ تمہارا کوئی سرپرست نہیں ہے۔ سوائے اللہ کے جو سارے عالم کا مالک و مختار ہے۔ لہٰذا میں تم کو اسی مالک کے سپرد کرتا ہوں اور اللہ کی

راہ میں قربانی کی تم سے بھیک مانگتا ہوں۔

عزیزو! اللہ کی راہ میں میدان جنگ میں پہونچکر میں تمہارے سینوں کو چھلنی ہوتے دیکھوں گا ٹینکوں کے نیچے تم کو کچلتے ہوئے دیکھنا پسند کروں گا۔ تم کو بغیر ہتھیار کے لڑتا اور بچھڑتا دیکھوں گا۔ تم کو بھوک پیاس سے تڑپتا دیکھنا گوارا کروں گا لیکن کسی حالت میں تم کو بزدل، کمزور اور ناکام ہوتے دیکھنا برداشت نہ کروں گا۔ لہذا میں ان تمام کوتاہیوں کے باوجود اب یہ ہدایت کرتا ہوں کہ تم اس میدان سے سیدھے محاذِ جنگ پر روانہ ہونا نہ کہ اپنے گھروں کو، تاکہ اعزہ واقارب سے ملکر تمہارے ارادے نہ بدل جائیں اور تمہارے عزم وارادہ کو ٹھیس نہ لگ جائے تم اپنے اعلیٰ کردار سے دنیا کو یہ ثابت کر دکھانا کہ تمہارے لئے دنیا میں ایک ہی چیز عزیز ہے اور وہ ہے غلامی کی زندگی سے آزادی کی موت جس کا تم بار بار اعادہ کر چکے ہو۔"

رضاکار فوج میں شامل ہو گئے

اب تک رضاکار جماعت ایک قومی تنظیم تھی۔ جس کا کوئی باقاعدہ تعلق حکومت یا فوج سے نہ تھا، لیکن اب کہ جنگ چھڑ چکی تھی، انڈین یونین کی فوجیں یلغار کرتی ہوئی حدود حیدرآباد میں داخل ہو چکی تھیں، اب اس تنظیم کو الگ تھلگ رہنے کا کوئی حق نہیں تھا، اب وقت آگیا تھا کہ یہ جماعت فوج کا ایک حصہ بن جائے، اور میدان جنگ میں داد شجاعت دے، اور آخر وقت تک سامراجی افواج کا مقابلہ کرے چنانچہ:۔

"اس تقریر کے بعد ہی مجاہد ملت نے یہ اعلان فرمایا کہ جس موقع کے لئے تنظیم کی تیزی کے ساتھ تجدید کی گئی تھی وہ نازک وقت آن پہنچا ہے۔ اور اب اس تنظیم کو مجموعی طور پر اور اس تنظیم کے ہر فرد کو حکومتی فوجی حکام کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ جو رضاکاروں کو بطور امدادی فوج (AUXILLART FORCE) کے استعمال کریں گے۔ چنانچہ مجاہد ملت کی مخاطبت کے بعد علاوہ ان تمام بے شمار رضاکاروں کے جو وہاں موجود تھے۔ ہر گھر کا بچہ بچہ رضاکار بنکر اپنے والدین کی مرضی کے بغیر بھی اپنے ملک کی مدافعت کے لئے نکل کھڑا ہوا اور محاذِ جنگ پر پہنچنے کے لئے بیتاب نظر آیا اور غیر متوقع طور پر کثیر تعداد میں عوام جنگی ہیڈ کوارٹر پر جمع ہو گئے۔"

لیکن ۔۔۔ ۔۔۔

لیکن بہت جلد رضاکاروں کا جوش سرد پڑ گیا۔ انھیں معلوم ہوگیا کہ باہر سے آنے والا دشمن تو بعد میں پہنچے گا، ایک خوفناک اور زبردست دشمن خود گھر میں موجود ہے، باہر کے دشمن سے تو ممکن ہے کسی طرح گلو خلاصی ہو ہی جائے، لیکن اس دشمن سے جو گھر میں دوست بنا بیٹھا تھا کسی طرح بھی جان نہیں بچ سکتی، :—

"مجلس کی اعلیٰ کمان سے یہ حکم ملا تھا کہ چونکہ رضاکاروں کے پاس خود کوئی ہتھیار نہ تھے اور اب جب کہ وہ حکومتی افواج کا ایک جزو قرار دیے جا چکے ہیں۔ اس لئے جملہ رضاکار سرکاری فوجی مرکز پر جمع ہوں گے۔ اور وہاں سے کمانڈر ان کو اسلحہ فراہم کر کے بلحاظ ضرورت محاذوں پر روانہ کریں گے لیکن رضاکاروں کو سب سے پہلے مایوسی یہیں سے شروع ہوئی۔ باوجود مختلف محاذوں پر دشمن کے حملے شروع ہو جانے کے اور دشمن کے آگے بڑھتے چلے آنے کے اوّل تو فوجی ہیڈکوارٹر سے رضاکاروں کی روانگی میں غیر معمولی تاخیر کی جانے لگی۔ دوسرے یہ کہ جو تعداد رضاکاروں کی کسی خاص محاذ کے لئے تجویز کی جاتی تھی۔ ان میں سے صرف چند کو روک کر باقی کو واپس چلے جانے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اور تیسرے یہ کہ جن رضاکاروں کو محاذ پر روانہ کیا جاتا ان کو حسب تصفیہ اعلیٰ کمان بجائے ہتھیار دے کر روانہ کرنے کے یہ کہہ کر نہتا روانہ کر دیا جاتا کہ محاذ پر پہنچنے کے بعد ان کو ہتھیار فراہم کر دیے جائیں گے۔ اور جب یہ لوگ محاذوں پر پہنچتے تو معلوم ہوتا کہ ان کو تو کجا، جن چند فوجیوں کو وہاں بھیجا گیا تھا۔ خود ان کو بھی اسلحہ فراہم نہیں کئے گئے۔"

فوج کو واپسی کا حکم

حیدرآبادی فوج کے سپہ سالار اعلیٰ العیدروس کے بارے میں منشی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی تصدیق حیدرآباد کی خونیں داستان سے بھی ہو جاتی ہے، اس شخص نے کسی ایک مورچہ پر کبھی اپنی فوجوں کو نہیں لڑایا، بلکہ لڑنے کے بجائے انھیں واپس آنے کا حکم دے دیا، :—

"۱۳۔ ستمبر کو دشمن نے حملہ شروع کیا۔ اور ۱۴۔ ستمبر سے حیدرآبادی افواج کو کمانڈر العیدروس کی جانب سے اپنے فوجی اور اسلحہ بچا کر واپسی کے احکام دے دیے گئے۔ اور یہ بھی

تاکید کردی گئی کہ دشمن کے حملوں کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ بلکہ خاموشی اور بچاؤ کے ساتھ
واپسی اختیار کی جائے۔ گویا جو تھوڑی سی بہت فوجیں دکھاؤ کے لئے محاذوں پر روانہ کی گئی تھیں
ان کی زندگی بھی خطرہ میں پڑ چکی تھی۔ جن حالات میں افواج کو واپسی کے حکم پر لبیک کہنا پڑا ہے۔
ان کی داستان صرف وہی لوگ سنا سکتے ہیں۔ جنہوں نے افواج کی کمان سنبھالنے کا ذمہ لیا تھا۔
سینکڑوں میل چھپ چھپا کر، ہوائی حملوں سے بچتے ہوئے ٹینکوں کی زد سے اپنے آپ کو محفوظ
کرتے ہوئے اور انڈین یونین کی خونخوار افواج کے تعاقب سے خود کو سنبھالتے ہوئے کس طرح
یہ لوگ حیدرآباد تک پہنچ سکے۔ یہ خود ایک طویل داستان ہے۔"

سازش اور غداری کا جال

حیدرآبادی افواج کے سپہ سالارِ اعلیٰ العیدروس
نے محاذِ جنگ پر کیسے دقیع، یادگار اور ناقابل
فراموش کارنامے انجام دیے، یہ تاریخِ حیدرآباد کا ایک بہت اہم باب ہے، ضروری
ہے کہ اسے بھی پیش نظر رکھا جائے ۔!——

جن محاذوں پر حیدرآبادی افواج اور رضاکار روانہ کیے گئے تھے۔ ان محاذوں پر دشمن
کے ہوائی جہازوں کے مقابلہ کے لئے نہ اینٹی ایر کرافٹ گنیں تھیں۔ نہ ٹینکوں کے لئے اینٹی ٹینک
گنیں فراہم کی گئی تھیں۔ نہ بکتر بند گاڑیوں کے لئے اینٹی بکتر شکن گاڑیاں روانہ کی گئیں اور نہ پیدل مسلح
افواج سے لڑنے کے لئے ہماری فوجوں اور رضاکاروں کو کوئی ہتھیار فراہم کئے گئے تھے۔ گویا
سازش اور غداری کا ایک جال تھا جو سرزمین حیدرآباد میں بچھا ہوا تھا اور محاذِ جنگ پر یہ
راز خود بخود کھلتا جا رہا تھا اور دشمن نہایت تیزی کے ساتھ بلا روک ٹوک آگے بڑھتا چلا آ
رہا تھا۔ بغیر کسی مقاومت کے حیدرآبادی افواج کا پیچھے ہٹتے چلے آنا اور سرعت کے ساتھ انڈین
یونین کی افواج کا آگے بڑھتے چلے آنا یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا تھا کہ حیدرآباد پر قبضہ کے
انتظامات قبل از وقت ہی ہو چکے تھے۔ لیکن ادھر صیانتی کونسل میں حیدرآباد کا مسئلہ بھی پیش
ہو چکا تھا اور حیدرآباد کے مقدمہ کی سماعت کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی جس میں بہت ممکن تھا
کہ سلامتی کونسل انڈین یونین کو لڑائی بند کرنے اور ہندوستانی افواج کو واپس بلا لینے کا حکم دے
دیتی، مگر انڈین یونین اور غداران ملک جس میں العیدروس مرزا اسمٰعیل، زین یار جنگ اور دین یار جنگ شامل

تھے۔ صیانتی کونسل کے تصفیہ کے اعلان سے قبل ہی حیدرآباد کی وحدت اور اس کی سیاسی اہمیت کو ختم کردینا چاہتے تھے۔ تاکہ حیدرآباد کا مقدمہ صیانتی کونسل میں زیر بحث ہی نہ آسکے اور یہ مسئلہ صیانتی کونسل کے اختیار سے باہر نکل جائے۔ ان تمام غداریوں کے باوجود رضاکاروں اور پٹھانوں نے جو مجلس کی طرف سے محاذوں پہ فداکارانہ خدمات انجام دے رہے تھے، کسی قسم کی فوجی امداد اور ہتھیار کی عدم موجودگی کے جو کچھ بھی اسلحہ مثلاً لٹھ، تلوار بھرمار بندوق یا برچھوں کے جوان کو میسر تھے۔ جہاں کہیں بھی دشمن سے مقابلہ کیا، نہایت جانفشانی اور بہادری سے آخر دم تک پیچھے نہیں ہٹے۔ بلکہ جانبازی اور جواں مردی کی ایسی مثالیں پیش کیں، جن کو تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔"

لیکن یہ سرفروش ——؟

ہاں العیدروس نے غداری کی، پرنس آف برار نے دھوکا دیا، نظام نے اپنے ملک اور قوم اور رعایا کا ساتھ نہ دیا، لیکن اس سرزمین پر کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھوں نے سرفروشی، فداکاری اور جاں نثاری کا ریکارڈ قائم کردیا، جو مٹ گئے لیکن امر ہوگئے،" ؎

(۱) اکثر رضاکاروں نے دشمن کی فوجوں کے قریب پہونچ کر اپنی معمولی بھرمار بندوقوں سے مقابلہ کیا جو دشمن کی اعلیٰ درجہ کی رائفلوں کے سامنے ہیچ تھیں اور بالآخر لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا۔

(۲) ہزاروں کی تعداد میں رضاکار ٹینکوں کے سامنے لیٹ لیٹ کر قربان ہوگئے کہ شاید ان کی قربانی سے ٹینک بے کار ہوجائیں۔

(۳) سینکڑوں رضاکار اپنی جیبوں میں بارود و کارتوس بھر بھر کر ٹینکوں کے نیچے لیٹ گئے۔ تاکہ بارود اور کارتوس کے پھٹنے سے ٹینک بھی پھٹ جائیں۔

(۴) ہزاروں کی تعداد میں رضاکار جتھوں میں خود ساختہ مولوٹوف کاکٹیل کے شیشے ہاتھوں میں لے کر گولہ باری کرتے ہوئے ٹینکوں پر حملہ آور ہوئے اور ٹینک کے قریب پہنچتے پہنچتے صرف چند رضاکار زندہ رہے۔ جنہوں نے ٹینک چلانے والوں پر حملہ کرکے ان کو مار گرایا اور پھر ٹینکوں کو بے کار کرنے کی کوشش کی۔

(۵) پٹھانوں نے نہایت بے جگری کے ساتھ بمبار طیاروں، گولی برسانے والے ٹینکوں اور مسلح فوج سے مقابلہ کیا۔ اور اپنی معمولی رائفلوں سے کئی طیاروں کو نقصان پہنچایا۔ اور ہندوستانی فوجوں سے ان کے اسلحہ بالخصوص برین گن وغیرہ چھین لائے۔

(۶) بعض مقامات پر صرف چند گنتی کے پٹھانوں نے ہزاروں کی تعداد میں مسلح افواج کا باوجود عدم فراہمی اسلحہ کے مسلسل کئی دن تک مقابلہ کیا اور کئی کئی سو انڈین یونین کے سپاہیوں کو ہلاک کیا اور باوجود دشمن کی افواج کی ہر ممکنہ کوشش کے ان کو اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھنے دیا مثلاً نارنج کا واقعہ۔

(۷) دیہات و تعلقات کے عام مسلمانوں اور پست اقوام نے اپنی اپنی حد تک نہایت جاں نثاری سے دشمن کی خونخوار افواج کا آخر دم تک مقابلہ کیا، اور اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔"

آنے والی مصیبت کا انتظار

یہ لوگ جو لڑنے، مرنے، کٹنے، جان دینے پر تیار تھے، غداری کے جال میں پھنس چکے تھے، یہ آگے بڑھنا چاہتے تھے، لیکن ان کو پیچھے گھسیٹ لیا جاتا تھا، یہ میدان جنگ میں اپنے حوصلہ اور ہمت کا ثبوت دینا چاہتے تھے، لیکن انھیں موقع نہ دیا جاتا تھا، ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی، یہ ـــ

• بہرحال دشمن کے بائیس محاذوں پر جو مملکت کے چاروں طرف دشمن نے باوجود والیٔ ریاست اور کمانڈر کو قبل از قبل ہم خیال کر لینے کے صرف رضاکاروں کے مقابلہ کے لئے قائم کئے تھے۔ نہتے عوام اور رضاکاروں کو دیر تک مقابلہ کرتے رہنا ممکن نہ تھا۔ رضاکار للکارتے تھے کہ ان کی مدد کی جائے، پٹھان تڑپتے تھے کہ ان کو اسلحہ فراہم کئے جائیں۔ وفادار فوجی منتظر تھے کہ ان کو مقابلہ کرنے کا حکم دیا جائے۔ اور اسلحہ دیئے جائیں اور عوام بے تاب تھے کہ اعلیٰ کمان سے سخت ترین احکام جاری ہوں تاکہ ساری ریاست کا نظم و نسق بدل دیا جائے۔ لیکن افسوس صحیح حالات معلوم ہونے تک اور سازش کا انکشاف ہوتے تک جنگ کا جو طوفان گزر چکا تھا۔ دشمن کی فوجیں دارالسلطنت حیدرآباد کے قریب تر پہنچ چکی تھیں۔ دیہات و اطراف و اکناف کے عوام پناہ لینے

کے لئے کثیر تعداد میں چاروں طرف سے شہر حیدر آباد میں پہنچ گئے۔ اسلحہ اور گولہ بارود کے اڈوں پر غدار کمانڈر العیدروس کی بالکلیہ ذاتی نگرانی تھی۔ شہر کے اوپر بمبار طیارے مسلسل گشت لگا رہے تھے۔ اور کسی دم بھی شہر اور اہالیانِ شہر پر بمباری کر کے نیست و نابود کر دیتے۔ مجلس کی اعلیٰ کمان مجبور و مایوس ہو چکی تھی۔ اور اب سوائے اس کے اور چارۂ کار نہ تھا اور مصلحت بھی اسی میں تھی کہ خاموشی کے ساتھ ہر آنے والی اور آئی ہوئی مصیبت کے لئے عوام تیار ہو جائیں اور نہتے اور بے بس عوام کی خونخوار دشمن کے ہاتھوں خونریزی کو روکا جائے۔ باوجود ان تمام کوتاہیوں کے دشمن کو آگے بڑھنے میں جس قدر رکاوٹیں رضاکاروں اور پٹھانوں نے پیدا کیں اور جس بے جگری کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ پولیس ایکشن نہ تھا فوجی حملہ تھا

انڈین یونین کی فوجوں نے ریاست حیدر آباد پر جو یلغار کی تھی، گو اسے وہ پولیس ایکشن کا نام دیتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے پولیس ایکشن کسی معنی میں بھی نہیں کہا جا سکتا، یہ ایک باقاعدہ اور منظم فوجی حملہ تھا:—

(۱) پنڈت نہرو اور سردار پٹیل اصل کارروائی سے قبل اپنی متعدد تقاریر، سرکاری بیانات اور اخباری اعلانات کے بموجب حیدر آباد کو یہ دھمکیاں دے چکے تھے کہ یا تو حیدر آباد کو انڈین یونین میں شامل ہونا پڑے گا۔ یا جنگ کرنی پڑے گی۔

(۲) یہی دونوں اسمبلی اور پارلیمنٹوں میں متعدد مرتبہ ارکان کے ان سوالات پر کہ کیوں نہ حیدر آباد کے خلاف جلد سے جلد جنگی کارروائی شروع کی جائے۔ اثبات میں جواب دے چکے تھے۔

(۳) اس کارروائی سے بہت قبل ہی سے اپنے کارندوں کو ریاست میں تباہ کاریاں پھیلانے اور خوف و دہشت پیدا کرنے کے لیے اندرونی طور پر اسلحہ فراہم کر رہے تھے۔ اور اسمبلی کے ایک سوال پر کہ کیوں نہ ریاست کے ہندوؤں کو مسلمانوں کو زیر کرنے کے لئے اسلحہ فراہم کئے جائیں یہ کہہ چکے تھے کہ معزز رکن یہ کیوں خیال کرتے ہیں کہ "اسلحہ فراہم نہیں کئے جا رہے"

(۴) اسٹیٹ کانگریس اور اس کی سوشلسٹ جماعت کی انڈین یونین اس سلسلہ میں مسلسل ہمت افزائی کر رہی تھی کہ مسلمانوں کو عام طور پر قتل کیا جائے۔ چنانچہ کمیونسٹوں کے بھیس میں اصل جنگی

کارروائی سے قبل سوشلسٹ کانگریسیوں نے متعدد مسلمان سرکاری ملازمین اور عام مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کرکر کے مارا اور تباہ و برباد کیا۔ گویا انڈین یونین نے حیدرآباد میں Genocide کو بھی جاری رکھا۔

(۵) والیٔ ریاست پر بھی خود انڈین یونین کے کارندوں نے براہ راست قاتلانہ حملے کئے۔ جس کے لئے انڈین یونین کے فوجی قسم کے بم استعمال کئے گئے جو بغیر انڈین یونین کی امداد کے ہرگز حاصل نہیں کئے جا سکتے تھے۔

(۶) ہر قسم کے تخریبی اور تباہ کن افعال کو جائز رکھا گیا اور سخت ترین معاشی ناکہ بندی کی گئی تاکہ حکومت اور عوام مجبور ہوکر غلامی قبول کرلیں۔

(۷) حملہ کے وقت باضابطہ بکتر بند مسلح افواج ملٹری کو استعمال کیا گیا اور ہر قسم کی جنگی تیاریوں کے ساتھ افواج کا داخلہ شروع ہوا۔ یعنی سب سے پہلے تباہ کن طیارے بمباری کرتے تھے۔ جسکے بعد توپ وار ٹینک گولیاں برساتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ جن کے پیچھے آرمرڈ کارس اور آرمرڈ فوجیں ہوتی تھیں۔ اور ان کے بعد پیدل افواج داخل ہوتی تھیں اس طرح نہایت منظم فوجی حملہ کے بعد بھی اگر اس کو پولس ایکشن کہا جائے تو یہ ایک غور طلب دھوکہ ہے۔

(۸) پولس ایکشن میں صرف ملٹری پولس عوام و مقامی حکام کو اپنی آمد کی وجہ اور ضرورت بتاتی ہوئی اور ان سے عمل طور پر تعاون کرتی ہوئی داخل ہوتی ہے اور نظم و نسق و انتظامات جاریہ کو چھیڑے بغیر حکام سے تعاون کرتی ہے اور امن و امان کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ برخلاف اس کے انڈین یونین کے پولس ایکشن نے بجائے امن و امان کو قائم کرنے اور نظم و نسق کو قرار رکھنے کے بدامنی اور کشت و خون شروع کردیا اور انتظامات نظم و نسق کو درہم برہم بلکہ نیست و نابود کردیا پھر بھی اس کی کارروائی کو پولس ایکشن کہا جاتا ہے۔

(۹) دارالسلطنت میں پہنچ کر بجائے نظام سے طے شدہ اعلان مفاہمت کے مطابق عمل کرنے کے فوجی گورنر اور فوجی حکومت قائم کردی گئی فوجی چھاؤنی کے اطراف و اکناف کے مسلمانوں کا قتل عام اور لوٹ مار شروع کردی گئی۔ حکومت کے مستعفی شدہ اراکین کو نظر بند کردیا گیا۔ نظام کی قائم کردہ کمیٹی کو تحلیل کردیا گیا۔ ہر عہدہ دار کو معطل کردیا گیا ——

______ ۔مسلمانوں کی عام گرفتاریاں

شروع کردی گئیں۔ اور ہر مسلمان کو رضاکار کہہ کر نشانہ ستم بنایا جانے لگا۔ پھر بھی اس کو پولیس ایکشن کہا جاتا ہے۔"

پھر کیا ہوا ـــــــ؟ فوجی حملہ کہئے، یا پولیس ایکشن، بہرحال یہ کارروائی عمل میں آئی، لیکن کس طرح ؟

یہ ایک جگرخراش اور لرزہ خیز داستان ہے، لیکن داستان کا یہی حصّہ سب سے زیادہ اہم ہے، لہذا اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

(۱) سرحدات سے لے کر شہر حیدرآباد میں داخل ہونے تک جو مسلمان نظر آیا اس کو رضاکار کہہ کر فوجیوں نے گولی کا نشانہ بنایا۔ جس کے نتیجہ پر اب تک تقریباً ایک لاکھ رضاکار مارے جا چکے ہیں۔

(۲) دیہات و مواضعات و تعلقات میں جس قدر مسلمان ملتے گئے ان کو بلا لحاظ اس کے کہ وہ رضاکار تنظیم سے کوئی تعلق رکھتے تھے یا نہ رکھتے تھے ایک ایک کے مشین گنوں سے ختم کر دیا گیا۔ جس میں اسی برس سے زائد کے بوڑھے اور شیر خوار بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں جن کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہوگی۔

(۳) مسلمانوں کی صفائی کے بعد مقامی ہندوؤں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان مسلمانوں کے مال و اسباب اور گھربار کو لوٹ لیں۔ لوٹ مار میں جو مقامی ہندو پس وپیش کرتے ان کو بھی بندوق کے کندوں سے مارا جاتا۔ لوٹے ہوئے مال و اسباب میں سے وہ اشیاء جو قیمتی اور کارآمد ہوتیں ان کو فوجی خود رکھ لیتے۔

(۴) متعدد سرکاری ملازمین کو جن میں ذمہ دار عہدہ دار بھی شامل ہیں فوجیوں نے ان کے مکانات اور دفاتر میں داخل ہوکر گولی کا نشانہ بنایا جن میں خاص طور پر عبدالستار سجانی مہتمم تعلیمات میدک۔ رشید عباس سوئم دوم تعلقدار سنگاریڈی، شیخ ابوالحسن صاحب مہتمم تعلیمات۔ کاظم جنگ تعلقدار میدک اور سینکڑوں دیگر ملازمین جن کا تعلق زیادہ تر سیول خدمات سے تھا شامل ہیں۔

(۵) دیہات و مواضعات و تعلقات و اضلاع کے تقریباً ہر مسلمان کو اس طرح لوٹا گیا ہے کہ اچھی سے اچھی حیثیت کے مسلمانوں کے پاس جس میں اعلیٰ سرکاری عہدہ دار بھی بکثرت شامل ہیں۔ سوائے جسم کے کپڑوں کے اور کوئی چیز باقی نہیں ہے۔

(۶) سینکڑوں کاروباری مسلمانوں کو جن کی حیثیت لکھ پتیوں سے کم نہ تھی اور حیدرآباد کے اضلاع و مضافات میں سکونت پذیر تھے۔ ان کے اہلِ معاملہ اور متعلقین کو تباہ و برباد کر کے بے گھر کر دیا گیا ہے گویا مسلمانوں کو مجموعی طور پر معاشی نقطۂ نظر سے اس قدر پست کر دیا گیا ہے کہ وہ کبھی اپنی حالت کو درست نہیں کر سکتے۔ اور اب ان کو پست اقوام سے بھی بدتر حیثیت سے زندگی گزارنی پڑے گی۔

(۷) ہزاروں مسلمان اپنے وطن کو چھوڑ کر چھپتے چھپاتے جنگلوں اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں مع عورتوں و بچوں کے طے کرتے ہوئے پیادہ پا بھوکے پیاسے کئی کئی دن کے بعد سینکڑوں میل مسافت طے کر کے شہر حیدرآباد کی طرف پہنچے۔ ان میں سے بھی جن جن کو فوجی ملتے گئے وہ مارے گئے۔ کچھ سفر کی صعوبتوں کو برداشت نہ کر کے خود مر گئے۔ اور جو پہنچے وہ بھی نہایت خستہ حال میں پہنچ سکے اور لاتعداد مسلمان جو افواج کے داخلہ کے وقت اپنے گھروں کو چھوڑ کر حیدرآباد آ رہے تھے۔ انھیں سفر کے دوران میں یونین کے ہوا باز سورماؤں نے گولیوں کا نشانہ بنایا۔

(۸) سقوط حیدرآباد کے فوراً بعد تقریباً ہر اُس ریل گاڑی کو جو حیدرآباد سے آ رہی تھی روک روک کر جس قدر مسلمان مل سکے ان کو انتہائی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور ہر قسم کی اذیتیں پہنچائی گئیں بالخصوص ضلع گلبرگہ کی جانب لنگم پلی، شنکرپلی، وقارآباد، ورنگل کی جانب بی بی نگر، بھونگیر، جنگاؤں ضلع عادل آباد کی جانب۔ جوگی پیٹھ، پداپلی پر ایسے واقعات بکثرت ہوئے اور اب تک بھی ہر اسٹیشن پر ہندو مسافروں کی امداد سے چن چن کر مسلمان مسافروں کو فوجی سکھ اتار لیتے۔ اور نہ معلوم ان کے ساتھ کیا کیا برتاؤ کرتے ہیں۔

(۹) اضلاع اور ان کے مختلف تعلقات و مواضعات مثلاً بیدر، نلگنڈہ، ورنگل

عادل آباد، عثمان آباد اور رائچور، گلبرگہ شریف، ظہیر آباد ہمناباد، نلدرگ، جالنہ، مومن آباد، جنگاؤں، محبوب آباد، ثریا بلیٹھا، حضور نگر وغیرہ پہ مسلمان مردوں اور عورتوں کو بڑی بڑی تعداد میں یکجا کھڑا کر کے یا تو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا یا ٹینکوں کے نیچے ان کو روند دیا گیا۔"

تبدیلِ مذہب کے واقعات

یہ خانہ بھی خالی نہیں ہے، :—

"دیہات و مواضعات اور تعلقوں میں سینکڑوں مسلمانوں کو تبدیلِ مذہب پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ظہیر آباد ضلع بیدر میں سکھوں اور فوجیوں نے جنگلوں میں چھپے ہوئے مسلمانوں کو تلاش کر کے ایک جگہ جمع کیا ان کے بال منڈوا کر چوٹیاں رکھوائیں اور ایک درگاہ کے مجاور کو سب سے آگے رکھ کر رام رام کہلاتے ہوئے تمام گاؤں میں پھرایا۔"

یہ مہاجر .....

"ہندوستان کے حالات سے سراسیمہ اور پریشان ہو کر بہت سے مسلمان، حیدر آباد میں مہاجر کی حیثیت سے آئے اور بس گئے۔ پولیس ایکشن کے بعد انھیں پھر ایک مرتبہ مہاجر بننا پڑا، اور جبراً انھیں ریاست سے خارج کر دیا گیا، :—

"مہاجرین جنھوں نے انڈین یونین کے مظالم سے تنگ آکر حیدر آباد میں پناہ لی تھی۔ اور جن کی تعداد چھ سات لاکھ سے کم نہ تھی۔ ان کو فوجی حکومت پھر حیدر آباد سے نکال رہی ہے۔ حالانکہ ان کی کثیر تعداد وہاں کاروبار، ملازمتوں اور دیگر طریقوں سے مستقل طور پر آباد ہو چکی ہے، یہ جانتے ہوئے کہ جن علاقوں سے یہ لوگ آکر بسے ہیں۔ وہاں اب ہندو یا سکھ آباد ہیں۔ اور اب اگر ان کو پھر اپنے مقامات پہ واپس کیا جائے تو وہاں ان کو اپنی کوئی چیز نہیں مل سکتی اور نہ ان کو اب وہاں کوئی آباد ہونے دے گا۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ حیدر آباد بھی اب انڈین یونین کا جز ہو چکا ہے۔ مہاجرین کو وہاں سے نکالنا گویا جان بوجھ کر مزید چھ سات لاکھ مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور قتل و غارت گری کا سامان مہیا کرنا ہے۔ جس پر عمل کرنا شروع کر دیا گیا ہے۔"

پٹھان اور عرب

حیدر آباد میں کئی پشتوں سے عربوں اور پٹھانوں کی بڑی تعداد مقیم تھی اور باقاعدہ حیدر آبادی بن گئی تھی لیکن پولیس ایکشن کے بعد اسے بھی مہاجر بننا پڑا، :-

"پٹھانوں اور عربوں پر بھی جو گزشتہ صدی سے حیدر آباد میں آباد ہیں اور جنھوں نے حیدر آباد کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ان کو نہایت بے دردی سے نکالا جا رہا ہے۔ اور ان پر سخت مظالم کئے جا رہے ہیں۔ ان سب کو اکٹھا کر کے ایک جگہ کر دیا گیا ہے۔ جہاں ان کو نہایت قلیل مقدار میں غذا دی جاتی ہے۔ اور وہاں سے ان کو باقساط نکالا جا رہا ہے۔"

مسلمان ملازمین سرکار

پولیس ایکشن کے بعد، جب حیدر آباد کے عام مسلمانوں پر زندگی کی آسانیاں دشوار ہو گئیں تو وہ مسلمان کس طرح بچ سکتے تھے جو سرکاری ملازم تھے، ــــــــ کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا، :-

"دیہات و تعلقات پر حکومت کا فقدان ہے۔ اس لئے کہ سرکاری ملازمین یا تو مار ڈالے گئے ہیں یا چھپ گئے ہیں یا ان مقامات پر واپس جانے سے ڈرتے ہیں اس لئے کوئی ہندو اب کسی ملازم سرکار کو مسلمان کی حیثیت میں گوارا کرنے کو تیار نہیں ہے۔ موجودہ حکومت کی جانب سے سرکاری ملازمین کے لئے پاس اجرا کر کے ان کو پولس کی نگہبانی میں اپنے مقامات پر روانہ کیا گیا تو راستہ میں فوج یا عام ہندوؤں نے انکے پاس پھاڑ ڈالے اور پولس کو بے دخل کر کے ان کی مار پیٹ کی گئی اس لئے اب مسلمان عہدیدار ملازمین سرکار پولس کی نگرانی میں بھی اپنے مقامات پر جانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس بہانے سے ہندو یونین کو اور زیادہ ہندوؤں کو ملازمتوں میں داخل کرنے کا موقع ملا ہے۔ پاس لے کر جانے والے ریل کے مسافروں کو بھی یونین کے فوجی اسٹیشنوں پر اتار لیتے ہیں "

کشتگان ستم

پولیس ایکشن کے بعد جو لوگ پکڑے گئے، ان پر کیا بیتی یہ بھی ملاحظہ ہو :-

"حیدر آباد میں جو لوگ رکھے گئے ان کے لئے کھلے میدانوں میں کانٹے کا تار لگا کر گھیرا

ڈالا گیا ہے جہاں بڑے سے بڑی اور چھوٹے سے چھوٹی حیثیت کا آدمی ایک ہی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ دھوپ بارش اور سردی سے کوئی بچاؤ نہیں ہے۔ زمین پر سونا بیٹھنا اور اور وہیں پیشاب، پاخانے سے بھی فارغ ہونا پڑتا ہے۔ کبھی دو وقت اور کبھی صرف ایک وقت فی کس ایک روٹی کھانے کو دی جاتی ہے، پانی صرف مقررہ اوقات میں نہایت تھوڑی مقدار میں دیا جاتا ہے، پیشاب، پاخانے کے لئے بھی اوقات مقرر ہیں۔ کوئی قیدی کسی خاص وجہ سے اگر کوئی رعایت چاہے تو اس کو زدوکوب کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کو کوئی طبی امداد بھی نہیں پہنچائی جاتی۔"

مسلمانوں کی جگہ ہندوؤں کا تقرر

ایک لازمی نتیجہ پولیس ایکشن کا یہ بھی ہوتا تھا:-

"ریاست میں جس قدر اہم عہدے تھے۔ ان پر ہندوؤں کو باہر سے لاکر رکھا گیا ہے اور مجموعی طور پر ہر مسلمان عہدہ دار کو تنگ کر کے ملازمت سے علیحدہ کیا جارہا ہے۔ چنانچہ جملہ معتمدین۔ نظماء چاروں صوبیدار۔ جملہ تعلقدار۔ جملہ مہتمان پولس، مددگاران پولس، تحصیلدار اور متعدد عہدہ داروں کو فی الحال معطل کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انسپکٹر جنرل پولس، ڈائرکٹر جنرل طبابت وصحت عامہ۔ ڈائرجنرل تعمیرات وآبپاشی۔ ایکشن افسر چیف اور اسسٹنٹ، سول اینڈ منسٹریٹر سب کے سب بدل کر ہندوؤں سے پُر کئے گئے ہیں۔ و نیز تقریباً چھ سات ہزار کی تعداد میں پولس کانسٹیبل اور دیگر ادنیٰ ملازمین بھی درآمد کئے گئے ہیں۔"

نظام کی آزادی؟

پولیس ایکشن کے بعد بار بار، اور مسلسل اعلان کیا گیا کہ نظام کی حیثیت اور مرتبہ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے لیکن کیا واقعہ بھی یہی تھا؟ —

نہیں واقعہ یہ تھا:-

(۱) نظام کو مسز سروجنی نائیڈو گورنر یوپی سے ٹیلیفون پر گفتگو کرنے دی گئی اور نہ ان کو تار دینے کی اجازت دی گئی۔

(۲) شہزادہ برار اور پرنس مکرم جاہ کو نظام نے ماہانہ اخراجات روانہ کرنا چاہے تو اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

(۳) ملٹری گورنر جب عام طور پر حکومت کے عہدہ داروں کو معطل اور گرفتار کر رہے تھے۔ تو نظام نے ایک دو کے متعلق سفارش فرمائی لیکن ان کی کسی بات کو نہیں سنا گیا۔

ان تمام پابندیوں کے باوجود نظام کو یہ بیان دینے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے کی طرح آزاد ہیں۔ اور ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

اخبارات بند

اخبارات کی بندش بھی پولیس ایکشن کا لازمہ تھی:

"ہر قسم کی خبروں پر زبردست احتساب ہے جس کو سر ظفر اللہ خان کے سلامتی کونسل کے احتجاج پر لفظاً تو اٹھا لیا گیا۔ لیکن اندرونی طور پر عملاً صحافت کو سخت ترین ہدایات دی گئی ہیں کہ کوئی خبر بغیر انفارمیشن افیسر بریگیڈیر مانکیکر کی منظوری کے شائع نہ کی جائے۔ متعدد قدیم ترین روزنامہ جات مثلاً رہبر دکن، صبح دکن، وقت مجلس، اتحاد وغیرہ کو مسدود کر دیا گیا ہے۔ اور صرف انڈین یونین کے ہم نوا روزناموں کی اشاعت جائز قرار دی گئی ہے۔ اب تک جملہ سترہ روزناموں کو بند کیا جا چکا ہے۔

... یہ بھی ہوا

پولیس ایکشن کے بعد باعزت لوگوں پر کیا گزری؟ داستان کا یہ ٹکڑا بھی قابل غور ہے:—

"جن عہدہ داروں، پبلک کارکنوں اور شرفاء کو گرفتار کیا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ نہایت معیوب اور بے عزتی کا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مثلاً اورنگ آباد کے صوبہ دار مولوی مصطفےٰ علی صاحب کو گرفتار کر کے ان کو ہر طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ ان کے منہ پر تھوکا گیا۔ ان کی داڑھی نوچی گئی اور ان کے کپڑے وغیرہ پھاڑ ڈالے گئے۔ اسی طرح مولوی عبدالکریم صاحب تمتاپوری جو گلبرگہ کے قدیم ترین ایڈوکیٹ، مجلس اتحاد المسلمین کے ذمہ دار کارکن اور مجلس مقننہ کے رکن تھے۔ ان کو انڈین یونین کی فوج نے حیدرآباد میں گرفتار کیا اور وہاں سے ان کو گلبرگہ کے اسٹیشن پر لے جا کر چھوڑ دیا انھوں نے چھوڑ دینے کی وجہ دریافت کی اور جب

وہ اسٹیشن سے باہر نکلے تو وہاں مقامی غنڈے ہندو اور سیوک سنگھ کے لوگوں نے ان کو پکڑ کر دونوں ہاتھ رسی سے باندھ دیے اور ان کے منہ پر تھوک کر اور کپڑے پھاڑ کر ان کے وطن گلبرگہ کے بازاروں میں پھرایا گیا اور جس قدر بے عزتی ممکن تھی وہ کی گئی۔ اور پھر فوج نے گرفتار کر لیا۔"

اب یہ بھی جرم ہے

پولیس ایکشن کی کارفرمائیوں کا سب سے زیادہ دلچسپ اور عبرت انگیز پہلو یہ ہے،:

"ان مسلمانوں پر جنھوں نے آج سے بیس بیس، پچیس پچیس سال پہلے نومسلم عورتوں سے جائز ازدواجی تعلقات قائم کر لیے تھے، چن چن کر ان پر تبدیلی مذہب کے الزامات عائد کر کے ملٹری حکومت کو ان کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔ اور ان پر عدالتوں میں مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔"

وہ چھ پٹھان

کیا تاریخ اس واقعہ کو فراموش کر دے گی؟

"تانج ضلع عثمان آباد کا ایک قصبہ ہے۔ جو دو انگریزی علاقوں یعنی شولاپور اور بارسی کے درمیان واقع ہے۔ اس مقام پر ایک چنگی کا ناکہ ہے۔ جو قصبہ کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں غیر سرحد کے لوگوں کے بلا اطلاع داخلہ کو روکنے کے لیے سڑک پر ایک رسی بندھی رہتی ہے جہاں آنے والوں کو ٹھہر کر چنگی کے جوان کو اطلاع دینی پڑتی ہے اور اجازت ملنے پر رسی سے آگے بڑھنے دیا جاتا ہے۔ سرحدی مقام ہونے کی وجہ سے وہاں بائیس پولیس کانسٹیبل اور ایک اسسٹنٹ انسپکٹر متعین تھے ایک دن انڈین یونین کی ایک لاری آئی جس میں مسلح سکھ فوجی بھرے ہوئے تھے۔ چوکیدار نے حسب معمول اسے روکا جس پر سکھوں نے تکرار شروع کی اور چوکیدار کو مارنا پیٹنا شروع کیا اور چنگی کی چوکی کے اندر داخل ہو کر لوٹنا چاہا۔ اس عرصہ میں گاؤں میں اطلاع پہنچی۔ گاؤں سے چھ پٹھان اپنی رائفلیں لے کر ناکہ پر پہنچے۔ فوجیوں کو سمجھایا گیا۔ لیکن جھگڑا بڑھتا گیا۔ اور سکھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ پولیس کو چونکہ احکام تھے کہ راست مقابلہ نہ کیا جائے۔ اس لیے صرف چھ پٹھانوں اور ایک چوکیدار نے سکھ فوجیوں کا مقابلہ کیا اور تقریباً ۳۲ فوجیوں کو ہلاک کیا۔ دوسری لاری میں وائرلس سٹ تھے۔ جس کی مدد سے انڈین یونین

کے علاقوں پہ اطلاع دے کہ تین فوجی کمپنیاں مدد کے لئے طلب کی گئیں۔ پٹھانوں نے مارے ہوئے فوجیوں کے ہتھیار چھین لئے اور نانج کی گڑھی کو مورچہ بنا کر وہاں سے جدید فوجی قوت کا مقابلہ شروع کیا۔ صبح کے دس بجے سے باضابطہ مقابلہ شروع ہوا۔ اور شام کے چھ بجے تک جاری رہا جب کہ یونین کے تین ہوائی جہازوں نے آکر پٹھانوں کے مورچہ پہ بمباری شروع کی۔ گڑھی کو توڑا گیا۔ اور پٹھانوں کو شہید کیا گیا۔ دشمن کی تین کمپنیوں میں سے صرف دس آدمی بچے باقی تمام کو صرف سات جانبازوں نے دن بھر مقابلہ کر کے ٹھکانے لگایا اور بالآخر خود جام شہادت نوش کیا۔"

صادق علی شہید

اس جنگ کے کئی پہلو — بھلائے جائیں گے ہم سے نہ تم سے !!!: —

"مسٹر صادق علی تنگبھدرا پراجکٹ ضلع رائچور پہ انجنیر تھے۔ انڈین یونین کے فوجی حملہ کے بعد جب یہ فوجیں تنگبھدرا پراجکٹ پر پہنچیں اور مسلمانوں کی جان و مال خطرے میں پڑ گئے تو مسٹر صادق نے ستر پٹھانوں اور رضاکاروں کو یکجا جمع کر کے ڈیفنس شروع کیا اور دشمن کی لاتعداد گورکھا فوج کو بڑی دور تک مار بھگایا۔ اور تنگبھدرا پراجکٹ سے قریب تر یونین کے علاقہ ہاسپٹ پر قبضہ کر لیا۔ اس مقابلہ میں تقریباً سات سو یونین کے فوجیوں کو ہلاک کیا۔ اور وائرلس سٹ اور آرمرڈ کارس پر قبضہ کیا۔ اور ہاسپٹ پر مورچہ بنا کر باضابطہ پھر مقابلہ شروع ہوا۔ دشمن نے پھر اپنی فوجوں کے یلغار آگے بڑھانے شروع کئے۔ جس میں علاوہ پیدل فوج کے ٹینک، آرمرڈ کارس وغیرہ بھی شامل تھیں۔ مسٹر صادق علی تقریباً چوبیس گھنٹے مقابلہ کرتے رہے لیکن کسی مزید فوجی کمک کے نہ ملنے اور دشمن کی فوجوں سے گھر جانے کی وجہ سے مجبور ہو گئے اور بالآخر دشمن کے نرغہ میں پھنس کر مع اپنے ساتھیوں کے نہایت بے دردانہ طور پہ شہید کئے گئے۔"

مالاباری بہادر

مالابار (مدراس) کے بہادر اور سرفروش مسلمانوں نے ایک مرتبہ پھر تاریخ میں اپنا مقام حاصل کر لیا، ! —

"ہنگولی ضلع پربھنی پر کپتان عبدالصمد خاں نے صرف ایک کمپنی کے ساتھ جس میں

۱۱۳ لمباری فوجی شامل تھے۔ نہایت دلیری کے ساتھ دشمن کی کثیر فوج کا مقابلہ کیا۔ مسلسل تین مرتبہ دشمن کی ایک بریگیڈ کو اپنی سرحد سے باہر بھگا دیا کتیسر گاؤں کے پل پر سے دشمن کو اُس وقت ہٹایا جب کہ دشمن ٹینکوں کے ذریعہ اس پُل پر قبضہ کر چکا تھا۔ اور مزید فوجوں کو جموں تک رہا تھا۔ مورچہ بنا کر مسٹر صمد نے چاروں طرف سے دشمن کا ایسا مقابلہ کیا کہ دشمن کو پُل چھوڑ کر ہٹنا پڑا۔ یہاں مسٹر صمد کو اور زیادہ فوجی مدد کی ضرورت تھی۔ مگر مدد نہیں ملی اس لئے پانچ میل پیچھے ہٹ کر پھر دشمن کا پورے ایک دن مقابلہ کیا لیکن پھر گیارہ میل پیچھے ہٹنا پڑا اور مقابلہ برابر کرتے رہے۔ بالآخر جب پیچھے ہٹتے ہٹتے جل گاؤں پر پہنچے تو صرف سات آدمی باقی رہ گئے تھے۔ بھوک پیاس کی شدت اور مسلسل مقابلہ سے تھک کر چور ہو چکے تھے۔ یونین کی فوجوں نے ان کے اطراف گھیرا ڈال کر گرفتار کر لیا اور سکھوں اور گورکھا فوجوں نے ان کو ہنگولی واپس لا کر وہاں کے مقامی مسلمانوں کے ساتھ سب کو ایک جگہ جمع کر کے قتل عام کیا۔ جس میں اتفاقاً دو تین ہندو بھی زد میں آ گئے۔"(۱)

---

(۱) یہ داستان درد ایسے شخص نے بیان کی ہے، جو موقع واردات پر موجود تھا۔ جس نے لرزہ خیز اور روح فرسا واقعات و حوادث بہ چشم خود دیکھے، اور انھیں باچشم تر، بادست مرتعش قلمبند کیا۔

اوپر جو واقعات بیان کئے ہیں وہ صرف چند ہیں جو خوف طوالت سے بہت سے واقعات نظر انداز کر دینا پڑے، جب دو قوموں میں، یا دو ملکوں میں جنگ ہوتی ہے، اور ان میں سے ایک کو فاتح کی حیثیت، اور دوسرے کو مفتوح کا درجہ حاصل ہوتا ہے تو ظفر مند فوجیں یہی کچھ کرتی ہیں۔ امریکہ نے جاپان میں جو کچھ کیا، روس نے ہنگری میں جو کچھ کیا، جرمنی نے فرانس میں جو کچھ کیا، فرانس الجزائر میں جو کچھ کر رہا ہے یہ حالات کا لازمی نتیجہ ہے اس پر غم و غصہ کا اظہار کتنا ہی کیا جائے، لیکن —— یونہی ازل سے مرے یار ہوتی آئی ہے۔

اس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا حیدرآباد اور ہندوستان میں اعلان جنگ ہوا تھا؟
—— نہیں۔ ——

(باقی صفحہ ۴۵۴ پر)

کیا حیدرآباد کا یہ مطالبہ تھا کہ برما، سیلون، اور جزائر مالدیپ کی طرح اس کی خود مختاری تسلیم کر لی جائے؟ —— نہیں،

حیدرآباد صرف یہ چاہتا تھا کہ اندرونی طور پر، اس کی خود مختاری تسلیم کر لی جائے، معاملات دفاع، امور خارجہ، اور رسل و رسائل میں وہ بھارت کی بالادستی قبول کرتا ہے،

اس نے یہ عہد بھی کر لیا تھا کہ کابینہ مشن کے دیے ہوئے، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تسلیم کیے ہوئے حق خود ارادیت سے فائدہ اٹھا کر وہ پاکستان سے ہرگز الحاق نہیں کرے گا اور اپنا خلوص ثابت کرنے کے لئے اس نے وہ بیس کروڑ کا قرض بھی واپس لے لیا تھا، جو اس نے پاکستان کو دیا تھا،

پھر بھی عدم تشدد کے پرستاروں نے، جو حملہ جاپان کے مقابلہ میں ہتھیار اٹھانے پر غلامی کو ترجیح دیتے تھے، پولیس ایکشن کے نام سے شکار شروع کر دیا،

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی،

بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا!

ملاحظات و ایضاحات

(۲)

بانگ قلمم دریں شب تار
صد معنی خفتہ کرد بیدار

(فیضی)

ملاحظات وایضاحات (۲)

مسٹر مینن نے اپنی کتاب (The Integration of the Indian States) میں مسئلہ حیدرآباد پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا انداز بیان ہر اعتبار سے سلجھا ہوا، اور معقول ہے۔ اس میں وہ ابتذال اور رکاکت نہیں جو مسٹر منشی کی تحریر میں پائی جاتی ہے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے بہت صاف اور شائستہ الفاظ میں کہا ہے، نہ قائد اعظم کو ملاحیاں سنائی ہیں، نہ پاکستان کے بارے میں ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ہیں، نہ نظام سے متعلق چبھتے ہوئے فقرے استعمال کئے ہیں، نہ قاسم رضوی کا ذکر سب و شتم کے ساتھ کیا ہے، حالانکہ اس پالیسی کے مصنف وہی تھے جس پر ایجنٹ جنرل کی حیثیت سے مسٹر منشی کو چلنا تھا۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قائد اعظم، پاکستان، نظام، قاسم رضوی، ان سب کے بارے میں ان کے خیالات حد درجہ مخالفانہ تھے الحاق ریاست پر اس درجہ انھیں اصرار تھا کہ پولیس ایکشن تک پر یہ جانتے بھی کہ اس سے ساری دنیا میں رسوائی ہوگی تیار ہو گئے، لیکن نطق و تحریر میں مشکل ہی سے کوئی ایسا لفظ استعمال کیا ہوگا، جو ذوق سلیم پر گراں گزرے،

لیکن اس حقیقت کا اعتراف کر لینے کے باوجود یہ ماننے میں ہمیں کوئی تامل نہیں کہ مسٹر مینن نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں نہایت چابک دستی اور ہنرمندانہ کمال سے کام لے

کہ حقائق کو مسخ کرنے کی سعی بلیغ کی ہے، اُنھوں نے تصویر کے دونوں رُخ نہیں دکھائے ہیں صرف ایک ہی رخ دکھایا ہے، وہی جو ان کے مفید مطلب تھا، یہ باتیں ایک وکیل کو زیب دے سکتی ہیں، لیکن ایک مورُخ کے لئے سرمایۂ ندامت ہونی چاہئیں،

اب ہم مینن صاحب کے ارشادات کا حقائق اور واقعات کی روشنی میں جائزہ لیں گے،

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی

منشی کی طرح مینن بھی تعصب کے مرض میں مبتلا ہیں، وہ برافگندہ نقاب اور بہ زیر نقاب، لیکن ——— توجہاں جاکے چھپا ہم نے وہیں دیکھ لیا، !!

اپنی قوم، اپنی ملت، اپنے ملک سے محبت کرنا گناہ نہیں ثواب ہے، لیکن یہ ثواب گناہ اس وقت بن جاتا ہے، جب اپنی قوم ملک کے لئے دوسری قوم کو ہدف ستم بنایا جائے۔

حیدرآباد کے الحاق کا اصل محرک یہ تھا کہ وہاں سے مسلمانوں کی حکومت ختم کی جائے اور ان کے نقوش و آثار بھی ختم کر دیے جائیں، ظاہر ہے یہ کوئی مقدس مقصد نہیں تھا اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جو وسائل و ذرائع اختیار کئے گئے، نہ وہ اصول پر مبنی تھے، نہ دیانت پر، حیدرآباد کے خلاف جو بات کہی گئی ہے، خود ہمیشہ اسی پر عمل رہا ہے ———

این گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند،

مثلاً مینن صاحب کو ایک سنگین اعتراض یہ ہے کہ لائق علی کابینہ میں، جو ہندو شریک تھے، وہ اپنی قوم کے نمائندے نہیں تھے،

بے شک یہ اعتراض وزنی ہے، لیکن اس کا سارا وزن اس وقت ختم ہو جاتا ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود حکومت ہند نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا، وہ ہمیشہ ایسے غیر ہندو اصحاب کو صوبہ اور مرکز میں شامل کرتی رہی جو اپنی قوم کے نمائندے تھے، نہ اپنی قوم کے نمائندگان مجلس آئین ساز کے نمائندے تھے اور حد یہ ہے کہ خود اپنے دیانت دار نمائندہ بھی نہیں تھے،

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد سے کانگرسی صوبوں میں جتنے مسلمان وزیر لئے گئے ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جو اپنی قوم کا نمائندہ ہو، قوم کے منتخب نمائندے اس پر تجویز ملامت ایوان اسمبلی میں پاس کرتے تھے، اور کانگرس اسے وزیر بنا دیتی تھی، بمبئی، سی، پی، بہار یو پی، ہر جگہ یہی ہوا، اور اگر کسی حلقہ سے اسمبلی کا ممبر منتخب ہو جانا قوم کی نمائندگی کی دلیل ہے تو نہ ہم کانگرس پر اعتراض کر سکتے ہیں، نہ کانگرس کو لائق علی پر اعتراض کرنا چاہیئے۔

صوبوں کو چھوڑیئے مرکز کو لیجئے، مسٹر مینن سے زیادہ اس بات کو یاد رکھنے کا کسے حق ہے کہ جب انٹریم حکومت لارڈ ویول نے قائم کی، تو جواہر لال نے آصف علی، سر شفاعت احمد خاں اور سید ظہیر کو وزیر بنا لیا تھا، کیا یہ مسلمان قوم کے نمائندے تھے؟ کیا یہ مرکزی اسمبلی کے مسلم ممبران کے نمائندے تھے؟ مسٹر مینن اس پوچھتے ہوئے سوال کا جواب ہرگز اثبات میں نہیں دے سکتے،

منشی کی طرح مینن نے بھی اپنی کتاب میں ہندوؤں کی مظلومیت کا رونا رویا ہے، اگر رضاکاروں نے یا حیدر آباد کی لائق علی حکومت نے بے گناہ اور امن پسند ہندوؤں پر ظلم کیا، تو بہت برا کیا، شرمناک حرکت کی، اسلام سے غداری کی، مسلمان قوم کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ لگایا، لیکن مسٹر مینن نے اور ان کے آقا سردار پٹیل نے، جو وزیر داخلہ بھی تھے، ان مظلوم مسلمانوں کے لئے کیا کیا، جن کا گڑھ مکتیشر میں، بہار میں اور خود دارالحکومت دہلی میں قتل عام کیا گیا تھا؟ ان مسلمانوں کی مظلومیت کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا، لیکن سردار کا دل نہ پسیجا، وہ گاندھی جی کا مر جانا بھی گوارا کر لینے پر تیار ہو گئے، اگر سردار نے مظلوم مسلمانوں کو بچانے کے لئے کہیں اور نہیں صرف دہلی ہی میں ہی پولیس ایکشن کر لیا ہوتا، تو آج مینن صاحب کی یہ دلیل کتنی محکم ہوتی؟

حد یہ ہے کہ مینن صاحب کے ممدوح سردار پٹیل نے مشرقی پنجاب سے جب مسلمانوں کو انخلا کا حکم دیا، تو وہ مسلمان بھی بوریہ بستر باندھنے پر اور ہندوستان میں رہ کر، ہندوستانی ہوتے ہوئے مہاجر بننے پر مجبور ہو گئے، جو حکومت ہند کے بہت بڑے افسر

تھے، مثلاً سید غلام السیدین اور وہ بھی جنھوں نے کانگرس کی دوستی میں اپنی قوم کو چھوڑ دیا تھا، مثلاً ڈاکٹر سیف الدین کچلو، اور مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، سیدین صاحب، کچلو صاحب، اور رحمان صاحب دہلی میں آکر بس گئے، اور ان کے مکانات پر ہندو اور سکھ قابض ہو گئے! مشرقی پنجاب تو پھر دور کی بات ہے، خاص دہلی کو لیجیے،

دہلی میں جب مسلمانوں کا قتل عام ہوا، تو فوج اور پولیس نے کافی قتل و غارت کے بعد قرول باغ، سبزی منڈی اور پہاڑ گنج وغیرہ کی مسلم آبادی کو پرانے قلعہ میں عارضی طور پر پہنچا دیا کہ جب تک حالات ساز گار نہیں ہوتے دھوپ کھائیں، سردی کی ٹھٹھرن کا لطف لیں، اس ماحول سے طبیعت اکتائے تو ہیضے سے راہ و رسم پیدا کر لیں، لیکن جو سخت جان مسلمان اس ماحول میں بھی زندہ رہے، کیا حالات ساز گار ہوتے کے بعد ان کے مکانات انھیں ملے؟ وہ پاکستان نہیں آئے، لیکن خانماں برباد بننے پر مجبور ہو گئے۔

مینن صاحب نے اور منشی صاحب نے بھی غیر مسلم معابد کی بے حرمتی کا ذکر بھی کیا ہے، اس داستان کو اگر صحیح مان لیا جائے (یہ صحیح نہیں ہے آگے چل کر ہم اس پر گفتگو کریں گے) تو بھی کیا وہ لوگ یہ شکایت کرنے کا حق رکھتے ہیں، جن کے عہد حکومت میں مشرقی پنجاب، الور، بھرت پور، اور خود دہلی کی اکثر مسجدیں، خانقاہیں اور عبادت گاہیں چھین لی گئیں، اور وہ باستثنائے چند آج ۱۴ سال گزرنے کے بعد بھی واگزار نہ ہو سکیں؟

اگر یہ کہا جائے کہ حیدر آباد میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، مسلمان اقلیت میں تھے اقلیت کو کس طرح اکثریت پر حکومت کرنے کا حق دے دیا جاتا؟ تو اس کے جواب میں کیا ہم پوچھ سکتے ہیں، کیا کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت نہ تھی؟ کیا کپور تھلہ میں مسلمانوں کی اکثریت نہ تھی؟ کیا ان دونوں ریاستوں میں ہمیشہ اقلیت ہی اکثریت پر حکومت نہیں کرتی رہی؟ کشمیر میں آج بظاہر اکثریت کی حکومت ہے، لیکن وہ اقلیت کے سامنے

اتنی ہی بے بس ہے، جتنے جواہر لال نہرو، چو این لائی کے سامنے بے بس ہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ،

لائق علی نے چھکے چھڑا دیئے

منشی نے اپنی کتاب میں اور مینن صاحب نے اپنے ارشادات میں، بار بار میر لائق علی کا ذکر کیا ہے، ریاست کے وزیر اعظم وہی تھے، انہی کو تمام مسائل متعلقہ سے عہدہ برآ ہونا تھا، انہی کو تمام مسائل مہمہ طے کرنے تھے، وہی تھے جنھوں نے ہندوستان کے ایجنٹ جنرل (منشی) وزیر اعظم (نہرو) وزیر محکمۂ امور ریاست (پٹیل) سکریٹری محکمۂ امور ریاست (مینن)، گورنر جنرل (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) سے مذاکرات کیے، ان مذاکرات کی بڑی دلچسپ تفصیل منشی اور مینن نے فراہم کر دی ہے اسے پڑھ کر، ایک غیر جانبدار شخص یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہے کہ لائق علی خداداد طور پر، سیاست دانی اور تدبر کے فن میں عظیم و جلیل فنکار کی حیثیت رکھتے ہیں،

ذرا غور تو کیجیے، ایک طرف لائق علی ہیں، تن تنہا، اندرونی مشکلات میں گھرے ہوئے، سازشوں، دراندازوں، غداروں اور جاسوسوں کی سرگرمیوں سے درماندہ جنھوں نے آج سے پہلے تک نہ سیاست کے میدان میں قدم رکھا تھا، نہ سیاست دانوں سے رابطہ رکھا تھا، نہ وزارت کا مزا چکھا تھا، نہ حکومت کے لذت شناس تھے، ایک صنعت کار کی حیثیت سے مرنجاں مرنج اور خاموش زندگی بسر کر رہے تھے، ——— ہاں تو ایک طرف یہ شخص لائق علی تھا، اور مقابلہ میں، کون ہے؟ مسٹر مینن انڈین سول سروس کے دیرینہ سال، تجربہ کار، معمر اور منجھے ہوئے دکن انگریزوں کے راز آشنا، اپنی حکومت کے دل و جان سے وفادار، الحاق حیدر آباد کے مسئلہ پہ اٹل دلائل کا پشتارہ ساتھ لیے نطق و کلام کے خوب خوب جوہر دکھاتے ہیں یہ ہٹتے ہیں تو مسٹر منشی سامنے آتے ہیں، سرد و گرم چشیدہ، ایک کامیاب قانون داں، ایک کامیاب سیاست داں، مدت مدید سے سیاست کے میدان میں گرم سفر کبھی دھمکاتے ہیں، کبھی چمکارتے ہیں، کبھی آنکھیں دکھاتے ہیں، کبھی سر جھکاتے ہیں، یہ

رخصت ہوتے ہیں، تو سردار پٹیل جلوہ افروز ہوتے ہیں، جن کی دہشت کا ہندوستان کی تمام چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ریاستوں میں یہ حال ہے کہ جدہر نکل جاتے ہیں، درودیوار سے آواز آتی ہے،

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

جو اپنے وقت کا آمر ہے، جس نے جواہر لال تک کو بے بس کر رکھا ہے، جس سے پرنس آف برار، ولی عہد مملکت آصفیہ، بمبئی میں نیابۃً حاصل کرنے گئے تھے، تو تجبر، اور رعونت کا عالم یہ تھا کہ پرنس آف برار بالکل پاس بیٹھے ہیں، سردار پٹیل، ایک پاؤں ——— جس پر سے لنگی کا پلو ہٹا ہوا ہے، اور پنڈلیاں صاف نظر آرہی ہیں، ——— اس طرح پھیلائے بیٹھے ہیں کہ اگر اٹھائیں تو پاؤں کے انگوٹھے اور پرنس کی ناک میں تصادم ہوکر رہے، ڈان نے یہ تصویر شاید ٹائمز آف انڈیا سے لیکر شائع کی تھی، اور اس پر سرخی قائم تھی۔ (Indian Culture) .... تو یہ سردار صاحب، اپنی رعونت، تجبر، اور عنان آمری کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں، دہمکاتے ہیں، ڈراتے ہیں، خوفناک نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہیں، خاندان آصف جاہی کے خاتمہ کی بشارت دیتے ہیں، سب کچھ کر گزرنے کا اعلان کرتے ہیں،

سردار ہٹتے ہیں، تو پنڈت جواہر لال نظر فروز ہوتے ہیں، ——— جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟ ——— ان کا غصہ مشہور ہے، کبھی جھنجلاتے ہیں، کبھی بگڑتے ہیں، کبھی خفا ہوتے ہیں، یہ اپنی جگہ چھوڑتے ہیں تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن جلوہ نما ہوتے ہیں،

رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں!

لاٹ صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں، بہت بڑے آدمی ہیں، یہ نہ ہوتے تو کوئی ریاست بھی الحاق پر آمادہ نہ ہوتی، فاتح برما، جنگجو، کشور کشا، خاندان شاہی کے رکن، تیز جا، تیز دست، خاندان آصف جاہی کے خاتمہ

کا اعلان تو ان کا تکیۂ کلام ہے، نہرو کے دوست ہندوستان کے دوست، پٹیل کے دوست بھی اور نیاز مند بھی اس پر تلے ہوئے ہیں کہ اپنے عہدے کی میعاد ختم ہونے سے پہلے الحاق حیدرآباد کی تقریب منعقد کر کے جائیں گے، نرم گفتگو میں، آہنی عزم اس طرح نمودار ہوتا ہے، جیسے گربۂ مسکین کے مخملی پنجہ سے، نکیلے اور خون آشام ناخن برآمد ہوتے ہیں، ایک انگریز پالیٹیشین کی طرح جب چاہتے ہیں تبسم کو زہر خند، اور زہر خند کو تبسم بنا لیتے ہیں، آج تک کسی کے سامنے نہیں جھکے، سب کو جھکاتے رہے، اور دشمن کو جھکانے میں تو کمال رکھتے ہیں، کیسے کیسے حریف پنجہ فگن ان کے سامنے آگر سر جھکانے پر مجبور ہو گئے، غرض، تجربہ، روایت، تربیت تعلیم، عمل سے جو کچھ اپنی طویل زندگی میں سیکھا ہے سب باری باری سے آزماتے ہیں، کہ جس طرح بھی ہو اس بت پر فن کو رام کر لیں،

لیکن، ———

لیکن، اکیلا لائق علی ان سب سے لڑتا ہے، سیاست کا جواب سیاست سے، تدبر کا تدبر سے، دھمکی کا دھمکی سے، دوستی کا دوستی سے دیتا ہے، نہ زبان لڑکھڑاتی ہے نہ قدم ڈگمگاتے ہیں، اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے، حق پر اڑا ہوا ہے، نہ تحریص سے متاثر ہوتا ہے، نہ تہدید سے مرعوب ہوتا ہے اصول سامنے ہے، اور اسی اصول پر، دنیا کی بڑی، اور اپنی حکومت سے ہزار گنا بڑی حکومت سے جنگ کئے جا رہا ہے۔

ہمارے دور غلامی نے کیسے کیسے جوہر قابل اور عالی دماغ پیدا کئے، حیف ہے کہ وہ اپنے نئے وطن اور آزاد ملک میں ناقدری کے شکار ہوں، اور ان کی ذہنی و دماغی صلاحیتیں رائیگاں جائیں،

الحاق کیوں اور کس اصول سے؟

حکومت ہند کی طرف سے الحاق کے مطالبہ نے اتنی شدت اختیار کی کہ بالآخر وہ پولیس ایکشن کے ذریعہ پورا کیا گیا،

لیکن سوال یہ ہے کہ الحاق کا مطالبہ کیوں تھا؟ اور کس اصول کے ماتحت تھا؟ اس سوال کا جواب ماؤنٹ بیٹن سے لے کر مینن تک کسی کے پاس نہیں ہے

برطانیہ نے جب اپنے اختیارات حکومت سے دستبرداری اختیار کی تھی، اس وقت خود بخود نظام ان تمام علاقوں کے مالک ہو گئے تھے، جو انگریزوں نے ان سے بزور ہتھیائے تھے، اصولاً برار بھی انھیں مل جانا چاہتے تھا، اور شمالی سرکار کے علاقے بھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک گفتگو کے موقع پر۔ جیسا کہ مسٹر مینن نے لکھا ہے ——— اس موقف کی اہمیت تسلیم بھی کی، لیکن عذر یہ کیا کہ برار گو از روئے اصول نظام کا ہے لیکن انہیں اس لئے واپس نہیں دیا جا سکتا کہ وہ صوبہ سی پی کا جز بن چکا ہے ' ——— یہ منطق اصول کی نہ ہوئی طاقت کی ہوئی،

تمام ریاستوں نے عام اصول یہ طے کیا تھا کہ دفاع، امور خارجہ، اور مواصلات کے سوا، کسی معاملہ میں حکومت ہند مداخلت نہیں کرے گی، باقی تمام معاملات میں ان کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کی جائے گی، لیکن حکومت ہند نے ہر ریاست سے مذکورہ بات منوانے کے بعد الحاق کا مطالبہ کیا، اور الحاق کے معنی یہ تھے کہ ہر ریاست اپنی انفرادیت ختم کر دے، جن ریاستوں نے رضا کارانہ یا مجبورانہ طور پر، اس مطالبہ کے سامنے سر جھکا دیا، ان کے بارے میں کچھ کہنا بیکار ہے، لیکن جن ریاستوں نے اس نئے مطالبہ کو نہیں مانا، آخر کس اصول اور ضابطہ کے ماتحت انھیں مجبور کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنا وجود حکومت ہند میں مدغم کر دیں؟

اس سلسلہ میں مسٹر مینن اور ان کے ہم خیالوں نے جہاں تک حیدر آباد کا تعلق ہے تین باتوں پر بہت زیادہ زور دیا ہے،

ایک یہ کہ ریاست حیدر آباد اقتصادی، صنعتی، حرفتی، اور مالی حیثیت سے پسماندہ تھی وہ اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی تھی،

دوسرے یہ کہ ریاست حیدر آباد، کبھی بھی خود مختار، اور آزاد نہیں رہی تھی،

تیسرے یہ کہ وہاں مسلمانوں پر لطف و کرم کی بارش ہوتی تھی، اور ہندوؤں کو نظر انداز کیا جاتا تھا،

ہم ان تینوں امور پر الگ الگ گفتگو کریں گے۔

حیدر آباد کی اقتصادی و صنعتی حیثیت

ہندوستان کی تمام ریاستوں میں، ریاست حیدر آباد سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاست تھی، اور اس کا سبب یہی تھا کہ اس کی اقتصادی حالت بہت اچھی تھی، اسی مسئلہ پر مسٹر منشی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں، البتہ صنعتی و حرفتی حیثیت پر مختصر سی گفتگو کریں گے، :

ہمارے سامنے اس وقت حیدر آباد کی صنعتی ڈائرکٹری ہے، یہ ۱۹۴۵ء کی ہے اس میں چھوٹے بڑے صنعتی اداروں اور کارخانوں کی جو تعداد درج کی گئی ہے، وہ ۲۸۱ تک پہنچتی ہے، یہ ڈائری بالکل مکمل بھی نہیں ہے، بہت سی کارگاہیں رہ گئی ہیں، ان ۲۸۱ کارخانوں میں، بعض چھوٹے ہیں، بعض بہت چھوٹے ہیں، بعض بڑے ہیں، بعض بہت بڑے ہیں، لیکن بہر حال ان سے حیدر آباد کے صنعتی مستقبل کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند کا مختصر طور پر ہم تعارف کراتے ہیں۔

۱۔ عثمان شاہی ملز ناندیڑ

اس کا سرمایہ ادا شدہ پچاس لاکھ روپے سے زائد تھا، اس کی اپنی ایک جننگ فیکٹری بھی موجود تھی، سالانہ ۵۲ لاکھ ۱۸ ہزار پونڈ سوت، اور ۴۱ لاکھ ۴۲ ہزار پونڈ پارچہ تیار کیا جاتا تھا۔ مزدوروں کی تعداد ڈھائی ہزار سے متجاوز تھی جن سے آٹھ گھنٹہ یومیہ کام لیا جاتا تھا، مزدوروں کے لئے طبی امداد کا معقول انتظام تھا، ان کے بچوں کے لئے بھی ہر طرح کا سامان میسر تھا، رہائش کے لئے کوارٹرس موجود تھے،

۱۹۴۴ء میں کمپنی کو ۴۱ لاکھ ۴۹ ہزار روپیہ منافع ہوا۔

۲۔ اعظم جاہی ملز ــــ ورنگل

کمپنی کا ادا شدہ سرمایہ ۱۷ لاکھ ۹۷ ہزار روپیہ تھا، اس مل کی بھی اپنی جننگ فیکٹری موجود تھی، یہاں سالانہ ۴۸ لاکھ پونڈ پارچہ تیار کیا جاتا تھا، محکمۂ رسد حکومت ہند نے فوجی اغراض کے لئے اسے مخصوص آرڈر دیئے تھے، مزدوروں کی تعداد دو ہزار تھی، ان کے

لئے کھیل کے میدان اور کلب بھی موجود تھے، ۱۹۴۶ء سے مزدوروں کی شرح اجرت میں اضافہ کیا گیا، مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کا انتظام بھی مل کی طرف سے تھا۔

۳۔ رام گوپال ملز ــــ سکندرآباد | یہ کارخانہ ۱۸ لاکھ روپیہ کے سرمایہ سے قائم کیا گیا، یہاں کے مزدوروں کی تعداد بھی دو ہزار کے قریب تھی، روزانہ پندرہ ہزار گز کپڑا یہ مل تیار کرتی تھی،

۴۔ ہوم انڈسٹریز لمیٹڈ | یہ کارخانہ، اشیائے ذیل تیار کرتا تھا۔
۱۔ دستی کاغذ، جاذب، کارڈ بورڈ،
۲۔ ٹوپیاں،
۳۔ ریشمی پارچہ جات،
۴۔ چرمی سامان،
۵۔ بیڑی، صابن، ناس، کتھا، لفافے،

مرد مزدوروں کی تعداد، ۴۶۷ اور عورتوں کی تعداد ۱۰۵۵ تھی،

۵۔ دی اورنگ آباد ملز لمیٹڈ | یہاں شیروانیاں، ڈبل چادر، تولیاں اور دھوتیاں تیار ہوتی تھیں، روزانہ دو ہزار مزدور یہاں کام کرتے تھے، اس کے پارچہ کی نکاسی حیدرآباد سے باہر بھی خوب ہوتی تھی،

۶۔ کرشنا کاٹن اینڈ سلک ملز | یہ کارخانہ مشیرآباد میں تھا، یہاں ساڑیوں قمیص، اور شیروانی کا پارچہ تیار کیا جاتا تھا۔

۷۔ محبوب شاہی ملز لمیٹڈ۔ گلبرگہ | یہاں پارچہ از قسم، ساڑی دھوتی، قمیص کوٹ و قمیص تیار کیا جاتا تھا، مزدوروں کی تعداد ۲ ہزار تھی۔

۸۔ حیدرآباد آلوین میٹل ورکس لمیٹڈ | یہاں آہنی سامان، مثلاً الماریاں، تجوریاں، پلنگ، چاقو اور قفل

وغیرہ تیار کئے جاتے تھے، دفاتر، مکانات، اور دواخانجات کے لئے فرنیچر بھی تیار کیا جاتا تھا، مال کی نکاسی اقطاع ہند میں خوب ہوتی تھی،

سرمایہ ۲۵ لاکھ روپے،

مزدور ایک ہزار سے زائد

۹ - بھارت بٹن فیکٹری

اس کارخانہ میں بٹن، ایرنگ، ساڑھی پن، وغیرہ تیار ہوتے تھے،

حصص پر پانچ فیصد منافع،

۱۰ - نیو الیکٹرک ورکس

اس کارخانہ کے مالک مسٹر ٹیلیجکو تھے، جنھوں نے عثمانیہ ٹکنیکل کالج میں تعلیم پائی تھی، برقی بھٹی، ادویات وغیرہ کے لئے اس کی ایجاد تھی، فالج اور لقوے جیسے امراض کے علاج کیلئے آلات برقی بھی اس کارخانہ نے خود بنائے تھے، نیز بغیر سایہ کا چراغ بھی بنایا تھا جو اپریشن کے لئے مفید ہے جو برقی چولھے اس کارخانے کے تیار شدہ ہیں وہ بالکل ولایتی سامان کا نمونہ معلوم ہوتے ہیں،

۱۱ - دی دکن پورسلین اینڈ پاٹریز لمیٹڈ

ہمہ اقسام کے ظروف چینی یہاں تیار ہوتے تھے، سرمایہ مشغولہ ۲۵ لاکھ روپے

۱۲ - سرپور پیپر ملز محدود لمیٹڈ

سرمایہ مجوزہ ایک کروڑ، جاری شدہ سرمایہ ۴۵ لاکھ روپیہ کاغذ سازی ۲٫۵ لاکھ ٹن سالانہ، ہمہ اقسام، "کاغذ نگر" ریلوے اسٹیشن عملہ اور عہدہ داروں کے لئے مکانات اور بنگلے، رفاہی کاموں میں، مدرسہ، دواخانہ، مسجد وغیرہ، ملازمین کو ۲۰ فیصد گرانی الاونس ملتا تھا، بلا کرایہ مکان، مفت روشنی اور پانی، طبی امداد بلا معاوضہ،

۱۳ - سید اسمٰعیل اینڈ سنز

سرمایہ ایک لاکھ روپیہ، نفع ۵ فیصد خاص دستی کاغذ کی صنعت، اوقات کارکردگی سات گھنٹے روزانہ، گورنمنٹ پریس یہاں کا مال خریدا کرتا تھا، پونا اور بمبئی میں بھی یہاں کا مال برآمد ہوا کرتا تھا-

۱۴- دی حیدر آباد سوپ اینڈ آئل ورکس لمیٹڈ | جاری شدہ سرمایہ دس لاکھ روپیہ، نہایت

کامیاب،

۱۵ حیدرآباد کیمیکل اینڈ فارماسوٹیکل ورکس | ایک سو سے زائد پٹینٹ دوائیں، یہ کارخانہ تیار کرتا تھا، سرمایہ کار، ۵

لاکھ روپیہ مزدوروں کی تعداد دو سو سے زائد، مدراس، بمبئی، سی پی، اور سیلون سے بھی کثیر فرمائشیں وصول ہُوا کرتی تھیں،

۱۶- پری سرجیکل ڈریسنگ ورکس | روئی گاڈ، بنڈیج، اور سینٹری تاول وغیرہ کی تیاری، مزدوروں کی تعداد ڈیڑھ

سو کے لگ بھگ،

۱۷- واسد لو آیورویدک فارمیسی | سرمایہ ۵ لاکھ روپیہ، مزدوروں کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب، اس فارمیسی کا مال

اطبائے ریاست خوب خریدتے تھے،

۱۸- روز بسکٹ ورکس | سرمایہ ڈھائی لاکھ روپیہ نفع ۱۵ فیصد، صنعت، بسکٹ، چاکلیٹ وغیرہ، مشنری جرمن، مال کی نکاسی

اقطاع ہند میں بھی خوب ہوتی تھی،

۱۹- چار مینار سگریٹ فیکٹری | مزدوروں کی تعداد سات سو سے زیادہ، عملہ یورپین بھی، مزدوروں کے لئے ہر طرح کی

سہولت،

۲۰- تاج گلے ورکس | سرمایہ ۲۰ لاکھ روپیہ، دس سال سے نفع ۶½ فیصد تقسیم ہو رہا تھا۔

صنعت، چینی کے پاٹ، فرشی اینٹے، استوانے، ٹب، پاٹ مرتبان، رکابیاں کٹورے، پیالیاں، تشتریاں، بنچ اور کرسیاں، چھتوں کے ٹائلز،

۲۱۔ تاج گلاسس ورکس سرمایہ کار ۲۵ لاکھ روپیہ،

۲۲۔ سررشتہ ریلوے یہ حکومت کا محکمہ تھا، ۱۳۶۰ میل پر ریلوے لائن قائم تھی، ریلوے بسیں چار ہزار بیاسی میل رقبہ میں دوڑتی تھیں، ۱۹۴۴ء میں ۱ملین سے زیادہ مسافروں نے سفر کیا،

۲۳۔ سررشتہ زراعت ارنڈی، جوار، کپاس، مونگ پھلی، السی، باجرہ، مکئی تمباکو، اور تل کی کاشت میں حیدرآباد کو ہندوستان پر تفوق تھا۔

۲۴۔ سررشتہ معدنیات ۱۹۲۷ء تک سونے کی کان سے، بہ مقام ہٹی ایک لاکھ ۵۱ ہزار اونس سونا نکالا گیا، سنگرینی وغیرہ میں کوئلہ کے ذخائر نکالے جارہے تھے، ریاست کے معدنیات میں کوئلہ، سیمنٹ اور سنگ مرمر شامل ہیں، یہاں کی کانوں میں بارہ ہزار مزدور ملازم ہیں۔ عادل آباد میں لوہا بھی دستیاب ہوا تھا،

سطور بالا میں مختصر طور پر ہم نے جو نقشہ پیش کیا ہے اس سے حیدرآباد کی صنعتی ترقی، اور شاندار صنعتی مستقبل کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے،

حیدرآباد کی آزادی اور خودمختاری اب ہم دوسری شق پر بحث کریں گے یعنی یہ کہ حیدرآباد کی آزادی اور خودمختاری کبھی اپنا کوئی وجود رکھتی تھی یا نہیں؟

مسٹر منشی اور مسٹر مینن کا خیال ہے کہ حیدرآباد کبھی بھی آزاد اور خودمختار نہیں رہا تھا لہٰذا، آزادی پر اصرار بے معنی تھا،

ان دونوں حضرات کو یہ دعوے کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا اگر حیدرآباد آزاد نہیں تھا تو انگریز اور فرانسیسی کیوں اس سے دوستی قائم کرنے کی جدوجہد ایک عرصۂ دراز تک کرتے رہے، خانہ جنگی اور باہمی منافست کے باعث سلطنت مغلیہ ختم ہوگئی،

پھر اگر حیدر آباد نے "یار وفادار" بنکر، برطانیہ سے رشتہ استوار کر لیا، یا چلئے غلامی قبول کرلی تو اس سے سابقہ آزادی کی نفی کیونکر لازم آتی ہے؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ انتزاع سلطنت مغلیہ تک حیدر آباد نے، تخت دہلی سے اپنا تعلق قائم رکھا، لیکن تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ تعلق سیاسی بالکل نہیں تھا، اخلاقی تھا،!

ٹیپو سلطان کو انگریزوں نے شکست دی، اور ایک بہت بڑی حکومت کو ختم کردیا، ٹیپو کے تصور سے انگریزوں کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، وہ کسی طرح اسے شکست نہیں دے سکتے تھے، اگر نظام نے انگریزوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا اور ٹیپو کی مدد کی ہوتی تو آج سارے جنوبی ہند کا نقشہ کچھ اور ہوتا نظام کی یہ حرکت ملکی اور قومی نقطۂ نظر سے یقیناً غداری تھی، لیکن اس پر گفتگو کا یہ موقع نہیں، سوال یہ ہے کہ اگر حیدر آباد آزاد نہیں تھا، تو انگریزوں نے خوشامد کرکرکے، اور رشوت پیش کرکرکے اسے کیوں اپنا اتحادی بنایا؟

۱۸۵۷ء کے غدر میں اگر نظام نے ذرا اشارہ کردیا ہوتا، تو انگریز افسانۂ ماضی بن جاتے لیکن نظام اور سالار جنگ نے انگریزوں کا ساتھ دیا، جس پر الفنسٹن صاحب جو صاحب سیف و قلم دونوں تھے یعنی بمبئی کے گورنر بھی، اور مورخ بھی، بے ساختہ کہہ اُٹھے:

"اگر نظام نے ہمارا ساتھ نہ دیا ہوتا، تو ہم کہیں کے نہ رہتے،!"

یہ الفاظ خود بول رہے ہیں، خود اپنی تشریح ہیں، ان سے ممنونیت کے جس گہرے جذبہ کا اظہار ہو رہا ہے وہ کسی حاشیہ کا محتاج نہیں، نظام نے تو ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا، وہ انگریز تھے جنھوں نے یک بیک نظام کو پہچاننے تک سے انکار کردیا،

یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

اب ہم دوسری اور تیسری شق سے متعلق "تاریخ حیدر آباد" سے چند شواہد پیش کرتے ہیں:-

بادشاہت سے انکار

حیدرآباد اور اودھ کے فرمانروا درحقیقت "نواب وزیر" ہی تھے، نظام الملک آصف جاہ دکن میں، اور برہان الملک اودھ میں، لیکن دونوں تخت دہلی سے بے نیاز ہوکر بادشاہت کررہے تھے، انگریزوں نے جس طرح اودھ کے نواب وزیر کو دہلی کے خلاف شہ کر بادشاہ تسلیم کرلیا (غازی الدین حیدر کے وقت سے یہ سلسلہ شروع ہوا)، اسی طرح انھوں نے فرمانروائے حیدرآباد کو بھی یہ رشوت دینی چاہی، لیکن :۔

ٹیپو کی بربادی کے بعد سرکار کمپنی نے نظام سے دریافت کرایا کہ وہ بادشاہ کا لقب اختیار کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ نظام نے جواب دیا کہ خاندان تیموریہ کا جب تک ایک شاہزادہ بھی باقی ہے تب تک والی دکن کا اپنے آپ کو بادشاہ کے لقب سے ملقب کرنا نمک حرامی کے مترادف ہے۔ (صفحہ ۴۴۱)

یہی نہیں بلکہ، حیدرآباد کے خودمختار فرماں روا دہلی کے بے بس بادشاہ کو ہمیشہ اپنا آقا تسلیم کرتے رہے، اور وہاں سے القاب وخطابات حاصل کرنے کی جد وجہد کرتے رہے۔

جب بادشاہ دہلی کی طرف سے فرمان سرفرازی آیا تو نواب نے بلدہ سے نکل کر باغ لنگم پلی میں مقام کیا اور باہر میدان میں ایک بڑا خیمہ استادہ کرایا، اور اس میں مسندِ زریں بچھائی گئی، ایلچی نے فرمان اس پر رکھدیا، نواب مسند کے تلے کھڑے ہوکر آداب اور مجرا عرض کرکے مسند کے پاس باادب بیٹھ گئے، عرض بیگی نے وہ فرمان اٹھا کر نواب کے ہاتھ میں دیا، نواب اس کو اپنی پگڑی میں بغیر جیغے کے رکھ کر ہاتھی پر سوار ہوکر لاؤ لشکر اور تجمل کے ساتھ شہر میں آئے۔ توپ خانے سے سلامی کی توپیں سر ہوئیں جب دولت سرا میں پہنچے تو امرائے نذریں گزرانیں۔ (صفحہ ۴۳۶)

اسی طرح کا ایک اور واقعہ جب دہلی کی سلطنت عالم نزع میں مبتلا تھی :۔

نواب ناصر الدولہ صاحب نے اکبر شاہ بن شاہ عالم ثانی سے جو برائے نام دہلی کا بادشاہ تھا درخواست کی تھی کہ مجھ کو بھی بدستور میرے باپ دادا کا خطاب اور القاب

عطا ہو، اس پر بادشاہ کی طرف سے ایک فرمان ۱۲۴۹ھ کو صادر ہوا جس میں موجودہ نواب کی مسند نشینی کی تہنیت اور آنجہانی نواب کی تعزیت تھی، نواب نے خسروانہ جلوس کے ساتھ اس کا استقبال باغ لنگم پلی تک کیا، اس فرمان کے بموجب نواب کا خطاب مظفر الملک نظام الدولہ افضل الاراکین السلطنت آصف جاہ میر فرخندہ علی خاں بہادر سپہ سالار یار وفادار رستم دوران ارسطو زماں مقرر ہوا۔ (صفحہ ۴۹۵)

یہ واقعہ ذکاءاللہ کی تاریخ سے لیا گیا ہے۔

نواب اکبر علی خاں سکندر جاہ، اسد الدولہ، فولاد جنگ نظام الملک آصف جاہ ثالث کا واقعہ:۔

باوجودیکہ ان کے والد ۷ ربیع الثانی کو فوت ہوئے تھے، مگر ان کی مسند نشینی میں کئی دن کی دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کو مسند نشینی منظور نہ تھی، مشیر الملک اور دوسرے امراء کے اصرار سے یہ کارِ عظیم اپنے دوش پر لیا، انھوں نے تعلقات عرفیہ کا پابند ہو کر منظوری شہنشاہ دہلی سے حاصل کی، اس وقت دہلی میں برائے نام شاہ عالم ثانی جس کو غلام قادر خاں روہیلہ نے نابینا کر دیا تھا، بادشاہ تھا، انھوں نے برٹش گورنمنٹ سے معاہدہ کی تجدید کر کے اتحاد قائم کیا، اور گورنر جنرل باجلاس کونسل کی دستخطی سند مورخہ ۲۷ ماہ اگست ۱۸۰۳ء مطابق جمادی الآخر ۱۲۱۸ھ اس مضمون کی انھیں دی گئی کہ دوستی اور اتفاق جو اس قدر استحکام کے ساتھ درمیان نواب نظام علی خاں مرحوم اور گورنمنٹ کمپنی کے جاری ہیں اسی طرح ہر وقت ایمانداری کے ساتھ جاری متصور ہوں گے، اور ہمیشہ کے واسطے دونوں میں جاری رہیں گے، اور تمام عہد نامجات اور اقرار نامجات جو نواب مرحوم اور کمپنی کے درمیان جاری ہیں، حرفاً جاری و ساری متصور ہوں گے، اور عہد و اقرار نامجات تا یوم القیام ملحوظ رہیں گے۔ (صفحہ ۴۴۵)

اس سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہے کہ انگریزوں نے "تا یوم القیام" یعنی روز قیامت تک کے لئے "ایمانداری" کے ساتھ دوستی کے جو عہد نامے لکھے تھے انھیں اٹلی کی اجازت سے ماؤنٹ بیٹن نے مکڑی کے جالے کی طرح توڑ دیا۔

اور جہاں تک نظام کا تعلق تھا، انھوں نے شرط وفا ہر حالت میں نباہی، چنانچہ غدر میں جب انگریز موت وزیست کی کشمکش میں گرفتار تھے سپاہ حیدرآباد نے نازک ہو چلی پر داد شجاعت دے کر انھیں نئی زندگی دی وہ سپاہ حیدرآباد ہی تھی جس نے :-

"درۂ مدن پور کے فتح کرنے میں اس نے بڑی مدد دی اور پھر تالبیٹ کے قلعہ پر جو جھانسی سے جنوب میں واقع ہے قبضہ کر لیا، اس کے بعد جھانسی کے محاصرے اور کنچ کی لڑائی میں اور کالپی کی فتح میں شریک رہی، ان ہنگاموں سے فارغ ہو کر جب دکن کو مراجعت کی تو راستے میں بلوائی زمینداروں کو زیر کیا، اور پھر تانتیا ٹوپی کی باغیانہ حرکتوں کی وجہ سے گوالیار پر چڑھائی کی، اور اس کے قلعے کو فتح کر کے تیرہ مہینے کے بعد ملک نظام کو واپس آئی۔ فروری ۱۸۵۸ء میں کنٹنجنٹ کے ایک دستے نے شولاپور کے باغی راجہ کی فوجوں کو منتشر کر دیا۔ (صفحہ ۵۳۲)

یہ ایسے خدمات جلیلہ تھے جن کا اعتراف کرنے پر انگریز مجبور ہو گئے:-

گورنر بمبئی نے حیدرآباد کے برٹش ریزیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن کو بدیں مضمون تار بھیجا تھا کہ اگر نظام برگشتہ ہو جائے تو پھر ہمارے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ کرنل ڈیوڈسن کو گورنر جنرل کا ایک تار ملا کہ دہلی انگریزوں کے قبضہ سے نکل گئی، یہ پڑھتے ہی ریزیڈنٹ نے فوراً سالار جنگ کو بلوایا اور حقیقتِ حال سے اطلاع دی، انھوں نے کہا یہ مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو چکا ہے۔ بہر حال ریاست حیدرآباد کی وفاداری اور دوستی میں ذرہ بھر بھی فرق نہ آیا۔ سالار جنگ نے فوراً چند معتمد اور سمجھدار عربوں اور نظام کے گارد کے سپاہیوں سے ضروری انتظام کیا اور شہر کے دروازوں اور شاہراہوں پر ان لوگوں کو متعین کر کے حکم دیا کہ اگر کوئی شخص انگریزوں کے برخلاف لوگوں کو برانگیختہ کرتا ہوا پایا جائے تو فوراً بلاتامل گولی سے مار دیا جائے، اور اگر کوئی واعظ مفسدانہ وعظ کرتا ہوا دیکھا جائے تو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ ان انتظامات کی نسبت نظام کی فوج کا سپہ سالار میجر جنرل ہیون لکھتا ہے کہ ان موثر اور اولوالعزمانہ تدابیر نے جنوبی ہندوستان کو بچا لیا، ورنہ اگر حیدرآباد کے لوگ ہماری مخالفت میں اٹھ کھڑے

ہوتے تو مدراسی بھی ضرور ان کی تقلید کرتے، انسائیکلو پیڈیا برطانیہ نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ غدر ۱۹۵۷ء کے موقع پر حیدرآباد کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی، اس وقت حکومت نظام ہی کے مخالف یا موافق ہو جانے پر سارا دار و مدار تھا، کیونکہ وہی ہندوستان میں سب سے بڑی اسلامی ریاست تھی۔ اس کی مخالفت یا موافقت سے مسلمانوں پر بہت گہرا اثر پڑ سکتا تھا۔ (صفحہ ۵۳۳)

لیکن اس وفاداری کا جو صلہ ماؤنٹ بیٹن اور انگریز قوم نے دیا اسے تاریخ کس طرح فراموش کر سکے گی؟

خود مختاری کا ایک اور ثبوت

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب انگریزوں نے مغل خاندان کو ختم کر دیا تھا، اور سارے ہندوستان کے بلا شرکت غیرے مالک بن گئے تھے حیدرآباد کی کیفیت یہ تھی:-

چونکہ غدر کے بعد بادشاہ دہلی کا سکہ چلنا نامناسب تھا، گورنر جنرل کے ایما سے حیدرآباد میں بادشاہی سکہ موقوف ہو کر ۹ محرم ۱۲۷۵ھ سے نیا سکہ تجویز ہوا جس میں ایک طرف نظام الملک آصف جاہ اور دوسری طرف حیدرآباد اور تیمناً لفظ محمد کے عدد ۹۲ مسکوک ہونا قرار پائے اس سکے کا نام حالی مشہور رہا۔ (صفحہ ۵۴۶)

اس عبارت میں گورنر جنرل کا "ایما" خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست

حیدرآباد نے اپنی طرف سے حق دوستی ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی، پہلی جنگِ عظیم جب شروع ہوئی تو:-

اس موقع پر ریاست حیدرآباد کے حکم سے حیدرآباد امپیریل سروس افواج کی دونوں رجمنٹیں تیار کر دی گئیں، پہلی رجمنٹ فی الفور بھیج دی گئی، جنرل آرتھر وائن اس کا کمانڈر تھا، دوسری رجمنٹ ریزرو میں رکھ لی گئی، سرکاری کتابوں میں ان رجمنٹوں کے کارنامہائے جنگ تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔ حیدرآباد دیفنسرز کی خدمات خاص طور پر سزاوار تحسین قرار دی گئیں۔ افواج آصفی کے مختلف افسروں

کو امتیازی نشانات ملے، نیز ان کی خدمات کا اچھے الفاظ میں اعتراف کیا گیا، افواج کا پہلا حصہ ۶ رماہ اپریل ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد واپس آیا، اور دوسرا حصہ ۸ رماہ اپریل ۱۹۲۰ء کو تقریباً دو کروڑ روپیہ نقد مختلف شکلوں میں بطور امداد دیا گیا، مختلف قرضہائے جنگ میں ریاست آصفیہ نے تقریباً ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ روپیہ دیا۔ نیز ۱۹۱۸ء میں جب برطانوی ہند میں مالی حالت نازک ہو رہی تھی، نظام نے پچاس لاکھ روپے کی غیر مسکوک چاندی بطور قرض دی، ریاست کے کارخانوں میں ساڑھے بارہ لاکھ روپے کے گولے، گاڑیاں اور دوسری چیزیں بنیں، جو صرف شدہ قیمت پر بلا منافع برطانوی حکومت کے حوالے کر دی گئیں، گھاس کے بہت بڑے ذخائر مفت دیئے گئے، اس پر ریاست بائیس ہزار روپے سالانہ خرچ کرتی تھی، نمبر ۲۰ دکن ہارس کے نظام اعزازی کرنیل ہیں، اس رسالے کو نئے ہتھیار دیئے گئے، گھوڑوں کو سواری کے لئے درست کرنے کی غرض سے آدمی مہیا کئے گئے، ان پر ریاست کے ۲۸ لاکھ روپے صرف ہوئے، حیدرآباد امپیریل سروس وغیرہ کا خرچ ایک کروڑ تین لاکھ روپے تھا، اس طرح جنگ کے زمانہ میں ریاست حیدرآباد نے کم و بیش چھ کروڑ روپیہ صرف کیا، جنگ کے بعد حکومت برطانیہ نے نواب میر عثمان علی خاں بہادر کو ہز اگزالٹڈ ہائی نس (اعلیٰ حضرت) بنا دیا۔ (صفحہ ۵۸۶)

پھر دوسری جنگ عظیم میں، نظام نے انگریزوں کو جو مدد دی، وہ تو خود ان کے وہم و خیال سے زیادہ تھی۔

یہ بھی ایک تاریخی واقعہ

نظام اور حکومت ہند کے مابین سفارتی تعلقات

ہے اور اس لئے اسے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے:۔

نظام علی خاں بہادر کے عہد تک دونوں سرکاروں میں برابر کے سفارتی تعلقات تھے۔ حیدرآباد میں ریزیڈنٹ اور کلکتے میں سفیر رہتا تھا۔ یعنی ۱۸۰۵ء تک۔ (صفحہ ۴۳۹)

غیر مسلموں کے ساتھ انتہائی فیاضانہ سلوک

اب تیسری شق لیجئے یعنی وہاں کے ہندوؤں اور غیر مسلموں کے ساتھ حکومت کا رویہ کیا تھا؟ بہتر ہے کہ اس سوال کا جواب تاریخ سے لیا جائے۔

حیدرآباد میں ہندوؤں کے منادر کی تعداد ساڑھے پندرہ ہزار کے قریب ہے۔ جن میں صدہا از سر نو تعمیر کئے گئے ہیں، اور سینکڑوں کی مرمت ہر سال محکمہ امور مذہبی . . . کے خرچ سے ہوتی ہے، پنڈتوں اور پوجاریوں کے وظائف مقرر ہیں۔ اسی طرح نصرانی، پادری بھی نظام کی اسلامی رواداری سے برابر بہرہ مند ہو رہے ہیں، غیر مسلموں کے ساتھ جو رواداری نظام کی ریاست میں روا رکھی جاتی ہے اس کی بہت سی مثالوں میں سے صرف ایک مثال اس وقت پیش کی جاتی ہے۔ ڈیکا جی کے رسٹوران کے سامنے نواب افسر جنگ کمانڈر اعظم افواج حیدرآباد نے ایک مسجد کی تعمیر شروع کی تھی، اس مقام کے قریب ایک چھوٹا سا دیول (مندر) بھی تھا۔ مسجد کی عمارت مکمل ہو چکی تھی کہ اعلیٰ حضرت کی توجہ مندر کی طرف منعطف ہو گئی۔ آپ نے فی الفور امتناعی حکم جاری کر دیئے اور مسجد کی تعمیر بند کرا دی۔

سکھوں کے بچوں کی تعلیم کے لئے خاص اہتمام ہے، ان کی تنخواہیں مقرر ہیں، اگر کوئی سکھ لاولد مر جاتا ہے تو پنجاب میں اس کے اعزہ واقربا میں سے اس کا جائز وارث اور قریب ترین رشتہ دار تلاش کیا جاتا ہے، اور متوفی سکھ کی جگہ اسے مقرر کیا جاتا ہے، اگر وہ وارث اور رشتہ دار نابالغ ہوتا ہے تو سنِ بلوغ تک متوفی کی نصف تنخواہ بطور وظیفہ اسے ملتی رہتی ہے، بالغ ہونے پر اسے متوفی کی جگہ مقرر کیا جاتا ہے۔

نواب میر عثمان علی خاں کو اپنی ہندو اور مسلمان رعایا کی فلاح و بہبود سے نہایت دلبستگی ہے، چنانچہ انھوں نے مسجدوں کے ساتھ ہندو مندروں کیلئے بھی رقوم اور عطیات مقرر کر رکھے ہیں، چنانچہ ریاست کے میزانیہ سے جو اعداد و شمار معلوم ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مندروں کے لئے قریباً ایک لاکھ روپے کے عطیات مقرر ہیں، مسلمان بادشاہ ہندوستان میں ہمیشہ ہندوؤں کے مندروں کی محافظت کرتے چلے آئے ہیں۔

اور نواب موصوف نے بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر اس اسلامی رواداری کی شان و عظمت کو ہر طرح سے برقرار رکھا ہے۔

ریاست حیدرآباد میں رعایا سے انکم ٹیکس نہیں لیا جاتا، حالانکہ اس ریاست میں بڑے بڑے تاجر، سوداگر اور جاگیردار ہیں، جنہیں ہزاروں لاکھوں روپے کی آمدنی ہے۔ کئی کروڑپتی سوداگر بھی ہیں لیکن کسی سے ایک پیسہ انکم ٹیکس کا نہیں لیا جاتا، اور اس کا سب سے زیادہ فائدہ ہندو رعایا کو پہنچ رہا ہے، کیونکہ تجارت اور دوسری آمدنی کے بڑے بڑے ذرائع اور کاشتکاری اور عہدے ہندوؤں کے ہاتھ میں ہیں۔

نواب صاحب نے اپنی ہندو رعایا کے جذبات کی خاطر گاؤکشی کی ممانعت کر رکھی ہے۔

ہندوستان میں قدیم الایام سے ایک رسم چلی آتی ہے کہ بعض ہندو اپنی لڑکیوں کو مندروں کی نذر کر دیتے ہیں، اور یہ لڑکیاں تمام عمر کنواری رہتی ہیں، اور مندروں ہی میں اپنی زندگی گزارتی ہیں، ظاہر ہے کہ نوجوان عورتیں جب بیاہ سے روکی جائیں گی تو وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ناگفتہ بہ ذرائع سے کام لیں گی ان کا جمع رکھنا مذہب کے لئے بے حد خطرناک تھا، مس میو نے اپنی کتاب مدر انڈیا میں ان دیوداسیوں کا بالتفصیل ذکر کیا ہے، اور روشن خیال ہندو ان دیوداسیوں کو ملک اور مذہب کے لئے بلا جانتے ہیں، اور ان کے وجود کو ہندوؤں کے تقدس کے حق میں نقصان رساں سمجھتے ہیں، نواب میر عثمان علی خاں نے ان عورتوں کو مندروں کی بھینٹ کرنا قانوناً بند کر دیا اور جس قدر دیوداسیاں تھیں ان کو مندروں کی گرفت سے آزاد کر دیا۔ (صفحہ ۹۱)

تخویف و تہدید گورنر جنرل وغیرہ کی طرف سے

مسٹر مینن نے جہاں کہیں بھی اپنی کتاب میں مذاکرات الحاق کا ذکر کیا ہے، خواہ وہ مذاکرات لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ہوئے ہوں یا جواہر لال سے، یا سردار پٹیل سے، یا خود مسٹر مینن سے، بار بار یہ دھمکی ضرور دی جاتی ہے کہ اگر الحاق نہ ہوا تو ریاست تباہ ہو جائے گی، خاندان آصفیہ مٹ جائے گا، نظام برباد ہو جائیں گے، یہ موقع جو مل گیا ہے، یہ آخری اور بالکل آخری ہے، اسے اگر رائیگاں کر دیا گیا تو

پھر کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

کیا ایک حکومت دوسری حکومت سے اس طرح مذاکرات کیا کرتی ہے؟ کیا ایک حکومت کے دوسری حکومت سے اسی انداز میں مذاکرات ہونے چاہئیں؟ کیا دل اسی طرح جیتے جاتے ہیں، دشمنوں کو یونہی دوست بنایا جاتا ہے؟ مسٹر مینن اور ان کے بالادستوں کا سب سے کمزور استدلال یہی ہے، اگر یہ حضرات دھمکی اور تخویف کے بجائے دوستانہ رویہ اختیار کرتے تو شاید معاملات یہ صورت نہ اختیار کرتے

ایک پرانی یاد

حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کی مالی، معاشی، اقتصادی، صنعتی اور حرفتی ترقیات کے باوجود، اور ہندوؤں کے ساتھ غیر معمولی رواداری برتاؤ کے باوجود ہندو اکابر کے دل اس ریاست کی طرف سے کبھی صاف نہیں رہے۔

غالباً ۱۹۴۰-۴۱ء کا واقعہ ہے، بمبئی کے ریڈیو اسٹیشن پر "جنگی خبروں پر تبصرہ" کرنے میں گیا ہوا تھا، لیکن وقت سے کچھ پہلے پہنچ گیا، سامنے بمبئی کرانیکل کا سنڈے ایڈیشن پڑا تھا، وقت گزاری کے لئے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ یکایک کرشنا ہرو (مسز ہتھی سنگھ) کے ایک مضمون پر نظر پڑی، کرشنا ہرو جواہر لال کی سب سے چھوٹی بہن ہیں۔ اور بمبئی میں ایک دولت مند شخص مسٹر ہتھی سنگھ سے بیاہی ہیں، انھوں نے جنوبی ہند کے متعلق اپنے تاثراتِ سفر بڑے دلچسپ انداز میں لکھے تھے، ایک طائرانہ نظر حیدرآباد پر بھی ڈالی تھی، مضمون کے نقطہ نقطہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ انھیں حیدرآباد کی "پسماندگی" اور "رجعت پسندی" سے کتنی کوفت ہوئی تھی، یہ مضمون گو کرشنا ہرو کا تھا، لیکن یہ ذہن اس اعلیٰ طبقہ کا تھا جو ہمیشہ سے حیدرآباد کی مفروضہ اور مبینہ برائیوں ہی پر نظر رکھنے کا عادی تھا۔ مذاکراتِ صلح کے وقت . . . ۱۹۴۸ء میں یہی ذہن کام کر رہا تھا، اور اسی نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا۔

پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی مثالیں

مسٹر مینن کی تصریحات سے ایک بات اور واضح ہوتی ہے، جو یقیناً افسوسناک ہے، یعنی ایک طرف تو نہایت دوستانہ ماحول میں مذاکراتِ صلح جاری تھے، دوسری طرف نہایت متعدی

سے حریت کی پیٹھ میں چھرا گھونپا جا رہا تھا، لائق علی دہلی میں ہیں ماؤنٹ بیٹن، نہرو، سردار سب ان کی پذیرائی کر رہے ہیں، الگ الگ بلا کر باتیں کر رہے ہیں۔ دوسری طرف سر والٹر مانکٹن بھی موجود ہیں، اور ان کے ذریعہ کوشش کر رہے ہیں کہ نظام لائق علی کو برطرف کر کے نئی کابینہ بنالیں،

ایک طرف نظام سے نہایت خلوص کے ساتھ مذاکرات صلح جاری ہیں، دوسری طرف در پردہ پولیس ایکشن کی تیاریاں کی جا رہی ہیں، اور عین ان تیاریوں کے وقت جب لائق علی یہ پوچھتا ہوا سوال لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مینن کی موجودگی میں تہرہ سے کرتے ہیں تو وہ بڑی معصومیت سے اسے انہونی اور مہمل بات ———— کہکر ٹال جاتے ہیں، سدرن (Southern) کمانڈ سے نامہ و پیام اور ہدایات کا سلسلہ پولیس ایکشن کے سلسلہ میں جاری ہے۔

یاد رہے یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب نظام اپنے دستخط سے مزین کر کے یہ تحریر دے چکے ہیں کہ:-

(۱) وہ پاکستان سے ہرگز الحاق نہیں کریں گے۔

(۲) ممالک غیر سے کوئی سیاسی رابطہ نہیں قائم کریں گے۔

(۳) دفاع، مواصلات اور امور خارجہ کے سلسلہ میں حکومتِ ہند کی بالادستی تسلیم کریں گے۔

(۴) پاکستان کو جو بیس کروڑ روپے کی ہنڈیاں دی گئی ہیں، انھیں پاکستان کیش نہیں کرائے گا۔

اس کے بعد بھی اگر، پولیس ایکشن کی تیاریوں کو پیٹھ میں چھرا گھونپنا نہ کہیں تو کیا کہیں گے؟

ثالثی سے چڑ

جس طرح کوئی قمار باز کسی موقع پر خلاف توقع رقم خطیر جیت لیتا ہے اور پھر بازی لگانا چھوڑ دیتا ہے، اسی طرح ریڈ کلف کو ثالث مان کر اور اس کے ایوارڈ سے گورداسپور اور کشمیر لے کر حکومتِ ہند ثالثی کے نام سے چڑنے لگی تھی۔

چنانچہ حکومتِ نظام اور حکومتِ ہند کے مابین جو معاہدہ قائم ہوا تھا، اس میں واضح دفعہ یہ تھی کہ اگر فریقین میں معاہدہ کی کسی دفعہ پر اختلاف ہو تو اس کا فیصلہ ثالثی سے کرایا جائے گا، پولیس ایکشن کے دن تک حکومتِ ہند، حکومتِ نظام پر معاہدہ قائمہ کی خلاف ورزیوں کا الزام لگاتی رہی اور جواب میں حکومت حیدرآباد کی طرف سے ثالثی کا مطالبہ پیش ہوتا رہا، مگر حکومت ہند نے پولیس ایکشن کو ثالثی پر ترجیح دی، وہ کسی قیمت پر بھی ثالثی کے لئے تیار نہیں تھی، اسے اندیشہ تھا کہ اگر معاملہ ثالث کے سامنے گیا تو وہ مقدمہ ہار جائے گی۔

پولیس ایکشن کے بعد

بہر حال پولیس ایکشن ہوا اور بقول مسٹر منشی، بقول آل انڈیا ریڈیو بقول جواہر لال نہرو، بقول سردار پٹیل، بقول راج گوپال اچاریہ اور مجلس اقوام متحدہ میں حکومت ہند کے بقول ہندوستانی فوجیں نظام کی درخواست پر حیدرآباد میں داخل ہوئی تھیں، پھر مینن نے سردار سے مشورہ کر کے منشی کے ذریعہ اور بطور خود اور زین یار جنگ کی وساطت سے نظام کو یقین دلایا کہ ان کے مرتبہ میں فرق نہیں آئے گا، ان کی حکومت قائم رہے گی، ان کا خاندان باقی رہے گا۔

مگر ——— ؟

پہلے ہلہ میں نظام ملٹری گورنر کے ماتحت کر دیئے گئے۔

دوسرے ہلہ میں انھیں راج پرمکھ بنا دیا گیا، اور حیدرآباد میں وہ ذمہ دار حکومت قائم کر دی گئی جس کا مطالبہ ماؤنٹ بیٹن، سردار، نہرو، مینن وغیرہ کرتے چلے آئے تھے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

تیسرے ہلہ میں ریاست حیدرآباد کا وجود ختم کر دیا گیا، اور سی پی، بمبئی اور مدراس میں اس کے علاقے تقسیم کر دیئے گئے، اور نظام ایک معزز شہری بن گئے۔

اور چوتھے ہلہ میں :-

حیدرآباد ۸؍مئی

کل نظام دکن کی قیام گاہ کنگ کوٹھی میں پولیس کے دو افسران الزامات

کی تحقیقات کے لئے پہنچے کہ اطلاع ملی تھی کہ وہاں کچھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر رکھا گیا ہے، پولیس افسران نے تقریباً پندرہ منٹ تک نظام اور رکنگ کوٹھی کے بعض افراد سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری رکھا۔

یہ تحقیقات سٹی مجسٹریٹ حیدرآباد کے حکم پر عمل میں آئی تھی۔

(پاکستان ٹائمز، ۹ رمئی ۱۹۶۰ء)

بیچارے نظام!

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

حیدرآباد کا وجود قصۂ پارینہ بن چکا ہے، نظام تخت سے اتر کر کچھ دن کے لئے "راج پرمکھ" بنے، پھر صرف "ایک معزز شہری" رہ گئے، اب وہ بھی نہیں ہیں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے طویل دور حکومت میں حیدرآباد نے ہر اعتبار سے اور خاص طور پر علمی اعتبار سے اتنی ترقی کی کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، لیکن یہ ساری ترقیاں پولیس ایکشن کے بعد نسیاً منسیا ہو گئیں، بقول میر

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اس کے اک آنے میں کیا کیا نہ گیا مت پوچھو
وقتِ قتل آرزوئے دل جو لگے پوچھنے لوگ
بس اشارت کی اُدھر، اُن نے کہا مت پوچھو

نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ

(ضمیمہ جات)

مصحفی تیغِ نازِ خوباں سے
ہو گیا قتل بے گناہ افسوس

ضمیمہ (۱)

سر اکبر حیدری

مسٹر منشی نے اپنی کتاب میں سر اکبر حیدری وزیر اعظم حیدر آباد دکن کا جو سراپا بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے سنگ دل، فرقہ پرست اور ہندو کش تھے، لیکن واقعات کی کسوٹی پر اگر ان کی سیرت و کردار کو کسا جائے تو معلوم ہوگا، ان میں تعصب نام کو نہ تھا، کانگرسی مہاتماؤں اور لیڈروں سے ان کے اور ان کے خاندان کے نیاز مندانہ تعلقات تھے، ہندو صوفیا سے ان کی عقیدت مندی حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی، سری اربندو گھوش، سال بھر میں ایک مرتبہ جب درشن دینے کے لئے اپنے خلوت کدہ سے نمودار ہوتے تھے تو سر اکبر حیدری، زحمت سفر برداشت کر کے ایک زائر کی حیثیت سے پہنچتے تھے، ریاست کے ہندوؤں کے ساتھ ان کا جو برتاؤ تھا اس کی دل آویز تصویر خالدہ ادیب خانم اپنے سفر نامہ میں کھینچ چکی ہیں، ان کے صاحبزادے سر صالح اکبر حیدری، کانگرسی زعما کی نظر میں اتنے محبوب تھے کہ آسام جیسے سرحدی صوبہ کے ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے معاً بعد گورنر بنا دیئے گئے ان سب باتوں سے قطع نظر، سر اکبر حیدری میں تنظیمی صلاحیت اس بلا کی تھی کہ حیدر آباد کی ساری مادی ترقیاں انہی کے عہد کی یادگار ہیں،

تعجب ہے کہ مسٹر منشی سر گوپال سوامی آئنگر جیسے شخص کے مداح و معترف ہیں، سر راما سوامی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، لیکن سر اکبر حیدری کے لئے ان کی ڈکشنری میں تحسین و ستائش کا ایک لفظ بھی نہیں، ——— کیا صرف اسی لئے کہ وہ بہر حال مسلمان تھے؟

ضمیمہ (۲)

عثمانیہ اردو یونیورسٹی

اردو سارے ہندوستان کی مشترک زبان تھی، اور مسلمانوں کو تو اس زبان سے خاص طور پر تعلق خاطر تھا، لیکن سارے ہندوستان میں کوئی عصری درسگاہ اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی جراءت نہیں کر سکی، حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی نہیں، لیکن اردو زبان کے مرکز سے دور، بہت دور، جنوبی ہند میں مملکت حیدرآباد نے اردو یونیورسٹی قائم کی، اور ذریعہ تعلیم اردو کو قرار دیا۔ اس یونیورسٹی کے ملحقہ کالجوں، انجینئرنگ کالج، میڈیکل کالج سائنس کالج، ٹکنیکل کالج، اور دوسرے فنی کالجوں میں بھی ذریعۂ تعلیم اردو تھی، انگریزی کے وہ الفاظ جو عام طور پر زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے، یہاں وہ بھی اردو بن گئے، اور اس شان سے کہ انھوں نے حیات جاوید حاصل کر لی،

یونیورسٹی کے لیے "جامعہ"، کالج کے لئے "کلیہ" چانسلر کے لیے "امیر" رجسٹرار کے لئے، "معتمد" اور اسی طرح کے بہت سے الفاظ ترشے ہوئے نگینہ کی طرح، آب و تاب دکھانے لگے،

عام خیال یہ تھا کہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی کا معیار پست رہے گا، اسی اندیشہ سے ہندوستان کی بلند معیار یونیورسٹیوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کو تسلیم نہیں کیا، لیکن جب یہاں کے گریجویٹ، لندن، پیرس، برلن اور واشنگٹن وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں داخل ہوئے تو ہندوستانی یونیورسٹیوں کے طلبہ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ امتیاز و اختصاص

کے ساتھ کامیاب ہوئے، اور دھوم مچ گئی۔

تقسیم ہند تک یہ یونیورسٹی قائم رہی، لیکن پولیس ایکشن کے معاً بعد یک بیک اس کا ذریعہ تعلیم انگریزی کر دیا گیا، اور پھر کچھ عرصہ بعد اسے "ہندی" یونیورسٹی بنانے کا اعلان کر دیا گیا، لیکن اندھرا کا صوبہ جب عالم وجود میں آگیا، تو ہندی کو جان کے لالے پڑ گئے، کیونکہ جنوبی ہند کے ہندوؤں کو ہندی سے اتنی ہی نفرت ہے، جتنی سمپورنانند کو اردو سے، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی یونیورسٹی کا خواب، خواب پریشاں بن گیا، فی الحال انگریزی ہی وہاں ذریعہ تعلیم ہے، آگے چل کر ممکن ہے صوبائی زبان اس کی جگہ لے سکنے میں کامیاب ہو جائے۔ بہرحال اب اصل عثمانیہ یونیورسٹی کا عالم یہ ہے کہ،

ہر چند کہیں کہ ہے ۔۔۔ نہیں ہے

ضمیمہ (۳)

دارالترجمہ

حیدر آباد نے جب اردو یونیورسٹی قائم کی، تو اس کے وسائل بھی مہیا کر لئے، فوراً ہی ایک دارالترجمہ قائم کیا، جس نے انگریزی، عربی، فرنچ اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی تاریخی، علمی، ادبی، تحقیقی، نصابی اور فنی کتابوں کے اردو زبان میں ترجموں کی اشاعت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔

بغداد میں، بیت الحکمۃ، یعنی دارالترجمہ ہارون رشید کے عہد میں قائم ہوا، اور مامون رشید کے دورِ حکومت میں عروج کی انتہائی منزل پہ پہنچ گیا، بغداد، حیدر آباد کی طرح ایک ریاست کا صدر مقام نہیں تھا، اپنے وقت میں دنیا کی سب سے بڑی اور با جبروت حکومت کا پایۂ تخت تھا، ہارون اور مامون میں یہ سکت تھی، کہ وہ فرنگی تاجداروں سے ان کے کتب خانے لے لیں، اور ان کے ترجمے کرائیں، لیکن حیدر آباد نے منہ مانگے داموں پہ ہر اہم کتاب خریدی، اور بڑی اونچی شرح معاوضہ پہ ان کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ اور قیمت اتنی کم رکھی کہ غریب سے غریب شائق علم بھی باسانی خرید سکے۔

قدیم و جدید علوم و فنون کی وہ کون سی کتاب ہے جس کا ترجمہ حیدر آباد کے دارالترجمہ نے بصرفِ زرِ کثیر نہ شائع کیا ہو؟

پولیس ایکشن کے بعد دارالترجمہ پہ تالا پڑ گیا، غیر مطبوعہ مسودے دیمک کی نذر ہو گئے، مطبوعہ کتابیں کوڑیوں کے مول ——— اتنی سستی کہ ردّی فروش پڑیا باندھنے کے لیے خرید سکیں ——— فروخت کر دی گئیں، اور جب اس پر بھی اسٹاک ختم نہ ہوا، تو خوبیٔ قسمت سے آگ لگ گئی،

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردِ سر بسیار بود!

ضمیمہ (۴)

دائرۃ المعارف

عربوں کو "اپنی عربیت" پر جتنا ناز ہے، کسی قوم کو شاید اپنے مذہب پر بھی اتنا ناز نہ ہوگا، مصر، عراق، سعودی عربیہ، شرق اردن وغیرہ میں سنگین اختلافات ہیں لیکن "مسئلہ عرب" جب درپیش ہو تو سب ایک ہو جاتے ہیں، سعودی عرب، مصر، عراق وغیرہ کی مالی حالت بہت اچھی ہے "جنت عدن تجری من تحتھا الانھار" کی ایک نئی تفسیر پٹرول کے بحر کراں نے پیش کر دی ہے، لیکن بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے، عربی علوم، اور عربی کتابوں کی اشاعت اس وسیع پیمانہ پر جملہ عرب حکومتوں نے ملکر بھی نہیں کی، جتنی حیدرآباد نے دائرۃ المعارف قائم کر کے انجام دے ڈالی۔

یورپ، استنبول اور دوسرے مقامات کے کتب خانوں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر حدیث، طبقات، اسماء الرجال الرجال، علوم قرآن، اور دوسرے علوم اسلامی پر گم شدہ اور نایاب کتابیں پانی کی طرح روپیہ بہا کر حاصل کیں، ان کی تصحیح و مقابلہ پر بے دریغ روپیہ صرف کیا، پھر ان کی طبع و اشاعت پر، اندھا دھند خرچ کیا، اور اس طرح عہد اول کی وہ نادر کتابیں جن کا ذکر عہد مابعد کی کتابوں میں ملتا تھا حلیۂ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گئیں، اور اب حالت یہ ہے کہ مصر وغیرہ سے جو تحقیقی، علمی اور فنی کتابیں چھپتی ہیں، ان میں دائرۃ المعارف حیدرآباد کی کتابوں کے بکثرت حوالے ملتے ہیں کہ بغیر اس کے گاڑی آگے چل ہی نہیں سکتی، اور یہاں وہ وسیع پروگرام ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا ہے، جو آئندہ کتابوں کیلئے تھا! حیدرآباد کی علمی خدمتوں اور کارناموں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ:

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

ضمیمہ (۵)

سردار پٹیل کے نام منشی کا خط

کے، ایم منشی ایجنٹ جنرل حکومت ہند متعینہ حیدرآباد نے سردار پٹیل وزیر امور ریاست و نائب وزیر اعظم کو ۲۹۔ فروری ۱۹۴۹ء کو ایک خط بھیجا:۔

"اپنے اس خط میں حیدرآباد کی اقتصادی حالت پر ہی گفتگو کرنا چاہتا ہوں، حکومت حیدرآباد نے جیسا کہ میں ۲۸۔ فروری ۱۹۴۹ء کے مکتوب بنام مسٹر مینن میں عرض کر چکا ہوں ایک آرڈی ننس کے ذریعہ ہندوستانی سکہ کا چلن حدود ریاست میں بند کر دیا ہے، حکومت حیدرآباد کا اس بات پر اصرار کہ وہ غیر ممالک میں اپنے ٹریڈ ایجنٹ مقرر کرے گی، اور اس حق پر اصرار کہ وہ اپنی فاضل برآمد کے ذریعہ فارن ایکسچینج حاصل کرے گی، یہ بات اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت حیدرآباد کو اقتصادی طور پر آزاد اور اتنا طاقتور بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ہندوستان کی پوزیشن زیادہ سے زیادہ دشوار ہو جائے، میری پُر زور رائے ہے کہ آئندہ حیدرآباد سے گفت و شنید مصالحت کے وقت یہ اقتصادی عنصر ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے،

اس خط کے ساتھ ایک تتمہ منسلک ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ حیدرآباد کی درآمد و برآمد کے سلسلہ میں صحیح حیثیت کیا ہے؟، میں نے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں، وہ ریاست کے سرکاری

ریکارڈ سے حاصل کئے ہیں، اور ان پہ پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے، ان اعداد و شمار سے حکام
ریاست نے اپنے وسائل کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے،

حال ہی میں نظام گورنمنٹ نے حدود ریاست سے باہر مونگ پھلی کی برآمد پہ پابندی عائد
کردی، اس اقدام کا یقینی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کی مارکیٹ بری طرح متاثر ہوگی، حکومت نظام
بہت سستے داموں مونگ پھلی کا ذخیرہ جمع کر رہی ہے، یہ گویا پہلا اقدام ہے اپنی قابل برآمد اشیاء
کو باہر فروخت کر کے اسٹرلنگ یا فارن ایکسچینج حاصل کرنے کا،

میں نے اپنے تتمے میں یہ بات واضح کردی ہے کہ حیدرآباد پر اقتصادی دباؤ ڈالنا بس
ضروری ہے، اس طرح ہم بہ آسانی اسے راہ راست پر لاسکیں گے، لیکن حیدرآباد کی سول سروس
بہت زیادہ فرض شناس اور کارگزار ہے، لائق علی کا مقصد یہ ہے کہ حیدرآباد کو اقتصادی
طور پر خود کفیل بنا دیا جائے، ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت اس مقصد کو حاصل کرنے میں
تمام امکانی تدابیر عمل میں لائی جارہی ہیں، اگر کچھ مہینے تک یہ کیفیت قائم رہی تو پھر ہماری اقتصادی
ناکہ بندی بھی کچھ زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگی۔

حیدرآباد ہندوستان کے مختلف گوشوں سے مال منگانے اور غیر ممالک سے سامان
درآمد کرنے میں ہندوستانی ریلوں کا محتاج ہے، دوسری طرف بعض نہایت اہم لائنیں ہندوستان
کے مختلف علاقوں سے حیدرآباد سے ہوتی ہوئی گزرتی ہیں، حیدرآباد ہندوستان کے ایک
حصہ کو دوسرے حصہ سے کسی طرح منقطع نہیں کر سکتا لیکن مشکلات ضرور پیدا کر سکتا ہے، کیونکہ
پھر جنوبی ہند کو باقی ہندوستان سے متصل رکھنے کے لئے دور دراز کا راستہ اختیار کرنا پڑے
گا، جو ریل شمالی ہند اور جنوبی ہند (دہلی سے مدراس تک) نیز مغربی ہند اور مشرقی ہند (بمبئی
سے مدراس تک اور گوا سے مسولی پٹم تک) جاتی ہے وہ حیدرآباد ہوتی ہوئی گزرتی ہے
اور کافی دور تک اس علاقہ سے اسے گزرنا پڑتا ہے، اپنی اس اہمیت سے حیدرآباد
بخوبی واقف ہے، اور وہ اسے سودے بازی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے، تاکہ اس دھونس
کی بنیاد پہ غیر ممالک سے سامان منگانے اور وہاں سامان بھیجنے کے سلسلہ میں براہ راست
ٹرانسپورٹ کا حق حاصل کر سکے، اگر حیدرآباد کو ٹرانسپورٹ کی سہولتیں دینے سے حکومت

ہند انکار کردے تو اس سے حیدر آباد کو سخت دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حکومت بمبئی اور مدراس نے درآمد پر جو پابندیاں عائد کی ہیں، ان کی ذمہ داری صرف حیدر آباد کے غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل پر ہے،

دکن ایرویز کو بجا طور پر حکومت حیدر آباد اپنی آزادی کا نہایت اہم عنصر سمجھتی ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے یہ ہوائی سروس ہندوستان میں دہلی سے بنگلور، اور مدراس تک جاری ہے، اور اس طرح شمالی ہند کو جنوبی ہند سے ملحق کرتی ہے اور اب اسکیم یہ بن رہی ہے کہ کراچی سے چٹاگانگ تک دکن ایرویز کے طیارے اڑائے جائیں اور اس طرح ضروری اشیاء کی درآمد کی جاسکے، یہ کمپنی حکومت چلا رہی ہے، لیکن اب اسے قومیانے کی اسکیم مرتب کی جارہی ہے تاکہ ٹاٹا وغیرہ کے جو حصے ہیں، قومیانے کے بہانے انھیں چھین لیا جائے،

حکومت ہند نے نظام گورنمنٹ کو حکیم پیٹھ کا ہوائی اڈہ تفویض کر کے ہمارے مواصلات پر ایک زبردست ضرب لگائی ہے، حیدر آباد میں تیزی سے دوسرے ہوائی اڈے تعمیر ہو رہے ہیں، حکومت ہند صرف وائرلیس اسٹیشن پر کنٹرول رکھتی ہے، لیکن میں اپنے اطلاعات کے مطابق کہہ سکتا ہوں کہ اسی اسٹیشن سے کراچی پیغام بھیجے جاتے ہیں اور ہم انھیں گرفت میں نہیں لے پاتے۔ میری صلاح یہ ہے کہ حکومت ہند کو ہوائی اڈوں کے معائنہ اور جائزہ کا حق حاصل کرنا چاہیے، آپ کی اجازت کے مطابق جو آپ نے میری تجویز کے مطابق مرحمت فرمائی تھی میں نے حکومت ہند کے وزیر رسل و رسائل آنریبل رفیع احمد قدوائی سے رابطہ پیدا کیا، انھوں نے فوراً اور بروقت اقدام کر کے انڈین اوورسیز ایرویز لیمیٹڈ کی یہ درخواست منظور کر لی کہ اسے لائسنس دیا جائے، لیکن اس پر عمل درآمد میں رکاوٹیں پیدا کی جارہی ہیں، مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ قدوائی صاحب کی وزارت کے ذمہ دار افسر باوجود اس کے کہ یہ معاملہ بے انتہا اہم تھا نہایت تغافل سے کام لے رہے تھے، بہرحال کسی نہ کسی طرح کمپنی کو لائسنس ملا اور ۲۰-فروری ۱۹۴۸ء سے اس نے اپنے طیارے اڑانا شروع کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حیدر آباد کی حکومت اس اقدام سے بہت الجھن اور پریشانی میں مبتلا

ہوگئی، اس نے احتجاج پر احتجاج کیا، معین نواز جنگ نے مجھ سے کہا کہ انڈین اور سیز ایرویز لمیٹڈ کو لائسنس دے کر ہماری علاقائی خود مختاری پر حکومت ہند نے حملہ کیا ہے۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ علاقائی خود مختاری کا جو دعویٰ حیدرآباد نے کیا ہے اگر اسے تسلیم کر لیا گیا تو رسل و رسائل پر اس وقت جو بالادستی ہمیں حاصل ہے وہ قطعاً ختم ہو جائے گی،

میں آپ کی توجہ وقت کی اہم ترین ضرورت پر مبذول کرانا چاہتا ہوں :-

۱۔ دکن ایرویز کو ہرگز یہ باور کرنے کا موقع نہ دیا جائے کہ واقعی وہ ایک غیر ملکی کمپنی ہے، نیز حیدرآباد کے ہوائی اڈے کو بھی غیر ملکی پورٹ نہ تسلیم کیا جائے، جس پر حکومت ہند کو کسی طرح کی بالادستی پھر اصولاً نہیں حاصل ہو سکتی۔

۲۔ دکن ایرویز کو ہندوستانی حدود سے باہر پرواز کرنے کی قطعاً اجازت نہ دی جائے،

۳۔ دکن ایرویز کی حیدرآبادی علاقہ میں اجارہ داری کو کسی قیمت پر تسلیم نہ کیا جائے۔

میری رائے میں مناسب تو صورت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں آپ خود آنریبل رفیع احمد قدوائی سے گفتگو کریں، تاکہ پالیسی متعین طور پر قائم ہو جائے، ورنہ ان کے محکمے کے افسر برابر مشکلات پیدا کرتے رہیں گے،

حکومت نظام نہایت تیزی اور چستی کے ساتھ حسب ذیل پروگرام پر عمل پیرا ہے،

۱۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال کے لئے زیادہ سے زیادہ اسٹاک اور ذخیرہ کی فراہمی، کم سے کم مدت میں اور تیز سے تیز رفتار کے ساتھ۔

۲۔ غیر ممالک میں تجارتی نمائندے ٹریڈ ایجنٹ متعین کرنے میں ممکنہ حد تک عاجلانہ اقدامات۔

چنانچہ حکومت حیدرآباد نے حسب ذیل نام اپنے تجارتی ایجنٹوں کے تقرر کے لئے منتخب کر لیے ہیں۔

۱۔ مشرق وسطیٰ میں ٹریڈ کمشنر کا تقرر —— اس علاقہ میں ایران اور مصر کو بھی شامل رکھا گیا ہے۔

۲ - مشرق بعید میں ٹریڈ کمشنر کا تقرر ———— اس علاقہ میں برما، تھائی لینڈ اور جاپان شامل ہیں۔

۳ - آسٹریلیا، انڈونیشیا اور دوسرے قریبی جزائر میں ٹریڈ کمشنروں کا تقرر،

۴ - برطانیہ عظمیٰ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں ٹریڈ کمشنروں کا تقرر،

۵ - امریکہ، کینیڈا اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں ٹریڈ کمشنروں کا تقرر،

۶ - زیادہ سے زیادہ مقدار میں ایسی چیزوں کا پیدا کرنا جو غیر ممالک میں برآمد کی جا سکیں، اس سلسلہ میں خاص طور پر آب رسانی کے ذرائع وسیع کرنے، نئے کنوئیں کھودنے، نئے تالاب تعمیر کرنے کی جدوجہد تیزی سے جاری ہے، اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مخصوص افسر کا تقرر عنقریب کیا جانے والا ہے۔

محولۂ بالا پروگرام کو روبہ عمل لانے کے لئے مسٹر غلام محمد (پاکستان) نے لائق علی کو مشورہ دیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زرِ مبادلہ خواہ اسٹرلنگ کی صورت میں ہو یا ڈالر کی جمع کر لیں، تاکہ حیدرآباد دوسرے ممالک سے ضرورت کی چیزیں درآمد کر سکے،

لندن میں حکومت حیدرآباد کے تیس لاکھ سے زیادہ پونڈ جمع ہیں،

مجھے معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند سے ریزرو بنک آف انڈیا کی معرفت یہ اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ حکومت ہند کی جو کفالتیں حکومت حیدرآباد کے پاس ہیں انھیں اسٹرلنگ یا سونے میں تبدیل کر دیا جائے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا ہے، لیکن میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر یہ تجویز عمل میں آ گئی تو برطانیہ میں حیدرآباد کے پاس اسٹرلنگ کا بہت بڑا ذخیرہ ہو گا جسے وہ اپنی مرضی سے جس طرح اور جس مقصد پر چاہے صرف کر سکے گا،

ایک تجویز یہ بھی ہے کہ امریکہ سے اس معاملہ میں گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے کہ سرکاری طور پر قرض حاصل کیا جائے تاکہ وہاں سے مال درآمد کرنے میں آسانی ہو، اسی طرح کی گفت و شنید امریکہ کے بنکوں سے بھی جاری ہے، چنانچہ حیدرآباد کا ایجنٹ جنرل متعینہ لندن

امریکہ کے چیز بنک (Chase Bank) سے گفت و شنید کر رہا ہے۔
معین نواز جنگ بڑی سرگرمی سے اس جد و جہد میں مصروف ہیں کہ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بنک کی ممبری حیدرآباد حاصل کر سکے،

حیدرآباد میں ہندوستانی سکے کے چلن پر جو پابندی عائد کر دی گئی ہے وہ حیدرآباد کی اقتصادی آزادی کی اسکیم کا ایک حصہ ہے، حیدرآباد کے سرکاری ریکارڈ سے مجھے یہ معلومات حاصل ہوئے ہیں کہ ہندوستانی روپیہ بند کرکے حیدرآبادی کرنسی کو اہمیت دینے کا یہی وسیلہ تھا۔ میں نے جو کاغذات دیکھے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ۱۸۷۰ء اور پھر ۱۹۰۹ء میں جب حیدرآباد نے سکے کا قانون پاس کیا تو یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ ہندوستانی سکہ بدستور چلتا رہے گا، اور اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی،

میں نے حیدرآباد کا یہ اقتصادی جائزہ تفصیل کیا تھا اس لئے پیش خدمت کیا ہے کہ میں محسوس کر رہا ہوں مسٹر لائق علی حیدرآباد کو اقتصادی طور پر آزاد اور خود مختار بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے ہیں، یہ اندازہ میں نے اس گفتگو سے لگایا ہے جو بارہا میرے اور ان کے مابین ہوئی،

مذکورۂ بالا حقائق و معروضات کے پیش نظر لابد ضروری ہے کہ حیدرآباد کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک مرعی نہ رکھا جائے ورنہ ہندوستان کی خود مختاری اور اقتصادی خود مختاری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا، •

ضمیمہ (۶)

حیدرآباد کے اقتصادی حالات کی رپورٹ

سردار پٹیل کی خدمت میں

حیدرآباد مندرجہ ذیل اشیاء اپنی ضرورت سے اتنی زیادہ رکھتا ہے کہ انھیں برآمد کرکے زر مبادلہ کما سکتا ہے،

۱- اناج ــــ پچاس لاکھ ٹن،
۲- تیل ــــ تین کروڑ پچاس لاکھ ٹن،
۳- روئی ــــ تین کروڑ چالیس لاکھ گانٹھ،
۴- کوئلہ ــــ چار کروڑ پچاس لاکھ ٹن
۵- سیمنٹ ــــ ایک کروڑ تیس لاکھ ٹن
۶- کاغذ ــــ تین لاکھ ٹن۔

ذیل میں وہ اشیاء درج کی جاتی ہیں جن کی حیدرآباد میں کمی ہے اور جنھیں وہ ہندوستان یا بیرون ہند سے درآمد کرنے پر مجبور ہے،

۱- پٹرول ــــ تئیس لاکھ گیلن،
۲- مٹی کا تیل ــــ بتیس لاکھ گیلن،
۳- بری کٹنگ آئل ــــ چھ لاکھ چھ ہزار گیلن۔
۴- ایندھن اور کروڈ آئل ــــ تیرہ لاکھ پچیس ہزار گیلن۔

۵۔ نمک ——— آٹھ ہزار ٹن،

۶۔ گڑ ——— پندرہ ہزار ٹن،

۷۔ کپڑا ——— پچاس ہزار گانٹھ،

علاوہ ازیں تقریباً دس کروڑ روپے کی عام ضروریات کی چیزیں اس کو درآمد کرنا پڑتی ہیں۔

۱۔ مشینری اور پلانٹ، تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ روپیہ،

۲۔ خام اشیا، صنعتوں کو چلانے کے لئے دو کروڑ پچاس لاکھ روپیہ۔

حیدرآباد ہندوستان کی پیداوار کے مقابلہ میں گیہوں ۱/۱ اور ——— چاول ۱/۱۰۵ پیدا کرتا ہے، اور تقریباً بیس فیصد باجرہ پیدا کرتا ہے، باجرہ اور دال وہ ضرورت سے بہت زیادہ پیدا کرتا ہے، گیہوں اور چاول کم، لیکن تھوڑی کوشش سے تعیم میں توازن اور راشننگ کرکے بڑی آسانی سے اناج کے معاملہ میں وہ خودکفیل ہوسکتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے متعدد صوبے بڑی حد تک حیدرآباد کی دال کی پیداوار کے محتاج ہیں:

شکر کے معاملہ میں بھی حیدرآباد خودکفیل ہے، اگرچہ اس کا کوٹہ باقی ہندوستان سے بہت کم ہے،

حیدرآباد میں گڑ بھی کم پیدا ہوتا ہے لیکن اس کی تلافی راشننگ کے ذریعہ ہوسکتی ہے،

نمک کے معاملہ میں حیدرآباد بڑی حد تک محتاج ہے۔

حیدرآباد کی مونگ پھلی کی پیداوار سات لاکھ ٹن سے زیادہ ہے، یعنی ہندوستان کی جملہ پیداوار کے مقابلہ میں ۲۳ فیصد،

رینڈی کی پیداوار میں اسے تقریباً اجارہ داری حاصل ہے، تقریباً چالیس ہزار ٹن رینڈی وہاں پیدا ہوتی ہے، جو ہندوستان کی جملہ پیداوار کے مقابلہ میں چالیس فیصد ہے،

بیتالیس ہزار ٹن السی کی پیداوار حیدرآباد میں ہوتی ہے، یعنی ہندوستان کی جملہ پیداوار کے مقابلہ میں بارہ فیصد،

حیدرآباد روئی بھی اپنی ضرورت سے بہت زیادہ پیدا کرتا ہے، یعنی تقریباً تین کروڑ چالیس لاکھ گانٹھ، یہ اتنی مقدار میں پیدا ہوتی ہے کہ اس سے بھی حیدرآباد سودے بازی کر سکتا ہے، بہت سی کاٹن ملیں شولاپور، احمدآباد اور بمبئی میں واقع ہیں، ان سب کی ضرورتیں حیدرآباد سے پوری ہوتی ہیں۔

کوئلہ ضروریات زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور حیدرآباد میں اس کی پیداوار ضرورت سے بہت زائد ہے، تقریباً دس لاکھ ٹن کوئلہ حیدرآباد میں پیدا ہوتا ہے، اس میں سے چار لاکھ پانچ ہزار ٹن برآمد کیا جاتا ہے، ایم ایس ایم ریلوے، ایس آئی ریلوے اور میسور ریلوے اور جنوبی ہند کی صنعت گاہیں حیدرآباد ہی کے کوئلہ سے چلتی ہیں، یہ بہت بڑی نعمت حیدرآباد کے ہاتھ میں ہے، جس سے وہ بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے، اگر ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں میں اس کی برآمد بند ہو جائے تو غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا، کیونکہ ہندوستان میں اس کی پیداوار ضرورت سے کم ہے،

سیمنٹ بھی ضروریات زندگی میں بہت زیادہ غیر معمولی طور پر اہمیت کی حامل ہے، اور حیدرآباد سیمنٹ کے معاملہ میں بھی نہ صرف خود کفیل ہے، بلکہ ضرورت سے بہت زیادہ پیدا کرتا ہے، اپنی پیداوار کا یہ صرف ایک چوتھائی استعمال کرتا ہے، باقی برآمد کی جاتی ہے، یہ ایک اور بہت بڑی اہم چیز حیدرآباد کے ہاتھ میں ہے جس سے وہ بہت کافی نفع کما سکتا ہے۔

سرپور مل تقریباً پانچ ہزار ٹن کاغذ بناتی ہے، جس کا بڑا حصہ برآمد ہوتا ہے، سارے ہندوستان میں کاغذ کی پیداوار نوے ہزار ٹن ہے جس میں سے چھ فیصد حیدرآباد میں بنتا ہے،

پٹرول کے معاملہ میں حیدرآباد خود کفیل نہیں ہے اور اس اہم ترین ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ دوسروں کا محتاج ہے کیونکہ بغیر اسے درآمد کئے کام نہیں چلتا، اس معاملہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس کی ٹرانسپورٹ کا مسئلہ کافی ٹیڑھا ہے۔ حیدرآباد ہندوستان سے ایسا انتظام کرنا چاہتا ہے کہ آسانی کے ساتھ پٹرول درآمد کر سکے، تاکہ وہ غیر ممالک

یہ چیزیں مہیا کر سکے، موجودہ اسٹاک تین مہینے تک کفایت کرے گا۔ اسے ذخیرہ کرنے کے وسائل پر حکومت حیدرآباد غور کر رہی ہے، میرے مخبروں نے مجھے جو اطلاع دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدرآباد کئی مہینے تک پٹرول کو درآمد کئے بغیر اپنا کام چلا سکتا ہے،

لبری کیٹنگ آئل کی بھی حیدرآباد کو سخت ضرورت ہے کہ بغیر اس کے وہ اپنی ریلوے صنعت گاہوں کو کامیابی کے ساتھ نہیں چلا سکتا، اگر حیدرآباد میں پٹرول اور لبری کیٹنگ آئل کی درآمد بند کر دی جائے تو حیدرآباد کی ٹرانسپورٹ کو بڑا دھکا لگے گا اور اس کا سنبھلنا مشکل ہو جائے گا،

حیدرآباد کو تقریباً اسی ہزار ٹن نمک درکار ہوتا ہے، اس کے استعمال میں کچھ کمی بھی کی جا سکتی ہے، لیکن اس نے نمک کا اتنا ذخیرہ فراہم کر لیا ہے جو کم و بیش ایک سال تک اسے بے نیاز رکھے گا، کسی حد تک گڑ اور شکر کی بھی حیدرآباد میں کمی ہے۔ لیکن حکومت حیدرآباد نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے گنے کی کاشت کا وسیع پیمانے پر بندوبست کیا ہے،

حیدرآباد میں کپڑے کی بھی کمی ہے، حکومت حیدرآباد پوری کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ ملیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں کپڑا تیار کر سکیں تاکہ آگے چل کر محتاجی نہ ہو، حیدرآباد کی ملیں جو کپڑا تیار کرتی ہیں، وہ چھتیس ملین گز ہے، ہینڈلوم سے جو کپڑا تیار ہوتا ہے وہ ساٹھ ملین گز ہے، گویا کپڑے کی مجموعی پیداوار چھیانوے ملین گز ہے، لیکن ہینڈلوم کا کپڑا زیادہ تر اس دھاگے سے تیار ہوتا ہے جسے برآمد کرنا پڑتا ہے، گویا عمومی طور صورت حال یہ ہے کہ مقامی ملیں جو کپڑا تیار کرتی ہیں وہ فی کس ڈھائی گز کے حساب سے بیٹھتا ہے اور ہینڈلوم سے جو کپڑا تیار ہوتا ہے اسے بھی اگر شامل کر لیا جائے تو فی کس تین گز کپڑا پڑتا ہے باہر کی ملوں سے جو کپڑا منگایا جاتا ہے وہ فی کس ساڑھے چار گز اور ہینڈلوم کا جو کپڑا باہر سے منگایا جاتا ہے وہ ڈھائی گز پڑتا ہے، اگر حیدرآباد میں باہر سے کپڑا نہ پہنچنے دیا جائے اور سوت کی درآمد پر بھی پابندی لگا دی جائے تو اسے اپنے کپڑے کے مصارف میں ساٹھ فیصد تخفیف پر فوراً مجبور ہو جانا پڑے گا،

بعض دوسری چیزوں میں بھی حیدر آباد درآمد پر مجبور ہے جو غیر ممالک سے منگائی جاتی ہیں۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ وہ غیر ممالک سے اپنی ضرورت کی چیزیں براہ راست منگا سکے اس بات کی سر توڑ کوشش کی جا رہی ہے کہ بعض ضروری اشیا کا اسٹاک جمع کر لیا جائے اور سختی کے ساتھ راشننگ کا اصول نافذ کر دیا جائے، تاکہ موجودہ اسٹاک زیادہ دیر چل سکے۔

صنعتوں کو چلانے کے لئے مشینری، پلانٹ اور خام اشیاء کی سخت ضرورت ہوتی ہے، یہ چیزیں حیدر آباد باہر سے درآمد کرنے پر مجبور ہے، اور جب تک ٹرانسپورٹ کے سلسلہ میں اس کے مطالبات حکومت ہند تسلیم نہ کر لے، اس کی صنعت مفلوج ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ نہ اسپیر پارٹس بہم پہنچ سکیں گے، نہ خام اشیاء مہیا ہو سکیں گی،

حال ہی میں وسیع پیمانے پر اسپیر پارٹس کا ذخیرہ خریدا گیا ہے، مقصد یہ ہے کہ اسے ہنگامی اور نازک وقت کے لئے محفوظ رکھا جائے،" (۱)

---

(۱) سردار ولبھ بھائی پٹیل کے نام مسٹر منشی کا خط، اور خط کے ساتھ اس کا تتمہ دیکھنے سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان نے حیدر آباد میں اپنے ایجنٹ جنرل کا تقرر صرف اس لئے کیا تھا کہ وہاں جا کر اپنے مخبروں کا جال پھیلا دے، سرکاری ریکارڈ سے دلوگوں کا ضمیر خرید کر کے معلومات حاصل کرے، ریاست کی صنعتی، اقتصادی، سیاسی تنظیمی اور عسکری سرگرمیوں کا جائزہ لے، اعداد و شمار فراہم کرے، اور انھیں نمک مرچ لگا کر اپنے سردار کے سامنے پیش کر دے، اور پھر سردار کو ناکہ بندی کا، اقدام کا، حملہ کا مشورہ دے، اور یہ سب کچھ عین اس زمانہ میں کرے جب کہ ابھی معاہدہ قائمہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی پبلک بیانات میں، اخبارات کے صفحات پر، اسمبلی کے ایوان میں، سردار اور سردار کے رفقاء، دوستی تعاون اور سلوک باہمی کی تلقین کریں، لیکن اندرون خانہ "دشمن" کے کمزور مورچوں کی جستجو کی جائے ان میں شگاف ڈالا جائے، اپنی تیاریاں پورے طور پر جاری رکھی جائیں، اور "دشمن" کو مغالطہ میں رکھا جائے، اور پھر دفعتہً الزامات کی بارش کی جائے، کردہ اور ناکردہ گناہوں کی فہرست تیار کی جائے، ہر بیان صفائی کو مسترد کر دیا جائے، ہر توجیہ کے ماننے سے انکار کر دیا

(باقی حاشیہ ص ۵۰۰ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۹۹) جائے، ہر عذر کو، عذر بارد قرار دیا جائے، صلح کا ہاتھ جھٹک دیا جائے، ازروئے معاہدہ ثالثی کی طے شدہ شرط تک کو ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ اور پھر یک بیک "پولیس ایکشن" کیا جائے، اور اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے اور پھر اس پر فخر کیا جائے کہ

"جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہوگا"!

ایک عام اصول یہ ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے، لیکن سردار کو اور ان کے ایجنٹ کو نہ حیدر آباد سے محبت تھی، اور نہ وہ حیدر آباد سے برسر جنگ تھے، معاہدہ قائم تھا، دوستی کے پیمان بندھ رہے تھے، لیکن در پردہ دشمنی کی گھات بروئے کار لائی جا رہی تھی،

یہ حرکتیں نازی جرمنی کے لئے باعث ندامت نہیں ہو سکتی تھیں، سرخ روس کیلئے مایۂ فخر و ناز ہو سکتی تھیں، فاسطسٹ اطالیہ کے لئے، ان پر نازش کا موقع ہو سکتا تھا، لیکن کیا ان لوگوں کے لئے بھی یہ باتیں مایۂ فخر و مباہات ہو سکتی تھیں، جو عدم تشدد کے پرستار تھے، جو اصول اور عقیدہ کے لئے سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے؟

کوئی حرج نہ تھا اگر حیدر آباد سے صاف الفاظ میں کہہ دیا جاتا، الحاق کرو، ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ، لیکن سر منشی جاتے اس لئے ہیں کہ حیدر آباد اور ہندوستان میں دوستی کا نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کر دیں، اور کرتے یہ ہیں کہ دشمنی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے،

اللہ رے کمال کہ دل پہ یہ اختیار،
شب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا!